... ایمن روشن ہے — شمع یہاں بھی جلتی ہے

الحکمۃ ضالۃ المؤمن (ح)

حکمت مومن کا کھویا مال ہے

جنوری ۹۴ء

تہذیب الاخلاق

Rs. 4·50

مجلس ادارت

اغراض و مقاصد

۱. جہل، رجعت پسندی اور خود فریبی کے خلاف جدوجہد، ذہنی بیداری، دانشوری اور مربوط فکری کی روایت کا احیاء۔ ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت۔ ۲. مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع، زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت ۳. ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط و اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش۔ ۴. ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔ ۵. ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا چرچا۔ ۶. سائنسی علوم و فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت۔ ۷. علوم و فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف۔

مقالہ نگاروں کیلیے

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔

عام فہم سائنسی، علمی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ کریں۔

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔

مسودہ بڑے سائز 20 cm x 30 cm کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دو دو سطروں میں صاف صاف تحریر ہونے چاہیے اور ناصاف مسودات رد کر دیے جائیں گے۔

مقالہ میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں۔ شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں۔ تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا ہوا ٹکٹ لگا لفافہ بھی ہو۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۳

شمارہ ۱

جنوری ۱۹۹۴ء

بانی ... سرسید احمد خاںؒ

* سرپرست *

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

انچارج سرکولیشن	نائب مدیر	ترتیب
شفیق احمد	احمد مجتبیٰ قریشی	[illegible]

ترسیل زر کا پتہ : Phone : 24027

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق [illegible]

مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ [illegible]

Editor, Tahzeeb-ul-Akhlaq [illegible]

[illegible] Aligarh [illegible]

زر سالانہ :

اندرون ملک Rs. 45.00

بیرونی ممالک [illegible]

[illegible]

مندرجات

نامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ مسلم یونیورسٹی بہرحال اُن سے متفق ہو۔

: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پبلشر: کبیر احمد جائسی۔ مقام اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت۔
اے ایم یو علی گڑھ۔ مطبع: اے ایم یو پریس۔ علی گڑھ

اداریہ

افسوس ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے ایک قدیم استاد، شعبۂ عربی کے سابق ریڈر حافظ غلام مصطفیٰ صاحب نے ۲۷ دسمبر ۱۹۹۳ء کو صبح کو سوا آٹھ بجے اس عالم فانی کو خیرباد کہا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

حافظ صاحب مرحوم کی پیدائش یکم جولائی ۱۹۱۷ء کو موضع کھونپا ضلع الٰہ آباد میں ہوئی۔ ان کے والد حاجی قدرت علی صاحب ایک اوسط درجے کے ناخواندہ تاجر تھے۔ وہ خود تو ناخواندہ تھے مگر اپنی اولادوں کو عالم فاضل دیکھنے کے متمنی تھے۔ اسی جذبے کے تحت انھوں نے غلام مصطفیٰ صاحب کی تعلیم و تربیت کا انتظام کیا۔ سب سے پہلے انھوں نے غلام مصطفیٰ صاحب کو اس مدرسے میں داخل کروایا جہاں حفظ کا انتظام تھا۔ حافظ مکمل کرنے کے بعد انھوں نے ۱۹۳۷ء میں مولوی (عربی) کا امتحان دیا جس میں وہ اول درجے میں کامیاب ہوئے۔ بعد ازاں ۱۹۳۹ء میں عالم (عربی) ۱۹۴۰ء میں فاضل (عربی) کے امتحانات بھی اول درجے میں پاس کیے۔ ان امتی . . . کو پاس کرنے کے بعد وہ مدرسۂ عربیہ مرزاپور چلے گئے جہاں سے انھوں نے ۱۹۴۱ء میں فاضل درس نظامی کی سند حاصل کی۔

ان کی ملازمت کا زمانہ ۱۹۴۰ء ہی سے شروع ہو جاتا ہے۔ وہ ابھی فاضل درس نظامی کی سند حاصل نہیں کر پائے تھے کہ ان کا تقرر مدرسۂ عربیہ مرزاپور میں مدرس کی حیثیت سے ہو گیا اور انھوں نے اس مدرسہ میں ایک سال تک مدرس کی حیثیت سے کام کیا۔ ۱۹۴۱ء میں وہ مدرسۂ اسلامیہ فتح پور کے مدرس مقرر ہوئے جہاں انھوں نے تین برس تک کام کیا۔ ۱۹۴۴ء میں ان کو سرکاری ملازمت مل گئی اور وہ اسکول ٹیچر ہو کر باندہ چلے گئے۔ باندہ میں چند برسوں تک ٹیچر رہنے کے بعد گورنمنٹ اسکول جون پور میں ان کا تقرر ہو گیا جہاں وہ ۱۹۵۴ء تک کام کرتے رہے۔ حافظ غلام مصطفیٰ صاحب نے اپنی ملازمت ہی کے دوران آگرہ یونیورسٹی سے ۱۹۴۹ء میں ایم۔ اے (اردو) ۱۹۵۱ء میں ایم۔ اے (فارسی) اور ۱۹۵۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ایم۔ اے (عربی) کے امتحانات اول درجے میں پاس کیے۔ عربی کے امتحان میں انھوں نے پوزیشن بھی حاصل کی تھی۔ ۱۹۵۴ء میں ان کا تقرر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ عربی میں بہ حیثیت لکچرر ہوا اور وہ ۱۹۶۱ء تک لکچرر بعد ازاں ۱۹۶۱ء سے ۱۹۷۷ء تک بہ حیثیت ریڈر شعبۂ عربی کی خدمت میں مشغول رہے اور ۱۹۷۷ء میں اسی عہدے سے اپنی خدمات سے سبکدوش ہوئے۔

مجموعی طور پر انھوں نے سینتیس برسوں تک درس و تدریس کا فریضہ انجام دیا اور تئیس برسوں تک علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ عربی کی آبیاری کرتے رہے۔ اس طویل عرصے میں انھوں نے سیکڑوں طالب علموں کی رہنمائی کی اور ان کو علم و فضل کی دولت سے نوازا۔

حافظ صاحب مرحوم بہت ہی شریف بلکہ بے نفس انسان تھے۔ حالات کچھ بھی ہوں، کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لاتے اور ہمیشہ اپنے آپ کو اپنے فرائض منصبی میں معروف رکھتے۔ ان کی ایک خاص خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ کسی کے بھی شرمندۂ احسان نہ ہوتے، کسی سے کوئی خدمت نہ لیتے حتیٰ کہ اپنی اولادوں سے بھی اپنا کام نہ کرواتے ان کی کوشش ہوتی کہ وہ اپنے سارے کام خود انجام دیں۔ جب تک ان کے ہاتھ پیر چلتے رہے انھوں نے اپنا کام کسی کو نہ کرنے دیا اور جب اس قابل نہ رہے تو کڑھا کرتے کہ دوسرے ان کا کام انجام دے رہے ہیں۔

وہ اپنی نوجوانی ہی سے بلڈ پریشر کے مریض تھے جس کی وجہ سے ہمیشہ ان کے سر میں درد ہوا کرتا۔ اسی مرض نے تقریباً ساٹھ برس کی عمر تک اُن کو پریشان کیا۔ جب اس کا کامیاب علاج ہو گیا تو مثانے کی پتھری اور پیشاب کی زیادتی کا مرض لاحق ہو گیا جس نے مرتے دم تک ساتھ نہ چھوڑا۔ اسی سال دسمبر کے وسط میں ان کے گردوں نے کام کرنا چھوڑ دیا جس کے نتیجے میں وہ روز بروز کمزور ہوتے گئے۔ ۲۷ر دسمبر کو وقتِ موعود آ گیا اور ان کے جسم و جان کا رشتہ ہمیشہ کے لیے منقطع ہو گیا۔

حافظ صاحب مرحوم کے علمی آثار میں Religious Trends in Pre Islamic Arabic Poetry (مطبوعہ ۱۹۶۸ء علی گڑھ) ابن الفارض (مطبوعہ ادارۂ علوم اسلامیہ علی گڑھ ۱۹۶۳ء) اور احمد الاسدی کی اخبار الکرام (مع تحشیہ و تعلیقات، مطبوعہ جامعہ سلفیہ بنارس، ۱۹۷۶ء) خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔

ان کی جسمانی یادگاروں میں تین صاحب زادے اور دو صاحب زادیاں ہیں۔ بڑے صاحب زادے غلام مجتبیٰ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں سینیئر فوٹوگرافر ہیں۔ دوسرے صاحب زادے ڈاکٹر غلام منتقیٰ اجمل خاں طبیہ کالج سے M.D کر چکے ہیں اور تلاشِ معاش میں سرگرداں ہیں، سب سے چھوٹے بیٹے ڈاکٹر غلام مرسلین مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ ویسٹ ایشین اسٹڈیز میں عربی کے لکچرر ہیں۔ صاحب زادیوں میں بڑی ڈاکٹر صفیہ جاریہ ہیں جن کی شادی پروفیسر انیس احمد انصاری صدر شعبۂ کلیات اجمل خاں طبیہ کالج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے ہوئی ہے۔ چھوٹی صاحب زادی ڈاکٹر میمونہ جاریہ خاتون ہیں جو 2+10 میں کیمسٹری کی لکچرر ہیں۔ ان کی شادی سنبھل کے ایک تاجر ظریف احمد صاحب سے ہوئی ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ مرحوم کی اہلیہ محترمہ، صاحب زادوں اور صاحب زادیوں کو صبرِ جمیل کی دولت عطا فرمائے اور مرحوم کو اعلیٰ درجات سے نوازے۔ آمین

کبیر احمد جائسی

کن چیزوں میں تہذیب چاہیے

سرسید احمد خان

جب کہ ہم کسی قوم کو تہذیب کی طرف مایل کرتے ہیں تو ہم کو منظور ہے تو ہم کو منظور ہے کہ ہم یہ بھی بتادیں کہ اس قوم کو کن کن چیزوں میں تہذیب کرنی چاہیے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کے جو حالات ہیں ان کے لحاظ سے ہمارے خیال میں آتا ہے کہ مفصلۂ ذیل چیزیں ہیں جن کی تہذیب پر اُن کو متوجہ ہونا چاہیے

اول آزادیٔ رائے

مسلمانوں کی رائے اور ان کے خیالات ہر ایک امر میں تقلید کرتے کرتے اور رسومات کے پابند رہتے رہتے ایسے پست اور پامال ہو گئے ہیں جس کے سبب کسی قسم کی ترقی کی تحریک ان میں نہیں ہوتی۔ پس جب تک کہ رائے کی آزادی اُن میں پیدا نہ ہوگی اُس وقت تک ان میں تہذیب نہیں آنے کی۔

دوم، درستیٔ عقائد مذہبی

ہندوستان کے مسلمانوں کے عقاید مذہبی جو ان کی کتابوں میں لکھے ہیں وہ اور ہیں اور جو ان کے دلوں میں ہیں اور جن کاموں کو یقین سمجھا ہوا ہے وہ اور ہیں۔ ہزاروں عقاید فرضیہ ان کے دلوں میں ہیں۔ پس ان کی تہذیب کرنا اور اپنے عقاید کو سنت اسلام کے مطابق کرنا اور اسی پر یقین رکھنا تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کی اصل جڑ ہے۔

سوم خیالات و افعالِ مذہبی

ہندوستان کے مسلمانوں میں صدہا خیال اور توہمات ایسے موجود ہیں جن کو وہ عمدہ افعال مذہبی سمجھ کر ادا کرتے ہیں حالاں کہ ان کو مذہب اسلام سے کچھ علاقہ نہیں ہے۔ یا تو وہ خود بدعت ہیں یا رسومات و خیالات کفر و شرک ہیں جو باعث ہمارے نامہذب ہونے کے ہیں۔ پس ہم کو مہذب ہونے کے لیے ان کی تہذیب درکار ہے

چہارم: تدقیق بعض مسایل مذہبی

ہمارے مذہب کے بعض صحیح اور اصلی مسایل ایسے ہیں جن کی پوری پوری تحقیق و تدقیق اب تک نہیں ہوئی اور اگرچہ وہ مسایل فی نفسہٖ صحیح و درست ہیں، الا بیان واضح اور تحقیق کامل نہ ہونے کے سبب علوم عقلیہ کے بخلاف اور تہذیب و شائستگی کے مخالف معلوم ہوتے ہیں۔ پس ہم کو ان کی تشریح و تفسیر میں تہذیب کرنی چاہیے

پنجم: تصحیح بعض مسایل مذہبی

ہم کچھ شک نہیں کرتے کہ بعض مسایل ایسے بھی ہیں یا یوں کہو کہ بعض ایسے مسایل سمجھے ہوئے ممکن ہے جن میں متقدمین نے غلطی کی ہو پس ان کو بحث میں لانا اور ایک امر منقح ٹھہرانا ہمارے لیے ضرور ہے۔

ان تمام چیزوں کو جو مذہب سے متعلق ہیں ہم نے تہذیب و شائستگی میں اس لیے داخل کیا ہے کہ قوم کے مہذب ہونے پر مذہب کا بڑا اثر ہوتا ہے۔ پس جس قدر جس قوم کے مذہب میں نقص ہے اتنا ہی اس کی پوری تہذیب میں نقصان ہے۔

ششم، تعلیم المفالہ

مذہب کے بعد جو چیز سب سے زیادہ ضروری ہے وہ تعلیم ہے۔ ہم کو زمانہ گزشتہ اور حال پر نظر کر کے ایک ایسا طریقۂ تعلیم معین کرنا چاہیے جس سے علوم دینی اور دنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجے تک ہم کو قابو ملے۔

ہفتم، سامانِ تعلیم

ہمارے لیے صرف طریقۂ تعلیم معین کرنا ہی کافی نہ ہوگا بلکہ آپس کی مدد اور مجموعی ہمت اور فیاضی سے اس کا سامان بھی مہیا کر دینا ضروری ہوگا۔

ہشتم، عورتوں کی تعلیم

کچھ شبہ نہیں ہے کہ قومی تہذیب و شائستگی کے لیے عورتوں کا تعلیم یافتہ ہونا ضرور ہے۔ پس ہم کو لڑکیوں کی تعلیم کے لیے اور ان کو دستکاری سکھلانے کے لیے کوئی عمدہ بندوبست کرنا چاہیے

نہم، ہنر و فن و حرفہ

اپنی قوم میں ہر قسم کے ہنر اور صنعت اور فن و حرفہ کو پھیلانا اور ترقی دینا قومی تہذیب کے لیے ایک بہت بڑا جزو ہے۔

یہ تمام باتیں وہ تھیں جو مجموعاً و منفرداً ہر شخص سے اور کل قوم سے علاقہ رکھتی تھیں۔ اب ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں جو ہر ایک شخص کی ذات سے علاقہ رکھتی ہیں مگر ان کا اثر کل قوم پر ہوتا ہے اور ہر ایک میں ان باتوں کے ہونے سے قومی تہذیب و شائستگی قرار پاتی ہے۔

دہم، خود غرضی

سب سے بڑا عیب ہم میں خود غرضی کا ہے اور یہی مقدم سبب قومی ذلت اور نامہذب ہونے کا ہے۔ ہم میں سے ہر ایک کو ضرور ہے کہ رفاہ عام کا جوش دل میں پیدا کریں اور یقین جانیں کہ خود غرضی سے تمام قوم کی اور اس کے ساتھ اپنی بھی بربادی ہوگی۔

اس مقام پر ہم کو ایک کہانی یاد آئی۔ انسان کے اعضا میں تکرار ہوئی اور ہر ایک عضو نے خود غرضی اختیار کی۔ تھوڑی دیر بعد معدہ بھوک کے مارے بے چین ہوا۔ پانوں نے کہا کہ میں کیوں چل کر غذا بہم پہنچاؤں۔ ہاتھوں نے کہا کہ ہم کیوں غذا کو منھ تک پہنچائیں۔ آنکھوں نے کہا کہ ہم کیوں اس کی بھال بھی دیکھیں۔ ناک نے کہا کہ غذا کا سڑا بسا بساندا ہونا میں کیوں سونگھوں۔ منھ نے کہا کہ میں کیوں چبا کر حلق میں نگلوں۔ سب آپ آپ چپکے ہو رہے۔ دو ایک دن تو جوں توں گزر گئے، پھر تو پانوں لڑکھڑانے لگے، ہاتھ کانپنے لگے، منھ ہلانے کی طاقت نہیں رہی، آنکھوں میں اندھیرا آنے لگا، تب تو گھبرائے کہ یہ کیا ہوا۔ اس وقت عقل کے پاس گئے۔ اس نے کہا کہ خود غرضی نے تمہارا یہ حال کیا ہے۔ تم نے جانا کہ دوسرے کے کام سے ہم کو کیا مطلب ہے۔ حالاں کہ حقیقت میں وہ تمہارا ہی کام تھا اور اس کا نقصان تمہارا ہی نقصان تھا۔ پس جس قوم کے لوگوں میں خود غرضی ہوتی ہے جیسا کہ ہندوستان کے مسلمانوں میں ہے تو وہ اب آپ اپنے تئیں برباد کرتی ہے۔

یازدہم، عزت اور غیرت

غیرت اور عزت یہ دونوں آپس میں ایسی ملی ہوئی ہیں کہ کبھی جدا نہیں ہوتیں۔ جس کو عزت ہے اس کو غیرت ہے، جس کو غیرت ہے اس کو عزت ہے۔ اب مسلمانوں میں ان دونوں چیزوں کی کمی کیا، بلکہ وہ معدوم ہو گئی ہیں اگرچہ میری اس بات سے لوگ متعجب ہوں گے کہ مسلمان کیوں کر ایسے ہیں، اگر اب بھی ان کو کوئی گالی دے جان نکال لیں، مر جائیں پر اپنی شان نہ جانے دیں۔ شادی بیاہ میں ہرگز ناک کٹائی نہ ہونے دیں۔ روپیہ قرض لیں اور شادی

دھوم سے کریں۔ اگر باوا مر گیا ہے تو اس کی فاتحہ اور چہلم کی قدر و بندی میں کبھی دریغ نہ کریں۔ پھر کیوں کر ان کو اپنی عزت یا غیرت کا خیال نہیں ہے۔

یہ سب باتیں سچ ہیں، مگر یہ سب شیطانی اور جھوٹی عزت اور غیرت ہے، جو اصلی اور اخلاقی عزت ہے، ہم کو اس کا ذکر کرتے ہیں۔ کس کو اس بات کی غیرت ہے کہ ہم کو کوئی جھوٹا خیال کرے۔ کس کو اس بات کا خیال ہے کہ ہم آپس میں اور معمولی باتوں میں بھی سچ کی عزت پر بٹا نہ لگائیں۔ کون ہے جو بلحاظ اپنی اخلاقی عزت کے کسی برائی کے فعل سے بشرطیکہ اس میں سزا لے دنیاوی کا اندیشہ نہ ہو بچ کر اپنے تئیں معزز رکھنا چاہتا ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ اور قوموں میں یہ نقص نہیں ہے مگر بلاشبہ اتنا کہتے ہیں کہ مہذب و شائستہ قوموں میں نہ خدا کے ڈر سے، بلکہ اپنی عزت کے ڈر سے ان باتوں کا بہت خیال ہے۔

دوازدہم: ضبطِ اوقات۔

ہماری قومی تہذیب و شائستگی میں اوقات کے منضبط نہ ہونے سے بڑا نقصان پہنچا ہے۔ ہر ایک کو اپنے خاص کاموں میں اپنی خاص اوقات کا اور بہ لحاظ عام قوم سے متعلق ہیں ان میں تمام قوم کو یکساں اوقات منضبط کرنا چاہیے کہ یہ بھی ایک اصل اصول قومی تہذیب و شائستگی کا ہے۔

سیزدہم: اخلاق

بالفعل مدار اخلاق ہم لوگوں میں اس پر رہ گیا ہے کہ جب کسی سے ملے کچھ ہنس کر سلام کیا، کچھ محبت کی جھوٹی باتیں بنائیں، کچھ اپنی جھوٹی نیازمندی کا اظہار کیا، کچھ ان کی جھوٹی تعریف کی آؤ بھگت کی اور دل میں کہا کہ خوب اُلّو بنایا۔ جب وہ چلا گیا تو یا تو بُرا کہنے لگے یا جو باتیں کی تھیں اُن کا نقش بر آب کا سا بھی نشان نہ تھا۔

یہ سب باتیں انسان کے دل کو اور اس کے اخلاق کو خراب کر دیتی ہیں۔ بلاشبہ ہم کو سب سے جھک کر اور خندہ پیشانی سے ملنا چاہیے، مگر وہیں تک جہاں تک کہ انسانیت کا مقتضا ہے، مگر اس کو مکاری کی حد تک نہ پہنچانا چاہیے۔

چہاردہم: صدقِ مقال

یہ تو وہ صفت ہے کہ جو انسان کو قطب و ابدال کے درجے سے بھی بڑھا دیتی ہے۔ مگر یہاں ہمارا مطلب دنیاوی باتوں میں سچے پن کا ہے۔ ضرور ہے کہ سب لوگ سچ میں عزت سمجھیں۔ ایک شخص دوسرے کی بات کو سچ سمجھے تاکہ قائل کو قبل کلام اس بات کی غیرت ہو کہ سامع میرے اس قول کو جھوٹ نہ سمجھے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہم اپنے لڑکوں سے خوش طبعی میں کہتے ہیں کہ کیوں جھوٹ بولتا ہے۔ آپس میں ایک دوست دوسرے کو کہتا ہے کہ میاں کیوں جھوٹ بولتے ہو، ان باتوں سے جھوٹ کے عیب اور جھوٹ کے طعنے کی غیرت دل سے جاتی رہتی ہے جو بڑا سبب ذلت قومی اور نامہذب اور ناشائستہ ہونے قوم کا ہوتی ہے۔

پانزدہم: دوستوں سے راہ و رسم

ہماری راہ و رسم جو دوستوں سے ہے اس میں بھی نہایت نقص ہیں۔ ہم آپس میں اس طرح پر نہیں ملتے جیسے انسان انسان سے ملتے ہیں بلکہ اس طرح پر ملتے ہیں جیسے میوان آپس میں ملتے ہیں۔ ان تمام طریقوں اور قاعدوں میں تہذیب کرنی ایک بڑا امر ضروری ہے۔

شانزدہم۔ کلام

طرز گفتگو اور سیاق کلام بھی جزو اعظم تہذیب و شائستگی کا ہے جس کی ہم میں بہت کسر ہے۔ ہمارے کلام میں وہ الفاظ جو مہذبانہ گفتگو میں ہوتے ہیں، نہایت کم مستعمل ہیں اور اس لیے اس کی اصلاح کی بہت ضرورت ہے۔

ہفتدہم: لہجہ

اس کو بھی تہذیب میں بڑا دخل ہے۔ اکثر لہجہ یا اس قسم کی آواز جس سے شبہ ہو کہ آدمی بولتے ہیں یا

جانور لڑتے ہیں، ناشائستہ ہونے کی نشانی ہے کسی قدر اس پر بھی ہم کو توجہ درکار ہے۔

ہژدہم: طریق زندگی

یہ تو ہمارا ایسا ابتر و خراب ہے کہ ہم بے مبالغہ کہہ سکتے ہیں کہ بہت سے جانور ایسے ہیں جن کا طریق زندگی ہمارے طریقۂ زندگی سے نہایت عمدہ اور اچھا ہے۔

نوزدہم: صفائی۔

بدن اور گھر اور لباس سب کی صفائی تہذیب میں داخل ہے۔ انگریزی مثل ہے کہ خدا اور خدا کے بعد صفائی مسلمانوں کے ہاں بھی حدیث ہے

الطہور شطر الایمان

[پاکیزگی نصف ایمان ہے]

مگر ہم مسلمان بہت کم اس کی طرف متوجہ ہیں۔ صورت دیکھو تو واہ واہ، گھر دیکھو تو سبحان اللہ! اس لیے ہم کو صفائی پر توجہ کرنے کی بھی بڑی ضرورت ہے۔

بستم، طرز لباس

لباس کی قطع اور وضع درست ہونی بہت بڑی نشانی تربیت یافتہ ہونے کی ہے۔ دیکھ لو کہ تمام دنیا میں جس قدر وحشیانہ پن کم ہوتا گیا اسی قدر لباس کی درستی ہوتی گئی۔ پس ہم کو اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو کر دیکھنا چاہیے کہ کس قسم کی ترمیم کے لائق ہے۔

بست و یکم، طریق اکل و شرب۔

اگر ہم تعصب نہ کریں اور انصاف سے دیکھیں تو ہمارا طریقۂ اکل و شرب ایسا ہے کہ جو قومیں ہم سے زیادہ صفائی سے کھاتی ہیں جب وہ ہم کو کھاتے ہوئے دیکھتی ہیں تو ان کو قے آتی ہے۔

بست و دوم، تدبیر منزل۔

ہماری تدبیر منزل یعنی انتظام خانہ داری ایسا ابتر و خراب ہے جس میں نہایت درجے کی اصلاح و ترقی کی حاجت ہے۔

بست و سوم، رفاہ عورتوں کی حالت میں

غیر قوموں نے ہمارا برتاو عورتوں کے ساتھ جیسا کچھ خیال کیا ہے اور لکھا ہے اس میں یقینی بہت سی غلطیاں غلط فہمیاں ہیں، مگر جو اصلی حالت عورتوں کی بلاشبہ ترقی کے لائق ہے اور ہمارا برتاو عورتوں کے ساتھ بہت سی اصلاح اور تہذیب کا محتاج ہے۔

بست و چہارم، کثرت ازدواج

اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں میں کم ہے مگر پھر بھی زیادہ ہے اور نہایت نالائقی سے اور خدا و خدا کے رسول کے حکم کے برخلاف برتا جاتا ہے۔ یہ ایسی بدخصلت مسلمانوں میں جاری ہے جس کی بدولت اسلام کو شرمندگی و بدنامی ہے۔

بست و پنجم، غلامی

اگرچہ ہندوستان میں انگریزوں کی بدولت غلامی کی بد رسم موقوف ہو گئی ہے مگر ہمارے مہذب و شائستہ ہونے کے لیے صرف اس کا موقوف ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ ہمارے دل میں اس بات کا یقین ہونا چاہیے کہ درحقیقت یہ رسم خلاف مسلمان مذہب کے تھی اور فی نفسہ خراب و نالائق تھی۔ اس لیے ہم کو اس پر توجہ کرنے کی ضرورت باقی ہے۔

بست و ششم، رسومات شادی

جو رسومات شادی کی ہم مسلمانوں میں رائج ہیں ایک بھی ان میں سے مذہب اسلام کی رسم نہیں ہے اور جیسی نالائق اور نامہذب وہ رسمیں ہیں شاید ہی اور کوئی رسم اس سے زیادہ ناشائستہ اور نامہذب ہوگی۔

بست و ہفتم، رسومات غمی۔

اسی طرح رسومات غمی کا حال ہے کہ برخلاف مذہب اسلام کے ہم نے نامہذب اور ناشائستہ رسمیں اختیار کر لی ہیں۔

خدا رحمت کرے مولوی اسمٰعیل پر جن کی بدولت بہت سی نامہذب و ناشائستہ رسمیں شادی اور غمی کی ہم میں سے

چھوٹ گئی ہیں مگر اس پر بھی بہت کچھ باقی ہیں جن کی تہذیب پر ہم کو متوجہ ہونا چاہیے۔

بست و ہشتم، ترقی زراعت

زراعت کی ترقی اور کاشت کاروں کی حالت کی بہتری قومی ترقی اور تہذیب میں بڑا اثر رکھتی ہے اور اس میں ہم کو بہت کچھ کرنا ہے۔

بست و نہم، تجارت۔

سب سے آخری جزو ہے قومی ترقی اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کا اور ہم مسلمانوں میں سے یہ امر بالکل متروک ہو گیا ہے۔ پس ہم کو اپنی قوم میں اس کا رواج دینا اور عمدہ اصولوں پر اس کو قایم کرنا ایک بہت بڑا امر واسطے تہذیب و شائستگی حاصل کرنے کے ہوگا۔

یہ خیال نہ کرنا چاہیے کہ تمام دنیا کی چیزوں کی ترقی ہم سے کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ اگر ہم متوجہ ہوں گے اور تہذیب و شائستگی حاصل کرنا پر دل لگا دیں گے تو سب کچھ ہم سے ہو سکے گا۔ یہ باتیں ظاہر میں بہت سی معلوم ہوتی ہیں لیکن آپس میں ایک دوسرے سے ایسا علاقہ رکھتی ہیں کہ جب ایک بات میں ترقی شروع ہوتی ہے تو ہر ایک بات میں از خود ترقی ہوتی جاتی ہے پر کوشش شرط ہے۔

السعی منی و الاتمام من اللہ تعالیٰ

"کوشش میری طرف سے ہے اور پورا کرنا اللہ کی طرف سے ہوتا ہے"۔

" نظامِ تعلیم کی تجدید و احیا کے سلسلے میں سب سے زیادہ ضروری یہ ہے کہ اساتذہ کا معاشرتی معیار بلند کریں کیونکہ ملک کی قدیم روایات کے برعکس اساتذہ کو قدر و منزلت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا ان کا پیشہ افسوس ناک حد تک ذلیل ہو چکا ہے ماضی میں اساتذہ کا مقام بہت بلند تھا لیکن شومیٔ قسمت سے آج کل زمانے کا نقشہ ہی بدل چکا ہے استاد کا پیشہ وہ اختیار کریں جو دیانت دار ہوں اور راست بازی کا نمونہ ہوں نہ کہ خود غرضی اور سیاسی مفاد کے بندے۔"

(مولانا آزاد)

ایک سنگِ میل

سید حامد*

مسلمانوں کی زبان پر یہ جملہ بار بار آرہا ہے کہ ہم کیا کریں پس ماندگی اور بے چارگی کے احساس نے ایودھیا، سورت، اور بمبئی کے سانحات کے بعد اور شدت پکڑلی ہے۔ انھیں یہ خیال ستا رہا ہے کہ ان کے رہنماؤں (جن کے ساتھ نام نہاد کی صفت لگی ہوئی ہے) نے قیادت کا حق ادا نہیں کیا۔ انھوں نے نہ تو صحیح سیاسی رہنمائی فراہم کی نہ مسلمانوں کی تعلیمی اور معاشرتی اصلاح کے لیے کوئی قابلِ ذکر کوشش کی۔ ہماری گفتگو اور مذاکرات اور تقاریر اور مضامین کی تان بالعموم اسی شکایت پر ٹوٹتی ہے۔ حالاں کہ یہ بات سامنے دیوار پر لکھی ہوئی ہے کہ ہمیں سب سے پہلی ترجیح جہالت دور کرنے کو دینا چاہیے کہ جہالت ہی ہماری پس ماندگی اور بدنصیبی کا سرچشمہ ہے۔

آزادی کے بعد شمالی ہندوستان میں تعلیم کی قلمرو میں سب سے اہم اور سب سے موثر کوشش ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے کی ہے۔ اس کے صدر جناب حکیم عبدالحمید نے صحت کے علاوہ تعلیمی پیش رفت کو مقصدِ زندگی قرار دیا ہے کہ افرادی طاقت، صحت اور تعلیم سے ہی بنتی ہے۔ انھوں نے پہلے مسلم تعلیمی اداروں کا ایک ملک گیر سروے کرایا جو ابھی تک حوالہ اور استفادہ کے کام آتا ہے اور تحقیق کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ علاوہ بریں ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی نے ٹیلنٹ سرچ کم اسکالرشپ اسکیم (صلاحیت کی تلاش اور وظائف کی اسکیم) شروع کی جسے اب آٹھ سال ہوگئے ہیں اور جس کے تحت ملک بھر کے ذہین مسلم طلبا کو تعلیم کی چار سطحوں کے نتائج اور تحریری اور زبانی جانچ بین کے بعد تعلیم کے اخراجات سے یک سو کر دیا جاتا ہے۔

ان تین تحقیقی پروجیکٹوں کو جو ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے تحت چلائے جا رہے ہیں ایک الگ مضمون درکار ہوگا۔ ہمدرد یونیورسٹی کو وجود میں آئے ہوئے چار سال ہوگئے اور اب وہ تشنۂ تعارف نہیں ہے۔ ہم یہاں صرف تعلیم آباد کی مہم کا ذکر کریں گے جو ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی سنگم وہار میں چلاتی ہے۔ تعلیم آباد ہمدرد اسٹڈی سرکل اور ہمدرد پبلک اسکول پر مشتمل ہے۔ اوّل الذکر کو کھلے ہوئے لگ بھگ ایک سال ہوگیا۔ اس مختصر مدت میں اس کے فیض تربیت سے ۱۹۹۱ء کے امتحان کے نتیجے میں ۴ اور ۱۹۹۲ء کے نتیجے میں ۱۴ امیدوار کامیاب ہوئے۔ ہمدرد پبلک اسکول کا افتتاح دلی کے عمائدین اور ماہرین تعلیم کی موجودگی میں ۵ جولائی ۱۹۹۳ء کو ہوا۔ عمارت، آلات، احاطہ، لائبریری، لیبارٹریوں، اساتذہ اور متعلقہ سہولتوں

* سابق وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ـــــ تعلیم آباد، نئی دہلی

نکھتے ہوئے یہ امید کی جاتی ہے کہ آئندہ دو سال میں اس
کول کا شمار دلی کے بہترین اسکولوں میں ہونے لگے گا۔ اسکول
سربراہی کرنل ہیکر گرانٹ کر رہے ہیں جن کی صلاحیت اور
ربے کو علمی حلقوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔

پبلک اسکولوں پر وقتاً فوقتاً نکتہ چینی ہوتی رہی ہے۔
ہا جاتا ہے کہ یہ خوش حال طالب علموں تک اپنے فیوض کو
محدود رکھتے ہیں اور یہاں کے فارغین عوام سے دور ہو جاتے
یں۔ ان اعتراضات کے باوجود اچھے پبلک اسکولوں میں
اخلے کے لیے طلبا (اور ان کے والدین) بڑی تعداد میں
ستک دیتے ہوئے نظر آتے ہیں کیوں کہ ہندوستان
ں زندگی کے مختلف شعبوں کو یہی اسکول قیادت فراہم کرتے
یں۔ ہمدرد پبلک اسکول کا مسلک یہ ہے کہ یہاں کے طلبا
دید علوم، اچھے اطوار، اقدامیت اور اعتماد حاصل کرنے کے
لاوہ اپنی وطنی اور ذہنی روایات سے جڑے رہیں۔

اس طرح ہمدرد پبلک اسکول ان اہم اقدامات اور
وجیکٹوں کی ایک کڑی ہے جو ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی
نے اٹھائے ہیں۔ مدعا یہ ہے کہ اس اسکول سے جو
طالب علم فارغ ہوں وہ زندگی کے مختلف شعبوں میں امتیاز
حاصل کریں اور قیادت کا رول ادا کر سکیں۔ اسکول اور
سرکل ۱۴ ایکڑ کے ایک قطعے میں واقع ہیں۔ اسکول میں دو
ہوسٹل ہیں، ایک لڑکوں کے لیے ایک لڑکیوں کے واسطے۔
ہر ایک کی صلاحیت ڈھائی سو ہے۔ مختلف کھیلوں کے لیے
میدان، کورٹ اور ساز و سامان کا اہتمام کیا جا رہا ہے۔
دلی میں یوں تو کئی اچھے پبلک اسکول موجود ہیں لیکن کم
اسکول ایسے ہیں جن میں بورڈنگ ہاؤس بھی ہوں۔
ہمارے یہاں اس سہولت کی وجہ سے ملک کے مختلف
گوشوں سے طالب علم داخلے کے لیے آ رہے ہیں۔ ٹیچرس
کے رہنے کے لیے فلیٹس معقول تعداد میں بنائے گئے ہیں۔

ہمدرد پبلک اسکول کی ان خصوصیات نے اس کے
افتتاحی جلسے میں ان اشخاص کو کھینچ بلایا جو مسلمانوں اور
کمزور طبقوں کی فلاح میں دلچسپی رکھتے ہیں اور جنھیں تعلیم
سے انہماک ہے۔ اس اسکول کا افتتاح مسلمانوں
کی جدید اور معیاری تعلیم کے سفر میں سنگ میل کی
حیثیت رکھتا ہے۔

مومنو! کوئی قوم کسی قوم سے تمسخر
نہ کرے ممکن ہے کہ وہ لوگ ان
سے بہتر ہوں اور نہ عورتیں عورتوں سے
(تمسخر کریں) ممکن ہے کہ وہ ان سے
اچھی ہوں اور اپنے مومن بھائی کو عیب
نہ لگاؤ اور نہ ایک دوسرے کا برا نام
رکھو۔ ایمان لانے کے بعد برا نام رکھنا گناہ
ہے اور جو توبہ نہ کریں وہ ظالم ہیں۔"

(الحجرات ۱۱)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد نمبر ۱۳ شمارہ نمبر ۱ - (جنوری ۱۹۹۴ء)

حیاتیات و ماحولیاتی توازن

محمد شمیم جیراج پوری *

ہماری زمین ایک اکیلا سیارہ ہے جس پر زندگی جو کہ جانوروں اور پیڑ پودوں پر مشتمل ہے، پائی جاتی ہے زمین اور اس کے ارد گرد کے ماحول ATMOSPHERE پر وہ حصہ جو کہ زندگی کو SUPPORT کر سکتا ہے، اسے BIOSPHERE کہا جاتا ہے۔ اس BIOSPHERE کو اگر غور سے دیکھا جائے تو موسم اور دوسرے ماحولیاتی فرق کی وجہ سے اسے کئی خطوں میں جنھیں ECOSYSTEM کہا جاتا ہے تقسیم کر سکتے ہیں اور ہر ECOSYSTEM کی اپنی الگ خصوصیات ہیں جیسے کہ سمندر، ریگستان پہاڑ، میدانی علاقے و نیز جنگلات وغیرہ۔ ایک ECO-SYSTEM کا جاندار عموماً دوسرے ECOSYSTEM میں یا تو رہ نہیں سکے گا یا اگر کسی طرح سے زندہ رہ بھی گیا تو اُسے بہت سی دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ سب سے آسان مثال ہے کہ آم کا پودہ جو سخت گرمی اور میدانی علاقے کا ہے وہ پہاڑوں پر مشکل سے ہی زندہ رہ سکتا ہے۔ اسی طرح سیب کا پیڑ ان علاقوں میں نہیں ہو سکتا ہے جہاں آم ہوتے ہیں۔ قدرت نے ہر جاندار کی جگہ یعنی ECOSYSTEM متعین کر رکھی ہے یا یوں کہیے کہ ہر جاندار کا ارتقا یعنی EVOLUTION اس طرح سے ہوا ہے کہ اُس کی جگہ یا مقام اس BIOSPHERE میں متعین ہے گو کہ WARM-BLOODED ANIMALS یعنی وہ جانور جن کے خون کا درجۂ حرارت موسم کے لحاظ سے تبدیل نہیں ہوتا وہ ایک ECOSYSTEM سے دوسرے ECOSYSTEM میں جا سکتے ہیں اور رہ بھی سکتے ہیں مگر پھر بھی ان کو اپنے علاقے میں ہی رہنا زیادہ پسند ہے یعنی وہ اپنے علاقے کو ہی فوقیت دیتے ہیں۔ حضرت انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ ہم ہر ECOSYSTEM میں بڑی آسانی سے ADJUST ہو جاتے ہیں اور ہم نے ساری دنیا کے ہر حصے پر دھیرے دھیرے بسیرا کر لیا ہے اور پیڑ پودوں اور جانوروں کے لیے بہت کم جگہ چھوڑی ہے اور اسے بھی دن بہ دن تنگ کرتے جا رہے ہیں۔

اگر ہم جنگلی جانوروں اور پیڑ پودوں کو دیکھیں تو ایک بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ تمام ذی روح اپنی پیداوار (اعداد و شمار) کا مناسب توازن برقرار رکھتے ہیں اور یہی کسی بھی ECOSYSTEM

---

* ڈین فیکلٹی آف لائف سائنس، ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف ایگریکلچر، پروفیسر آف زولوجی، اے ایم یو علی گڑھ

کے بخوبی چلنے، صحیح اور صحت مند (HARMONIOUS)
ہونے کی گارنٹی ہے۔ روزمرہ کی زندگی میں بھی ہم دیکھتے
ہیں کہ ہمارے ارد گرد رہنے والے چرندے، پرندے
اور پیڑ پودے اپنی تعداد متوازن بنائے رکھتے ہیں۔ ہمارے
گھروں پر اکثر چڑیاں جیسے چیل، کوے، فاختہ، گوریا وغیرہ
آتی رہتی ہیں۔ سال ہا سال سے اگر آپ نے غور کیا ہوگا
تو اُن کی تعداد میں کوئی اضافہ نہیں ہوا ہوگا۔ ہمارے
گھروں کے آس پاس رہنے والے بلّی یا کتّے اکثر
پانچ یا چھ بچّے دیتے ہیں مگر چند دنوں کے بعد یہ بچّے
دھیرے دھیرے غائب ہوجاتے ہیں۔ یا تو وہ زندہ نہیں رہ
پاتے یا دوسرے قریبی علاقوں میں اپنی TERRITORY
بنا لیتے ہیں تاکہ زندگی کی کش مکش یا جدوجہد (STRUGGLE FOR EXISTENCE) میں ایک دوسرے کی راہ
میں حایل نہ ہوں اور کسی کو بھی خوراک کی پریشانی نہ ہو۔
یہی وہ اہم بات ہے جسے POPULATION CONSTANCY
یا نسلی توازن کہا جاتا ہے اور جو کسی بھی ECOSYSTEM
کی صحت کی نشانی ہے۔ جنگل میں ہرن و شیر دونوں کی
ضرورت ہے مگر ایک خاص تناسب سے۔ اگر شیر نہ ہوں
تو ہرن کی تعداد غیر ضروری طور سے بڑھ جائیگی اور نقصان دہ ہوگی اور اگر ہرن نہ ہونگے تو
شیر زندہ کیسے رہ سکے گا۔ لہٰذا دونوں کی موجودگی ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم
ہے۔ یہ اصول تمام WILDLIFE پر لاگو ہے۔

کوئی بھی ECOSYSTEM جس میں موجود مختلف
قسم کی SPECIES یعنی حیاتیات کی قسموں کا توازن
بگڑنے کی وجہ کسی بھی SPECIES کی تعداد غیر معمولی
طور پر گھٹنے بڑھنے یا بالکل ختم ہونے سے ہو سکتی ہے۔
ایسے ECOSYSTEM کو ENDANGERED یعنی خطرے کی
زد میں سمجھا جاتا ہے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اکثر
ذمّہ داری ہم انسانوں پر ہی عاید ہوتی ہے۔ ہماری تعداد
جس تیزی و کثرت سے بڑھتی جا رہی ہے اور خاص طور
سے غریب ممالک جس میں ہمارے اپنے ملک ہندوستان
کا نام سر فہرست آتا ہے۔ دوسرے ممالک بنگلہ دیش اور
پاکستان ہیں۔ چین میں بھی آبادی بہت تیزی سے بڑھ
رہی ہے مگر وہ POPULATION CONTROL پروگرام پر
بہت سختی سے کاربند ہیں اور بگڑتی ہوئی حالت کو
کافی حد تک سدھار چکے ہیں۔ ہندوستان کے پاس
دنیا کا صرف ۲ فی صدی زمین کا حصہ ہے مگر انسانوں
کی تعداد قریب ۱۶ ہے۔ تمام دنیا کی آبادی کی۔ آپ اس
سے خود ہی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تمام ترقی بڑھتے ہوئے
انسانی سیلاب میں غرق ہو جائے گی اور ہو رہی ہے
ہمارے ملک کی کھیتی کے لائق آدھی سے زیادہ زمین
بیکار ہے۔ تیزی سے سو کروڑ کی طرف بڑھتی ہوئی آبادی
میں آدھی سے زیادہ لوگ ان پڑھ ہیں اور قریب اتنے ہی
لوگ غریبی کی لائن (POVERTY LINE) کے نیچے ہیں۔

بڑھتی ہوئی آبادی کو زیادہ غلّہ پیدا کرنے کے لیے
زمین چاہیے، کھانا پکانے اور دوسرے کاموں کے لیے
طاقت یعنی ENERGY چاہیے۔ نتیجتاً ہرے بھرے جنگل کٹ
رہے ہیں، ان کی جگہ انسانوں کے بنائے ہوے CONCRETE
کے جنگل اُگ رہے ہیں اور ہم سب لوگ ایک ECOLOGICAL DISASTER کی طرف قدم رنجہ ہیں۔

ایسی سبھی چیزوں سے ماحول میں خرابی پیدا ہوتی
ہے۔ آکسیجن (OXYGEN) کم ہوتی جاتی ہے۔ کیونکہ
پودوں کی تعداد گھٹ رہی ہے اور کاربن ڈائی آکسائڈ
(CARBON DIOXIDE) اور اس جیسی مہلک گیسوں
کا حجم بڑھتا رہتا ہے جس سے کہ GLOBAL WARMING
کا خطرہ دن بہ دن بڑھ رہا ہے اور اس کے نتائج بہت
خطرناک ہو سکتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ انسان کی
اپنی ہی زندگی خطرے میں پڑ جائے۔ گرمی بڑھنے سے بڑے
بڑے آئس برگ (ICEBERG) پگھل، بکھر، گر

یح سمندر بڑھ جائے گی جس سے نچلی سطح کی زمینیں جیسے
دیپ، بنگلہ دیش کا بیشتر حصّہ اور ہندوستان کا کچھ حصّہ
ق ہو جائیں گے۔ بڑھتی ہوئی گرمی ناقابلِ برداشت ہو جائے
جس سے موسم میں تبدیلی واقع ہو جائے گی اور جنگلی جانور
ر نباتات جو کہ ایک خاص درجۂ حرارت پر زندہ رہتے
ر پروان چڑھتے ہیں دھیرے دھیرے ختم ہونے لگیں گے
ماید کانٹیلے پیڑوں اور کچھ ایک ریگستانی جانوروں کے
ادہ کچھ نہ بچے۔ ادھر چند سالوں سے جب سے اوزن
ا سطح (OZONE LAYER) پر سوراخ کا پتہ لگا ہے یہ
ری دنیا خاص طور سے سائنس دانوں کے لیے ایک لمحۂ
یہ بن گیا ہے۔ کیوں کہ اگر یہ پرت ختم ہو جائے یا اس
ں بڑے بڑے سوراخ ہو جائیں تو بھی تمام کی تمام حیاتیات
WILD LIFE بشمول حضرت انسان کے ختم ہو سکتی ہے۔
یالوجسٹ کا یہ خیال ہے کہ جب زندگی کا ارتقاء
(EVOLUTION) اپنی ابتدائی منزل میں تھا تو اوزون
ا سطح (OZONE LAYER) نہیں تھی۔ سورج سے
ملنے والی ULTRAVOILET-RAYS تب زمین پر سیدھی
تی تھیں اور کوئی بھی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر
ہ پانی کی گہرائیوں میں نہ ہو۔ اسی وجہ سے زندگی کی ارتقا
ا ابتدائی منزلیں سمندر میں طے ہوئیں۔ جب کافی آکسیجن
ضا میں ہو گئی تو آسمانی اونچائیوں پر وہ OZONE میں تبدیل
گئی اور اُس کی ایک پرت دنیا کے چاروں طرف
ن گئی۔ اسی پرت کے بننے کے بعد ہی جاندار سمندر سے
ملی زمین پر نکل آئے اور ارتقا کی منزلیں طے ہونے
یں۔ اب اگر یہ پرت ہی ختم ہو جائے گی تو خشکی کے جانور و
باتات تو بے موت مارے جائیں گے۔ انسان نے اپنی
سائش کے لیے جو سامان بنائے ہیں مثلاً فریج جس میں
ستعمال ہونے والی گیس جسے CFC کہتے ہیں اور
ایرکنڈیشنر میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ اس کا

استعمال اگر کم نہ کیا گیا تو خطرہ بہت مہلک ثابت ہوگا
یہ کوشش ہو رہی ہے کہ ان مشینوں اور AEROSOLS
میں کوئی دوسری چیز ہی استعمال ہو۔

یوں تو بڑھتی ہوئی آبادی سے بہت سے خطرات
ہیں مگر سب کا تذکرہ تفصیل سے ممکن نہیں لیکن بڑھتی
ہوئی گندگی، بیماریاں، ہر وقت دماغی تناؤ میں الجھا
ہوا انسان یہ سبھی غالباً POPULATION PRESSURE
اور روزمرہ بڑھتے ہوئے STRUGGLE یا جدوجہد
کا نتیجہ ہے۔ لوگ بہت زیادہ ذرائع کم، مواقع کم، نتیجہ
اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ روز اخبار اٹھا کر
دیکھیں تو خراب حالتوں سے ہی بھرا رہتا ہے۔

اکثر یہ سوال ذہن میں اُبھرتا ہے کہ جب دودھ
پلانے والے جانور اور چڑیاں یا پھل و پھولوں والے
پودے یعنی HIGHER FORMS OF LIFE ہی ارتقا
کی آخری منزل تھے تو پھر یہ گھاس پھوس یہ چھوٹے موٹے
جاندار کیڑے مکوڑے کیوں؟ اگر یہ ارتقا کی منزل کی
کڑی تھے تو وقت کے ساتھ ساتھ انھیں بھی ختم ہو جانا
چاہیے تھا لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ HIGHER
ANIMALS AND PLENTS کی تعداد تو گنی چنی
ہے یعنی آٹے میں نمک کے برابر یا انگریزی میں - ہ
A DROP IN THE OCEAN جب کہ ۹۵ فی صد سے
زیادہ تو یہی کیڑے مکوڑے ہیں۔ اس کا صاف مطلب
ہے کہ مادرِ مطلق کو ان سب کی اہمیت اور ضرورت اور
اس نظام کائنات کو چلانے کے لیے ان کے ROLE
کا پورا پورا احساس ہے MAMMALS اور BARDS
بڑے مزور ہیں اور ان کے اعضا پیچیدہ اور عمدہ کارکردگی
کرتے ہیں مگر کیا ایک خلیے (SINGLE CELLED)
کے امیبا (AMOEBA) جو زندگی صرف ایک CELL
میں گزار دیتا ہے اور آثار زندگی کی علامت رکھتے

ے تمام عمل بخیر و خوبی کر گزرتا ہے۔ میں تو اسے قدرت کا
نہ ہی سمجھتا ہوں اور ایک عجوبہ بھی۔ اس کی سادگی میں ہی
ری کرامات ہے۔ یوں تو اگر دیکھیں تو ہر جاندار یہاں تک
انسان بھی اپنی زندگی ایک CELL سے ہی شروع کرتا
ہے۔ جسم کی پیچیدگی تو بعد میں بنتی ہے۔ کچھ جاندار ایک CELL
ہی رہ جاتے ہیں جب کہ دوسروں میں یہ سیل (CELL)
تی رہتی ہے اور اس کے نتیجے میں ان کا جسم ہزاروں
کھوں بلکہ کروڑوں سیلس (CELLS) کا بن جاتا ہے۔
یا میں سب جانداروں کا ایک مقام ہے جیتی جاگتی
نیا کو قایم رکھنے اور چلانے میں ان کا رول ہے۔

اگر ہم غور کریں تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں
جائے گی کہ انسان اکیلے زندگی نہیں گزار سکتا اور صرف
وا اور پانی پر زندہ نہیں رہ سکتا۔ یہ کوشش کہ غذا
ند دوائوں کی ٹکیہ یا کیپسول کی شکل میں لی جائے، چند
ن تو چل سکتی ہے مگر تاحیات نہیں۔ انسان کی اپنی
ندگی چند جانوروں اور پیڑ پودوں پر منحصر ہے جن سے
ہ غذا حاصل کرتا ہے۔ ایک لمبے عرصے تک زندہ رہنے
لے لیے ان جانداروں کا ہونا اشد ضروری ہے۔ اب
سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ہماری ہی طرح وہ جاندار یعنی پیڑ
ودوں یا گائے بھینس یا دیگر حیاتیات جن سے دوائیں
غیرہ بناتے ہیں ان کا بھی تو انحصار اسی طرح کچھ اور جانداروں
ر ہے۔ لہٰذا ہر جاندار اپنی خوراک حاصل کرنے کے لیے
دوسرے جاندار پر منحصر ہوتا ہے۔ صرف شیر کو ہی ہرن کی
ضرورت نہیں ہوتی ہے بلکہ ہرن کو بھی شیر کی ضرورت ہوتی
ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ خدا کی بنائی
ہوئی ہر مخلوق کی ایک اہمیت اس BIOSPHERE میں
ہے اور جیسے جیسے حیاتیات کی قسمیں ختم یعنی EXTINCT
ہو رہی ہیں ہر جاندار جس میں ہم بھی شامل ہیں، موت کی
رف گامزن ہے۔ فنا ہونا یعنی EXTINCTION ایک

قدرتی سچائی ہے جو بھی قسمیں حیاتیات کی ہیں، انھیں کبھی نہ
کبھی بدلتے ہوئے ماحول کی وجہ سے صفحۂ ہستی سے مٹ
جانا ہے DINOSAURS کے ساتھ کیا ہوا سب کو معلوم
ہے۔ جو کچھ جانور یا پیڑ پودے ہم دیکھتے ہیں ان سے کئی
گنا زیادہ وقت کے ہاتھوں فنا ہو چکے ہیں لیکن ان کی جگہ
دوسروں نے لے لی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی دنیا
میں حیاتیات کی تعداد بے شمار ہے۔ بقول شاعر ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہاں ہو گئیں

انسان جب اپنی ابتدائی ارتقا کے دور میں تھا تو اسے
موجودہ آسائشوں میں سے کچھ بھی حاصل نہ تھا۔ اس کی
رہائش بھی جنگل میں ہی تھی۔ اپنے کھانے پینے کے لیے
اسے بھی جنگل کے دوسرے جانوروں کے ساتھ جدوجہد
کرنی پڑتی تھی لیکن دھیرے دھیرے اپنی ذہنی صلاحیت
یادداشت اور لکھنے پڑھنے اور تحقیق کرنے کی صلاحیت
نے اسے پوری دنیا بلکہ کائنات کا مالک بنا دیا۔ انسان کا
کلچرل اور سوشل ارتقا اس کے اپنے بیالوجیکل ارتقا سے
کم اہم نہیں ہے لیکن انسانوں کی تعداد غیر معمولی طریقے سے
بڑھتی جا رہی ہے جس کے نتیجے میں جنگلی حیاتیات دھیرے
دھیرے کم ہوتی جا رہی ہیں۔ ابھی پچھلے ہی سال برازیل
کے شہر RIO-DE-JANEIRO میں قریب قریب تمام ممالک
کے سربراہوں کے لیے یہ ایک اہم مسئلہ تھا۔ بات دراصل
یہ ہے کہ حیاتیات کے جسم بنانے کی کمیا (BIOMASS) کی تعداد اس زمین
پر شیرہ ہے۔ اس کا گھٹنا بڑھنا ممکن نہیں ہے۔ یہ صرف شکلیں ہی تبدیل کر سکتی
ہے۔ اب جب کہ انسانوں کی تعداد اس تیزی سے بڑھ رہی ہے تو زیادہ تر
BIOMASS کا استعمال صرف انسانی جسم کی نشوونما پر خرچ ہو رہا ہے
لاچار و بے زبان جانوروں کے لیے کم ہی بچتا ہے اور ان کی تعداد
روز بروز کم ہی ہوتی جا رہی ہے۔ لاکھوں سال پہلے کہیں
ہزاروں سال میں جا کر ایک SPECIES فنا (EXTINCT)

ہوتی تھی۔ اب ہر سال اندازے کے مطابق ہزاروں SPECIES صفحۂ ہستی سے مٹتی جا رہی ہیں۔ ارتقائی منازل جو کہ آہستہ آہستہ طے ہوتی تھیں اور تب کہیں جا کر ہزاروں برس بعد نئی SPECIES وجود میں آتی تھیں اب تیزی سے ہوتی ہوئی تبدیلیِ ماحولیات کی وجہ سے سب کچھ بے ربط سا ہو گیا ہے۔

ان سب باتوں کے ہوتے ہوئے بھی امید کی ایک کرن ابھی باقی ہے۔ انسانوں میں اس بات کا شعور بیدار ہونا چاہیے کہ اب تک جو بھی ہوا وہ صحیح نہیں تھا اور یہ اشد ضروری ہے کہ اس کی روک تھام کی جائے، حالات کو بدلا جائے اور خدا کی بنائی ہوئی اس دنیا کو تباہی کے غار میں نہ ڈھکیلا جائے۔ دنیا کے کونے کونے میں اب ENVIRONMENTAL PROTECTION کی بات چل رہی ہے

اور بہت سی باتوں پر لوگ اور حکومتیں عمل پیرا بھی ہیں میرے خیال میں ماحول کا سدھار کرنا اور اسے صاف ستھرا رکھنا ہم سب کا اولین فرض ہے۔ خدائے پروردگار ہمیں زندگی عطا کرتا ہے اور ایک ماحول کے سپرد کر دیتا ہے جس میں ہمیں اپنی زندگی گزارنی ہے۔ اسی لیے اس کی پاکیزگی برقرار رکھنا ہم سب کا لازمی فرض ہے۔

اس زمین پر ہر روز کروڑوں طرح کے جاندار پیدا ہوتے اور ختم ہو جاتے ہیں جیسے زیست برحق ہے اسی طرح سے موت بھی اور یہ زندگی اور موت کا چکر چلتا ہی رہا ہے اور چلتا ہی رہے گا۔ ؎

زندگی کیا ہے عناصر کا ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے انھیں اجزا کا پریشاں ہونا

[یہ مضمون کچھ تبدیلی کے ساتھ آل انڈیا ریڈیو کے اردو مجلس پروگرام " ایک ملاقات " کے تحت ۲۵ اکتوبر ۱۹۹۳ کو شام ۷ بج کر ۴۵ منٹ پر نشر کیا گیا]

اور جو لوگ صبح و شام اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں اور اس کی خوشنودی کے طالب ہیں، ان کے ساتھ صبر کرتے رہو۔
(الکہف ۲۸)

تجارتی اخلاق

محمد سعود عالم قاسمی*

میں جس محلے میں آج سے دس سال پہلے رہتا تھا وہاں چائے کا ایک ہوٹل ہے جس کا مالک مسلمان ہے۔ ایک دن میں اس میں بیٹھا چائے کا منتظر تھا۔ اس دوران ایک نوجوان آیا اور ایک خالی میز کے سامنے بیٹھ گیا۔ اس نے کاؤنٹر سے اخبار بھی اٹھایا تھا اور اسے پڑھنے لگا۔ ہوٹل والے نے کاؤنٹر سے آواز دی۔ جناب آپ کو کیا چاہیے؟ وہ نوجوان اخبار کی کسی سرخی پر نظر جمائے ہوئے تھا، ہوٹل والے کی آواز نہ سن سکا۔ اس لیے اس نے جواب نہیں دیا۔ ہوٹل والا اپنے کاؤنٹر سے اٹھ کر آیا اور اخبار اس نوجوان کے ہاتھ سے چھین کر بولا۔ یہ ہوٹل ہے، اخبار پڑھنے کی جگہ نہیں۔ نوجوان اچانک یہ کچھ دیکھ کر بہت مضمحل ہوا مگر کچھ کہنے کے بجائے کرسی سے اٹھا اور قریب کے ایک دوسرے ہوٹل میں چلا گیا جو چھوٹی ذات کا ایک غیر مسلم جس کا مالک ہے اور پھر وہاں بیٹھنا اور چائے پینا اس کا معمول بن گیا۔ اس وقت تک اس کے ہوٹل میں عموماً مسلمان چائے پینے نہیں جاتے تھے اور ہوٹل والا تنہا سا نظر آیا کرتا تھا۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ غیر مسلم ہے اور دوسرے اس وجہ سے بھی کہ وہ چھوٹی ذات سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اس کے بعد مسلمان وہاں بیٹھنے لگے اور اب دس سال بعد میں یہ دیکھتا ہوں کہ غیر مسلم ہوٹل آباد بھرا نظر آتا ہے، وہاں چائے پینے والوں کی بڑی تعداد آتی ہے، اس کے مقابلے میں مسلم ہوٹل خالی خالی سا نظر آتا ہے اور اس کا مالک حسرت سے غیر مسلم ہوٹل میں چائے نوش حضرات کی تعداد کو دیکھتا ہے اور کڑھتا رہتا ہے۔

دکان دار کی بداخلاقی کا فطری نتیجہ یہی ہے کہ وہ گاہک کو اپنی دکان سے دور کر دیتا ہے جب کہ اخلاق سے انسان دور کے گاہکوں کو بھی اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ غیر مسلم دکان دار جس اخلاق، سلیقے اور نرمی سے گاہکوں کے ساتھ پیش آتے ہیں اس اخلاق کا مظاہرہ مسلم دکان داروں سے نہیں ہوتا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ غیر مسلم گاہکوں کو لچھمی سمجھتا ہے اور گھر آئی لچھمی کو واپس جانے دینا بدنصیبی کی بات ہے، جب کہ مسلمان اپنے گاہکوں کو محتاج سمجھتا ہے اور محتاج و مختار کے درمیان جس طرح کا معاملہ ہوتا ہے وہی یہاں روا رکھتا ہے۔ غیر مسلم گاہکوں کی بے سلیقگی اور سختی کو اخلاق سے رفع کرتا ہے اور مسلم جھگڑے اور تناتنئے سے کام لیتا ہے۔

آپ نے یہ بھی دیکھا اور سنا ہوگا کہ فسادات کے

---

* ناظم دینیات (سنی) اے ایم یو۔ علی گڑھ

زمانے میں بہت سے نادان غیر مسلم دکان دار یہ دھمکی دیتے ہیں کہ وہ مسلمان کو راشن اور سودا وغیرہ نہیں دیں گے، اس کے جواب میں بعض جیالے مسلمان کبھی یہ طے کر لیتے ہیں کہ وہ آئندہ غیر مسلموں سے سودا نہیں لیں گے مگر جب فسادات کے سیاہ بادل چھٹتے ہیں اور حالات معتدل ہوتے ہیں تو نہ غیر مسلم دکان دار اپنی دھمکی پر عمل کرتا ہے اور نہ مسلمان اپنا وعدہ وفا کرتا ہے، بلکہ غیر مسلم دکان دار کے خریدار مسلمان بہت ہوتے ہیں۔ جب اُن سے پوچھا جاتا ہے کہ ایسا کیوں ہے تو کہتے ہیں کہ غیر مسلم اچھی ڈیلنگ کرتا ہے۔ اس کے انداز معاملہ میں اچھائی ہوتی ہے۔

شاید اس سے اتفاق نہ کیا جا سکے کہ غیر مسلم سستا اور اچھا سامان بیچتا ہے اور مسلمان مہنگا اور گھٹیا سامان بیچتا ہے مگر اس سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عموماً غیر مسلم دکان دار مسلمانوں کے مقابلے زیادہ تمیز و سلیقہ اور اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس شہر میں جائیے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے وہاں بھی مارکیٹ اور بازار پر غیر مسلم حضرات ہی کا غلبہ نظر آتا ہے اور وہ نہایت صفائی اور خوب صورتی سے لوگوں کو اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ نتیجے میں وہ خوش حال اور مال دار نظر آتے ہیں، جب کہ مسلمان تجارتی اخلاق اور حکمت سے عاری ہونے کی بنا پر رزق کے وسیع امکانات کو محدود کر لیتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ وہ قوم جس کے مذہب میں تجارتی اصول اور تجارتی اخلاق کا کوئی خانہ نہیں تھا، اس قوم سے کیسے آگے بڑھ گئی جس کے یہاں نہ صرف تجارتی اصول اور تجارتی اخلاق بڑی اہمیت رکھتے ہیں بلکہ وہ اس کے دین و ایمان کا حصہ بھی ہیں اور اس کے اسلاف کی شاندار تجارتی تاریخ بھی ہے؟ اس کا جواب صرف یہ ہے کہ غیر مسلم تجارتی اخلاق کا مظاہرہ کرتا ہے اور مسلمان تجارتی اخلاق سے یکسر عاری ہے۔ تاہم جہاں کہیں مسلمان اپنے اس اخلاق پر قائم ہیں وہاں اُن کی تجارت میں برکت ہے، وہ خوش حال ہیں اور ان کا غیر مسلموں پر بھی ایک اثر ہے۔ تجارت زندگی کا ایک شعبہ ہی نہیں بلکہ بڑا شعبہ ہے۔ اس لیے عبادات و اخلاق سب کچھ کا رشتہ ہے۔ اسی لیے اسلام میں تجارت کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے اور اس کے طریقے بھی بتائے گئے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن و حدیث میں تجارت کے تعلق سے بہت کچھ کہا گیا ہے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور سنت تجارت کا رہنما اصول فراہم کرتی ہے۔ مگر مسلمان تاجر بالعموم اس سے ناواقف اور غافل ہیں۔ اماموں کے خطبے ہوں، علماء کی تقریریں ہوں یا واعظوں کے وعظ ہوں۔ ان میں نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج وغیرہ ساری عبادات کے فضائل سننے کو ملتے ہیں مگر تجارتی اصول و آداب اور تجارتی اخلاق سے علماء صرفِ نظر کر لیتے ہیں۔ حالاں کہ تجارت بھی وہ شعبہ ہے جس کی طرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی توجہ دلائی اور مسلمانوں کی اس شعبے میں آگے بڑھنے کے لیے حوصلہ افزائی فرمائی۔ آپ نے زراعت اور ملازمت کے مقابلے میں تجارت کو خصوصی اہمیت دی آپؐ نے فرمایا:

"سچا اور امانت دار تاجر قیامت کے دن
انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ
ہوگا" (ترمذی)

اگر ہمارے مسلمان دکان داروں میں صرف یہ دو صفات سچائی اور امانت پیدا ہو جائیں تو خوش حالی اور ترقی کی ضمانت دی جا سکتی ہے۔ اگر اس کے ساتھ محنت اور خوش خلقی کو جوڑ لیجیے تو یہی تجارت کے عناصر اربعہ بن جاتے ہیں۔

قابلِ غور بات یہ ہے کہ ہندوستان میں ہم جس ماحول کو اپنے لیے سازگار بنانا چاہتے ہیں، اس میں غیر مسلموں سے ہمارے تعلقات کو بڑا دخل ہے۔ غیر مسلموں پر اثر انداز

نہ تو ہماری نماز ہوتی ہے اور نہ ہمارا روزہ اور زکوٰۃ۔ کیوں کہ اس سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ ہمارا معاملہ اور لین دین اثر انداز ہوتا ہے۔ اگر اس میں اخلاق و صداقت آجائے تو اس ماحول کو بدلنے میں اور اپنے لیے سازگار بنانے میں بہت مدد ملے گی جو فی زمانہ نہایت ضروری ہے۔

اسے اس پہلو سے بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ہمارے علماء، واعظین، مبلغین اور دانشوروں کا رابطہ عموماً اپنے ہی طبقے یعنی مسلمان سے رہتا ہے، اس کے مقابلے میں تجارت پیشہ اور کاروباری مسلمانوں کا رابطہ غیر مسلموں سے سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے معاملات کو اسلامی شکل دیں، اپنے لین دین میں اسلامی اصولوں کا پاس رکھیں اور غیر مسلموں کو اپنے اخلاق و کردار اور حسنِ معاملہ سے متاثر کریں تو نہ صرف وہ اپنی تجارت کو مضبوط و مستحکم کر سکتے ہیں بلکہ اسلام کی سچی اور اچھی ترجمانی بھی کر سکتے ہیں۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان میں پہلے پہل جن لوگوں نے اسلام کی تبلیغ و اشاعت کی وہ تجارت پیشہ مسلمان تھے ہمارے اسلاف کا یہ نمونہ آج بھی ہمیں جذبہ و حرکت عطا کر سکتا ہے۔ اس کے لیے ضرورت اس بات کی محسوس ہوتی ہے کہ مسلمانوں میں تجارتی شعور عام کیا جائے، تجارت کے اسلامی اصولوں سے ان کو متعارف کرایا جائے اور ان میں تجارتی اخلاق پیدا کیا جائے۔ ان کو حسنِ معاملہ اور کاروبار کے صحیح طریقۂ کار کو اپنانے کی دعوت دی جائے۔ اس کے لیے منظم اور مسلسل جدّوجہد کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے اخبارات و رسائل، میڈیا، ذرائع ابلاغ کے مناسب طریقوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔ ائمۂ مساجد اپنے خطبات میں اسے موضوعِ سخن بنائیں۔ علماء اپنی تقریروں میں اسے اہمیت دیں اور مسلم تنظیمیں اس پر اپنی توجہ صرف کریں۔ اگر یہ طبقہ اصلاحِ معاملہ پر آمادہ ہو گیا تو امید کی جا سکتی ہے کہ مسلمانوں کے عمومی حالات بہتر ہوں گے اور ان میں خوش حالی آئے گی اور ہندوستان میں مسلمانوں کا وقار اور اعتبار مضبوط اور بلند ہو جائے گا۔

اولڈ بوائز کا عطیہ

اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن الٰہ آباد برانچ کی طرف سے ہر سال کی طرح اس سال بھی آٹھویں درجے میں سب سے زیادہ نمبر حاصل کرنے والی طالبہ کو مبلغ پانچ سو روپیہ کا انعام دیا گیا۔ ۱۹۹۳ء میں سب سے زیادہ نمبر عبداللہ گرلز اسکول کی طالبہ شگفتہ وہاب نے ۹۶.۷۵٪ حاصل کر کے یہ انعام جیتا ہے۔ گزشتہ پندرہ سال میں عبداللہ گرلز اسکول کی یہ آٹھویں طالبہ ہے کہ جس نے انعام حاصل کیا۔ ہر سال یہ انعام علی گڑھ کے ان اسکولوں میں دیا جاتا ہے کہ جو یونیورسٹی کے زیر انتظام چل رہے ہیں۔

امین نظام شیروانی۔ صدر۔ خورشید نقوی۔ نائب صدر۔ جے۔ سی۔ بھاردواج۔ جنرل سکریٹری

اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن۔ ۲۷ اے کان پور روڈ۔ الٰہ آباد۔ اتر پردیش

اسکولوں کے معیار

عتیق احمد صدیقی *

۱۹۹۲ء کے یو۔پی ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ بورڈ کے امتحانات کا نتیجہ بیس فی صد رہا تھا۔ خود دہلی کے ثانوی (سکنڈری) اور فوق ثانوی (ہائر سکنڈری) امتحانات کا نتیجہ ایسی نچلی سطح پر پہنچ گیا تھا جس نے تمام ذمّہ داروں کو چونکا دیا تھا۔ تعلیمات کے ڈائرکٹوریٹ، دہلی انتظامیہ، مرکزی وزارت تعلیم، تعلیمی تحقیق و تربیت کی قومی کاونسل (این سی ای آر ٹی) غرض کہ سارے شعبے حرکت میں آگئے۔ عوام کی طرف سے بھی احتجاجی آوازیں اٹھیں کہ دہلی کے مرکز ہونے کی وجہ سے اس کا ہر کام معیاری ہونا چاہیے، اس میں تعلیم بھی شامل ہے۔ بالخصوص اس وجہ سے بھی کہ یہاں جو سہولتیں میسر ہیں، دوسرے مقامات پر ممکن نہیں ہیں۔ پھر مشورے، ہدایات اور نگرانی کے بھی جیسے انتظامات یہاں ہیں دوسری جگہوں پر نہیں ہو سکتے۔ یہ بات الگ ہے کہ ان کا مناسب استعمال نہ کیا جائے۔ قومی کونسل کے شریک ڈائرکٹر پروفیسر اے کے شرما کی سربراہی میں تحقیقاتی کمیٹی قایم کی گئی کہ یہ معلوم کرے کہ آخر دہلی میں امتحان کے نتائج اس قدر کیوں گر رہے ہیں، دوسرے لفظوں میں یہ کہ تعلیمی معیار کیوں گر رہا ہے۔ اس کمیٹی نے یہاں کے اسکولوں، ان کی کارکردگی، ان کے تدریسی عملے اور دیگر سہولتوں کا تفصیلی جائزہ لے کر اپنی رپورٹ پیش کی تو اس میں صرف ان خامیوں کا تذکرہ کیا جن کی وجہ سے یہ مایوس کن صورت حال پیدا ہوئی۔ اگرچہ اس سے بالواسطہ یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا کہ ان خامیوں کو دور کر دیجیے تو صورت حال بدل جائے گی لیکن اس کمیٹی سے یہ توقع بھی کی جاتی تھی کہ وہ کچھ مثبت تجاویز پیش کرے جن کے نفاذ کی ذمّہ داری انتظامیہ، پرنسپل صاحبان اور اساتذہ کی ہو اور جن سے تدریسی امور بہتر ہوں۔

۱۹۹۳ء کا یو۔پی بورڈ کا نتیجہ کچھ بہت مختلف نہیں رہا۔ توجہ مرکوز کرنے کے لیے صرف علی گڑھ کو لیجیے۔ اس ضلع سے ہائی اسکول امتحان کے لیے ۳۶۴۷۲ امیدوار تھے ان میں ۱۰۵۲۵ خانگی (پرائیوٹ) امیدوار بھی شامل تھے (باضابطہ اسکول میں داخل ہو کر دو سال تعلیم حاصل کرنے کے بعد امتحان میں شامل ہونے والے) امیدواروں کی تعداد ۲۵۹۴۷ تھی، جن میں صرف ۷۲۹۶ امیدوار کامیاب ہوئے یعنی ۲۸ فی صد۔ ناکام طلبا کی تعداد رہی ۱۸۶۵۱۔ ہمارے موجودہ نظام تعلیم میں ہائی اسکول کے ایک طالب علم پر سرکاری خزانے سے کم و بیش چھ ہزار روپیہ سالانہ خرچ ہوتا ہے۔ ناکام ہونے والے طالب علموں

---

* پروفیسر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

پر ایک کروڑ بارہ لاکھ روپیے کی رقم خرچ ہوئی تھی۔ اس میں وہ مصارف شامل نہیں جو والدین اپنے بچوں پر کرتے ہیں۔ ان طالب علموں کی ناکامی کے ساتھ یہ سب رقوم صفر میں تبدیل ہوگئیں۔ یہ سب قومی خسارہ ہے۔ یوپی کے ۶۳ اضلاع پر اس حساب کو پھیلایے تو قومی خسارے کی رقم پریشان کن حد تک پہنچ جاتی ہے۔ ہندوستان جیسا ملک جس کی آبادی کا ایک بڑا حصہ آج بھی خط غربی سے نیچے زندگی بسر کر رہا ہے، کیا اس طرح کے نقصانات کا متحمل ہو سکتا ہے؟

اسی صورت حال سے پیوستہ ایک اور معاملہ ہے ہائی اسکول اور انٹرمیڈیٹ کے امتحانوں میں صرف علی گڑھ سے جو تقریباً اکتالیس ہزار طالب علم ناکام ہوئے، ان کو کوئی اسکول/کالج اب داخلہ دینے کو تیار نہیں ہے۔ دسویں اور بارہویں جماعتیں ان طالب علموں سے پہلے ہی بھری ہوئی ہیں جو نویں اور گیارہویں میں کامیاب ہو کر آئے ہیں، ان میں سے بھی تیسرے درجے میں کامیاب ہونے والوں کو باہر نکالا جا رہا ہے۔ پھر پچھلی اکتالیس ہزار طالب علم آبادی کی گنجائش کہاں پیدا کی جائے؟ داخلے کی اس دشوار حالت کا اسکولوں/کالجوں نے استحصال کرنا شروع کر دیا ہے کہ داخلے کے لیے بڑی بڑی رقمیں عطیہ کے طور پر اینٹھی جانے لگی ہیں۔ ایک بار بگاڑ کا یہ راستہ کھل جائے تو پھر اس کا بند کرنا مشکل ہے۔

اور اس صورت حال کا سماجی پہلو اس سے بھی زیادہ خطرات کا حامل ہے۔ یہ ہزارہا (پورے اتر پردیش میں لاکھوں) نوجوان ناکامی اور محرومی کی دلدل میں پھنس کر جب مایوسی کا شکار ہوں گے تو کیا رُخ اختیار کریں گے، اس کی پیش قیاسی مشکل نہیں ہے۔ اس مایوس زدہ فوج میں ہر سال اتنے ہی نوجوان شامل ہوتے چلے جائیں گے تو اندازہ کیجیے یہ کتنی بڑی فوج ہوگی۔ معاشرہ اس کے غیظ و غضب کا مقابلہ کس طرح کرے گا؟

اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے فوری اقدامات کی ضرورت ہے۔ والدین، طالب علم، استاد اور انتظامیہ تعلیمی نظام کے عناصر ترکیبی ہیں۔ خرابی کی موجودہ حالت تک پہنچانے میں یہ تمام عناصر ذمہ دار ہیں اور پھر وہ معاشرے جس میں ہر طرح کا بگاڑ روزافزوں ہے اور جس نے نظامِ تعلیم سے متعلق تمام لوگوں کو بری طرح متاثر کیا ہے۔ تعلیم کے ساتھ جو تقدیس کا تصور وابستہ تھا وہ قصۂ پارینہ بن چکا ہے۔ ان عناصر ترکیبی کے مزاج کو تبدیل کرنا طویل مدتی کام ہے۔ اس کے لیے کوشش ہونی چاہیے۔ کیوں کہ جب تک ان عناصر کی اصلاح مزاج نہ ہوگی، اس وقت تک کوئی تدبیر، کوئی طریق کار اور کوئی نقشۂ عمل کامیابی سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔ ان میں سے ہر ایک کی اصلاح حال کے لیے تدابیر اختیار کرنا ہوں گی لیکن ان میں سب سے زیادہ اہم دو عناصر ہیں: استاد اور طالب علم اور ان کی مجموعی عمل سے پیدا ہوتا ہے طریق تدریس اور جیسا طریق تدریس اختیار کیا جائے گا ویسے ہی نتائج حاصل ہوں گے۔ اس لیے سب سے پہلے یہ غور کرنا مناسب ہوگا کہ آیا طریقۂ تدریس میں کوئی تبدیلی کی جا سکتی ہے جس سے خود طلبا میں تشویق ہو سکے اور ان کی تحصیل (LEARNING) کا معیار بہتر ہو سکے۔

"تعلیم سب کے لیے" کی مہم کے ذیل میں وزارت فروغ وسائل انسانی نے جہاں تعلیم کی توسیع کے لیے اقدامات کیے، وہیں معیار کو بہتر بنانے کی تدابیر پر بھی توجہ دی اور اتر پردیش کی تعلیمی تحقیق و تربیت کی ریاستی کاؤنسل کو یہ کام سپرد کیا کہ وہ تدریس کے ایسے طریقوں پر غور کرے جن سے کام لے کر معیار کو بہتر بنایا جا سکتا ہے اور تدریس کا کوئی ایسا نمونہ تیار کرے جس کو اسکولوں میں بالخصوص ابتدائی اسکولوں میں نافذ کیا جا سکتا ہو۔

ماہرین کی ایک بڑی جماعت نے اس مسئلے پر غور و خوض کیا اور جو طریق تدریس انھوں نے وضع کیا اس کا

تجربہ ضلع اعظم گڑھ کے ایک بلاک کے ساٹھ اسکولوں میں کیا گیا، اس کے بہتر نتائج سامنے آئے اور اس طریق کار کو وسیع پیمانے پر اختیار کرنے کی سفارش کی گئی۔

نظام تعلیم میں تدریس کا گہرا تعلق امتحان سے ہے اسی کے ذریعے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ طالب علموں نے کیا حاصل کیا اس کو دوسرے لفظوں میں یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ اساتذہ نے کیا اور کیسا پڑھایا۔ گویا امتحان سے تدریس وتحصیل۔ (Teaching and Learning) دونوں ہی کی آزمائش ہو جاتی ہے۔ حالاں کہ امتحان تعلیم کا مقصد نہیں ہے بلکہ مقصد تو یہ ہے کہ طالب علم کچھ سیکھے، اس کے ذریعے اس کے ذہن کی نشو ونما ہو اور اس کی شخصیت نکھرے لیکن اس نے کیا سیکھا یہ تو امتحان سے ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے سارا زور امتحان پر ہی مرکوز ہو گیا۔ اب صورت حال یہ ہے کہ استاد کے پڑھانے میں بھی امتحان مدنظر رہتا ہے اور طالب علم بھی صرف امتحان کے نقطۂ نظر سے پڑھتا ہے۔ اسی وجہ سے امتحان جب تک سر پر نہیں آجاتا طالب علم سنجیدگی سے پڑھائی پر متوجہ نہیں ہوتے۔ تب وقت کی تنگی کے باعث وہ اس کم سے کم حصۂ نصاب پر توجہ دینا چاہتے ہیں جس سے امتحان میں کامیاب ہو جائیں۔ اول تو نصاب کا بڑا حصہ اس طرح نظر انداز ہو جاتا ہے اور دوسرے یہ تیاری بارش کی ایک بوچھار کی طرح ہوتی ہے کہ جس کا پانی بہا چلا جاتا ہے، زمین کو سیراب نہیں کرتا۔ اس تیاری میں طالب علم جو کچھ سیکھتے بلکہ یاد کرتے ہیں وہ نہ اُن کے ذہن کا حصہ بن پاتا ہے نہ اُن کی شخصیت کا۔ تحصیلِ علم تو ایک سست رفتار عمل ہے۔ یہاں نہایت حزم واحتیاط کے ساتھ ایک کے بعد دوسرا قدم اٹھانا ہوتا ہے۔ ایک اینٹ کے اوپر دوسری اینٹ رکھی جاتی ہے مگر شرط یہ ہے کہ یہ عمل برابر جاری رہے، خرگوش کی چھلانگوں کی طرح نہیں بلکہ کچھوے کی سست مگر مسلسل رفتار کی طرح۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب استاد اور طلبا تدریس وتحصیل کی طرف برابر متوجہ رہیں، وقت کا صحیح استعمال کریں گن گن کر ایک ایک قدم اٹھاتے رہیں اور پھر یہ بھی دیکھتے رہیں کہ جو قدم اٹھا اس سے کتنی پیشرفت ہوئی۔ اگر مناسب اور حسب دلخواہ پیش رفت نہیں ہوئی تو کیوں؟ کیا قدم ناکافی تھا؟ کیا سمت ورفتار میں کچھ خامی تھی کیا وہ قوت استعمال نہیں ہوئی جو اس کے لیے ضروری تھی؟ اور جب یہ خامی یا نقص معلوم ہو جائے تو اس کو دور کرنے کی کوشش کی جائے یا تو دوسرے قدم کے ساتھ ہی یا دوسرے قدم کو روک کر۔ یعنی جب تک پہلے قدم کی خامی کا تدارک نہ ہو جائے اس وقت تک دوسرا قدم نہ اُٹھایا جائے۔ مذکورہ بالا تجربہ میں جو تدابیر وضع کی گئیں وہ کچھ اس قسم کی تھیں۔

۱۔ اب تک ہر جماعت کے نصاب کو ایک اکائی مانا جاتا ہے۔ پورے تعلیمی سال اُس کی پڑھائی ہوتی ہے (اگر یہ واقعتاً ہو جائے) اور سال کے آخر میں امتحان ہوتا ہے۔ اگرچہ ششماہی اور سہ ماہی امتحانات بھی ہوتے ہیں، لیکن دار ومدار تو سالانہ امتحان پر ہی ہوتا ہے۔ جیسا اوپر ذکر ہوا، مدت تعلیم کے سال بھر کے وسیع پیمانے پر پھیلے ہونے کی وجہ سے استاد اور طالب علم دونوں ہی بےفکری کا شکار رہتے ہیں اور ہیں تو آخر کے تین چار مہینوں میں۔ اسکولوں میں تعلیمی سال بالعموم نو/دس ماہ پر محیط ہوتا ہے۔ تعطیلات وغیرہ کا لحاظ رکھتے ہوئے آٹھ ماہ ایسے ضرور ہوتے ہیں جن میں تعلیمی کام جاری رہتا ہے یا جاری رہنا چاہیے۔ نصاب کو ایک اکائی زمان کر چھوٹی چھوٹی سات آٹھ اکائیوں میں تقسیم کیا جائے۔ اس کی تدریس کی تکمیل کے لیے وقت مقرر کیا جائے۔ بہتر یہ ہوگا کہ یہ اکائیاں مساوی درجہ کی ہوں اور ان کی مدت تکمیل

بھی مساوی ہو اور اس تکمیل کا وقت معین ہو۔ معینہ وقت پر یہ پوچھا اور بتایا جائے کہ یہ اکائی مکمل ہو گئی یا نہیں۔ مکمل نہ ہوئی ہو تو اس کے اسباب واضح کیے جائیں اور اس کی تلافی کی کوشش کی جائے۔

۲۔ ہر اکائی کی تکمیل کے بعد اس سے متعلق آزمائش کی جائے جس سے یہ معلوم ہو کہ تمام طلبا نے تحصیل کا مطلوبہ معیار حاصل کر لیا۔ یہ تو ممکن نہیں کہ تمام طلبا کا معیار اکتساب یکساں ہو لیکن ایک اقل معیار تو متعین کرنا ہوگا اور اسی سے تمام طلبا کے اکتساب کی پیمائش کی جائے گی۔ مثلاً ۵۰ فی صد نمبروں کو اقل اوسط معیار قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس سے کم حاصل کرنے والے کمزور قرار دیے جائیں گے۔

۳۔ اسی کو تدریس اور تحصیل (Teaching and Learning) دونوں کا پیمانہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ کلاس کے ۵۰ فی صد سے کم بچے ۵۰ فی صد سے کم نمبر حاصل کرتے ہیں تو یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ خرابی تدریس میں ہے۔ کیوں کہ ذہانت کی عام سطح اوسط ہوتی ہے۔ اسے ۵۰ سے ۶۰ فی صد قرار دیا جاسکتا ہے یعنی کسی بھی گروہ طلبا میں کم از کم ۵۰ فی صد طلبا اوسط ذہانت کے ضرور ہوں گے۔ ایک چوتھائی شاید اس سے نیچے اور ایک چوتھائی اس سے اوپر۔ جہاں یہ تناسب برقرار نہ رہ سکے وہاں غور کرنا ہوگا کہ خرابی کہاں ہے تدریس کی خرابی ہے؟ اساتذہ نے بے توجہی برتی ہے؟ طلبا کی لاپروائی ہے؟ نصابی کتب کا کوئی نقص ہے؟ نصاب مطلوبہ معیار سے کہیں زیادہ ہے؟ طلبا کی پچھلی استعداد مطلوبہ معیار سے پست تھی جس کی وجہ سے وہ موجودہ مرحلے کی تعلیم کے ساتھ نہ چل سکے؟ خرابیاں کچھ اسی نوع کی ہو سکتی ہیں لیکن ان میں سے کوئی بھی ناقابلِ علاج نہیں ہے۔ ایک بار اگر استاد ان کا علاج کرنے کی ٹھان لیں تو ان کی شناخت کی جاسکتی ہے اور مناسب تدابیر اختیار کی جاسکتی ہیں کہ ان کا فوری تدارک ہو۔

۴۔ ہر اکائی کی تدریس کے بعد اگر آزمائش ہو اور تدارک کی تدابیر اختیار کی جاتی رہیں تو سال ختم ہوتے ہوتے اچھے نتائج برآمد ہونے کی توقع کی جاسکتی ہے۔ یہاں صورتِ حال کے جائزہ لینے کا اور خرابی کے تدارک کا کئی مرتبہ موقع ملتا ہے۔ جتنی جلدی اس پر توجہ کر لی جائے گی اتنا ہی علاج آسان ہوگا ؎

سرچشمہ شاید گرفتن بمیل
چوں پُر شد نہ شاید گزشتن بپیل

(چشمے کے منہ کو سینک سے بند کیا جاسکتا ہے لیکن جب وہ بھر جائے تو ہاتھی بھی اس کو نہیں روک سکتا)۔

یہاں معاملہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی تدارک کا ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے جائزہ لینا ہوگا اور اسی کے تحت تدابیر اختیار کرنی ہوں گی۔

۵۔ لیکن اگر اوسط معیار ۵۰ فی صد اور اس سے اوپر ہے تو صرف ان طلبا کی نشاندہی کرنی ہوگی جو کمزور رہیں یعنی جو اوسط معیار سے فروتر ہیں۔ ان میں ممکن ہے دس پانچ فی صد بچے ایسے ہوں جو خلقی طور پر کمزور رہیں۔ انھیں

ناممکن العلاج کے علیحدہ زمرے میں رکھا جا سکتا ہے۔ کمزور طلباء میں بڑی تعداد ایسے بچوں کی ہوگی جو کسی سابقہ محرومی کی وجہ سے کمزور ہیں ان کو تھوڑا سا سہارا دیا جائے تو یہ اپنی کمزوری کو بہت جلد دور کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے مندرجہ ذیل تدارکی اقدامات کیے جا سکتے ہیں۔

الف۔ ایسے بچوں کو چند باتوں کا احساس دلانا ہوگا:

۱۔ وہ دوسرے بچوں سے پیچھے ہیں۔

۲۔ لیکن یہ کوئی فطری بات نہیں ہے ان کی صلاحیتیں بھی دوسروں کے برابر ہیں۔

۳۔ ذہنی فطری صلاحیتوں کی معمولی کمی کو محنت سے پورا کیا جا سکتا ہے۔

۴۔ وہ اگر کوشش کریں تو دوسرے اچھے بچوں کے برابر آ سکتے ہیں۔

ب۔ ان کو خود مطالعے کی ترغیب دی جائے کہ وہ اپنی کتابوں کو خود بھی پڑھیں۔ خاص طور پر پچھلی جماعتوں کی پڑھی ہوئی کتابوں کو دوبارہ پڑھیں۔ اس سے ان کی پچھلی کمزوری کسی حد تک دور ہونے میں مدد مل سکتی ہے۔

ج۔ ان کمزور بچوں کو اچھے بچوں کے ساتھ مل کر مطالعہ کرنے پر آمادہ کیا جائے۔ گھر پر جو کام کرنے کے لیے دیا جائے اس میں اچھے بچے ان کمزور بچوں کے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اور اس طرح نہ صرف ان کی کمزوری کو دور کرنے میں معاونت کر سکتے ہیں بلکہ اس سے خود ان کی استعداد کی بھی جلا ہوگی اور ان کے لیے ایک مضبوط بنیاد فراہم ہوگی۔

د۔ خود اساتذہ کو ایسے بچوں پر تھوڑی توجہ الگ سے دینی ہوگی۔ کلاس کی تدریس کے علاوہ تھوڑا وقت دے کر ان کی کمزوری کو دور کرنا ہوگا۔ کلاس کی تدریس کے دوران شاید یہ بچے وہ سب اخذ نہ کر سکے ہوں جو استاد کلاس کو دینا چاہتا تھا۔ الگ سے ایک بار ان کو پھر سمجھا دیا جائے تو امکان ہے کہ وہ اس بات کو اچھی طرح سمجھ لیں اور اس طرح اپنی سطح کو دھیرے دھیرے بلند کر سکیں۔

ہ۔ اساتذہ ان بچوں کی اس طرح مدد کرنے کے علاوہ ان کو گھر پر بھی کام کرنے کے لیے دیں۔ اول تو گھر پر کیے جانے کے لیے کام تمام بچوں کو دیا جانا چاہیے اور پھر اس کی تصحیح کا کام بھی مسلسل ہونا چاہیے۔ بچوں کو جب تک اپنی غلطیوں کا علم نہیں ہوگا، وہ ان کو دور کیسے کریں گے۔ ان غلطیوں کو دور کرنے کے لیے ان کو تحریری/تقریری مشق علیحدہ سے کرانی چاہیے۔ تحصیل میں مشق و مزاولت کا بڑا حصّہ ہوتا ہے۔ جتنی مشق ہوگی اتنی ہی تحصیل کی راہ آسان ہوگی۔

و۔ یہاں خود والدین کا بھی بڑا اہم کردار ہوگا۔ انھیں اپنے بچوں کی مدد کرنی چاہیے۔ اگر وہ خود پڑھے لکھے نہیں ہیں اور اپنے بچوں کو کوئی تعلیمی مدد دینے سے قاصر ہیں تو انھیں اس کا کسی دوسرے ذریعے سے اہتمام کرانا چاہیے۔ یہ بھی نہیں کر سکتے تو کم از کم اتنا تو ضرور کریں کہ اسکول کے بعد بچے ایک مقررہ وقت تک گھر پر پڑھیں۔ اس میں وہ خواہ اسکول کا دیا ہوا کام کریں یا صرف مطالعہ کریں یا یاد کرنے کا کام کریں لیکن مقررہ وقت میں پڑھنے کا کام پابندی کے ساتھ ہونا چاہیے

اور یہ والدین کی نگرانی میں ہی ہو سکتا ہے کہ وہ نہ صرف بچے کو اس کا موقع فراہم کریں بلکہ اس کو اس پابندی کی تاکید بھی کریں۔ آخر یہ دولت اور متاعِ گراں مایہ تو انھیں کی ہے اس کو بربادی سے بچانا اور اس کو بہتر بنانے کی کوشش کرنا پہلی ذمہ داری تو انھیں کی ہے۔

۶۔ ہر اکائی کی تدریس کے بعد آزمائش کا مطلب یہ نہیں ہونا چاہیے کہ جو اکائی تدریس و آزمائش کے مرحلے سے گزر چکی، اس کو بالائے طاق رکھ دیا گیا بلکہ ہر اگلی اکائی کی آزمائش میں پچھلی اکائیاں بھی شامل رہنی چاہئیں۔ مثلاً تیسری اکائی کی تدریس کے بعد اس کی آزمائش کا موقع آئے تو پہلی اور اکائیوں میں سے بھی کچھ نہ کچھ حصہ اس آزمائش میں شامل رہے ورنہ بچے پچھلی اکائیوں سے صرف نظر کر لیتے ہیں اور ان کے مشتملات نسیاً منسیاً ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اسی لیے صرف سالانہ امتحان کے طریقے کو پسندیدہ قرار نہیں دیا جا سکتا نظام میں ابتدائے سال میں پڑھے ہوئے حصے ذہن سے محو ہو جاتے ہیں اور ان کو از سر نو یاد کرنا طلبا کے لیے بار ہو جاتا ہے ہر اکائی بار بار دہرائی جاتی رہے تو اول تو اس کے مشتملات مستحضر رہتے ہیں اور پھر اس طرح ذہن نشین ہو جاتے ہیں کہ مدتا العمر محو نہیں ہوتے۔

۷۔ ان آزمائشوں کو صرف خانہ پری کے لیے نہیں ہونا چاہیے۔ آزمائشیں بھی تدریس کا اہم حصہ ہوتی ہیں۔ اگر تعلیم کے اجزائے ترکیبی سیکھنا، سمجھنا، تحسین کرنا، علم کی زندگی سے تطبیق کرنا اور سیکھی ہوئی چیزوں کو ذہن میں محفوظ رکھنا قرار دیے جائیں تو آزمائشوں کے ذریعے ان سب صلاحیتوں کی پرکھ ہونی چاہیے صرف روایتی انداز کی آزمائش/امتحان سے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا۔ آزمائشی مشقیں اس طرح ترتیب دی جائیں کہ اس سے بچوں کی صرف یادداشت (دوسرے لفظوں میں کہیے رٹنے کی صلاحیت) کا امتحان نہ ہو بلکہ تعلیم کے جملہ اجزا کی جانچ ہو جائے۔ یعنی یہ کہ بچے نے کتنا سیکھا اور جو سیکھا اس کو کتنا سمجھا ہے، اس سے وہ کتنا ذہنی حظ حاصل کرتا ہے اور پھر زندگی کے اپنے مشاہدے میں ان کی کس قدر تطبیق کر سکتا ہے اور بے شک یہ بات بھی کہ وہ سیکھی ہوئی کتنی باتوں کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھ سکتا ہے۔ تدریس میں بھی ایک اچھا استاد ان سب باتوں کو مدنظر رکھتا ہے۔ آزمائشوں میں بھی انھیں مدنظر رکھنا چاہیے تبھی تعلیم بچوں کے ذہنی نشوونما میں معاون ہو گی۔

سال بھر میں صرف ایک یا دو امتحان ہوں تو ان سب باتوں کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ مقررہ وقت میں چند سوال ہی کرنے کی گنجائش ہو سکتی ہے، اس وقت ممتحن کے سامنے صرف اتنی بات رہتی ہے کہ سوالات اس طرح پوچھے جائیں کہ کل نصاب کا احاطہ ہو جائے۔ تدریس و تعلیم کے باقی پہلوؤں کا بہت زیادہ خیال نہیں رکھا جا سکتا، اس لیے وہ اکثر چھوٹ جاتے ہیں اور لے دے کے بچے کی صرف یادداشت کی آزمائش کی جا سکتی ہے۔ اسی لیے امتحان کے قریب اکثر بچے اپنی کتابیں رٹتے نظر آتے ہیں۔ امتحان کے آس پاس

تھوڑی سی مدت تک یہ رٹی ہوئی چیزیں ان کے ذہن میں محفوظ رہتی ہیں اور پھر اتنی ہی تیزی سے ذہن سے نکل جاتی یا جتنی تیزی سے ان کو یاد کیا گیا تھا۔ اکثر و بیشتر ان کے ذہن پر ان کے نقوش مرتسم نہیں ہو پاتے۔ اس لیے بچوں کی نشوونما ن کی شخصیت کی تعمیر میں ان کا پورا فائدہ بھی مترتب نہیں پاتا۔

تعلیم کے عمل میں اصل حیثیت تو تدریس و تحصیل ا ہے۔ امتحان کی بالکل ضمنی لیکن چوں کہ امتحان/آزمائش ے بغیر تحصیل کی پیمایش نہیں ہو سکتی اور پیمایش کے بغیر ول کو ایک درجہ سے اگلے درجہ میں نہیں بھیجا جا سکتا۔ سا لیے امتحان کی اہمیت میں اضافہ ہو گیا۔ اس بات کو تنا ہی غلط خیال کیجیے لیکن عملی حقیقت یہ ہے کہ تدریس و تصیل کا انداز امتحان/آزمائش کے انداز سے ہی متعین تا ہے۔ اس لیے آزمائشی سوالات کو نہایت احتیاط سے مرتب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے کہ یہ نہ صرف معلومات تمام حصے کا احاطہ کریں بلکہ تعلیم کے مختلف پہلوؤں پر بھی محیط ہوں۔

ان طریقوں کو ساٹھ اسکولوں کے بچوں پر آزمایا ا تو ان کے نہایت عمدہ نتائج برآمد ہوئے۔ بچوں کی صلاحیتوں ں اضافہ ہوا۔ ابتدا میں ۷۰ فی صد بچے ۴۰ فی صد کی سطح سے نیچے تھے۔ اس طریقۂ کار کے استعمال سے ان میں بہتری آثار پیدا ہوئے اور صرف ایک تعلیمی سال میں ۸۰ فی صد اکتساب کی ۵۰ فی صد اور اس سے اوپر کی سطح تک پہنچ ۔ اس طریقۂ کار کو اگر مسلسل استعمال کیا جاتا رہے تو تساب کی سطح برابر اٹھتی رہے گی۔ اس کا بہت خوش گوار تدریس اور تحصیل دونوں پر ہی مرتب ہوگا اور یوں معیار تعلیم کے بہتر ہونے میں مدد ملے گی۔

اسکولوں کے جس گرتے ہوئے معیار کا ذکر شروع میں کیا گیا، وہ اگر تشویش ناک ہے تو اس کو روکنے کی کوشش کرنی ہوگی۔ یہ مسئلہ انفرادی نہیں اجتماعی ہے، بلکہ اب تو اسے قومی مسئلہ تصور کیا جانا چاہیے۔ کوئی ایک استاد اس میں تنہا کچھ نہیں کر سکتا۔ اگرچہ ساری تبدیلیوں کی ابتدا فرد سے ہی ہوتی ہے لیکن جو اسکول اپنے معیار کو بہتر کرنا چاہتے ہوں اور کو بحیثیت مجموعی اقدام کر کے اس طرح کے نظام کو اپنے ہاں قائم کرنا پڑے گا۔ اس کی تحریک انتظامیہ کی طرف سے ہو سکتی ہے۔ وہ مناسب حالات پیدا کر کے اساتذہ کو س کے لیے آمادہ کریں کہ کوئی بھی طریقۂ کار ان کی معاونت کے بغیر نہیں چل سکتا بلکہ تعلیمی معاملات تو سراسر انھیں پر منحصر ہوں گے۔ اساتذہ و انتظامیہ کو مل کر اس کے لیے نقشۂ عمل طے کرنا ہوگا۔ ان خرابیوں کو دور کرنا ہوگا جو اس گراوٹ کا باعث بن رہی ہیں۔ جواب دہی کا کوئی نظام قائم کرنا ہوگا۔ اسکول میں معیار کی کوئی کم سے کم حد مقرر کرنی ہوگی۔ جب اسکول کے نتائج اس حد سے کبھی نیچے گر جائیں تو ان اشخاص کو جواب دہ ہونا پڑے گا جو اس کے ذمہ دار ہوں لیکن اس سے بھی زیادہ تو اساتذہ اور طلبا میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا ہوگا کہ وہ اس احساس کے تحت اپنے کاموں کی صورت گری کریں۔ موجودہ تشویش ناک صورتِ حال کو بدلنے کے لیے ضروری تدابیر خود بھی سوچیں اور دوسروں کے تجربے میں آئی ہوئی تدابیر کو اختیار کریں۔ اپنا وہ پیشہ ورانہ، قومی اور انسانی کردار ادا کریں جو ہمیشہ استاد کا طرۂ امتیاز رہا ہے۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۳، ش ۱ - (جنوری ۹۴ء)

جان ڈیون پورٹ

سرسید احمد خاں اور خواجہ الطاف حسین حالی کے ہم عصر

مصطفیٰ شیروانی

تہذیب الاخلاق کے اکتوبر ۱۹۹۳ء کے شمارے میں جناب ذوالفقار احمد نے اپنے تحقیقی مضمون "سرسید کا طرزِ فکر" میں، سرسید علیہ الرحمہ کے نواب محسن الملک کے نام ایک خط میں جان ڈیون پورٹ کے تذکرے کی تفصیل درج کی ہے۔ بقول سرسید" جان ڈیون پورٹ نے اپنی تصنیف میں جس کی طباعت کا صرفہ خود سرسید" نے دیا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر لگائے گئے الزامات کی پُرزور تردید کی ہے لیکن اس سے بھی اہم جان ڈیون پورٹ کے عرب مسلمانوں کے علم و ادب کے اعتراف کا وہ تذکرہ ہے جو خواجہ الطاف حسین حالی نے "مسدس حالی" کے حواشی میں کیا ہے۔ مسدس حالی میں عربوں کی فصاحت یوں بیان ہوئی ہے

فصاحت کے دفتر تھے سب گاؤ خوردہ
بلاغت کے رستے تھے سب نا
ادھر روم کی شمع انشاء تھی مردہ
ادھر آتش پارسی تھی فسردہ
یکایک جو برق آ کے چمکی عرب کی
کھلی کی کھلی رہ گئی آنکھ سب کی

خواجہ صاحب اس بند کے حاشیے میں لکھتے ہیں ؎

"فصاحت و بلاغت عرب کا ذاتی جوہر تھا میدان جنگ میں ان کی تقریروں سے مبارزوں کے دل بڑھتے تھے اور مخالفوں کے جی چھوٹ جاتے تھے۔ انھیں کو زبانیں لڑائیوں میں تیر و سنان کا کام دیتی تھیں۔"

جان ڈیون پورٹ نے لکھا ہے:

"عرب کے علم و ادب نے یونان و روم کے علم و ادب میں ازسرنو جان ڈالی تھی۔"

آگے حالی لکھتے ہیں:

"اورینٹل ٹرانسلیشن کمیٹی (ORIENTAL TRANSLATION COMMITTEE) کی پہلی تجویز میں اس بات کا اعتراف کیا گیا ہے کہ فن ادب خصوصاً قصص و حکایات میں کوئی عرب سے بڑھ کر نہیں ہوا۔"

(مسدس حالی حواشی)

جان ڈیون پورٹ اور مولانا حالی کے اس ادعا کا ثبوت

۲-۶-۶-۳۴، حمایت نگر، حیدرآباد (آندھرا پردیش)

ایک حالیہ تصنیف "عربک لینگویج (Arabic Language) سے بھی ملتا ہے جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ہی شعبہ ویسٹ ایشین اسٹڈیز (West Asian Studies) کے جناب ایم۔ آر۔ کے ندوی اور احمد اشفاق صاحبان نے شائع کی ہے جس میں صرف عربی زبان کے دنیا کے مختلف ممالک میں انگریزی تراجم پر مبنی ہزاروں سے زاید تصانیف کی فہرست ہے اور ایک سو سال قبل جان ڈیون پورٹ کے اس قول کی تصدیق بھی ہوتی ہے کہ عربی زبان کا مختلف ممالک میں رجحان کو کس طرح فروغ حاصل ہوتا رہا ہے جیسے Indiana University کے پروفیسر Miggilagaa "مراقش کی عربی کے بنیادی مسائل" پیش کرتے ہیں یا Mr T.V. IRVING اپنی تصنیف Teaching of Arabic to English Speaking Muslims میں رقم طراز ہیں:

"مغربی ممالک میں عربی زبان و ادب
کی تعلیم عام طریقے پر اس لحاظ سے
ناکافی ہے کہ اس زبان کے ذریعے
اسلامیات کا جو پس منظر پیش کیا
جاسکتا ہے اور مشرق وسطیٰ میں اسلام
کے فروغ کی جو وجوہات ہیں اس سے
یہ نوعمر طلبا عام طور پر نابلد رہتے ہیں۔"

یعنی بیسویں صدی میں اس کا احساس مزید تقویت حاصل کرتا ہے کہ جیسا انیسویں صدی میں جان ڈیون پورٹ نے مختلف ممالک کی زبان و ادب پر عربی زبان کے اثرات کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح حالیہ دور میں بھی عربی زبان کے ذریعے اسلامیات اور خود مذہب اسلام کے متعلق معلومات فراہم کرنا ازبس ضروری اور بیحد اہم ہے۔

یہ بھی اظہر من الشمس ہے کہ U.N.O میں بین الاقوامی ہوائی جہاز اور پانی کے جہاز کے عملہ کے لیے عالمی تجارت کو فروغ دینے کی غرض سے تیل کے ذخائر تک رسائی کے واسطے اور اقوام عرب سے معاملات کی تکمیل کے لیے جس عربی زبان کا بولنا، سیکھنا، سمجھنا اور لکھنا آج کے معاشرے میں ناگزیر ہوگیا ہے اس میں اسلامی تہذیب و ثقافت اور معاشرت کی جھلک نظر نہیں آتی بلکہ ملک عرب کے مختلف صوبوں کی "کھڑی بولی" جیسی عربی سمجھنے کے لیے بھی کسی کتابی استعداد کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ "لا" اور "نعم" جیسے چند ضروری الفاظ سیکھنے سے مدد مل جاتی ہے۔

جس عربی کا جان ڈیون پورٹ نے یونان اور روم کے علم و ادب پر اثر انداز ہونے کا اپنی تصنیف میں تذکرہ کیا اس عربی کے لب و لہجہ، اظہار و بیان کی نفاست اور درسیات کی باقاعدگی کی ضرورت کا احساس بھی شامل ہے۔ جان ڈیون پورٹ کے متعلق سرسید احمد خاںؒ نے محسن الملک کو تحریر کیا تھا۔

"نہایت تعظیم ادب اور محبت رکھنے
کے لائق آدمی ہے، وہ مسلمان نہیں
ہے انگریز ہے۔"

[اس میں سرسیدؒ کو کچھ غلطی ہوئی اس لیے کہ انگریز ایک قوم کا نام ہے نہ کہ مذہب کا۔ ایک انگریز بھی مسلمان ہو سکتا ہے جب کہ جان ڈیون پورٹ عیسائی تھے]۔

آگے سرسیدؒ لکھتے ہیں:

"جب آپ اس کی کتاب دیکھیں
گے تو جانیں گے کہ وہ انگریز ہزاروں
مسلمانوں سے بہتر ہے۔"

اپنی تصنیف میں جان ڈیون پورٹ نے ہر اس الزام کا مسلم الثبوت جواب دیا ہے جو آں حضرت صلعم کی ذات گرامی پر لگائے گئے تھے یہ حقیقت ہے کہ ایسے محقق کی تحقیقات جن کی تصنیف 'این اپالوجی فار

"محمد اینڈ قرآن" An Apology for Muhammad & Quran میں ہر الزام کا جواب پیش کیا گیا، اس کے مطالعے اور صحیح پس منظر کے لیے بھی عربی ادب کی تعلیم کی اہمیت نظر انداز نہیں کی جاسکتی اور یہ وہ عربی ادب ہے جس کی تعلیم EDWARD GIBBON (۱۷۳۷ء - ۱۷۹۴ء) مصنف Decline and Fall of the Roman Empire نے اپنی تصنیف کے دور اسلامی کے باب کے لیے آکسفورڈ میں حاصل کی۔ گبن لکھتے ہیں:

> Since the days of Pocock and Hyde oriental learning has always been the pride of Oxford, and I once expressed an inclination to study Arabic" ("Autobiography")

اور یہی وہ زبان و ادب ہے جس کے متعلق ایک مستشرق کا بیان ہے کہ:

"نویں صدی عیسوی میں اہل ہنود کو سائنسی تحقیقات کا ذخیرہ عربی زبان میں منتقل کیا گیا۔"

۱۹۲۹ء میں جب میرے والد ماجد جناب پروفیسر ہارون خاں شروانی مرحوم اپنے یورپ کے دورے میں اپنی مادر جامعہ آکسفورڈ تشریف لے گئے، وہاں اپنے قدیم استاد Prof A. E. W. Hazel جو اس College کے پرنسپل تھے انھوں نے پروفیسر شروانی سے کسی قدر افسردگی سے تذکرہ کیا تھا کہ:

> "آکسفورڈ میں جس قدر مواد ہندوستان کے متعلق عربی زبان میں ہے اس سے خود ہندوستانی اس وجہ سے استفادہ کرنے سے محروم رہتے ہیں کہ وہ عربی زبان و ادب سے ناواقف ہوتے ہیں۔"

(یورپ جنگ سے پہلے از پروفیسر ہارون خاں شروانی ۴۲)

اگر اسلامی معاشرے کا صحیح تجزیہ مقصود ہو اور عربوں کے علم ہیئت، سائنسی معلومات کا حقیقی اندازہ لگانا مقصود ہو تو عربی کی تعلیم ضروری ہے جس کا جان ڈیون پورٹ نے یونان و روما کے زبان و ادب پر اثر انداز ہونے کا ذکر کیا ہے۔

کتابیات

۱- جان ڈیون پورٹ An Apology for Muhammad & Quran
۲- خواجہ الطاف حسین حالی
۳- آٹو بایوگرافی آف گبن Autobiography of Edward Gibbon
۴- پروفیسر ہارون خاں شروانی۔ یورپ جنگ سے پہلے
۵- ایم۔ آر۔ کے ندوی اور احمد اشفاق Arabic Language -
۶- پیرس سائیکلوپیڈیا۔ Pears Cyclopaedia

عصری سائنٹیفک تعلیم کے ساتھ قرآنی علوم کے مکمل فروغ کے لیے

اقلیتوں کا تعلیمی نٹ ورک ٹرسٹ (MANDET میڈنٹ)

کے قیام کی تجویز

ایس۔ منظور عالم *

ہندوستان کے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا مسئلہ اب انتہائی شدید ہو گیا ہے۔ کیوں کہ ہماری تعلیمی پس ماندگی کی وجہ سے ہم مقامی، علاقائی، قومی اور بین الاقوامی روزگار کی منڈی میں کامیابی کے ساتھ مقابلہ نہیں کر سکتے انٹرنس ٹیسٹس میں دوسروں کے ساتھ مسابقت کرنے کے ہماری اس صلاحیت کے فقدان اور نا اہلی کی وجہ سے ہم پیشہ ورانہ کورس اور پوسٹ گریجویٹس کی سطح کے نصاب میں داخلہ حاصل کرنے میں ناکام رہتے ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کے تعلق سے اس گراوٹ کا سدباب نہ کیا گیا تو ہم ہندوستان میں مفلسی اور غربت کی زندگی گزارنے کے لیے مجبور ہو جائیں گے اور مسلمان نہ صرف ملازمتوں سے بلکہ بدلتے ہوئے پیشہ ورانہ مہارت میں وسیلۂ ترقی سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہ مضمون قومی سطح پر ان ہی خصوصیات کے اعتبار سے ایک مستقل اور فیصلہ کن عزم کا مظہر ہے۔ ہم اس حقیقت سے واقف ہیں کہ سارے ہندوستان بھر میں اور بالخصوص جنوبی ہند کی مختلف مسلم تعلیمی تنظیموں نے مسلمانوں کے تعلیمی مفادات کو پروان چڑھانے میں نمایاں حصہ ادا کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی ہمارے مسائل میں بھی غیر متناسب اضافہ ہو گیا ہے اور اس نے خطرناک رُخ اختیار کر لیا ہے۔ اب وقت کا تقاضا ہے کہ ہند کے مسلمان قومی سطح پر متحد ہو کر نہ صرف اس تعلیمی بحران کا حل تلاش کر لیں بلکہ گراوٹ کے رُخ کو موڑ کر ترقی کی راہ پر گامزن کر دیں۔

اس پس منظر کے ساتھ حسب ذیل تجاویز اور سارے چیلنجز سے نمٹنے کے لیے ایک حل پیش کرنے کی یہاں کوشش کی گئی ہے۔ میں بطور خاص آپ سے تعلق خاطر کے ساتھ ان تجاویز کا بہ نظر غائر جائزہ لینے کے لیے آپ کے وقت اور آپ کی توجہ خاص کا طالب ہوں۔ آپ اس کو قبول کر سکتے ہیں اور اس میں ترمیم کر سکتے ہیں یا پھر اسے مسترد بھی کر سکتے ہیں اور اپنے طور پر کوئی اور متبادل تجاویز پیش کریں۔ ان میں سے آپ جو بھی طریقہ اپنائیں گے وہ زیادہ علمی، ٹھوس، کارکرد اور قومی سطح پر بھی اہمیت و افادیت کا حامل ہوگا۔ میں آپ سے اللہ جل شانہ کا واسطہ دے کر التماس کرتا ہوں، آپ اسے پوری احتیاط کے ساتھ پڑھیں اور اپنی تعمیری تنقیدوں سے نوازیں۔ آیئے ہم سب ملت اسلامیہ ہند کے مفاد کو

---

* مشیر عالمی بینک واشنگٹن، سابق وائس چانسلر کشمیر یونیورسٹی۔

تعلیم کے ذریعے خدمت کے لیے مل بیٹھیں۔ آپ یہ جانتے ہیں کہ اسلام نے علم کے حصول کو ہم پر لازمی قرار دیا ہے۔

یہ تجاویز حسب ذیل مفروضات کی اساس پر ہی پیش کی جارہی ہیں۔

مسلمانوں کی پسماندگی کا ایک بنیادی سبب قرآن حکیم سے ان کی دوری ہی ہے۔ قرآن کریم کی تلاوت اور بغور مطالعہ مسلمانوں میں خواندگی کو یقینی بناتا ہے۔ قرآن کریم مسلمانوں سے تمام گناہوں سے پاک اعلیٰ و اخلاقی کردار کا متقاضی ہے اور انھیں سائنس اور ٹکنالوجی سے سبق حاصل کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ مسلمانوں میں اللہ تعالیٰ کی مدد اور استعانت کا یقین پیدا کرتا ہے۔ اگر وہ قرآنی اقدار پر سختی کے ساتھ کاربند ہوں

انا لننصر رسلنا والذین امنوا فی الحیٰوۃ
الدنیا و یوم یقوم الاشھاد۔ (۴۰ - ۵۱)

[بلاشک و شبہ ہم اپنے رسولوں کو مدد
کریں گے اور ان کی بھی جو کہ اس دنیاوی
زندگی میں اس دن پر (دونوں ہی پر)
ایمان رکھتے ہیں جس دن ان کے نامۂ
اعمال ان کے سامنے لائے جائیں گے]

یہ خدائی مدد کا ذکر سورہ فصلت میں آیا ہے (۴۱-۳۱)

لہذا یہ بالکلیہ طور پر واضح ہے کہ ہمارے لیے قرآنی معیار زندگی پر عمل لازمی ہے۔ اسی عمل کے ذریعے ہم اللہ تعالیٰ کی پناہ اور مدد حاصل کرسکتے ہیں۔ لہذا یہ عمل فیصلہ کن اہمیت کا حامل ہے۔ اس لیے ہماری جدّ و جہد اور ممکنہ کوشش یہی ہونی چاہیے کہ تمام مسلمان نوجوان اور ضعیف، مرد و خواتین قرآن پر سختی سے عمل پیرا ہوں۔ انھیں چاہیے کہ وہ قرآن کی ہدایات کو اس کے معنیٰ و مفہوم اور ان کی افادیت سے پوری طرح ہدایت و رہنمائی حاصل کریں۔ قرآن کے شعور اور اس پر عمل کرنے کی بدولت ہی مسلمان نہ صرف ہندوستان بلکہ سارے اقطاعِ عالم میں موجودہ تاریکی اور نکبت و افلاس کی حالت سے نکال کر عزت اور توقیر اور تابناک باعظمت زندگی بسر کرنے کا تصور کرسکتے ہیں۔ قرآن کریم صاف طور پر ان نکات کو واضح کرتا ہے۔

اللّٰہ ولی الذین اٰمنوا یخرجھم من
الظلمٰت الی النور ۵

[اللہ تعالیٰ ان کا محافظ ہے جو اس بات
پر ایمان رکھتے ہیں کہ وہ ان کو اندھیروں
سے اجالوں کی طرف رہنمائی کرے گا]۔

یہ ایمان اس کے ماننے والوں میں اسی وقت پیدا ہوسکتا ہے جبکہ وہ قرآن کے عربی متن کے ساتھ ساتھ اس کے معتبر ترجمے اور تشریحات کو پابندی کے ساتھ پڑھیں قرآن مجید مسلمانوں کو یہ نصیحت کرتا ہے کہ وہ قرآن کو پابندی سے خصوصیت کے ساتھ صبح کی اولین ساعتوں میں پڑھا کریں طلوع آفتاب سے غروب آفتاب تک پابندی کے ساتھ نمازیں قائم کریں اور صبح کی نماز (فجر) کا پڑھنا اور نماز میں قرآن کی تلاوت کیا کریں۔ یہ صبح کی نماز اور تلاوت قرآن پاک ان کے ایمان کی تصدیق ہے۔

اقم الصلوۃ لدلوک الشمس الی غسق
اللیل وقرآن الفجر ان قرآن الفجر
کان مشھودا ۵

مسلمانوں میں پوری طرح خواندگی کو عام کرنے اور ملک کے طول و عرض میں پرائمری اور سکنڈری اسکول کی سطح پر معیاری عصری تعلیم کا حصول نہایت ضروری ہے سرسید احمد خاں کے عہد میں یونیورسٹی کی تعلیم کے حصول کی ضرورت سمجھی گئی تھی تاکہ مسلمان انتظامی شعبوں، قانون، طبیعیات اور ریاضیات کے علوم وغیرہ جیسے پیشہ ورانہ شعبوں میں پیچھے نہ رہ جائیں۔ اب صورت حال تیزی کی سمت تبدیل ہوگئی ہے۔ سائنس ٹیکنالوجی، مینجمنٹ، قانونی علمی

اور دیگر پیشہ ورانہ کورسس میں داخلہ پانے کے لیے طلبا کو مسابقت کر کے میرٹ میں جگہ بنانا ضروری ہو گیا ہے۔ مسلم طلبا صرف اس لیے داخلہ پانے سے محروم ہو جاتے ہیں کہ وہ کمزور ہیں اور پرائمری سے لے کر پری یونیورسٹی کی سطح تک ان کے اسکولوں کے تعلیمی ڈھانچے ناقص معیار کے تعلیمی بنیادوں پر قایم ہیں۔ لہٰذا موجودہ مرحلے میں مسلمان طلبا کے لیے شاندار تعلیمی سہولتیں درکار ہیں۔ ترقی یافتہ پیشہ ورانہ یونیورسٹی کے دیگر کورسس میں داخلے کے لیے اگر وہ شدید مسابقت کا سامنا کرنے کے لیے اچھی طرح تیار نہ ہوں تو پھر وہ ناامیدی اور نفسیاتی طور پر بے چینی کا شکار ہو جائیں گے۔

اسکول کی سطح پر بشمول پری یونیورسٹی سطح پر تعلیمی معیار میں اضافے سے مسلمان بچے اور بچیوں میں مسابقت کے جذبات پروان چڑھیں گے۔ اس سے وہ میڈیسن، انجینئرنگ اور ٹکنالوجی کے پیشہ ورانہ کورسس میں داخلہ لینے کے لیے قومی اور ریاستی ایجنسیوں کی جانب سے منعقد کیے جانے والے انٹرنس امتحانات میں کامیابی کے ساتھ مقابلہ آرائی کرنے کے اہل ہو سکیں گے۔

سارے ملک میں اقلیتی تنظیموں اور اداروں کی جانب سے بے شمار اسکولس چلائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ محسوس کیا جا سکتا ہے کہ ان کا تعلیمی معیار سارے ملک کے معیار تعلیم کے مقابلے میں کم پایا جاتا ہے۔ حیدرآباد میں ہمارا یہ تجربہ رہا ہے کہ چند مدارس کو چھوڑ کر اقلیتوں کی طرف سے چلائے جانے والے اسکولوں میں تعلیم کا معیار نہایت پست ہے۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ ایسے اقلیتی ادارے قایم کیے جائیں جو ملک میں دستیاب بہترین اعلیٰ معیار سے مطابقت رکھنے والی معیاری تعلیم و تدریس کا انتظام کریں۔ ایسا تب ہی ممکن ہو سکتا ہے جب کہ ان اداروں کو تعلیم دینے کے لیے معاون اچھے اور معیاری آلات (TEACHING AIDS) سائنس ٹیچنگ لیباریٹریز اور معیاری لائبریریاں مناسب تعداد میں دستیاب ہوں۔ ساتھ ہی انھیں ایسے معیاری اسٹاف سے آراستہ کیا جائے جو ملک بھر کے مطابقت رکھنے والی شرح تنخواہیں پا سکیں۔

چند ایک کو چھوڑ کر ملک کی موجودہ سیاسی قیادت بھی ہندوستان کے مختلف فرقوں کی غربت اور پسماندگی کو دور کر کے معیاری تعلیم کی فراہمی میں کوئی خاص دلچسپی نہیں رکھتی۔ ان کی پالیسیاں اعلیٰ ذات کی سیاسی اجارہ داری کو پائیدار بناتا ہے۔ اس اجارہ داری کو سنگین خطرات لاحق ہو سکتے ہیں۔ اگر یہ غریبوں، ہریجنوں، مسلمانوں اور دیگر پسماندہ طبقات کو معیاری تعلیم کا موقع فراہم کریں ہمارے سیاسی قایدین اپنی لفاظی اور چرب زبانی سے ہمیں اپنے جھوٹے وعدوں میں الجھائے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ نہ ہم ان سے رجوع ہوں اور نہ ہی ان کی سرپرستی کو قبول کریں۔

ہندوستان کا مستقبل متوسط درجے کی ٹکنالوجی کے فروغ میں پنہاں ہے۔ ساتھ ہی معیشت کو آزاد کرنے اور زرعی، چراگاہی، باغ بانی کی پروسیسنگ سے متعلق صنعتوں میں اور بین الاقوامی کمپنیوں کی متوقع حصہ داری اور بے شمار گھریلو استعمال کی اشیا کی تیاری کی صنعتوں کی بدولت متوسط درجے کی ٹکنالوجی میں کافی پیش رفت ہوئی ہے۔ اس بات کے پیش نظر فروٹ پروسیسنگ، لیدر پروسیسنگ، ریفریجریشن اور کئی ٹکنالوجی کے بہت سے اختراعی شعبوں کا قیام جیسے شعبوں میں عصری ٹکنالوجی کے بنیادی آلات کی تربیت کے ساتھ ہائی ٹیک کو آراستہ کرنے کی ترجیحی بنیادوں پر ضرورت ہے۔

متذکرہ مفروضات سے اتفاق کر لینے کی صورت میں اس کے ساتھ ہی ہمیں مشترکہ پرائمری اور سیکنڈری سطح کے سلسلہ وار اسکولوں کے قیام کی ضرورت کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا۔ جس کے ذریعے عصری اور قرآنی علوم دونوں ہی کے

درس وتدریس کا انتظام کیا جائے۔

مجھے توقع ہے کہ آپ میری اس رائے سے اتفاق کریں گے کہ صرف چند ایک مثالوں کو چھوڑ کر ہندوستان کے موجودہ اقلیتی تعلیمی ادارے بڑے پیمانے پر مطلوبہ تعلیمی معیارات کو برقرار نہیں رکھتے۔ اس کی وجہ ان کے اساتذہ کے معیار کی خامی ہے جس کو ٹیچرس ٹریننگ کالجوں کے قیام کے ذریعے دور کیا جا سکتا ہے۔ آپ اس بات کو بھی تسلیم کریں گے کہ ہندوستان کے تعلیمی ادارے ایسے بڑے چڑھے فیس وصول کرتے ہیں جو کہ بہت سے مسلمانوں اور دیگر فرقوں کے غریب طبقات کی پہنچ سے بعید ہیں۔

یہ امر بڑا بدبختانہ ہے کہ اقلیتوں کے تعلیمی ادارے مذہبی اور عصری علوم کے علاحدہ علاحدہ خانوں میں بٹ گئے ہیں۔ عصری سائنس سے مذہب کی دوری کا یہ نتیجہ ہے کہ ان میں اسلامی کردار اور قرآنی جذبہ کا فقدان پایا جاتا ہے۔ مذہب اور سائنس کی دوری اسلامی کردار اور روحِ قرآن کے مغائر ہے۔

ہمارے مذہبی اور مشرقی علوم کے ادارے یا مدرسے اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ قرآنی آیات کی قابلِ لحاظ تعداد کا ربط و تعلق کائنات کی سائن ٹیفک ماہیت سے ہے اور یہ قرآن مجید سائنسی علوم کے حاصل کرنے کی ترغیب و تلقین کرتا ہے۔ بالکلیہ اسی طرح علوم عصری کے تعلیمی ادارے یہ بات نہیں مانتے کہ قرآن کی تعلیمات پر مبنی طریقہ کار تعلیم کو صحیح سمت میں رہنمائی کر سکتا ہے اور اس عصری تعلیم کی بنیادی خرابیوں کی اصلاح کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے جب کہ اخلاقی اقدار کے بغیر عصری سائنس کی ترقی کا تصور بھی بے قیمتی ہوگا۔ صحیح خطوط کے تعین کی عدم موجودگی کے باعث سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی نے انسانیت کو تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا ہے اور اب خود ہمارے کرۂ ارض کا وجود و بقا کو بھی خطرات لاحق ہو چکے ہیں۔

قرآن کی تعلیمات ہی صحیح خطوط میں عصری تعلیم کے فروغ کا بنیادی وسیلہ و کلید ہے۔ بالکل اسی طرح سائنسی تعلیم ہی وہ بنیاد ہے جس کے ذریعے سائن ٹیفک جذبہ اور قرآن کی تعلیمات میں ایک ہم آہنگی پیدا کی جا سکتی ہے اور صحیح انداز میں اس توصیف و ستائش کی جا سکتی۔ لہٰذا ایک مسلمان کی شخصیت کو مؤثر وسعت دینے کے لیے عصری اور قرآنی دونوں علوم کے امتزاج کی اہمیت و افادیت مسلم ہے۔

حق و صداقت کی تلاش میں سرگرداں عصری سائنسی اسپرٹ اور قرآن کے اخلاقی اقدار کے ساتھ آگہی اور معلومات کو وسعت دینے کا یہ امتزاج نہ صرف علم کے فروغ کو تیز تر کرے گا بلکہ اس بات کو یقینی بنائے گا کہ معقولیت پر مبنی اور سائنسی سطح کی ترقی ہوگی جو عدل و انصاف، دیانت داری، سچائی، اخلاص، بے غرضی، باہمی امداد اور صبر و تحمل کی اخلاقی اقدار کی آئینہ دار ہوگی جیسا کہ قرآن حکیم درس دیتا ہے۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ ہندوستان میں اقلیتی تنظیموں کی جانب سے اور ان کے زیر انتظام یا اُن کے تحت چلائے جانے والے اداروں میں سے ایک بھی کوئی ایسا نہیں ہے جو متذکرہ بالا مقاصد کے حصول کے لیے اقدام کر رہا ہے اس لیے ان مقاصد کو پانے کے لیے حسب ذیل حکمت عملی کے ساتھ چند تجاویز پیش کی جا رہی ہیں۔

اقلیتی تعلیمی نٹ ورک ٹرسٹ (MEDNET) (میڈنٹ) کا قیام عمل میں لایا جانا ضروری ہو گیا ہے تاکہ حسب ذیل مقاصد کی تکمیل ہو سکے۔

(الف) ایسے اسکولوں کا قیام جو اعلیٰ معیاری تعلیم مہیا کر سکیں جہاں عصری تعلیم اور قرآنی احکامات کا امتزاج پایا جاتا ہو۔

(ب) ایسے پالی ٹکنک کالجوں کا قیام، جو عصری سائنسی خطوط پر کام کرتے ہوئے روزگار

پر مبنی متوسط درجے کی ٹکنالوجی کی درس و
تدریس کا انتظام کریں۔

(ھ) اعلیٰ صلاحیت کے حامل اساتذہ کی
ایک بھاری تعداد کو تربیت کی فراہمی کے لیے
ٹیچرس ٹریننگ کالجوں کا قیام۔

(د) ایسی نگراں کار ایجنسی کا قیام اور
میڈنٹ (MEDNET) کی جانب سے چلائے
جانے والے اسکولوں میں اور دیگر اقلیتی اداروں
میں تعلیم کے معیار کو برقرار رکھنے کے سلسلے
میں رضاکارانہ طور پر خدمات انجام دے۔

یہ اقلیتی تعلیمی نٹ ورک ٹرسٹ (MEDNET میڈنٹ) حقیقی معنوں میں قومی سطح پر بلکہ ممکن ہو تو بین الاقوامی حیثیت کا حامل ہو سکتا ہے جس میں بورڈ آف ٹرسٹیز کے ارکان ملک کے تمام گوشوں سے اور مقیم ہندوستانیوں میں سے منتخب کیے جائیں۔ اس طرح بورڈ آف ٹرسٹیز میں ہندوستان کی ہر ریاست اور ساتھ غیر مقیم ہندوستانیوں کو نمائندگی دی جائے۔

تعلیمی اداروں کے قیام کے لیے رقومات بالعموم امت مرحومہ کے ہر فرد سے وصول کی جائیں اور ان اصحاب سے بھی وصول کیے جائیں جو مسلمان لڑکے اور لڑکیوں کے لیے عصری اور تعلیمات قرآنی کے مفاد کو فروغ دینے میں دلچسپی رکھتے ہوں۔

اقلیتی تعلیمی نٹ ورک ٹرسٹ (MEDNET- میڈنٹ) ترجیحی بنیادوں پر ایسے ابتدائی اور ثانوی درجے کے اسکولوں کے قیام کے لیے جدوجہد کرے گا۔ جس میں اقلیتی طبقے کے ہر فرد کی رسائی حاصل ہو سکے۔ چاہے وہ معاشی و سماجی حیثیت سے کچھ بھی مقام رکھتا ہو۔ اس کا مقصد اولین ہندوستان کے تمام مسلمان گھروں میں اس طرح کے عصری اور قرآنی علوم کو عام کرنا ہوگا۔ یہ ادارے جن مقاصد کی تکمیل کے لیے جدوجہد کریں گے وہ حسب ذیل ہوں گے۔

۱۔ اعلیٰ معیاری تعلیم کی فراہمی اور قابلِ رشک شاندار تدریسی معیار کی برقراری جو کہ ملک کے موجودہ بہترین تدریسی اداروں سے کسی طرح کم نہ ہو۔

۲۔ اعلیٰ معیاری قرآنی تعلیم کے ذریعے جو اس کے مقدس اوصاف، مقدس قانون اور توحید سے متعلق اس کے نظریہ اس کی انسانیت نواز تعلیمات اور قرآن میں بتلائے گئے سائنسی مظاہر کا آئینہ دار ہو جس کے ذریعے ایسے کردار عالم وجود میں آئیں گے جو قرآن حکیم اور پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی تعلیمات اور آپ کی عملی زندگی سے ظاہر ہے۔

۳۔ عالمی اخوت و بھائی چارہ اور بنی نوع انسان کے اتحاد کی قدروں کو فروغ دینا جیسا کہ اسلام اجازت دیتا ہے۔

۴۔ آزاد خیالی، سائنسی جستجو کے جذبے کو پروان چڑھانا اور قومی اور بین الاقوامی سطح پر مسابقت کرنے کی صلاحیت کو اُجاگر کرنا۔

۵۔ انصاف رسانی، دیانت داری، اتحاد، انسانی مساوات اور احترام آدمیت سے متعلق احسن اقدار کا فروغ اور ان اوصاف کے پیدا کرنے کا عزم مصمم پیدا کرنا۔

۶ فرقہ واریت اور طبقاتی کشمکش کے خلاف، نسلی برتری یا کمتری کے احساسات اور ایسے تمام مسموم خیالات [illegible]

تیار کرنا جو انسانیت کو منقسم کرتے ہوں۔

۷۔ دیگر تمام مذاہب کے جذبۂ انسانیت اور اخلاقی قدروں کی قدر دانی کرنا۔

ان تعلیمی اداروں کے فارغ التحصیل طلبا عصری سائنسی علوم اور قرآنی پیام سے کما حقہ آراستہ و پیراستہ ہوں گے اس طرح وہ قرآن کی ان آیات کی صحیح توضیح پیش کریں جیسا کہ قرآن کریم میں کہا گیا ہے:

علم الانسان مالم یعلم (۵- ۹۰)

[انسان نے وہ سب علم کو پالیا جس کا وہ علم نہیں رکھتا تھا]

یہ طلبا ہمیشہ حصول علم کی جستجو کرتے رہیں گے اور ہر وقت اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو تلاش کرتے رہیں گے جس کو اللہ نے کرہ ٔ ارض میں، سمندر کی تہہ میں اور خلا میں پنہاں رکھی ہیں جس کے ذریعے وہ اپنی زندگی کو باقی رکھ سکتے ہیں، اس حقیقت کو وہ پوری طرح تسلیم کریں گے کہ اللہ کی نعمتیں سب کے لیے ہیں اور ہر کوئی ان نعمتوں کو حاصل کر سکتا ہے۔

کلا نمد ھؤلاء من عطاءِ ربک ط
وما کان عطآءُ ربک محظورًا ہ

(۲۰ - ۱۷)

[یہ سب کچھ تو اللہ کی نعمتیں ہیں۔ ہم بھی اوروں کی طرح بہ آسانی ان سب نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے آزاد ہیں۔ اللہ کی یہ نعمتیں کسی کے لیے محدود نہیں ہیں]

یہ طلبا اللہ جل شانہٗ کا ان بے شمار نعمتوں کے لیے ہر وقت شکر بجا لائیں گے اور مسلمان اپنی اس کھوئی ہوئی مثالی حیثیت کو دوبارہ پانے کے اہل ہو سکیں گے۔ جس کا تذکرہ قرآن مجید میں ان کے متعلق کیا گیا ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتؤمنون باللہ۔ (۳ - ۱۱۰)

[تم وہ بہترین امت ہو انسانیت کی بھلائی کے لیے مقرر کی گئی ہو تم وہی کرتے ہو جو کچھ کہ صحیح ہے اور اس برائی سے رک جاتے ہو جو غلط ہے اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو]۔

متذکرہ بالا رہنمایانہ خطوط کے ایسے ملے جلے اسکولوں کو چھوٹے پیمانے پر ہر ایک ریاست میں یا ایک ساتھ کئی ریاستوں میں شروع کیا جا سکتا ہے۔ اس کا انحصار عوامی مقبولیت اور وسایل کے حصول پر ہوگا اس مقصد کے لیے بنیادی طور پر معقول آراضی کا حصول لازمی ہوگا، جس کو عطیات کے طور پر قبول کیا جائے گا یا پھر قطعی فروخت کے ذریعے نقد رقم دے کر حاصل کیا جائے گا۔ ہر ایک اسکول کے کیمپس کے لیے کم از کم ۱۵ تا ۲۰ ایکڑ آراضی کی ضرورت ہوگی۔ اس کی تفصیلات بورڈ آف ٹرسٹیز کی جانب سے طے کی جائیں گی، جب یہ عالم وجود میں آئے گا۔

مختصر مدتی منصوبہ

اب جب کہ مذکورہ خطوط کی اسکیم کے شروع کرنے اور اس کی عملی صورت گری کے لیے کافی وقت درکار ہے اس لیے اقلیتی تعلیمی نٹ ورک ٹرسٹ (MEDNET — میڈ نٹ) ایک مختصر مدتی اساس پر حسب ذیل پروگرام کا آغاز کر سکتا ہے۔

۱۔ اہل خیر مسلم خاندانوں سے عطیات جمع کرنا تاکہ ذہین اور باصلاحیت مسلم لڑکے اور لڑکیوں کی تعلیم کے فروغ میں مدد دی جائے جو غریب یا متوسط طبقے سے تعلق رکھتے ہوں، ان کا داخلہ ایسے بہترین اسکولوں میں کرایا جا سکتا ہے جو اپنے تدریسی معیار کے

لیے شہرت کے حامل ہوں۔ اس کو دو طریقوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۲- بعض ایسے طلبا جو پہلے ہی سے باوقار تعلیمی اداروں میں زیر تعلیم ہوں لیکن ان کے سرپرست ان کے تعلیمی اخراجات برداشت کرنے میں دشواریاں محسوس کرتے ہوں۔

میڈنٹ ان بچوں کی تعلیم میں سرمایہ لگانے کی ذمہ داری قبول کر سکتا ہے۔ یہ طلبا لازمی طور پر اپنی جماعت کے سرفہرست اول آنے والے بچوں میں سے ۱۵ ہوں گے۔ ...اچھوں کے ساتھ اس کو شروع کیا جا سکتا ہے تاکہ باہمی تعاون کی اساس پر ایسی مدد کا آغاز ہو سکے۔ ان تجاویز کو اس توقع کے ساتھ پیش کیا گیا ہے کہ حیدرآباد، بنگلور، بمبئی، ترونڈرم مدراس، دہلی، کلکتہ وغیرہ جیسے ہر ایک شہر میں کم از کم لیسے ...خوش حال مسلمان خاندان ہوں گے جو کہ ان ذہین اور ضرورت مند طلبا کی اس طرح کی امداد کی رضاکارانہ پیش کش کر سکتے ہیں۔

۳- میڈنٹ اپنے عملی اقدامات کا آغاز یوں بھی کر سکتا ہے کہ جن خانگی اور سرکاری مدارس کا معیار بہت پست ہو، وہاں کے ذہین طلبا کا انتخاب کر کے انھیں باوقار اور معیاری تعلیمی اداروں میں داخلہ دلا کر منتقل کر دیا جائے۔ ان اداروں میں ایسے ضرورت مند طلبا کے تعلیمی اخراجات کی پابجائی کی جائے گی۔

اوپر صراحت کردہ دونوں ہی پروگراموں سے ایسی سہولتوں سے محروم مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا تاکہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ مستقل طریقے پر معیاری تعلیم حاصل کر سکیں۔

میڈنٹ (MEDNET) غریب علاقوں میں شام کے اوقات میں ٹیوشن کلاسز کے نظام کے امکانات بھی تلاش کر سکتا ہے۔ جہاں اقلیتی طبقے کی کثیر تعداد آباد ہے اور تعلیم ترک کرنے والے بچوں کا فی صد زیادہ ہو۔ اس طرح شام کے اوقات میں چلائی جانے والی اس کلاس سے دو مقاصد کی تکمیل ہو سکے گی۔ پہلی بات تو یہ کہ غریب طلبا کو اعلی معیاری کوچنگ مل سکے گی اور ان میں لکھنے پڑھنے اور تعلیم حاصل کرنے کی دلچسپی پیدا کی جا سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ ان پڑھ بچوں میں لکھنے پڑھنے کا ذوق پیدا ہوگا۔ اس قسم کی شام کی ہر ایک کلاس کا آغاز ایک مختصر سے درس قرآن سے ہوگا۔

میڈنٹ (MEDNET) مقامی طور پر کارکردگی جائزہ لینے والی باوقار ایجنسیاں بھی قائم کر سکتا ہے اور مقامی اقلیتی اداروں کو اس بات کے لیے تیار کروا سکتا ہے کہ وہ اپنے اداروں کے معیار کا جائزہ لیں۔ اس ایجنسی کے ذریعے نگرانی کو قبول کریں تاکہ ان کے اداروں کا معیار بلند ہو سکے اس قسم کی ایجنسیاں ہندوستان کے مختلف شہروں میں اپنے کام کا آغاز کر سکتی ہیں۔

اپنے مضمون کو ختم کرتے ہوئے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں دست بہ دعا ہوں کہ وہ ہماری رہنمائی کرے اور اس قسم کے تعلیمی اداروں کے قائم کرنے میں اپنی قدرت کاملہ سے ہماری مدد فرمائے جس کا ہم نے تصور کر لیا ہے جہاں ہم قرآنی تعلیمات اور سائنسی علوم کے امتزاج کے ساتھ تعلیم و تدریس کا اہتمام کرنے میں کامیاب ہو۔

مجھے اس قرآنی دعا کے ساتھ اپنا نوٹ ختم کرنے کی اجازت دیجیے۔

وآخر دعوٰهم ان الحمد للہ رب العٰلمین

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ۔ جلد ۱۳۔ شمارہ ۱۔ (جنوری ۹۴ء)

ساحلی آندھرا اور تلنگانہ کے مسلمان

مظہر الدین فاروقی *

"تیر و سنان افراد کو موت کے گھاٹ تو اُتار سکتے ہیں مگر قوموں کو فنا نہیں کر سکتے قوموں کو نیست و نابود کرنے کے لیے ایک ہی طریقہ ہے کہ انہیں اس گنج گراں مایہ سے محروم کر دیا جائے جس کے بل بوتے پر اُن کا قومی تشخص برقرار رہتا ہے اور جس کے لٹ جانے سے وہ قومیں نہیں رہتیں بلکہ بے ضمیر انسانوں کی ایک بھیڑ بن جاتی ہے جنہیں استعمار کی قوت جس طرف چاہتی ہے بے زبان جانوروں کی طرح میکانکی طور پر ہانک لے جاتی ہے۔" (پروفیسر عبدالحمید صدیقی)

آج مسلمانوں کو بے شمار مسائل کا سامنا ہے اور ان مسائل میں سب سے اہم مسئلہ ان کی اپنی شناخت کی برقراری اور حفاظت ہے۔ اس مضمون میں عموماً مسلمانوں اور خصوصاً ساحلی آندھرا، راشلیما اور تلنگانہ میں رہنے والے اُن تین لاکھ مسلمانوں کے حالات پر روشنی ڈالی جارہی ہے جن کی مادری زبان تلگو ہے ان میں بہت کم لوگ بہ مشکل اردو کی شُدبُد رکھتے ہیں۔ اس مضمون کے زیادہ تر حقائق متعلقہ نوجوانوں سے انٹرویو کے ذریعے حاصل کیے گئے ہیں۔

تلگو مادری زبان رکھنے والے ایک لاکھ ۹۴ ہزار مسلمان، "ساحلی آندھرا" ایک لاکھ ۲۳ ہزار ۵ سو گیارہ راشلیما اور ۱۹ ہزار ۹ سو ۴ تلنگانہ (نلگنڈہ، کھمم، کرنول، مدیا پلٹ) میں رہتے ہیں (مردم شماری ۱۹۸۱ء) ان مسلمانوں کی اکثریت ان پسماندہ طبقے سے تعلق رکھتی ہے جس کو ہم نداف، بنجارے، نور باند یا دودے کولو کہتے ہیں۔ اس طبقے کے لوگ B - B.C زمرے کے تحت مخصوص تحفظات کے مستحق قرار پاتے ہیں۔ یہ لوگ تلنگانہ کے دوسرے اضلاع میں بھی رہتے ہیں لیکن ان کے حالات مذکورہ لوگوں سے مختلف ہیں اور کسی حد تک یہ عام مسلمانوں میں ضم ہو چکے ہیں۔ نظام آباد، ورنگل، اور حیدرآباد میں چند مسلم مہتر A. B.C بھی پسماندہ فہرست میں شامل ہیں جو ہر اعتبار سے پسماندہ ضرور ہیں لیکن یہ سرکاری فہرست میں شامل نہیں اور اسی وجہ سے تحفظات کے مستحق بھی قرار نہیں پاتے۔

زیر بحث تین لاکھ تلگو مادری زبان والے مسلمانوں کی قلیل سی تعداد اردو کی شُدبُد رکھتی ہے لیکن

* پرنسپل المدینہ کالج آف ایجوکیشن محبوب نگر۔

بیان کیا جاتا ہے کہ شمار کنندہ (Enumerator) کی جانب سے مردم شماری کے دوران سابقہ ریکارڈ کی بنیاد پر اُن کی مادری زبان تلگو درج کی گئی۔ ان کو اس بات کا اعتراف بھی ہے کہ یہ اردو کے مقابلے میں تلگو کا استعمال زیادہ کرتے ہیں اور اس سے اچھی طرح واقف بھی ہیں۔ ان مسلمانوں کی بڑی اکثریت اپنی شناخت کھو چکی ہے۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو پر اکثریتی فرقے کی چھاپ کچھ ایسی بیٹھ چکی ہے کہ کسی بھی رخ سے ڈھونڈھنے سے بھی اسلام کی ایک جھلک تک نظر نہیں آتی۔ غرض یہ کہ ان کی تہذیب، تمدن، زبان، رسم و رواج اکثریتی رنگ میں ڈھل چکے ہیں ان میں بہت سارے لوگ ایسے ہیں جن کو بہ مشکل نام سے ہی مسلم کہا جاتا ہے لیکن انتہا یہ ہے کہ بعض لوگ اس شناخت سے بھی محروم ہو چکے ہیں۔ ان پس ماندہ مسلمانوں کے چند نام یہاں درج کیے جا رہے ہیں جن کی دیگر تفصیلات مضمون نگار کے ہاں بطور ریکارڈ محفوظ ہیں۔

ڈی۔ کاشیا۔ سامبلو۔ سیتوما۔ ودتھنٹ صاحب۔ پاروتی۔ ناگما۔ انجما۔ بدریا۔ بدرما بابیا۔ ناگورو میرا بائی۔ درگیا۔ یرتیا۔ نرسملو ریڈی۔ امام پٹیل وغیرہ۔

یہ لوگ مسلم سماج میں ایک "سماجی پسماندہ" طبقے کی حیثیت رکھتے ہیں لیکن اکثریتی سماج میں یہ سماجی پسماندہ نہیں بلکہ معاشی پس ماندہ تصور کیے جاتے ہیں۔ یہ شادی بیاہ کے تعلقات اپنے ہی لوگوں سے قایم کرتے ہیں۔ عام مسلمانوں سے شادی بیاہ کی مثالیں ایک آدھ ملی بھی ہیں تو نہ ملنے کے برابر۔ ان میں تعلیم حاصل کرنے کا رواج بہت کم ہے اور عورتیں شاذ و نادر ہی تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے والے نوجوانوں کی بہت کم تعداد گریجویشن کی سطح تک پہنچی ہے۔ ان نوجوانوں کو نہ تو گھر میں مسلم ماحول ملتا ہے اور نہ اسکولوں اور کالجوں میں ان کو کتابوں، رسالوں، اخبارات یا کسی اور ذریعے سے اپنے مذہب کے تعلق سے معلومات حاصل کرنے کا کوئی موقع نہیں ملتا۔ یہ نوجوان جب تعلیم کی غرض سے ضلع کے مستقر یا کسی شہر میں آتے ہیں تو بھی مسلم سوسائٹی سے ملنے جلنے یا تعلقات پیدا کرنے سے کتراتے ہیں جس کی اہم وجہ ان کی اپنے مذہب سے دوری، اردو زبان سے عدم واقفیت اور سماجی احساس کمتری ہے۔

اس طبقے کے ۲۰ گریجویٹ نوجوان طلبا سے انٹرویو لیے گئے اور یہ نوٹ کیا گیا کہ ان میں سے صرف ایک ہی نوجوان اپنے مذہب کی آسان اور بنیادی باتوں سے واقفیت رکھتا ہے جب کہ سبھی نوجوان اکثریتی مذہب اور اس کے مسایل سے اچھی طرح واقف ہیں۔ دو نوجوان ایسے بھی ہیں جنھوں نے ایم۔ اے تلگو لٹریچر سے امتیازی کامیابی حاصل کی ہے۔ یہ اکثریت کے مذہب کا گہرا مطالعہ رکھتے ہیں اور مذہبی معلومات میں اکثریتی فرقے کے ایک واقف کار سے کسی طرح بھی پیچھے نہیں۔ یہ بات قابلِ غور ہے کہ یہ نوجوان اپنے مذہب یا مذہب کی خوبیوں سے بالکل ناواقف اور کوسوں دور ہیں لیکن ان کے ذہن میں "مسلم پرسنل لا"، اسلام میں عورت کا مقام، اسلام میں پردہ، جیسے عنوانات یا نام نہاد نزاعی مسایل کا وجود پایا جاتا ہے ان میں دو نوجوان ایسے بھی پائے گئے ہیں جن کا تعلق ایسی جماعتوں سے ہے جن میں سے ایک پر فرقہ پرستی اور دوسری پر دہریت و شدت پسندی کے لیبل لگے ہیں اور مسلمان ان جماعتوں سے مشکوک ہیں۔ ان نوجوانوں کی یہ شکایت نوٹ کی گئی کہ "آج مسلم سماج میں ان کو سماجی مساوات نہیں ملتی"۔ انھوں نے مسلمانوں میں اونچ نیچ، طبقہ واریت جیسی موجودہ برائیوں کی طرف اشارہ کیا اور اس بات کی شکایت کی عام مسلمان ان

سے سماجی رشتے قایم کرنے سے کتراتے ہیں۔

ان مسلمانوں کی بڑی تعداد ساحلی آندھرا میں رہتی ہے جو اپنے مذہب سے بہت دور ہے۔ ان لوگوں کی زندگی کا مذہبی پہلو اس قدر کمزور ہو چکا ہے کہ ان کی مذہبی شناخت ختم ہو چکی ہے۔ ان کے ہاں مذہب کا وجود یا اُن کی شناخت عزاداری، قبر پرستی اور اسی طرح کی دوسری چیزوں میں ہے۔ انتہا یہ ہے کہ ان کی ایک بڑی تعداد ملاقات کے وقت صحیح طور پر السلام علیکم بھی ادا نہیں کر پاتی۔ بلکہ عام طور پر دونوں ہاتھ جوڑ کر نمستے یا نمسکار ہی کرتے ہیں۔ یہ لوگ عیدین کی نمازیں قریب کے بڑے گاوں یا مستقر کی مساجد میں جا کر ادا کرتے ہیں۔ یہ لوگ شادی بیاہ کے موقعوں پر قاضی کو بلواتے ہیں اور موت ہو جانے پر کسی بڑے گاوں یا شہر سے کسی مُلّا یا واقف کار کو 'جو آخری رسوم ادا کر سکے' بلواتے ہیں۔

ایک پوسٹ گریجویٹ نوجوان نے اپنی بے بسی اور مذہبی پسماندگی کا ذکر بڑے ہی دردبھرے انداز میں کیا۔ اس کے دادا کے انتقال پر میت کو قریبی گاوں کی مسجد میں نماز جنازہ پڑھوانے کے لیے لے جایا گیا لیکن میت کی نماز جنازہ میں خاندان کا کوئی فرد اس وجہ سے شریک نہ ہو سکا کہ ان میں سے کوئی بھی نماز جنازہ سے واقف نہیں تھا اور نہ ہی طہارت کے احکام سے باخبر۔ ان مقامات پر بہت سارے ایسے گاوں ہیں جہاں اِن پسماندہ مسلمانوں کی کافی تعداد ہے لیکن مسجد کا کوئی وجود نہیں۔ البتہ ہر گاوں میں عاشورخانہ اور درختوں پر جھنڈے ضرور ملتے ہیں جو یہاں کے مقدس مقامات تصور کیے جاتے ہیں۔ ان گاوں کی ایک طویل فہرست بن سکتی ہے۔ چند نام یہاں درج کیے جارہے ہیں۔ قوسین میں مسلم خاندانوں کی تعداد دی گئی ہے۔

کنڈلہ کنڈہ، گنٹور (۵۴ خاندان) چندرلاپاڈو کرشنا (۲۰ خاندان)، کرشنا پورم، کمم، پرکاشم (۱۰ خاندان)، لنگوجی پلی، کمم پرکاشم (۱۰۰ خاندان) گومٹی دورو، تندی گاما، کرشنا (۲۰ خاندان) گنڈ ریڈی پلی، گِدّالورو پرکاشم (۱۰۰ خاندان) دیوانگرم گِدّالورو، پرکاشم (۲۵ خاندان) کونڈہ پٹیا گِدّالورو پرکاشم (۲۰ خاندان) وغیرہ۔

ان مقامات کے مسلمان اپنے مذہب سے بالکل ناواقف ہیں اور یہی وجہ ہے کہ ان کی زندگی میں غیر مذہب کے اصول سرایت کر چکے ہیں۔ ان مسلمانوں کی خاصی بڑی تعداد غیر مذہب کے تہوار مناتی، مندروں کو جاتی اور پوجا بھی کرتی ہے۔ چند مقامات پر مسلم خاندانوں کا دوسرے مذہب کو قبول کرنے کے واقعات بھی نوٹ کیے گئے ہیں۔

آج مسلمانوں کو بے شمار مسایل کا سامنا ہے۔ مسلمان کروڑوں کی تعداد میں بھی رہ کر وقت کی میزان پر اپنی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتے۔ کہیں یہ سرمایہ دار سامراجیت کے شکار ہیں تو کہیں کمیونزم و اشتراکیت کی لپیٹ میں ہیں۔ کہیں آپسی رقابتوں، سازشوں اور سیاسی رسہ کشی میں الجھ کر اپنی طاقت گنوا رہے ہیں تو کہیں تعصب و فرقہ پرستی کے پنجوں میں پھنسے بے بس نظر آتے ہیں۔ ان کے لیے ہر صبح کہیں نہ کہیں تباہی یا قتل عام کا پیغام لے آتی ہے۔ بقول جناب سلیمان سکندر:

"ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پوری دنیا میں مسلمانوں کا خون سب سے سستا ہو گیا ہے۔ طاقت ور قوم جب بھی چاہتی ہے اپنی بربریت کا مسلمانوں کو نشانہ بناتی ہے۔" (سیاست ، اگست ۹۰ء)

ایسے حالات میں مسلمانوں کو دعوتِ فکر دیتے ہوئے ان کی پس ماندگی دور کرنے کی راہ سوچنے کے لیے بھی کوشش کی ضرورت ہے۔ اس لیے کہ مسلمانوں کی تہذیبی شناخت، دوسری تہذیبوں سے ممتاز ہے۔ یہ انسانوں کو کینہ، تفرقہ اور تعصب سے نجات دلاتی ہے۔ اور خلوص و محبت، بھائی چارگی، مساوات، اتفاق، اتحاد کا سبق سکھلاتی ہے تو پھر مسلمان اپنی اس شناخت کو کیوں مٹانے کے درپے ہیں؟

جب معاشرہ مذہب سے جدا ہوتا ہے تو سماجی اخلاقی اور انسانی اقدار جیسے الفاظ کوئی معنی نہیں رکھتے تو پھر آج مسلم معاشرے کی مذہب سے دوری کیا معنیٰ رکھتی ہے؟

علم جب مذہب سے جدا ہوتا ہے تو مادّہ پرستی، الحاد، روح کی خوابیدگی اور ذہنی انتشار کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ آج مسلمانوں کا اسلام سے ناواقف نام نہاد ترقی پسند طبقہ اسلام کے خلاف صفیں بنا رہا ہے تو پھر بھی مسلمان اپنے بچوں کی بہتر تعلیم کے ساتھ اسلامی اصولوں پر صحیح تربیت اور سیرت سازی سے غفلت کیوں برت رہے ہیں؟

مسلمانوں کا مذہب، کبھی بھی اپنے سماج میں اونچ نیچ، بھید بھاو، نسلی یا طبقاتی امتیازات کی قطعاً اجازت نہیں دیتا۔

تو پھر !!!

مسلمانوں کی اس قدر پس ماندگی کس طرح گوارہ ہو اور یہ پس ماندہ طبقات اپنی شناخت کو کھو کر اسلام سے دور کیوں بھٹک رہے ہیں؟؟؟

"کسی شخص کے لیے یہ جائز نہیں کہ اپنے بھائی کو تین دن سے زیادہ چھوڑے رکھے۔ دونوں ملیں لیکن یہ بھی منہ پھیر لے وہ بھی منہ پھیر لے ان دونوں میں بہتر وہ ہے جو سلام کی ابتدا کرے"

(بخاری شریف)

تھیلاسیمیا ـــــ ایک مرض

کے۔ ایس۔ صدیقی *

ملک واثق امین **

تھیلاسیمیا ایک موروثی مرض ہے جس میں خون کے اندر پائے جانے والے کریاتِ حمرا (R.B.C.) میں کئی طرح کی خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس مرض کے جینس (GENES) بیشتر افراد میں پائے جاتے ہیں لیکن ان میں اس مرض کی علامت پوری طرح رونما نہیں ہوتیں۔ تاہم اگر والدین کے جینس میں تھیلاسیمیا کا مرض ہے تو یہ ان کے بچوں میں منتقل ہو کر اپنا اثر دکھا دیتا ہے۔ اس مرض کی پہلی علامت خون کی کمی یعنی قلت الدم (ANAEMIA) ہے۔ جس کے نتیجے میں جلد اور چہرہ سفید، ہاتھ پیروں کا سن ہونا، بھوک کی کمی، طبعی نشو و نما کی کمی وغیرہ جیسی شکایتیں پیدا ہو جاتی ہیں اس مرض میں کریاتِ حمرا نازک ہو جاتے ہیں اور ان کی مدتِ حیات (جو کہ طبعی طور پر ۹۰ سے ۱۲۰ دن ہے) غیر معمولی طور پر کم ہو جاتی ہے۔ خون میں کریات حمرا کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے مخ العظم (BONE MARROW) اپنا کام تیز کر دیتے ہیں جس کے نتیجے میں کریات حمرا زیادہ بننے لگتے ہیں لیکن نتیجے کے طور پر یہ کریات پوری طرح گول نہ ہو کر مختلف شکل اختیار کر لیتے ہیں پھر بھی قلت الدم کا تدارک نہیں ہو پاتا۔ مخ العظم کے کام کی زیادتی کے نتیجے میں کچھ بڑی ہڈیوں اور چہرے کی ہڈیوں کی شکل بگڑنے لگتی ہے۔ کریات حمرا کے جلدی ٹوٹنے کے نتیجے میں جگر اور تلی کو بھی غیر معمولی طور پر اپنی کارکردگی بڑھانی پڑتی ہے۔ نتیجہ کے طور پر ان کا حجم بڑھ جاتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ کریات حمرا میں موجود فولاد (IRON) کی زیادہ مقدار جگر میں جمع ہونے لگتی ہے جو جگر کے لیے مضر ثابت ہوتی ہے۔ اس کے نتیجے میں جگر کے خلیات (LIVER CELLS) مجروح ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔

تھیلاسیمیا کا مرض اٹلی، ایران، یونان، ترکی، جنوب ایشیا اور چین وغیرہ میں بہت عام ہے۔ ان علاقوں میں آبادی کے ایک سے پندرہ فی صد افراد میں اس مرض کے جین پائے جاتے ہیں۔ تاہم اس تناسب سے مرض رونما نہیں ہوتا۔ بلکہ صرف تقریباً تین فی صد افراد میں یہ مرض دیکھنے کو ملتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق ہندوستان کی موجودہ ۸۴ کروڑ کی آبادی میں تقریباً ۲،۵ کروڑ افراد ایسے ہیں جن میں اس مرض کے جین پائے جاتے ہیں۔ جس کے نتیجے میں تقریباً ۷،۰۰۰ سے ۹۰۰۰ ہزار بچوں میں ہر سال یہ مرض پوری طرح پایا جاتا ہے۔

---

* ڈپارٹمنٹ آف کیمسٹری۔ اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

** ڈپارٹمنٹ آف کلیات، اجمل خاں طبیہ کالج، اے ایم یو۔

ہندوستان میں یہ مرض سندھی، پنجابی، لوہانا، پارسی اور موہر جیسی قوموں میں زیادہ عام ہے۔

ہندوستان میں بیشتر بچے اس مرض کی تشخیص سے پہلے ہی مر جاتے ہیں اور اگر تشخیص ہو بھی جائے تو علاج کی خاطر خواہ سہولت فراہم نہ ہونے کے نتیجے میں زندہ نہیں رہ پاتے۔ جیسا کہ گزشتہ سطور میں تحریر کیا جا چکا ہے تھیلاسیمیا میں کریاتِ حمرا کے نازک ہونے کے ساتھ ساتھ ان کی مدتِ حیات بھی کم ہو جاتی ہے جس کے نتیجے میں قلت الدم ہو جاتا ہے اور اس مرض میں مبتلا بچہ بہت کمزور اور سست ہوتا ہے۔ ایسے بچے کھیل کود کے علاوہ پڑھنے میں بھی دلچسپی کم لیتے ہیں۔ ان کی نشوونما، وزن اور لمبائی بھی عام بچوں کے مقابلے میں کم ہوتی ہے۔ قوتِ مدافعت (IMMUNITY) کمزور ہونے کے نتیجے میں ایسے بچے بہت جلد اور آسانی سے تعدیہ (INFECTION) قبول کر کے کسی بھی خطرناک مرض میں مبتلا ہو کر بہت کم عمر ہی میں مر جاتے ہیں اور عام طور سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ بچے کی موت کسی دوسرے مرض کے نتیجے میں ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ تھیلاسیمیا کے بچوں میں ایک عام شکایت بھوک کی کمی ہوتی ہے جس کے نتیجے میں معدنیات اور پروٹین کی کمی ہو جاتی ہے۔

اس مرض کے علاج کا واحد اصول یہ ہے کہ خون میں حمرۃ الدم (HAEMOGLOBIN) کی مقدار اس قدر لازمی طور پر برقرار رکھی جائے جس سے جسم کے افعال صحیح طور پر صادر ہو سکیں۔ اس کے لیے عام طور سے اس کی مقدار ۱۰ گرام فی ۱۰۰ ملی لیٹر کے آس پاس رکھتے ہیں جب کہ طبعی طور پر اس کی مقدار اس سے کہیں زیادہ ہونی چاہیے۔ اس مقدار کو برقرار رکھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عام بچوں میں عام حرکات و سکنات معمول پر رہ سکیں۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی جسمانی اور ذہنی نشوونما عام بچوں جیسی ہی ہو اور پھر یہ بڑے ہو کر ایک صحت مند آدمی کی طرح زندگی بسر کر سکیں لیکن حمرۃ الدم کی اس مقدار کو جسم میں برقرار رکھنے کے لیے بچے کو بار بار خون کی ضرورت ہوتی ہے، تقریباً ہر تیسرے چوتھے ہفتے ان کو ایک یونٹ خون دینا پڑتا ہے اور یہ خون ضروریاتِ زندگی کا ایک حصہ بن جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ان بچوں میں اور کوئی نقص نہیں ہوتا اور یہ صحت مند معاشرے میں اتنے ہی فعال ثابت ہوتے ہیں جتنے کہ اس مرض سے محفوظ دوسرے لوگ۔

بار بار نقلِ خون (BLOOD TRANSFUSION) کے نتیجے میں جسم کے اندر سیاہ مادہ بڑھ جاتا ہے۔ اس کو روکنے کے لیے عام طور سے صرف خلیات (PACKED - CELLS) ہی دینا بہتر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بار خون لینے سے ۲۰۰ سے ۲۵۰ ملی گرام (IRON) جسم میں داخل ہوتا ہے۔ جب کریاتِ حمرا ٹوٹتے ہیں تو یہ (IRON) جسم میں جمع ہوتا رہتا ہے جس کے نتیجے میں (IRON) کی سمیت (TOXICITY) پیدا ہو جاتی ہے۔ جس سے جگر، دل اور جسم کے دوسرے اعضا میں مضر اثرات مرتب ہوتے ہیں جس کے نتیجے میں موت واقع ہو سکتی ہے۔

بدقسمتی سے ہمارے ملک میں نقلِ خون کی سہولت عام نہیں ہے جس کی وجہ سے بہت سے بچے اور مریض اپنی جان گنوا دیتے ہیں کیوں کہ ان کی شمعِ زندگی کو روشن رکھنے کے لیے خون کی درکار مقدار میسر نہیں ہو پاتی۔ ایک اندازے کے مطابق اگر ہماری آبادی کے صرف پانچ فی صد لوگ ہی سال میں ایک بار خون کا عطیہ دیں تو ہندوستان کے تھیلاسیمیا کے کم و بیش سارے مریضوں کو زندگی مل سکتی ہے۔

تھیلاسیمیا کی روک تھام کا آسان طریقہ یہ ہے کہ وہ اشخاص جن کے جین میں یہ مرض ہو وہ اپنے خاندان

میں شادی نہ کریں اور اس کی جانچ خون سے آسانی سے کی جاسکتی ہے۔ ایک دوسرا موثر طریقہ یہ بھی ہے کہ حمل کے دوران جنین (FOETUS) کی جانچ کی جائے۔ اس کے لیے ۱۶ سے ۱۸ ہفتہ کے درمیان جنین کا خون حاصل کرکے یا ۸ سے ۱۰ ہفتہ کے درمیان جنین کی نسیجی جانچ کی جاتی ہے۔ اگر جنین میں تھیلاسیمیا کا مرض پایا جائے تو حمل ضائع کر دیا جائے۔ ان دونوں جانچ کی سہو ہمارے ملک میں موجود ہے تاہم مہنگی ضر ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ میڈیکل سائنس ا سلسلے میں آسان اور موثر طریقہ کب تک دیا کرسکتی ہے۔

"جس میں حسنِ خلق ہوتا ہے وہ مومن ہوتا ہے جس میں نہیں ہوتا وہ منافق ہے مومن فکر و غیرت میں مشغول رہتا ہے اور منافق حرص و امل میں۔ مومن سوائے خدا کے کسی سے توقع نہیں رکھتا اور منافق بجز خدا کے سب سے متوقع رہتا ہے۔ مومن سوائے اللہ کے سب سے مامون و بے خوف رہتا ہے، منافق سوائے خدا کے سب سے خائف رہتا ہے۔ مومن مال دیتا ہے دین نہیں دیتا، منافق دین دیتا ہے مال نہیں دیتا۔ مومن حسنات کرکے روتا ہے منافق گناہ کر کے ہنستا ہے۔ مومن کو خلوت و تنہائی اچھی معلوم ہوتی ہے، منافق کو جماو اور جماعت اچھی لگتی ہے۔ مومن کھیتی کرتا ہے اور اس کے بگاڑنے سے ڈرتا ہے، منافق بیخ کنی کرتا ہے اور توقع خرمن کی رکھتا ہے۔"

(مولوی ذکاء اللہ)

ہندوستانی مسلمانوں کا طرزِ عمل

پچھلی تاریخ کے آئینے میں

محمد اللہ خالص ★

عرب و ہند کے تعلقات بہت پرانے ہیں۔ ظہورِ اسلام سے کافی پہلے عربوں کا مختلف حیثیتوں سے ہندوستان میں آنے جانے کا سلسلہ قایم ہوگیا تھا جو ظہورِ اسلام کے بعد بھی جاری رہا۔ بلکہ مسلمانوں نے زیادہ جوش و خروش اور مستعدی کے ساتھ اُس میں اضافہ کیا۔ اُسے ایک جہت اور سمت عطا کی۔ پھر وہ خلیفہ ولید کے دورانِ حکومت ہندوستان میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوے۔ اُس وقت اُن کی فوجوں نے محمد بن قاسم کی سربراہی میں سندھ کے وسیع علاقوں کو فتح کرکے اسلامی حکومت میں شامل کردیا لیکن وہ نظم زیادہ عرصے تک قایم نہیں رہا اور جلد ہی وہ سارے علاقے دوبارہ مقامی حکمرانوں کے قبضے میں آگئے اور اسلامی حکومت کا دخل ختم ہوگیا۔

محمد بن قاسم کی فتوحات کے تقریباً تین سو سال بعد محمود غزنوی نے ہندوستان پر متعدد حملے کیے اور تقریباً ہر حملے میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کیں لیکن اس نے ہندوستان میں کوئی باقاعدہ سلطنت قایم نہیں کی اور پنجاب کے بعض علاقوں کو اپنی مملکت میں شامل کرکے بقیہ تمام مفتوحہ علاقوں سے مالِ غنیمت سمیٹ کر اور مقامی حکمرانوں سے بڑی بڑی رقمیں وصول کرکے انھیں کے سپرد کرتا رہا۔

محمود غزنوی کی اُس تگ و تاز کے تقریباً ڈیڑھ سو سال بعد شہاب الدین محمد غوری نے ہندوستان پر حملہ کیا جو ناکامیاب بنادیا گیا لیکن دوسرے ہی سال اُس نے دوبارہ حملہ کردیا جس میں اُسے زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور اُس نے ہندوستان کے وسیع علاقوں کو فتح کرکے ایک باضابطہ مسلم حکومت قایم کی اور قطب الدین ایبک کو اپنا نائب مقرر کیا۔

ایبک، غوری کا غلام تھا وہ اپنے آقا کی زندگی میں اُس کے نائب کی حیثیت سے ہندوستان پر حکومت کرتا رہا لیکن اُس کی وفات کے بعد اس نے ایک آزاد بادشاہ کی حیثیت سے حکومت کی اور یہ ایک عجیب تاریخی اتفاق ہے کہ ایبک کے بعد بھی کئی غلام، کیقباد کے دور تک ہندوستان کے حکمراں رہے۔ چنانچہ اسی نسبت سے تاریخ اُس دور کو غلام خاندان کی حکمرانی کا دور قرار دیتی ہے۔

★ چوک سہاور - ضلع ایٹہ

کیقباد کی موت کے ساتھ غلام خاندان کی حکمرانی کا دور ختم ہوا اور جلال الدین خلجی پہلے خلجی حکمراں کی حیثیت سے ہندوستان کے تخت پر بڑے جاہ وجلال کے ساتھ جلوہ افروز ہوگیا۔ اس کے بعد غیاث الدین تغلق نے اُس خاندان کی حکومت ختم کرکے تغلق سلطنت کی بنیاد ڈالی اور تقریباً ایک صدی تک ہندوستان کی قسمت اُس خاندان سے وابستہ رہی۔ اُس کا چراغ گل ہونے کے بعد سیّد خضر خاں کے ذریعے سیّدوں کی حکومت قائم ہوئی جو تقریباً چالیس سال ہی قائم رہ سکی اُس کے بعد حکومت کی شمع بہلول لودی کے سامنے آئی اور اُس کے ذریعے لودی سلطنت کا پھریرا سرزمین ہندوستان پر لہرانے لگا جسے ظہیر الدین محمد بابر نے ابراہیم لودی کے ہاتھوں سے چھین کر مغل سلطنت کی بنیاد قائم کی لیکن شیر شاہ سوری نے اس کے بیٹے ہمایوں کو ہندوستان کے تاج وتخت سے بیدخل کرکے سوری حکومت قائم کردی جو اس کی وفات کے بعد بہت ہی کم عرصے قائم رہ سکی اور ہمایوں نے دوبارہ ہندوستان میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوکر سوری سلطنت کا نقش مٹادیا اور مغل سلطنت کے تسلسل کو دوبارہ جاری کردیا۔ جو کسی نہ کسی حالت میں ۱۸۵۷ء تک قائم رہا۔

ہندوستان میں مسلم دورِ حکومت کے اس مختصر جائزے کے بعد میں جو بات کہنا چاہوں گا وہ یہ ہے کہ اس ملک پر محمود غزنوی کے حملوں اور پنجاب کے وسیع علاقوں کو اپنی سلطنت میں شامل کرنے سے لودیوں کی حکومت تک چھ مسلمان خاندانوں نے اس ملک پر حکومت کی جن کے دورِ حکومت میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے گئے۔ مظالم بھی کیے گئے۔ اکثر حکمراں بیہودہ رنگ رلیوں میں بھی مبتلا رہے۔ اُن کی رنگ رلیاں اور بے اعتدالیاں برداشت بھی کی گئیں لیکن مسلم سماج نے حکمرانوں کی سستی، کاہلی اور امورِ سلطنت سے مکمل لاتعلقی کو کبھی برداشت نہیں کیا اور اس انداز کے حکمرانوں کو تلوار کی نوک سے درست کردیا گیا۔ ضرورت محسوس ہوئی تو حکمراں خاندانوں کو تبدیل بھی کیا گیا لیکن جب خود مسلم سماج میں وسیع پیمانے پر سستی، کاہلی اور اجتماعی معاملات سے بے رغبتی پیدا ہوگئی اور مسلمان نئی تبدیلیوں سے گھبرانے لگے تو اُن کا وہ طریق کار ختم ہوگیا اور ان کی زندگی کا انداز ہی بدل گیا۔

ادھر اورنگ زیب عالمگیر کے بعد مغل حکمراں امورِ سلطنت، قوت وستعدی سے انجام دینے کے بجائے سہولت پسندی اور مکمل عیش وعشرت کے عادی بن گئے۔ آزمودہ کار سرداروں کی رفاقت اختیار نہ کرکے سفلے مسخروں اور زنانِ بازاری کی صحبتوں سے چوبیسوں گھنٹے لطف اندوز ہونے لگے جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ علاقہ دار اپنے اپنے علاقوں میں خودمختار حکمراں بن بیٹھے اور مرکزی حکومت کا مفہوم ہی ختم ہوگیا اس کے باوجود مغل خاندان کو حکمرانی کے منصب سے بےدخل نہ کیا جاسکا۔ یہاں تک کہ ہندوستان میں انگریزوں کی اُبھرتی ہوئی طاقت نے آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا وظیفہ مقرر کرکے اُسے لال قلعہ میں محدود کردیا اور ایسٹ انڈیا کمپنی نے عملاً ہندوستان کی مرکزی سرکار کا درجہ حاصل کرلیا۔

ہندوستان کا پورا سماج بالعموم اور مسلم سماج بالخصوص اس صورتِ حال کو برداشت نہ کرسکا اور ۱۸۵۷ء میں انگریزی اقتدار کے خلاف علمِ بغاوت بلند کردیا گیا لیکن افسوس کہ اُس انتہائی نازک اور خطرناک موقع پر بھی مسلم سماج کی ذہنی کاہلی اور نئی تبدیلیوں سے گھبرانے کی عادت نے کسی فوری ...

متحرک اور حالات کا سمجھداری سے مقابلہ کر سکنے والی شخصیت کو تحریکِ آزادی کا رہنما منتخب کرنے کے بجائے نام نہاد آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو ہی شہنشاہِ ہند تسلیم کر کے جنگِ آزادی کا جھنڈا انھیں کے کمزور ہاتھوں میں تھما دیا۔

بہادر شاہ ظفر خود تو میدان میں نکل کر جنگ آزادی کی فوجوں کو لڑا نہیں سکتے تھے۔ اپنے کاہل پست ہمت اور کوتاہ اندیش بیٹوں کو کماندار اور اپنے نام نہاد ولی عہد مرزا مغل کو سالارِ اعظم مقرر کر کے مطمئن ہو گئے لیکن ان سپہ سالاروں کا یہ حال تھا کہ راتوں میں خوب عیش کرتے، پاؤں پھیلا کر سوتے۔ دن چڑھے سو کر اُٹھتے، جو دل میں آتا یا اُن کے برانے خوشامدی مصاحب مشورہ دیتے اُس کے مطابق عمل کرتے لیکن جنگِ آزادی کے اصل رہنماؤں کے مشوروں اور نصیحتوں پر دھیان نہیں دیتے تھے۔

اُس دور میں جنرل بخت خاں نے بڑی سمجھداری دور اندیشی اور حکمت و تدبر سے انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے کا نقشہ بنایا تھا اور بڑی دلیری سے انگریزی فوجوں کا مقابلہ کیا تھا۔ وہ بہادر شاہ اور ان کے بیٹوں کو بھی مستعدی اختیار کرنے اور نازک حالات کا ٹھیک ڈھنگ سے مقابلہ کرنے کی بڑی دل سوزی سے تلقین کرتا تھا لیکن ان لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا اور وہ اپنی روش سے ہٹنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے۔ اس کا جو نتیجہ ہوا جنگِ آزادی کی تاریخ نے اُس کی تفصیلات کو محفوظ کر لیا ہے۔ اُس دور کے ایک معتبر مورخ اور ان حالات کے انتھک مبصر خواجہ حسن نظامی نے کسی جگہ لکھا ہے کہ "جنرل بخت خاں کو آزادی کا رہنما تسلیم کر لیا جاتا تو ہندوستان کو تاریخ اُسکو سے مختلف ہوتی جیسی کہ اب ہے۔"

ہندوستان کو آزاد کرانے کی اس پہلی تحریک پر قابو حاصل کرنے کے بعد انگریزوں نے تمام ہندوستانیوں سے بالعموم اور ہندوستانی مسلمانوں سے بالخصوص بھیانک انتقام لیتے ہوئے آزادی کے ہزاروں متوالوں کو تہ تیغ کر دیا۔ اُن کے ذرائع معاش تباہ کر دیے۔ ان کے گھر ویران کر دیے اُن کے اجتماعی ادارے تہس نہس کر دیے لیکن افسوس کہ وہ دردناک حالات بھی ہندوستانی مسلمانوں کی روایتی کاہلی اور نئی تبدیلیوں سے گھبرانے کی عادت کو ختم نہ کر سکے بلکہ اُس میں اضافہ ہو گیا اور وہ ان حالات کو اپنی تقدیر کا فیصلہ سمجھ کر ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے۔

ہندوستانی تاریخ کے اس موڑ پر سر سید مرحوم کی عظیم شخصیت اُبھری اور انھوں نے ہندوستانی مسلمانوں کو بلند آواز سے للکارا کہ وہ حالات سے بد دل نہ ہوں۔ بھرپور مستعدی سے میدانِ عمل میں نکل آئیں، اونچی تعلیم کے ذریعے اپنے ذہنوں کو روشن کریں اور اپنی کاہلانہ عادتوں کو بالکل ترک کر دیں جن کی بنا پر انھیں غلامی کی ذلت برداشت کرنی پڑی ہے۔

سر سید احمد خاں مرحوم نے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے کچھ دوسرے دردمند احباب کے تعاون سے زبردست تحریک بھی چلائی جس میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی اور اس کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کی سستی اور لاپرواہی یقیناً کم ہوئی اور انھوں نے قومی معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کیا

پنے ذاتی معاملات کو بھی سنبھالا لیکن حرکت و عمل کے اس
مقام تک نہ پہنچ سکے جو سر سید مرحوم کی معینہ منزل تھی۔ یہاں
ں کہ مختلف مرحلوں سے گزر کر جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے
۱۹۴۷ء میں ہندوستان خون میں نہا کر آزاد ہو گیا۔

اُس وقت اور اس کے بعد ہندوستانی مسلمانوں
نے جو مصیبتیں اور پریشانیاں جھیلی ہیں اور اب بھی جھیل رہے
ہیں وہ تاریخ کا بڑا دردناک باب ہے لیکن افسوس کہ
ن خطرناک حالات میں بھی انھوں نے روایتی کاہلی اور
ئی تبدیلیوں سے گھبرانے کی عادت کو ترک نہیں کیا
ہ آج بھی انتہائی قیمتی وقت کو ضایع کر رہے ہیں۔ بھرپور
حنت سے بچتے ہیں۔ تعلیم کی ان کی نگاہ میں کوئی خاص اہمیت
ہیں ہے۔ وہ کم سے کم کام کر کے زیادہ سے زیادہ فائدے
صل کرنے کی ترکیبیں سوچتے رہتے ہیں۔ انھیں جو مواقع
صل ہیں ان سے بھرپور فائدے حاصل نہ کر کے اُن
اقع کے حصول کی فکر میں رہتے ہیں جو ان کی دست رس
سے باہر ہیں۔ میرے خیال میں یہ بھی ذہنی کاہلی کی ایک
قسم ہے۔

ہندوستانی مسلمان حالات کے نئے نقشوں
میں اپنے لیے کوئی مضبوط اور باعزت مقام حاصل کرنا
چاہیں تو انھیں ہر قسم کی ذہنی و جسمانی کاہلی اور نئی تبدیلیوں
سے گھبرانے کی عادت ترک کرنی پڑے گی اور اپنی انفرادی
اور اجتماعی زندگی میں وہی مستعدی، کام کی لگن اور زندگی
کے ہر میدان میں ناکارہ لیڈر شپ کو تبدیل کرتے رہنے
کا طریقہ اختیار کرنا پڑے گا جو اُن کے بزرگوں کا شعار رہا
ہے۔ خدانخواستہ یہ نہ ہو سکا تو اُن کی تعمیرِ نو کا ہر خواب
ادھورا رہے گا اور دنیا کی ظالم و جابر طاقتیں انھیں
فریب بھی دیتی رہیں گی اور پامال بھی کرتی
رہیں گی۔

"معاف کر دینا اپنی ذات کے
سلسلے میں عزیمت ہے اور انتقام
لینا رخصت مگر قوم کے کمزوروں کے
حق میں انتقام لازم ہے الّا یہ کہ کمزور
لوگ خود ہی معاف کریں۔"
شاہ ولی اللہؒ

میرا علی گڑھ زندہ ہے

سیّد خالد محمود *

چھبیس سال کے بعد اپنی مادرِ علمی کی سرزمین پر پہنچ کر دل کی جو کیفیت تھی وہ ضبطِ تحریر میں لانا یقیناً ناممکن ہے۔ اس لمبے وقفے میں جہاں ایک طرف علی گڑھ سے آنے والے ہر شخص سے ؏

"او لوٹ کے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ چمن"

کے مصداق رہ کر اکثریت سے علی گڑھ کی اعلیٰ روایتی قدیم اقدار کے پامال ہونے کی خبریں ملتی تھیں، وہیں دوسری طرف اپنے زمانۂ طالب علمی کے علی گڑھ کی وہ حسین یادیں بھی دل میں تھیں جن کو مشعلِ راہ بنا کر میں نے اپنی عملی زندگی میں قدم رکھا اور زندگی کے مسئلے میں علی گڑھ اقدار کو اپنا لائحۂ عمل بنایا تھا۔ ان دونوں حقیقتوں کے خیالات کے ہجوم کو دل و دماغ میں باہم متصادم رکھ کر اپنے بیٹے کو اسی مادرِ علمی میں داخلہ دلانے کی نیت سے ساتھ لے کر جب علی گڑھ پہنچا تو مذکورہ بالا اکثریت کے تاثرات کہتے تھے کہ

"اب تو جی ڈرتا ہے خود اپنے ہی میخانے سے"

اور دل علی گڑھ کی سڑکوں پہ پہنچتے ہی اندر سے پکار رہا تھا کہ

تم ہو اک زندۂ جاوید روایت کے چراغ
تم کوئی شام کا سورج ہو کہ ڈھل جاؤ گے

کٹھ پلے کے قدیم پل سے اتر کر میرس روڈ کی طرف مڑ جاتا ہوں تو الحاج عبید الرحمٰن خاں شیروانی مرحوم کی وسیع و عریض کوٹھی کے سامنے پہنچ کر خیال آیا کہ چلو اچھا ہوا ادھر سے داخل یونیورسٹی ہوا اور مرحوم کے ان در و دیوار نے زبانِ حال سے کہا،

"جاؤ فرزندِ علی گڑھ، تمہارا علی گڑھ اپنی جگہ محفوظ ہے"

وہاں سے تھوڑا آگے بڑھ کر عبداللہ ہال کے قدیم پھاٹک کے سامنے سے ہوتا ہوا چورا ہا پار کر کے جب میں اپنے میزبان اپنے تیس سالہ پرانے رفیق کے دروازے پر پہنچتا ہوں تو اپنے وقت کا ایک خاموش اور صدر درجہ محنتی طالب علم جو آج ایک عظیم الشان کوٹھی کے ساتھ ساتھ ایک کلینک کا بھی مالک ہے جہاں مریضوں کے ہجوم میں اس کے چہرے کو ڈھونڈنا مشکل ہوتا ہے، مجھے گلے لگا کر وہ محبت بھرا استقبال کرتا ہے تو مجھے اپنا علی گڑھ آج بھی محفوظ نظر آتا ہے۔ یہاں جس شہر میں میں رہتا ہوں وہاں تعلیم کی ابجد سے مبرا ہونے

---

* ریڈر، شعبۂ نباتیات، تری بھون یونیورسٹی، مہندرا کیمپس، نیپال گنج، نیپال

کے باوجود اگر کسی کے ایک چھوٹے سے کمرے میں آدھا فرش
بھی بچھا ہے تو اس کے دماغ عرش پر پہنچ جاتے ہیں۔ مجھے
اپنے علی گڑھ میں وسیع کمروں میں دیوار سے دیوار مخملی فرش سے ڈھکے
لق و دق گھروں میں علم کی بلندیوں کو چھونے والے اپنے ایسے
چمن سراپا اخلاص ملے جنھوں نے اپنی محبتوں کے خزانے
میرے لیے وا کر دیے۔ میزبان موصوف کے گھر سے
یونیورسٹی ڈائرکٹری سامنے رکھ کر اپنے زمانۂ طالب علمی کے
جس کسی فرد کو ٹیلی فون کرتا ہوں وہ نام نہیں تیس سال
بعد صرف آواز سن کر ملاقات کے لیے سراپا منتظر ہونے کا
مژدہ سناتے ہیں۔ میرا علی گڑھ محفوظ ہے۔ ٹیلی فون کا ایس ملانے
کے اس سلسلے میں اپنی ایک ہم سبق کو اس کے گھر پر فون کی
گھنٹی سنا کر فون اٹھانے پر جب اس کو اپنا نام بتائے بغیر
ہم سبق ہونے کا سال اور اپنے چند دیگر ہم سبقوں کا نام
لیتا ہوں تو میرا علی گڑھ اس خاتون کے سراپا میں نمودار
ہو کر کہتا ہے کہ دوسروں کا نام لینے کی چنداں ضرورت نہیں
ہے — تم خالد محمود ہو اور بس فوراً آجاؤ، میرا پتہ یہ
ہے۔ اپنی شریک زندگی اور دونوں بچوں کے ہمراہ جب
میں اس خوب صورت سنگ مرمر سے متشابہ دلفریب کوٹھی
پہ پہنچتا ہوں تو خاتون مذکور اپنے شوہر نامدار جو اس
وقت یونیورسٹی کے اہم ترین عہدوں میں سے ایک پر فائز
ہیں اس طرح ملتے ہیں گویا

آملیں گے سینہ چاکان چمن سے سینہ چاک

گل ہائے خلوص و محبت سے سراپا ڈھکا جب وہاں
سے نکل کر ایک اور ہم عصر کی رہائش گاہ کی تلاش میں میں
بھی اپنے اور اس جیسے بے شمار ان شہروں کو یاد کرنے
والا ہی تھا جہاں لوگ سطوہ گیری کی انتہا کو اپنی تنگیٔ وقت کا کوڑہ
لگا کر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ سائیکل پر جا رہے دو نوجوان
طالب علم سائیکل سے اتر کر سائیکل الگ کھڑی کر کے نہایت
ادب سے میری بیوی اور بچیوں سے دو دو ہٹ کر مجھے مخاطب
ہو کر کہتے ہیں؛

"آپ کو کس کے گھر کی تلاش ہے سر؟"

میں آب دیدہ ہو جاتا ہوں۔ مجھے اپنا علی گڑھ پورے کا پورا زندہ
جاوید نظر آ رہا تھا۔ دونوں کو پاس بلا کر فلاں صاحب کے نام
اور پتے کی تفصیلات بتاتا ہوں تو دونوں ایک دم حرکت
میں آ جاتے ہیں اور مجھے اسی جگہ کھڑے رہنے کی تقریباً
درخواست کر کے، سائیکل پر روانہ ہو جاتے ہیں اور پانچ منٹ
بعد آ کر کہتے ہیں؛

"چلیے سر! ہمارے ساتھ چلیے"

اور ان صاحب کے گھر پہنچ کر گھنٹی بجا کر ان کے باہر نکل آنے
تک رک کر با ادب سلام کر کے واپس لوٹ جاتے ہیں۔

شام کا دھندلکا خوش آمدید کہنے کو ہے۔ میں اہلیہ
اور دونوں بچوں کو لے کر مولانا آزاد لائبریری پہنچتا ہوں
صدر دروازے سے داخل ہوتے ہی سامنے سر سید کا
قوی ہیکل پورٹریٹ لگا ہے۔ دونوں بچوں کو داہنے بائیں
کھڑا کر کے کہتا ہوں۔ دیکھو، لگ رہا ہے یہ فرشتہ اپنے
دونوں پر کھولے تم کو دعوتِ داخلۂ یونیورسٹی دے رہا ہے
اور کہہ رہا ہے کہ آؤ میرے نووارد و آؤ۔ علم کے اس سمندر
سے ایک چلو بھر پانی بھی لے لوگے تو زندگی بھر مسرور رہوگے۔
بائیں ہاتھ پر وہی کشادہ نہایت روشن وسیع ریڈنگ
روم جس میں مجھے زندگی نظر آتی ہے ایک مادر علمی کے
زندہ ہونے کی مستند نشانی۔ جہاں کم و بیش ڈھائی تین سو
طلبا ایک ساتھ بیٹھے یوں خاموشی سے مصروف مطالعہ ہیں
گویا مسجد میں نمازی سر بسجود ہوں۔ اس خاموشی
بھرے ہال میں اگر کوئی آواز سنائی دے رہی ہے تو صفحات
کے الٹے جانے کی یا قلم کے صفحات پر دوڑنے کی۔

وہاں سے نکل کر بالکل سامنے محققین کے کام کا
کا وسیع کمرہ ہے جہاں موٹی موٹی کتابیں، تہذیب اور
حوالہ کتب کے صفحات پر ملت اسلامیہ کے نوجوان طلب

تحقیق و جستجو میں مصروف ہیں۔ ان افراد کی پہلی قطار میں ایک باریش طالب علم کو دیکھ کر بے ساختہ ذہن میں یہ قطعہ گونجنے لگتا ہے کہ

رہبری جو نہ کرتے تو شیخ جی اب بھی
جدید علم و تفکر سے بے خبر ہوتے
بڑا کرم ہے علی گڑھ کا ورنہ ملت میں
نہ فلسفی نہ محقق نہ ڈاکٹر ہوتے

اسی ہال سے ملحق دو رویہ زینوں سے چڑھ کر ہم اوپر پہنچتے ہیں۔ سامنے فخر مسلم یونیورسٹی اور فخر ہندوستان ڈاکٹر ذاکر حسین خاں سابق صدر جمہوریہ ہند کا بڑا سا فوٹو ہے۔ بولتی ہوئی آنکھیں میرے بچوں سے گویا مخاطب یوں ہیں:

"یہاں سے تمہاری وہ زندگی شروع ہوتی ہے
جہاں بہت کچھ سیکھو اور زیادہ نہ سیکھ سکنے پر
دلگیر ہونا سیکھو۔ یہاں فرماں برداری سیکھو،
اطاعت شعاری سیکھو، بڑوں کا ادب، ہم چشموں
کا ادب، چھوٹوں کا ادب اور خود اپنا ادب۔ سعادت
مندی اور وفا شعاری کے ساتھ خود اختیار
اس علمی بستی کے نظام کی پابندی کو عین آزادی سمجھو۔"

درس دیتی یہ خاموش تصویر گزشتہ تیس سال سے اسی طرح آویزاں ہے اور ہر نووارد کو عہد در عہد سبق دیتی آرہی ہے۔

اور اس کے بعد میں پہنچتا ہوں ایک ایسے دروازے پر جہاں ماضی کے کئی نقوش ابھر آتے ہیں۔ مجھے اپنی مادر علمی چھوڑے ہوئے پورے ۲۴ سال ہو گئے ہیں۔ تقریباً آٹھ سال قبل میری اسی مادر علمی کے ایک چشم و چراغ مجنوں نے آنکھیں ہی کھولیں اس علمی و تہذیبی بستی میں جب فارغ التحصیل ہو کر اعدا اپنی ہی درس گاہ میں تدریسی عہدے پر فائز ہوئے تو درس و تدریس کے اس کعبے سے باہر نکلے " تاکہ آباد کریں دل کے صنم خانے کو " تو میرے وطن کے ہی ایک علم و ادب کے اعلیٰ قدردان کے علم پرور اعلیٰ خانوادے کی بیٹی کو اپنی رفیق زندگی بنا کر لے گئے۔ ان نوجوان سراپا علیگ کے دروازے پر

کھڑا اس کی گزشتہ دنوں سے اپنے اور اپنے بیٹے کے داخلے کے سلسلے میں بے لوث محبت نے نہ جانے کیا کیا سوچنے پر مجبور کر ڈالا۔ کبھی سوچتا ہوں کہ عاشق کے لیے معشوق کا شہر شہر کی گلیاں، گلیوں کے کتے، کتوں کی دم میں لگی مٹی سب ہی عزیز ہوتے ہیں۔ اسی کسی زمرے میں میں بھی آتا ہوں گا یا پھر —

مکتب عشق کا دستور نرالا دیکھا
اس کو چھٹی نہ ملی جس کو سبق یاد ہوا

کے مصداق یہ موصوف کبھی آج تک چھٹی نہ پا سکے۔ داخلے سے متعلق ان کی ناقابل بیان دائمی سہولیات دیکھ کر میں اپنے بچوں کو پروفیسر حبیب اور پروفیسر بادشاہ حسن وغیرہم کے دور انتظامیہ کے کئی قصے سنا جاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ میرا علی گڑھ یقیناً زندہ ہے۔

رات اپنے میزبان کے گھر پہ بستر پہ لیٹ کر یادوں کے ایک لامتناہی سلسلے میں کھو جاتا ہوں، نیند اچاٹ ہو جاتی ہے۔ سوچتا ہوں کاش میلوں شہلوں میں ہفتوں صرف کرنے والی ہماری ملت اسلامیہ کا ہر فرد صرف اور زندگی میں صرف ایک بار اور وہ بھی جب اس کے بچے جوان ہو رہے ہوں، اس عظیم درس گاہ میں ایک دو دن گزار دیں تو ابلیس کو اپنے مشیروں سے یہ نہ کہنا پڑے کہ

'پختہ تر کر دے مزاج خانقاہی میں اسے'

اور مسلم نوجوان سرسید کے خوابوں کی تعبیر بن کر ایک سچا اور پکا مسلمان اور دوسری طرف وطن عزیز کا اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان بن کر فخر ملت اور فخر وطن ثابت ہوں۔ جن دوستوں نے علی گڑھ کے مٹنے کی خبریں دی تھیں ان کے لیے دل کہہ اٹھتا ہے کہ

منزل وہی ہے، راہ وہی، راہبر وہی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ارادے بدل گئے

اور اپنے سفر علی گڑھ کے تاثرات کو پوری طرح کوشش کے باوجود مکمل طور پر قلم بند نہیں کر سکا ہوں کیوں کہ

دلوں کا حال تو بین السطور لکھتے ہیں۔

اترپردیش کے پندرہ انٹر کالجوں اور دس ہائی اسکولوں میں

ایک سو پانچ ہونہار طالبات کو شیروانی انعامات ۱۹۹۳ء

بیگم نصرت شیروانی *

اترپردیش کے قریب بیس گرلز انٹر کالجوں اور ہائی اسکولوں سے ۱۹۹۳ء کے بورڈ امتحانات کے نتائج ستمبر کے آخر تک موصول ہوئے۔ الحاج بیگم تارا رشید شیروانی (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ و چیف انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے اپنے کالج یا اسکول میں بورڈ امتحان میں فرسٹ ڈویژن کے ساتھ پوزیشن لانے والی ایک سو پانچ ہونہار طالبات کے لیے شیروانی انعامات بھیجے گئے۔ بارہ اداروں میں سے شیروانی انعامات جیتنے والی چھیالیس ہونہار طالبات کے نام پہلے پیش کیے جا چکے ہیں۔ مزید تیرہ اداروں میں شیروانی انعامات جیتنے والی انسٹھ ہونہار طالبات کے نام اب پیش ہیں۔

حمیدیہ گرلز انٹر کالج۔ الہ آباد

ہائی اسکول

۱۔ کماری راحت چاند سلمہا۔ ۲۔ کماری طلعت فاطمہ سلمہا۔ ۳۔ کماری تبسم سلمہا۔ ۴۔ کماری عرشی خانم سلمہا۔ ۵۔ کماری ثمینہ نشاط سلمہا ۶۔ کماری نبیدہ خلیل سلمہا۔ ۷۔ کماری شہلا انصاری سلمہا۔

انٹر:

۱۔ کماری نور بانو سلمہا۔ ۲۔ کماری نجمہ بی بی سلمہا۔ ۳۔ کماری شبانہ سلمہا۔ ۴۔ کماری شہناز سلمہا۔ ۵۔ کماری سیدہ خاتون سلمہا

اسمٰعیل نیشنل گرلز انٹر کالج۔ میرٹھ

ہائی اسکول

۱۔ کماری رشمی اگروال سلمہا۔ ۲۔ کماری ناظمہ سلمہا۔ ۳۔ کماری پریا گوئل سلمہا۔

انٹر

۱۔ کماری صابرہ خاتون سلمہا۔ ۲۔ کماری نرگس جہاں سلمہا۔
۳۔ کماری رہناز سلمہا
۴۔ کماری شادانی سلمہا

* سکریٹری مسلم گرلز ایجوکیشن کمیٹی، اے ۱۵/۳، فیز ۱۔ ڈی ایل ایف قطب انکلیو، نیو گڑگاؤں، ہریانہ

مسلم جوبلی گرلز انٹر کالج - رام پور -

ہائی اسکول

۱- کماری نیلم کوثر سلمہا - ۲- کماری سیمیں اختر سلمہا -

۳ - کماری سیما نقوی سلمہا

انٹر

۱- کماری عینیہ خواجہ سلمہا - ۲- کماری نفیس فاطمہ

سلمہا - ۳- کماری سعدیہ عرفان سلمہا

بیگم خیر گرلز انٹر کالج - بستی

ہائی اسکول

۱- کماری ارجمند شاہینہ سلمہا - ۲- کماری سودامنی

مشرا سلمہا - ۳- کماری انجو اگوہری سلمہا - ۴- کماری

ممتا شکلا سلمہا -

انٹر

۱- کماری کنیز فاطمہ سلمہا - ۲- کماری سریتا

شرما سلمہا -

بھدوہی گرلز انٹر کالج - بھدوہی - وارانسی

ہائی اسکول

۱- کماری شیبا نصرت سلمہا -

انٹر

۱- کماری رخشاں انصاری سلمہا - ۲- کماری ستو

بانو سلمہا

آل احمد گرلز انٹر کالج - امروہہ - مرادآباد

ہائی اسکول

۱- کماری شائستہ ناظم سلمہا ۲- کماری نغمہ ناہید

سلمہا - ۳- کماری شاذیہ بانو سلمہا -

انٹر: ۱- کماری نازیہ بانو سلمہا -

نجیب الدولہ گرلز انٹر کالج نجیب آباد بجنور

ہائی اسکول

۱- کماری بشریٰ خاتون سلمہا -

انٹر - ۱- کماری عشرت جہاں سلمہا

نہرو گرلز انٹر کالج - رام پور -

ہائی اسکول

۱- کماری سریتا کپور سلمہا - ۲- کماری نسرین

افغان سلمہا -

انٹر

۱- کماری منور ماچوہان سلمہا

نیشنل گرلز انٹر کالج - شاہ جہاں پور

ہائی اسکول

۱- کماری ساجدہ بانو سلمہا - ۲- کماری فوزیہ

جلیل سلمہا - ۳- کماری نزہت شکیل سلمہا -

انٹر میں کوئی فرسٹ ڈویژن نہیں -

ابوالکلام آزاد گرلز انٹر کالج - لکھیم پور کھیری

ہائی اسکول

۱- کماری نازنین سلمہا

۲- کماری عذرا پروین سلمہا

۳- کماری عائشہ صدیقی سلمہا

انٹر میں کوئی فرسٹ ڈویژن نہیں -

شریمتی صغریٰ بیگم گرلز ہایر سکنڈری اسکول فیروزآباد

۱- کماری کوثر بانو سلمہا -

۲- کماری کہکشاں سلمہا

۳- کماری فرح اقبال سلمہا

گورنمنٹ گرلز ہائر سکنڈری اسکول حاتم سرائے - سنبھل

۱- کماری رحمت جہاں سلمہا -

۲ کماری زینت پروین سلمہا

۳- کماری عذرا پروین سلمہا -

قدوائی گرلز انٹر کالج - انجان شہید - اعظم گڑھ

۱- کماری انجمنا سلمہا - ۲- کماری فرحانہ خاتون

سلمہا - ۳- کماری ارم زہری سلمہا -

ان کے علاوہ جن مسلم گرلز اداروں سے ۱۹۹۳ء کے نتائج آئے ہیں ان کی ہونہار ترین طالبات کے لیے انعامات بھیجے جا رہے ہیں جن کے نام آئندہ رپورٹوں میں پیش کیے جائیں گے۔ البتہ اب بھی اترپردیش میں قریب پندرہ مسلم ہائی اسکول و انٹر کالج ایسے ہیں جن کی محترمہ پرنسپل صاحباؤں نے ابھی تک ۱۹۹۳ء کے نتائج نہیں بھیجے۔ ان سب سے التماس ہے کہ اب مزید تاخیر نہ کریں اور اپنے اپنے اسکول یا کالج کے ۱۹۹۳ء کے نتائج جلد از جلد بھیج دیں تاکہ ہونہار ترین طالبات کو انعام پیش کیے جا سکیں۔

انعامات سے بھی زیادہ اہم ہے نتائج کا تجزیہ کرنا اور پھر یہ جائزہ لینا کہ کہاں یعنی کون سے ضلع یا مقام کے کن کن مسلم ہائی اسکولوں اور انٹر کالجوں میں دونوں بورڈ امتحانات کی سطح پر مسلم طالبات کی تعلیم کو گزشتہ سترہ سال میں کتنا فروغ حاصل ہوا۔ یہ جائزہ نامکمل رہے گا جب تک اترپردیش کے سب مسلم گرلز ہائی اسکولوں اور انٹر کالجوں سے ۱۹۹۳ء کے نتائج نہ آ جائیں۔

"ہندوستان میں سرکاری تعلیم نے جو نقصانات ہمارے قومی خصائل و اعمال کو پہنچائے ہیں ان میں سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ تحصیل علم کا مقصد اعلیٰ ہماری نظروں سے محجوب ہوگیا ہے۔ علم خدا کی ایک پاک امانت ہے اور اس کو صرف اس لیے ڈھونڈھنا چاہیے کہ وہ علم ہے لیکن سرکاری یونیورسٹیوں نے ہم کو ایک دوسری راہ بتلائی ہے۔ وہ علم کا شوق اس لیے دلاتی ہیں کہ بلا اس کے سرکاری نوکری نہیں مل سکتی۔ علم کو علم کے لیے نہیں بلکہ معیشت کے لیے حاصل کیا جاتا ہے۔"

(مولانا آزاد)

ہماری ایجنسیاں

۱- میسرز بک امپوریم
سبزی باغ - پٹنہ - بہار۔

۲ میسرز مکتبہ معارف الاسلام
ریاض الدین امیر محمد
جمعیۃ کالونی، انصار محلہ، روم نمبر ۶۸
فورتھ نظام پورہ،
بھیونڈی ۴۲۱ ۳۰۲
تھانے، مہاراشٹر

۳- میسرز طالب حسین
ایف ڈی ہائر سکنڈری اسکول
کاٹھ دروازہ، مرادآباد ۲۴۴۰۰۱

۴- میسرز صدیق اختر انصاری
اردو نیوز پیپر ایجنٹ
وارث پورہ، کامٹی، ۴۴۱۰۰۱
مہاراشٹر۔

۵ میسرز زاہد حسین
جمال بک ڈپو
باری روڈ، گیا، ۸۲۳۰۰۱ بہار

۶- میسرز مکتبہ جامعہ لمیٹڈ
پرنسس بلڈنگ، ای آر روڈ
بمبئی - ۴۰۰۰۰۳ مہاراشٹر۔

۷- میسرز سکریٹری غالب لائبریری
محلہ بنیہ، فیروزآباد ۲۸۳۲۰۳ - یوپی

۸- میسرز مکتبہ عمر
بک سیلر اینڈ نیوز پیپرز
مدینہ مسجد کمپلکس،
میناکشی سرکل، بیجاپور ۵۸۶۱۰۱
کرناٹک

۹ میسرز ثنائی بک ڈپو
پرانا قلعہ، سیوان، بہار۔

۱۰- میسرز ایجوکیشنل بک ہاؤس
شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

۱۱- کتاب سینٹر
شمشاد مارکیٹ
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۱

۱۲ میسرز فردوسی کتاب گھر، بک سیلرز پبلشرز
بھوسپا چوک،
دھرواد، کرناٹک

۱۳ میسرز کتاب محل
تکیہ، اعظم گڑھ - یوپی

۱۴ میسرز عبدالقایم
اردو لائبریری، تحصیل گیٹ، گھنٹہ گھر،
بدایوں ۲۴۳ ۶۰۱ یوپی

۱۵۔ میسرز اسلامک بک سینٹر
جامعہ کمپلکس، ایم۔ آر روڈ
بنگلور۔ ۰۰۲ ۵۶۰ کرناٹک

۱۶۔ میسرز محمد شمیع
معرفت خورشید بک اسٹال
پارنواده، رانچی روڈ، نواده ۱۱۰ ۸۰۵ (بہار)

۱۷۔ میسرز کریسینٹ بکس
اردو بازار، دربھنگہ ۱۱۰ ۸۴۶۔ بہار

۱۸ میسرز مکتبہ اسلامی
مقابل بڑے میاں درگاہ، شاہ گنج اورنگ آباد۔

۱۹۔ میسرز اسلامی بک ڈپو بک سیلر اینڈ نیوز پیپر ایجنٹ
نیومارکیٹ، تاتار پور چوک، بھاگل پور ۸۱۲۰۰۲ بہار

۲۰۔ میسرز آزاد بک ڈپو
مین روڈ مدھوبنی، مدھوبنی، بہار

۲۱۔ میسرز النور بک ایجنسی
آئی۔ جے۔ صدیقی صاحب
مکان نمبر ۱۔ ۱۱۔ ۱۱۷
مستان پورا، ناندیڑ ۶۰۲ ۴۳۱
مہاراشٹر۔

میسرز ایم ایچ بک سیلر، ہول سیل اینڈ رٹیلر
لعل باغ، دربھنگہ ۰۰۴ ۸۴۶۔ بہار

میسرز ریان الحسن۔
ایجوکیشن سوسائٹی۔ مکان نمبر ۴۴۔ ۲۔ ۶
محلہ اسلام پورا، انگلی ڈرمل، ضلع عادل آباد۔

۲۴ میسرز سینٹرل نیوز ایجنسی پرائیویٹ لمیٹڈ
پوسٹ بکس نمبر ۳۰۴۴۔ نئی دہلی

۲۵ میسرز سلطان بک ڈپو
ڈیزائن اینڈ پورٹریٹ
بی۔ ایم اسکول
گیا۔ بہار

۲۶ میسرز راشد قریشی
۱۱-۴-۱۹۰/۹۱۴۔ سیکنڈ فلور۔ حیدرآباد۔

۲۷ میسرز محمد الیاس
نیوز پیپر ایجنٹ۔ ۲۱۳ کولوٹولہ اسٹریٹ، کلکتہ۔

۲۸ میسرز صابری کتاب گھر
صابری محل ٹیپا
شاہ آباد۔ گلبرگہ۔
کرناٹک

۲۹ میسرز گلشن مدنی کتب خانہ
۵۵۱، مولی نالہ
جبل پور مہاراشٹر

ایک مکمل ہیلتھ ٹانک، بلکہ اور بھی بہت کچھ!



سنکارا
آپ کی صحت کے لیے ایک بھرپور ٹانک

سنکارا لازمی عناصر، جڑی بوٹیوں اور وٹامنوں کا نادر مرکب ہے۔ اس میں آئرن، کیلشیم اور زنک کی کافی مقدار ہے۔ الکحل نہیں، سنکارا میں الکحل بالکل نہیں ہے۔ سنکارا آپ کی کس طرح مدد کرتا ہے؟

اسکول جانے والے بچوں کے لیے:
سنکارا ذہنی اور جسمانی نشوونما میں مدد کرتا ہے۔ اس کی وجہ ہے سنکارا میں موجود مقوی عناصر (بالخصوص زنک اور آئرن) جو دماغ کے خلیوں کو بڑی مقدار میں غذا فراہم کرتے ہیں۔ یہ قوتِ حافظہ کی اصلاح بھی کرتا ہے۔

حاملہ خواتین کے لیے:
سنکارا حاملہ خواتین اور دودھ پلانے والی ماؤں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس میں ماں اور بچے کی صحت کے لیے ضروری فولک ایسڈ، وٹامن بی ۱۲، آئرن، کیلشیم اور زنک کافی مقدار میں ہیں۔

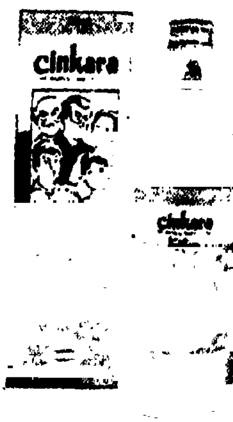
بالغوں کے لیے:
بھاگ دوڑ اور تناؤ بھری اس دنیا میں سنکارا مہلک امراض سے حفاظت کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ سنکارا دورانِ خون کو معمول کے مطابق کرنے اور جگر کے افعال میں کثافتوں کے جمع ہونے سے روکنے میں مدد کرتا ہے۔

ضعیفوں کے لیے:
سنکارا ضعیفوں کے لیے قابلِ مثال توانائی اور طاقت بحال کرنے والا ٹانک ہے۔ اختلاج میں کمی آجانے کے سبب پیدا ہونے والے امراض اور ضعیفی میں پریشانی کرنے والی بیماریوں سے حفاظت کرتا ہے۔ ان میں اکثر امراض کا سبب خراب اور غیر متناسب غذا ہے۔

تو آج ہی سنکارا لے آئیے۔ یہ پورے خاندان کے لیے قابلِ مثال صحت بخش ٹانک ہے۔

چند مشہور ٹانکوں میں موجود آئرن، کیلشیم، زنک اور الکحل کی مقدار (فی خوراک) کا موازنہ۔

Reputed brands of tonics	Iron (mg)	Calcium (mg)	Zinc (mg)	Alcohol content percent (V/V)	Contents per unit pack
1	–	12.4	–	12.00	400
2	–	–	–	11.0	240
3	8.00	–	–	–	454
4	13.00	–	–	–	200
5.	21.50	–	0.00002	5.5	200
6	16.700	–	–	–	300
7.	–	–	–	–	200
8.	7.00	–	4.50	–	100
9.	5.00	8.50	–	9.5	300
Cinkara	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]



لازمی غذائی عناصر، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا بھرپور مرکب

ہمدرد
سنکارا
مشہورِ عالم قدرتی ٹانک، ہر موسم میں سب کے لیے


بہارِ نو (بے بی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
شربت
نزلہ
زکام، نزلہ کے لئے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے پھنسی، خارش اور داد وغیرہ کی دوا
چند مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U. ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج
یونیورسٹی

Tahzibul Akhlaq January 1994 Regd. No L/ALG 27/93 Ph. : 24827

Litho Colour Printers Achal Tal, G T. Road, Aligarh Phone-24185

جو طاقِ حرم میں روشن ہے وہ شمع یہاں بھی جلتی ہے

الحکمۃ ضالۃ المؤمن

حکمت مومن کا کھویا مال ہے



فروری ۹۲ء

تہذیب الاخلاق

٭ مجلس ادارت ٭

٭ اغراض و مقاصد ٭

۱. جہل، رجعت پسندی اور جور فریبی کے خلاف جدوجہد، ذہنی بیداری، دانشوری اور مربوط فکری کی روایت کا احیاء۔ ماضی شناسی، حال آگہی اور مستقبل بینی کی دعوت۔ ۲. مذہب، تہذیب، اخلاق، انسانی اقدار اور تعلیم کے زیادہ جامع زیادہ ہمہ گیر اور زیادہ معنی خیز تصورات کی ترویج و اشاعت ۳. ملک کے مختلف مذہبی فرقوں میں باہمی ربط، اتحاد کا فروغ اور اردو ہندی کو قریب تر کرنے کی کوشش۔ ۴. ملک بالخصوص مسلم اقلیت کی تعلیمی اور ثقافتی ترقی۔ ۵. ذہنی بیداری اور روشن خیالی کے نمو میں سائنسی علوم کی تحصیل اور تخلیق کی اہمیت کا چرچا ۶. سائنسی علوم فنون اور جدید علمی انکشافات کی عام فہم زبان میں اشاعت ۷. علوم و فنون اور تمدن کے فروغ میں ہندوستانیوں اور مسلمانوں کے کارناموں کا تعارف

٭ مقالہ نگاروں کیلیے ٭

تہذیب الاخلاق کے اغراض و مقاصد سے مطابقت رکھنے والے مضامین ہی قابل قبول ہوں گے۔

عام فہم سائنسی، سماجی، اصلاحی، اخلاقی اور تعلیمی امور سے متعلق مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔

ناول، افسانہ، نظم، غزل اور خالص ادبی مقالہ ارسال کرنے کی زحمت نہ فرمایں۔

مختصر مقالوں کو ترجیح دی جائے گی۔ کتابوں پر تبصرے شائع نہیں کیے جائیں گے۔

مسودہ ٹرسے سائز 20 cm x 30 cm کے سفید کاغذ پر صرف ایک طرف دور دور سطروں میں صاف صاف تحریر ہو گنجان اور ناصاف مسودات رد کر دیئے جائیں گے۔

مقالہ میں وضاحت کے لیے دی جانے والی تصویریں اور شکلیں الگ سے دی جائیں شکلیں ٹریسنگ پیپر پر سیاہ روشنائی سے بنی ہوں اور ممکنہ حد تک مختصر سائز میں ہوں تصویروں اور شکلوں پر ترتیب وار نمبر پڑے ہوں اور تحریری مسودے کے حاشیے میں ان مقامات کی نشاندہی کر دی جائے جہاں انہیں لگانا ہو۔

اشاعت کی غرض سے آنے والے کسی بھی مقالے کو بغیر وجہ بتائے رد کیا جا سکتا ہے۔ باہر سے آنے والے صرف انھیں مقالوں کو واپس کیا جائے گا جن کے ساتھ پتہ لکھا مع ٹکٹ لفافہ بھی ہو۔

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

شمارہ ۲ — جلد ۱۳

فروری ۱۹۹۴ء

بانی ... سرسید احمد خاںؒ

* سرپرست *

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

وائس چانسلر اور صدر تہذیب الاخلاق ٹرسٹ

مدیر

کبیر احمد جائسی

ترسیل زر : Phone. 401027

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اینڈ نشانات

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

Editor, TAHZIBUL AKHLAQ & NISHANT,

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH. 202002

زر سالانہ :

انڈیا Rs. 45·00

بیرونی ممالک US $ 20·00 ہوائی ڈاک

عام ڈاک US $ 8·00

مندرجات

مالک: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ پبلشر: کبیر احمد جائسی۔ مقامِ اشاعت: ادارہ تہذیب الاخلاق اینڈ نشانت علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ پریس: اے ایم یو پریس، علی گڑھ

اداریہ

صبر، ضبط، تحمل، برداشت، نظم وضبط اور بے نفسی کو بھٹی میں تپ کر کندن بن کر دمکنے کا مہینہ آگیا۔ خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کو اپنی زندگی میں ایک بار پھر سحر و افطار اور تلاوت و تراویح کے اہتمام کا موقع ملا۔ زندگی میں سب کچھ وہی ہوگا جو اس سے پہلے تھا، وہی سحر خیزی ہوگی، نماز اور تلاوت کی پابندی ہوگی، وہی غذائیں ہوں گی وہی سونا اور جاگنا ہوگا مگر ہر چیز کا لطف کچھ دوسرا ہی ہوگا۔ وہ لطف جس کو صرف روزہ دار ہی محسوس کرسکتا ہے کوئی دوسرا نہیں۔

روزہ ہے کیا؟ یہ وہ اختیاری ترک ہے جو بندہ صرف اپنے رب کے لیے کرتا ہے یعنی بندہ اپنی تمام جسمانی خواہشات کو اللہ کے حکم سے ایک متعین وقت تک نہ صرف یہ کہ دبائے رکھتا ہے بلکہ کوشش کرتا ہے کہ اُن کی طرف نہ اس کا دل راغب ہو نہ ہی نظر۔ پیاس کا غلبہ ہے، سامنے پانی موجود ہے اور اللہ کے سوا کوئی دیکھنے والا بھی نہیں ہے مگر کیا مجال جو روزہ دار کے دل میں ایک لمحے کے لیے بھی ایک قطرہ پانی حلق سے اُتار لینے کا خیال آجائے۔ یہی حال غذا اور دوسری خواہشات کا ہے۔ بندہ کو پورا پورا موقع حاصل ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی تکمیل کرلے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو، مگر بندہ تو ایک عہد میں بندھا ہوا ہے، اس نے اپنے رب کے سامنے مکمل سپردگی کر رکھی ہے وہ اپنی ہر خواہش اور ہر ضرورت کو اپنے عہد پر قربان کردیتا ہے مگر اپنی سپردگی سے سرمو انحراف نہیں کرتا۔ یہ اُن روزہ داروں کا روزہ ہے جو روزے کی روح سے آشنا ہیں جو اِس راز سے واقف ہیں کہ اُن کا رب اُن سے کیوں روزے رکھوا رہا ہے اور اس سے اس کا مقصد کیا ہے؟

افسوس ہے کہ ایک دوسری طرح کا روزہ بھی ہمارے سماج میں رائج ہوگیا ہے جس کو سمجھا تو روزہ جاتا ہے مگر وہ روزے کی اصل روح اور مقصد سے عاری ہوتا ہے۔ ہم میں سے بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں کہ روزہ تو وہ پورے مہینے کا رکھتے ہیں، نمازوں کی

پابندی بھی کرتے ہیں، تراویح کا بھی اہتمام رکھتے ہیں مگر روزہ رکھ کر بھی بداخلاقی، غصہ ور، بے آپ اور تنک چڑھے ہو جاتے ہیں۔ روزہ کی حالت میں بات بات پر غصہ گرمی دکھانا گھر اور باہر جس پر بس میں ہے اس کو ڈنڈ منتر لگا دینا۔ ذرا ذرا سی غلطیوں پر چھوٹے چھوٹے بچوں کو پیٹتے پیٹتے ادھ مرا کر دینا، گھر کی ذرا سی بے نظمی پر غصہ اور طیش میں آکر سارے گھر والوں کو عذاب میں مبتلا کر دینا، روزہ دار تاجروں کا ڈنڈی مارنے سے گریز نہ کرنا اور روزہ دار خریدار کا بے ایمانی سے دکان دار کو جھانسہ دے کر اس کا کوئی مال اڑا لینا ہماری سماجی زندگی میں بڑی حد تک در آیا ہے۔ اس طرح کا روزہ، روزے کی اصل روح کو مجروح کرتا ہے اور شاید اسی طرح کے روزے کو فاقہ کرنا کہا گیا ہے۔

روزہ اللہ کی خوشنودی حاصل کرنے کا بندے کا عمل ہے۔ وہی اللہ جو رحیم ہے کریم ہے، رحمٰن ہے۔ وہی اللہ جس کی رحمت اس کے قہر پر غالب ہے، اسی کے بندے رمضان المبارک میں جب عبدالکریم اور عبدالرحیم بننے کے بجائے عبدالقاہر بن جائیں گے تو کیا اس کی خوشنودی خاک حاصل ہوگی؟ جب اللہ تعالیٰ اپنی رحمت پر، اپنے کرم پر اپنے قہر کو غالب نہیں ہونے دیتا تو بندے کو اس بات کا حق کہاں سے مل گیا کہ وہ اپنے خلق پر اپنے قہر کو غالب آجانے دے۔ روزے میں بدمزاجی، تلخ کلامی، بداخلاقی، بری عادتوں کا اظہار حدود اللہ کو توڑنے کے مترادف ہے۔ حدود اللہ کو توڑنے والوں کا جو انجام ہوتا ہے وہ اتنا واضح و روشن ہے کہ اس پر کسی اظہارِ خیال کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

خدا کرے کہ اس سال کے رمضان المبارک میں ہم صحیح اور حقیقی روزہ رکھنے پر قادر ہو سکیں اور ان تمام باتوں سے نہ صرف گریز کریں بلکہ متنفر ہو جائیں جو حدود اللہ کو توڑنے کے مترادف ہیں۔ اللہ کی پناہ اس روزے سے جو اس کی بارگاہ میں روزہ نہیں فاقہ شمار کیا جائے۔

کبیر احمد جائسی

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۳ - شمارہ ۲ (فروری ۱۹۹۴ء)

روزِ قیامت کیا
ہمارے اعمال مجسم صورت اختیار کرلیں گے؟

سید کاظم نقوی *

یہ سوال ذہنوں میں کھٹکتا ہے کہ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ روزِ قیامت ہمارے اعمال میں جان پڑ جائے اور ہمارا ہر عمل کسی اپنے مناسب شکل و صورت میں مجسم ہو جائے؟

عالمِ آخرت کی زندگی ہماری دنیاوی زندگی سے بالکل مختلف ہے۔ اُس کے خصوصیات یہاں کی زندگی کے خصوصیات سے جداگانہ ہیں۔ اُس کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی ہے کہ ہمارے اعمال وہاں مجسّم شکل و صورت اختیار کرلیں گے۔

اس دنیا میں جہاں ہم زندگی بسر کر رہے ہیں ہمارے افعال و اعمال، ہمارے حرکات و سکنات جلدی جلدی نگاہوں کے سامنے سے گزر جاتے ہیں۔ وہ وجود میں آکر بظاہر نیست و نابود ہو جاتے ہیں ان میں ثبات و قرار نہیں ہے۔ بے شک ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی ماہر اور موقع شناس فوٹو گرافر اُس جگہ موجود ہو جہاں کوئی شخص کسی جرم کا ارتکاب کر رہا ہو۔ ظاہر ہے کہ ہر جرم کے کچھ خاص مراحل ہوتے ہیں۔ ایسا ممکن ہے کہ کوئی بابصیرت اور سمجھ دار مصوّر مرحلہ بہ مرحلہ کسی جرم کی بولتی ہوئی تصویریں کھینچ لے یا کسی شخص کی باتوں کو ٹیپ کرلے۔ اس طرح سے وہ کسی جرم یا کسی گفتگو میں دوام کا رنگ بھر دے لیکن جہاں تک اس جرم اور گفتگو کا تعلق ہے وہ بہر حال چند سکنڈ میں انجام پاکر فنا کے سپرد ہو گئی، اس کی ذات باقی نہیں رہی لیکن یہی ہمارے اچھے اور بُرے افعال و اعمال، یہی ہماری زبان سے نکلے ہوئے الفاظ جو عالمِ وجود میں آکر بظاہر نیست و نابود ہو گئے، یہاں تک کہ وہ جس مختصر وقت میں موجود بھی تھے تو اُن کا وجود ہمارے وجود سے وابستہ تھا۔ بغیر ہمارے وہ مستقل طور پر موجود نہیں تھے، روزِ قیامت مستقل موجودات کی شکل اختیار کرلیں گے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ وہ اسی دنیا میں ہمارے ساتھ ساتھ رہیں اور ہم سے علیحدہ نہ ہوں۔

ظلم و جور، زیادتی اور ناانصافی روزِ قیامت ایک کالے بادل کی شکل میں نمایاں ہوگی جو ہمیں اپنے گھیرے میں لے لے گی۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

الظلم ھو الظلمات یوم القیامۃ

(سفینۃ البحار، مادّہ ظلم)

یتیموں کا مال جو لوگ ناجائز طریقوں سے کھا لیتے ہیں اُسے وہ قیامت کے دن آگ کے شعلوں کی صورت میں دکھائی دے گا۔ قرآن مجید میں ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا
إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا (نساء - ۱۰)

---

* پروفیسر، سابق صدر شعبۂ دینیات شیعہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

[جو لوگ یتیموں کا مال ظلم و زیادتی کرتے ہوئے کھا جاتے ہیں، وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں]

ہماری اس دنیا میں کسی کا ایمان دکھائی نہیں دیتا ہے مگر روزِ قیامت ایک روشنی اور نور کی شکل میں ظاہر ہوگا۔

یوم تری المومنین والمؤمنات یسعیٰ
نورھم بین ایدیھم و بایمانھم
[حدید — ۱۲]

[وہ دن کہ جب تم مومن مردوں اور مومن عورتوں کو اس طرح دیکھو گے کہ ان کا نور ان کے سامنے اور ان کے داہنی طرف ان کے ساتھ ساتھ چل رہا ہوگا]۔

خلاصہ روزِ قیامت ہمارے تمام کام جو ہم نے اس دنیا میں انجام دیے ہیں، کسی ایسی شکل میں نمایاں ہوں گے جو اُن کے لیے مناسب ہو۔

ایسا بھی ہوگا کہ عملی کیفیات روحانی اور جسمانی کیفیات میں تبدیل ہو جائیں گے۔ مثلاً وہ لوگ کہ جو سود کھا کر اپنے اس ظالمانہ اور غیر انسانی عمل کے ذریعے سماج کا اقتصادی توازن بگاڑ دیتے ہیں روزِ قیامت ایسے بیماروں کی شکل میں نظر آئیں گے جنھیں مرگی کا دورہ پڑتا ہو، جو زمین سے ڈگمگاتے ہوئے اُٹھتے اور اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکتے ہوں۔

الذین یاکلون الربا لایقومون الاکما یقوم
الذی یتخبطہُ الشیطان من المس۔
(بقرہ — ۲۷۵)

[جو لوگ سود کھاتے ہیں وہ قیامت میں کھڑے نہ ہو سکیں گے مگر اس شخص کی طرح کھڑے ہوں گے جس کو شیطان نے لپٹ کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو]۔

کنجوس، ذخیرہ اندوز اور دولت مند لوگوں کا کام یہ ہے کہ وہ برابر مال جمع کرتے رہتے ہیں۔ وہ غریبوں، ضرورت مندوں، محتاجوں اور بھوکوں کے بیچ میں رہتے ہیں لیکن انھیں رتی بھر ترس نہیں آتا۔ وہ خود کبھی اپنے اموال سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ وہ یہی پسند کرتے ہیں کہ ہمیشہ ہمیں اُنھیں بچا بچا کے رکھتے رہیں۔ زندگی بھر اُن کی ہر قسم کی ذمہ داری کا بوجھ اپنے کاندھوں پر لادے رہیں۔ خود مر کر دنیا سے چلے جائیں اور انھیں دوسروں کے فائدہ اُٹھانے کے لیے چھوڑ جائیں یہی اموال روزِ قیامت بھاری بھاری طوقوں کی شکل اختیار کر لیں گے۔ انھیں ان کی گردنوں میں ڈال دیا جائے گا اور وہ ان کے ساتھ کوئی کام کبھی نہیں کر سکیں گے، جیسا کہ قرآن مجید فرماتا ہے :

سیطوقون ما بخلوا بہ یوم القیامۃ
(آل عمران ۱۸۰)

ان آیتوں میں لوگوں کے خاص خاص کاموں کے متعلق اشارہ کیا گیا ہے کہ وہ روزِ قیامت مجسم صورت اختیار کر لیں گے۔ ان کے علاوہ قرآن مجید کی مختلف آیتوں میں کسی خاص عمل کی بابت نہیں بلکہ کلیہ کے طور پر اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے:

۱۔ ووجدوا ما عملوا حاضرا
(کہف — ۴۹)

[وہ روزِ قیامت اپنے اعمال کو اپنے سامنے پائیں گے]۔

حقیقت یہ ہے کہ لوگ جو سزائیں بھی بھگتیں گے، وہ اُنہی کے اعمال کا نتیجہ ہوگا۔ اسی لیے اس فقرے کے بعد بلا فاصلہ قرآن کریم توجہ دلاتا ہے۔

ولا یظلم ربک احدا۔

[تمہارا پروردگار کسی شخص پر ظلم نہیں کرتا ہے]

ب وبدا لھم سیئات ما عملوا وحاق۔

فھو ما کانوا بہ یستھزؤن ۔ (جاثیہ ۔۳۳)
[اُن کی بداعمالیاں ان کی آنکھوں کے سامنے آجائیں گی اور جن سزاؤں کا وہ دنیا میں مذاق اُڑایا کرتے تھے وہی اُن کا دامن پکڑے ہوگی]۔

ج یومئذ یصدر الناس اشتاتاً لیروا اعمالھم ۔ (زلزال ۔ ۶)
[اس دن لوگ بہت سی ٹولیوں میں نکلیں گے تاکہ ان کے اعمال انھیں دکھلائے جائیں]۔
فمن یعمل مثقال ذرۃ خیراً یرہ و من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ ۔
(زلزال ۔ ۷)
[جو شخص ذرہ برابر اچھا کام کرے وہ اس کے سامنے آئے گا ۔ اسی طرح جو شخص ایک ذرے کے برابر بُرا کام کرے، وہ اُس کو بھی دیکھے گا]۔

اِس آیت سے صاف پتہ چل رہا ہے کہ انسان خود اپنے اچھے اور بُرے عمل کو دیکھے گا، نہ کہ اُس کی سزا کو۔

یہی بات دوسری آیتوں میں بھی کہی گئی ہے ۔ یقیناً ایسا ہوسکتا ہے کہ اِن تمام آیتوں کا یہی مطلب ہو کہ لوگ اپنے گناہوں کی سزا اور اُن کے نتائج کا مشاہدہ کریں گے، لیکن یہ بھی مانی ہوئی بات ہے کہ یہ مطلب اِن آیتوں کے ظاہری مفہوم کے خلاف ہے اور اس کا شاہد بھی موجود نہیں ہے۔

اس کے علاوہ کتب حدیث میں ایسی روایات بھی موجود ہیں جن سے پتہ چلتا ہے کہ ان آیتوں کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قیامت کے دن لوگ اپنے اعمال کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھیں گے، بلکہ مقصود یہی ہے کہ اُن کے تمام اچھے اور بُرے کام مجسم صورت اختیار کریں گے۔

آیا ہمارے کام مجسم بن سکتے ہیں ؟

جو اہم سوال اِس مقام پر ہمارے دماغوں میں پیدا ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ آیا علم اور سائنس کی رو سے ایسا ہو سکتا ہے کہ ہمارے کام کسی وقت بھی مجسم شکل و صورت اختیار کریں ؟

اِس سوال کے جواب کے لیے پہلے چند مختصر باتوں کی طرف متوجہ ہونا ضروری ہے ۔

۱۔ تمام تعلیم یافتہ لوگ یہ جانتے ہیں کہ دنیا مادے اور انرجی کا ملا جلا ایک روپ ہے، زمین و آسمان میں ہر طرف ان ہی دونوں چیزوں کی جھلک نظر آتی ہے جو ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو ہیں ۔

ایک زمانے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ ان دونوں کے درمیان ایک ایسی دیوار کھڑی ہے جس کو لانگھا نہیں جاسکتا ۔ مادّہ ہمیشہ سے مادہ تھا اور مادہ ہی رہے گا ۔ یہی نوعیت انرجی کی بھی ہے لیکن سائنس کے آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اس عالم رنگ و بو کی ان دو بنیادی چیزوں کے بعض چھپے ہوئے خصوصیات کا پتہ چلا ہے ۔ اب تحقیق ہوئی ہے کہ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی بہت پرانی رشتہ دار ہیں۔

ایک وقت میں ایٹم کو اس مادی دنیا کی آخری سرحد خیال کیا جاتا تھا ۔ یہ ایک ایسا قلعہ تھا جو علم اور سائنس کے لیے ناقابل تسخیر سمجھا جاتا تھا لیکن ایک زمانہ آیا کہ اس کو فتح کرلیا گیا اور پتہ چلا کہ وہ عالم مادہ کی آخری سرحد نہیں، بلکہ وہ بھی چند چیزوں سے مل کر بنا ہے مگر اس کا دل چیرنے کے بعد سائنس کے ہاتھ میں بس انرجی ہی انرجی آئی ۔ معلوم ہوا کہ ایٹم سمٹی ہوئی انرجی کے علاوہ کوئی دوسری چیز نہیں ہے ۔ اس طرح یہ انکشاف ہوا کہ مادّے کا انرجی کی شکل میں تبدیل ہو جانا ایک ایسی چیز ہے جو ہو چکی ہے ۔

پڑھے لکھے لوگ جانتے ہیں کہ ریڈیو ایکٹیو (Radioactive) اجسام اپنے معمولی اور

عام حالات میں ملائیں کرنیں پھیلاتے ہیں۔ اس کے معنیٰ یہ ہیں کہ اُن کا مادہ بوسیدہ ہو رہا اور سڑ گل رہا ہے، وہ انرجی کی شکل میں تبدیل ہو رہا ہے۔

اس بات سے پتہ چلا کہ ایٹم کی سود کو توڑنے کے لیے ہر جگہ طاقت ور ایٹمی آلات کی ضرورت نہیں ہے۔ بلکہ اس دنیا کے بہت سے ایٹم خود بخود لیکن دھیرے دھیرے ٹوٹ پھوٹ رہے ہیں۔ یہ مسئلہ کا ایک رُخ تھا۔

اس کا دوسرا رُخ یہ ہے کہ آیا ایسا ہو سکتا ہے کہ جس طرح مادہ انرجی کی شکل میں تبدیل ہو جاتا ہے، اُسی طرح انرجی بھی مادے کی صورت میں تبدیل ہو جائے یا نہیں؟

یہ ٹھیک ہے کہ ابھی تک علم اور سائنس یہ کام نہیں کر سکا ہے لیکن یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا جب کہ ان دونوں کو ایک دوسرے کا قریبی رشتہ دار سمجھنا چاہیے بلکہ ایک ہی حقیقت کے دو روپ ہیں۔ اس صورت حال میں ان میں سے ہر ایک کا دوسرے کی شکل میں تبدیل ہو جانا ایسی بات نہیں ہے جو ہماری سمجھ میں نہ آئے۔ اس لیے اس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے کہ انرجی مادے کی شکل اختیار کر لے۔

۲۔ ہمارے کام درحقیقت انرجی ہی کی مختلف شکلیں ہیں۔ ہماری یہ بات چیت کیا ہے؟ آواز کی انرجی جو ہماری زبان اور ہمارے ہونٹوں کی انرجیوں کے ساتھ مل گئی ہے۔ وہ دماغ کی انرجی کا بھی سہارا لیتی ہے۔

ہماری تمام حرکتیں، ہمارے تمام اچھے اور بُرے کام، ظلم و انصاف، سخاوت اور کنجوسی، عبادت اور اطاعت انرجی ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔

ایک غلط فہمی اور اس کا ازالہ

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ یہی طرح طرح کی چیزیں جنھیں ہم کھاتے ہیں، وہ ہمارے جسموں کے اندر مختلف انرجیوں کی شکل میں تبدیل ہو کر اس طرح نمایاں ہوتی ہیں کہ اُن ہی کو ہمارے افعال و اعمال کے نام سے یاد کیا جاتا ہے حالانکہ یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ مادے کا انرجی میں تبدیل ہونا ایٹم کے ٹوٹنے یا ریڈیو ایکٹیو اجسام میں ایٹمی کرنوں کے پھوٹنے سے مخصوص نہیں ہے۔

اب یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ ہماری غذائیں ہماری غذائیں ہمارے جسموں کا ایندھن ہیں اور وہ ہمارے ان ہی جسموں کی مشین میں انرجی کی شکل اختیار کرتی ہیں، اس کا کیا مطلب ہے؟

اس سوال کا جواب مشکل نہیں، بلکہ آسان ہے، کیونکہ ہمارے بدن کے تمام دوسری مشینوں کی طرح ایک انرجی دوسری انرجی کی شکل میں تبدیل ہوا کرتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا ہے کہ مادہ انرجی کی صورت میں تبدیل ہو جاتا ہو۔

اس کی وضاحت یہ ہے کہ عام طور پر جب کسی چیز کا کیمیاوی Chemical تجزیہ ہوتا یا وہ کئی چیزوں سے مل کر بنتی ہے تو اس صورت میں وہ کسی ایک انرجی کی مالک ہو جاتی ہے یا کسی انرجی کو کھو بیٹھتی ہے۔ مثلاً جب کسی سوکھی لکڑی میں ماچس لگاتے ہیں تو اس کے اندر جو کاربن (Carbon) موجود ہے وہ ہوا کے آکسیجن (Oxygen) کے ساتھ مل جاتا ہے۔ وہ حرارتی انرجی آزاد ہو جاتی ہے جس کو اس نے سالہا سال کی طولانی مدت میں اپنے ولد کے اندر کاربن حاصل کرنے کے دوران اکٹھا کیا تھا۔ اُس وقت ایسا نہیں ہوتا کہ درخت کے کاربن یا ہوا کے آکسیجن کا کوئی حصہ انرجی سے تبدیل ہو۔

اب ہم ایسا کر سکتے ہیں کہ اس حرارتی انرجی کو پانی سے بھری ہوئی کسی پتیلی کے پیندے کے نیچے رکھ کر اسے بھاپ

کی شکل میں تبدیل کر دیں اور اس بھاپ کی طاقت سے پکھ پہیے گھومنے لگیں۔ غور فرمایا آپ نے کہ یہاں کیا ہوا؟ ہوا یہ کہ گرمی کی انرجی نے حرکت کی انرجی کا روپ اختیار کر لیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہی بھاپ کوئی دباؤ پا کر کسی نلی کو طے کر کے ایک دھماکہ پیدا کر دے۔ اس کے معنیٰ یہ ہوئے کہ گرمی کی انرجی آواز کی انرجی میں تبدیل ہو گئی۔

ان تمام مذکورہ حالتوں میں ایسا نہیں ہوا ہے کہ مادہ میں سے کچھ کم ہو گیا ہو، مادوں کی مقدار جوں کی توں اپنی جگہ برقرار ہے، بلکہ ہوا یہ کہ مادّوں کے اندر جو انرجی اکٹھا تھی اس نے اپنی شکل تبدیل کر دی۔

بعینہٖ یہی صورت ہمارے ان غذائی مادّوں کی بھی ہے جو ہمارے جسموں کے اندر پہنچ گئے ہیں، کیوں کہ ہوتا یہ ہے کہ یہ غذائی مادے آکسیجن کے ساتھ مل جل کر رہتے ہیں ان کے اس میل جول کے نتیجے میں گرمی کی انرجی آزاد ہو کر حرکت اور آواز وغیرہ کا بھیس بدل لیتی ہے۔

ہم جو کام کرتے اور ہمارے زبان و دہن سے جو آوازیں نکلتی ہیں، وہ بھانت بھانت کی انرجیوں کی شکل اختیار کر کے ہماری ارد گرد کی فضاؤں میں پھیل جاتی ہیں، اُن کی چھاپ ہمارے جسموں پر، اُن گھروں کے در و دیوار پر جن میں ہم رہتے ہیں، اُس زمین پر جہاں ہم زندگی بسر کرتے ہیں پڑ جاتی ہے، عارضی نہیں، دائمی چھاپ جو کبھی فنا نہیں ہوتی بلکہ اس نیچرل دنیا کے فایل میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتی ہے، یہاں فنا اور نیست و نابود ہونے کا کوئی مفہوم نہیں ہے، بس اس کی شکل کا بدلنا ممکن ہے۔

آخر کار ایک دن آئے گا کہ یہ انرجیاں جو بظاہر خاموش اور فراموش ہو گئی ہیں، اکٹھا کی جائیں گی وہ دوبارہ زندہ ہو کر نمایاں ہو جائیں گی اور بتائیں گی کہ وہ فنا نہیں ہوئی ہیں۔

کبھی کبھی یہ بات ہمارے سائنس میں پڑتی ہے کہ کوئی مشین ایسی ایجاد ہو گئی ہے یا ایجاد ہونے والی ہے جو اُن چوروں کے کرتوت کا فوٹو لے سکتی ہے جو چوری کی کہیں واردات کر کے وہاں سے صحیح و سالم طور پر بھاگنے میں کامیاب ہو گئے، یعنی بظاہر اس خالی جگہ اور فضا کی تصویر جہاں اب چور موجود نہیں ہیں اور نہ اب وہ وہاں کوئی کام کر رہے ہیں کیوں کہ وہ کرنیں یا لہریں کہ فزکس میں جن کا نام انفرا ریڈ (Infra Red Rays) ہے اُن کے جسموں کی گرمی کا روپ اختیار کرنے کے بعد اپنی جگہ موجود ہیں اور ان کی تصویر کھینچی جا سکتی ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ مان لینے کے بعد کہ انرجی مادّے کی شکل میں تبدیل ہو سکتی ہے، یہ گتھی بآسانی سلجھ جاتی ہے کہ روزِ قیامت ہمارے کام مادّی موجودات کی صورت اختیار کر لیں گے۔ اس بنا پر سائنسی نقطۂ نظر سے یہ بات ماننے کے قابل ہے کہ ہمارے کام جہانی شکل میں تبدیل ہو سکتے ہیں۔ اس بات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ عالمِ آخرت کی زندگی اور اس دنیا کی زندگی کے درمیان کتنا فرق ہے۔

غور کیجیے کہ اگر اسی دنیاوی زندگی میں ایسا ہوتا کہ ہمارے کام مادّی موجودات کی شکل اختیار کر لیتے، مثلاً خدانخواستہ ہم نے کسی شخص کو جو گالی دی یا کوئی دوسری جو نامناسب بات اس کے لیے کہی ہے ایک خطرناک بچھو کی شکل میں تبدیل ہو کر ہمیشہ ہمارے ساتھ ساتھ رینگتا رہتا یا اس کے بعد ایک کالا کالا دھبہ ہمارے چہرے پر نمودار ہو جاتا۔ ہم نے کسی کمزور اور بے قصور شخص کے منہ پر جو طمانچہ مارا یا کسی مظلوم آدمی کا حق چھینا ہے وہ اگر ایسے جانوروں کی صورت اختیار کر لیتا جن سے لوگوں کو گھن آتی ہے تو سماج میں ہمیں پھر کن نگاہوں سے دیکھا جاتا؟

ممکن ہے کہ یہ کہا جائے کہ اگر ایسا ہوتا تو بہت اچھا ہوتا کیوں کہ ایسی صورت میں ہم ٹھیک سنبھل کے راستہ چلتے، بے راہ روی ترک کر کے ٹھیک راستے پر چلتے

قدم آجاتے، بلکہ بڑی تیزی سے ہر لوگ اچھے اچھے کام کرنے لگتے۔ انسانی سماج کا حلیہ بدل جاتا، اخلاقی عیوب اپنا بوریا بستر باندھ کر رخصت ہوجاتے۔

لیکن یہ ملحوظ خاطر رہے کہ ایسی صورت میں ہماری روح کوئی ترقی نہ کرسکتی۔ ہمارے نفس میں کوئی بلندی نہ پیدا ہوتی بلکہ ہم لوگ اس طرح سے مجبور ہوکر زندگی بسر کرتے جیسے مجبور ہوکر۔ تمام لوگ اس شخص کے مانند ہوجاتے جسے کار خیر کے لیے مجبور کیا جائے۔ اس سے زبردستی کوئی اسکول کھلوایا جائے، کسی یتیم خانے میں چندہ دلوایا جائے۔ کھلی ہوئی بات ہے کہ مجبور ہوکر کسی اچھے کام کے انجام دینے کے بعد نہ روح میں مزید بلندی پیدا ہوتی اور نہ انسان کی اخلاقی سطح اونچی ہوتی ہے۔ اسی لیے اسلام نے اس سلسلے میں صرف انسانی عقل وفہم کو محرک خیر قرار دیا ہے۔ اس نے فقط خدا کی طرف کے رہنماؤں کے بلند تعلیمات پر اکتفا کی ہے۔

بہرحال اس بات کا انکار نہیں کیا جاسکتا کہ انسان کی اخلاقی تربیت کا پہلو ملحوظ رکھتے ہوئے روز قیامت ہمارے اچھے اور برے کاموں کے جسمانی صورت میں تبدیل ہوجانے کا عقیدہ انتہائی موثر اور مفید ہے، وہ انسان کی اخلاقی زندگی میں انقلاب لانے کی بھرپور طاقت رکھتا ہے، وہ بھلائی کی طرف اسے مایل کرتا ہے اور برائیوں سے الگ رہنے کی تحریک کرتا ہے، وہ ایسے اقدامات پر اسے آمادہ کرتا ہے جو قربانی، ایثار اور فداکاری چاہتے ہیں۔

"محرمات سے بچو تم بندوں میں سب سے افضل ہوگے اور خدا تعالیٰ نے جو تمہاری قسمت میں لکھ دیا اس پر راضی رہو تم سب سے بے نیاز رہوگے۔ اپنے پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک کرو تم مومن ہوگے۔ جو اپنے لیے پسند ہو وہی دوسروں کے لیے پسند کرو تم مسلمان ہوجاؤ گے اور زیادہ نہ ہنسا کرو کیونکہ زیادہ ہنسنا دل کو مردہ کر دیتا ہے۔"

(ترمذی شریف)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۳- شمارہ ۲ (فروری ۹۴ء)

تعلیم کا کام ــــ عائشہ بیگم کے نام

محمد اسحاق *

محترمہ عائشہ بیگم، صدر محفل علم وفن، سابق جوائنٹ ڈائرکٹر آف ایجوکیشن، مہاراشٹر کے نام اور کام سے بہت کم لوگ واقف ہوں گے۔ ان کا لائف مشن تعلیم ہی تعلیم ہے۔ اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے تعلیم ہی موضوع گفتگو ہوتا ہے۔ روزانہ صبح سے شام تک اپنی کار میں غریب ذہین بچوں کی تلاش میں گھر گھر اسکول اسکول پھرتی رہتی ہیں تاکہ ان کی مدد کی جائے۔ ان کے عزم اور لگن کو دیکھ کر خیال آیا کہ محترمہ کے کام کے متعلق کچھ معلومات حاصل کرنی چاہییں۔ تاکہ اس گم نام نیک نام خاتون کے کام سے عجب نہیں بہت سے خاندانوں کو روشنی ملے گی۔ ممکن ہے کچھ لوگ کچھ دیر کے لیے گہری فکر میں گم ہوجائیں گے اس مضمون کا اصل مقصد بھی یہی ہے ورنہ محترمہ کی تعریف و توصیف میں اپنا وقت ضائع کرنا نہیں ہے۔

دوسروں کی باتیں بعد میں ہوں گی، یہ بتائیے کہ آپ کے بچے بھی کچھ پڑھے لکھے ہیں۔

کہنے لگیں میرے سات بچے، چار لڑکے او تین لڑکیاں اس میں چھ ڈاکٹر ہوئے اور ایک لڑکا انجینیر۔ دو بہو ڈاکٹر ہیں اور تینوں داماد ڈاکٹر۔ یہ سب کے سب امریکہ، انگلینڈ میں ہیں۔ ایک صاحب زادی ڈاکٹر شمیم حیدرآباد ہی میں گورنمنٹ زنانہ ہسپتال کی سپرنٹنڈنٹ ہیں اور گاندھی میڈیکل کالج کی پروفیسر ہیں۔ اعلیٰ تعلیم کے دوران میرے بچوں نے گیارہ گولڈ میڈل ایک لڑکی نے میڈیسن میں چار گولڈ میڈل لیے یہ سب میرے یہاں آج بھی محفوظ ہیں۔ میں نے کہا ایک ہی خاندان میں گیارہ ڈاکٹر اور گیارہ گولڈ میڈل۔ احد عشر کوکبا کی مثال۔ گیارہ کے گیارہ آسمان کے ستارے۔ پھر ان سب کے بچے میڈیسن، انجینیرنگ اور کالج کی اعلیٰ تعلیم پا رہے ہیں۔

میں نے کہا کہ آپ کے سب بچے جب اتنے قابل نکلے تو ظاہر ہے کچھ اپنے آبائی خاندان کے ماحول اور روایات کا ضرور اثر ہوگا۔

ہاں یہ بات بڑے پتے کی ہے۔ میری آٹھ بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔ ہمارے خاندان میں بزرگ عالم، فاضل اور جید علمائے دین گزرے ہیں۔ میری والدہ کچھ زیادہ پڑھی لکھی نہیں تھیں لیکن ان کا ارادہ تھا کہ میں سب بچوں کو کالج تک اعلیٰ تعلیم دلوا کر رہوں گی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ میری سب آٹھ بہنیں محکمۂ تعلیمات میں کلاس ون گزیٹیڈ آفیسرس کے عہدے سے ریٹائر ہوگئیں اور میرے ایک بھائی ڈپٹی ڈائرکٹر کے عہدے سے ـــــ ساٹھ ستر برس پہلے لڑکیوں کے لیے

---

* ریٹائرڈ پرنسپل کالج آف ایجوکیشن، جاوید منزل، مکان نمبر ۶/۱۱۴/۴-۴۴ - ۱۱ بازار گوڑہ، حیدرآباد

تو اسکول زیادہ تھے اور نہ کالج۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ لڑکیوں کی تعلیم کو گناہ اور خاندان کے لیے عیب سمجھا جاتا تھا۔ ایسے زمانے میں آپ کی والدہ کی دور اندیشی اور روشن خیالی کچھ عجوبہ روزگار سے کم نہیں۔

تعجب ہے کہ آپ کے سب بچے اتنے ذہین اور فطین کیسے نکلے؟

آپ تو میرے سب راز معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ میں اور میرے شوہر روزانہ شام میں اپنے بچوں کے ساتھ دو تا چار گھنٹے ان کے اسباق اور ہوم ورک دیکھنے بیٹھ جاتے۔ ڈسٹرکٹ ایجوکیشنل آفیسر ہونے کے باوجود میں صرف ایک دن کلب گئی۔ عام طور پر ہم لوگ کسی تقریب میں شریک نہ ہوتے سوائے ایسی تقریب کے جو بہت ضروری اور اہم ہوتی۔ بچوں کی تعلیم میں ایک دن کا بھی حرج ہوتا تو میں بے چین ہو جاتی۔ ان کی عام معلومات کے لیے پربھنی کی پبلک لائبریری سے روزانہ ایک کتاب ایک آنے میں لاتی جو ۲۴ گھنٹوں بعد واپس کرنی پڑتی۔ وہ ایک کتاب ایک دن میں تین چار بچے باری باری پڑھ لیتے۔ اس طرح لائبریری کی ساری کتابیں میرے سب بچے دیمک کی طرح چاٹ گئے۔

میری ایک لڑکی ہوسٹن (امریکہ) میں گائناکالوجسٹ ہے جو انگلینڈ اور امریکہ کے بارہ امتحانات پاس کر چکی ہے۔ ایک داماد ڈاکٹر عبدالعلی شہرہ آفاق کارڈیالوجسٹ ڈاکٹر ڈنکولی کے ساتھ بھی کام کرتے ہیں۔ ان کی شہرت اور عظمت کے لیے اسی سالہ ڈاکٹر کولی کا نام کافی ہے۔

ان سب بچوں کی تعلیم پر خرچ بھی بہت آتا ہوگا۔ کس طرح آپ ان سب بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے اخراجات برداشت کرتے رہے۔

میں اور میرے شوہر سادہ لباس استعمال کرتے۔ میں نے اپنی زندگی میں کبھی بھڑک دار اور قیمتی ساری نہیں خریدی۔ جو بیگمس اور خواتین مجھ سے عید میں ملنے آتیں میری سادہ لباسی پر حیرت کرتیں۔ کیوں کہ وہ بھڑک دار لباس اور زیور سے آراستہ و پیراستہ ہوتیں۔ کبھی وہ پوچھ لیتیں کہ آپ ڈسٹرکٹ کی عہدہ دار ہوتے ہوئے بھی کیوں اتنے سادہ لباس میں رہتی ہیں۔ میں کہتی اچھے لباس اور زیور کی تمنا میرے دل میں نہیں ہے۔ اگر میں اس آرائش و زیبائش پر خرچ کروں تو میں بچوں کو پڑھا نہیں سکتی۔ جب یہ بچے بڑے ہو کر کچھ نام پیدا کریں گے تو اس وقت جو خوشی ہوگی اس کا اندازہ تو اب نہیں ہو سکتا۔ میں نے کبھی زندگی میں کسی سے کبھی قرض نہیں لیا۔ آج میرے سب خواب پورے ہو گئے۔ ان بچوں کو دیکھ کر ماں کو جو خوشی ہوتی ہے وہ آپ کو کیسے بتاؤں۔ مجھے اپنی سادہ زندگی پر کبھی شرمندگی نہیں ہوئی بلکہ ہمیشہ فخر ہی رہا۔ نہ معلوم کتنی خواتین نے میری زندگی سے سبق لیا ہوگا۔

میں نے گفتگو کو ذرا بدلتے ہوئے سوال کیا کہ اپنے بچوں کے لیے کون کیا کچھ نہیں کرتا۔ اگر آپ نے بھی یہ سب کیا ہے تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اگر آپ نے کچھ غریب، ذہین بچوں کے لیے بھی کیا ہوتا تو پھر ہم کو آپ کے کام سے کچھ دلچسپی ہو سکتی ہے۔ یہ سوال کچھ ان کی رگِ حمیت کو بھڑکانے والا تھا۔ ذرا جوش میں آ کر کہنے لگیں۔

میں نے بچپن ہی سے اور پھر اسکول کی ٹیچر اور بڑے عہدوں تک پہنچنے تک ہر منزل پر میں نے بحیثیت عہدہ دار نہیں بلکہ خانگی طور پر دوسروں کے بچوں کی تعلیم کے لیے مقدور بھر کوشش کرتی رہی۔

نمونے کو کوئی دس بارہ قصے ایک گھنٹے میں سنا ڈالے سب کہاں، کچھ آپ سن لیجیے۔ کہنے لگیں

میں اورنگ آباد میں ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر تھی ایک دن ایک غریب لڑکا آیا۔ کہنے لگا مجھے کہیں نوکر رکھوا دیجیے۔ پوچھا بیٹا کچھ پڑھا بھی ہے۔ کہنے لگا میٹرک اسی سال کامیاب ہوا ہوں۔ کیا نمبر لایا ہے۔ ۹۰ فی صد تین مضامین میں پورے سو فی صد۔ یہ حیرت میں پڑ گئیں۔

اس لڑکے کو سمجھایا کہ بیٹا تو ڈاکٹر بنے گا۔ غریب باپ نے وعدہ کیا کہ کسی طرح اس کے اخراجات برداشت کروں گا۔ وہ میڈیکل کے کورس کے دوسرے سال میں تھا کہ باپ کا انتقال ہوگیا۔ یہ اس وقت جالنہ میں تھیں۔ انھیں خط ملا کہ آپ کے مشورے پر عمل نہ کرتا تو اچھا ہوتا۔ میرے خاندان کا سہارا دینے والا کوئی نہیں۔ میں ایم۔بی۔بی۔ایس کے دوسرے سال میں ہوں۔ اگر مجھے کم از کم ۲۵ روپیے ماہانہ وظیفہ کسی طرح نہ ملے تو میں تعلیم ترک کرنے پر مجبور ہوں۔ محترمہ عائشہ بیگم نے فوراً ٹیلی گرام کے ذریعے ۲۵ روپیے منی آرڈر بھیج دیا اور خط لکھ دیا کہ تعلیم ختم کرنے تک ۲۵ روپیے ماہانہ تمھیں ملتے رہیں گے۔ یاد رہے کہ یہ روپیے آج کے نہیں کوئی تیس پینتیس برس پہلے کے تھے۔ اس لڑکے کو یہ رقم ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو کوئی تین برس تک ملتی رہی۔ ایک روز وہ گھر آیا اور اپنی پہلی تنخواہ محترمہ کے ہاتھ میں رکھ دی۔ محترمہ نے کہا اس کی حق دار تو تمھاری والدہ ہیں اور رقم واپس کر دی۔ لیکن اس شریف ڈاکٹر نے تعلیم کے زمانے کے پورے روپیے واپس کر دیے تاکہ اس قسم کی امداد دوسرے لڑکوں کے لیے جاری رہ سکے۔ اس ڈاکٹر کی شادی اونچے خاندان کی خوب صورت لڑکی سے ہوئی۔ ان کے بچے کالجوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور وہ آج کل سول سرجن ہیں۔ اگر وقت پر عائشہ بیگم صاحبہ نے اس لڑکے کی تعلیم میں دلچسپی نہ لی ہوتی تو نہ معلوم یہ ہیرا کہاں کوڑے کرکٹ میں گم ہو جاتا، کسی کو پتہ بھی نہ ہوتا۔

ضلع پربھنی میں ایک صاحب امریکہ میں پی ایچ۔ڈی لےکے آئے اور کسی بڑی ملازمت پر کام شروع کیا لیکن یہ تھے کٹر مذہبی آدمی۔ لڑکیوں کی تعلیم کے دشمن اور لڑکیوں کو پردہ کرانے کے سخت پابند۔ ان کی ایک بارہ سالہ لڑکی چھٹی جماعت میں پڑھتی تھی جو برقعہ اور رکشا کو پردہ لگا کر اسکول جاتی تھی۔ ایک روز یہ لڑکی پردے سے باہر دیکھ رہی تھی۔ باپ کی نظر پڑی۔ شام میں لڑکی اسکول سے واپس آئی۔ ابا جان غصے میں آپے سے باہر ہو گئے۔ لڑکی کے منہ پر اس زور سے تھپڑ مارا کہ لڑکی کے دانت ٹوٹ کر گر گئے، اور اسکول سے نام خارج کروا لیا۔ محترمہ کے بہت سمجھانے بجھانے پر اس لڑکی کو وہ دوبارہ اسکول بھیجنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس حادثے کے ایک دو سال کے اندر ہی ان صاحب کا اچانک انتقال ہو گیا۔ ۲۵ سالہ بیوہ اور پانچ بچے بے سہارا اس دنیا میں رہ گئے۔ عائشہ بیگم صاحبہ نے اس سارے خاندان کو اپنے گھر بلا کر رکھ لیا۔ یہ پردہ نشین بیوہ تھوڑی بہت پڑھی لکھی تھیں۔ انھیں پڑھانا شروع کیا۔ انھوں نے میٹرک پاس کر لیا اور ٹرینڈ ہو کر اسکول میں ٹیچر ہو گئیں۔ باپ کا مرنا گیا تھا سب کے لیے تعلیم کا دروازہ کھل گیا۔ یہ خاتون راتوں میں کپڑے سیتیں اور اس پیسے سے گھر کا خرچ چلانے لگیں۔ ان کے پانچوں بچے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے لڑکے اعلیٰ عہدوں پر ہیں اور لڑکیاں بڑے خاندانوں میں بیاہی گئیں۔ ان صاحب کے چھ بھائی چھوٹی موٹی کھیتی باڑی کا کام کرتے تھے۔ ان سب کے بچوں کو اس خاتون نے پڑھایا۔ اس روشن دماغ خاتون کی وجہ سے اس خاندان کے پچاس سے زاید افراد میں آپ کو ڈاکٹر، انجینیر، ٹیچر، پی ایچ۔ڈی، پرنسپل مل جائیں گے۔

میں نے کہا مولانا سلیمان ندویؒ نے کسی جگہ لکھا ہے کہ "اگر غریب خاندان کا کوئی لڑکا پڑھ لکھ کر بڑا آدمی بن جاتا ہے تو اس کی تیسری چوتھی پشت میں کوئی غریب باقی نہیں رہے گا ـــــــ اس پر محترمہ نے کہا:

دیکھیے صرف ایک ہی پشت میں تعلیم نے سارے خاندان میں انقلاب برپا کر دیا اور کہا میں نے کسی پردہ نشین خاتون کو ایسی ذہین، دور اندیش، دانش مند اور حوصلہ مند عورت کو اپنی زندگی میں نہیں دیکھا۔

ایک دن ایک لڑکی اپنے خاندان سے ناراض ہو کر محترمہ کے گھر آگئی تاکہ وہ کالج میں شریک ہو سکے۔ اس لڑکی کے بھائی کالج کی اعلیٰ تعلیم کے سخت مخالف تھے۔ بڑی مشکل سے محترمہ نے انھیں سمجھایا۔ اس لڑکی کے ساتھ اور آٹھ لڑکیوں کو کالج میں شریک کروا دیا۔ اسی لڑکی نے ڈیڑھ دو دن سے انگریزی لیکچر

میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی۔ آج کل زرعی کالج میں ایک شعبہ کی ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ ہے اور پروفیسر کی حیثیت سے کام کر رہی ہے۔

اچھا آج کل آپ کی مصروفیت کیا ہے۔ دبیرپورہ میں جینی صاحب کے بنگلہ میں "امام بخش میموریل اسکول" چلا رہی ہوں جس میں ۱۲۶ طلبا اور دس ٹیچرس کام کرتے ہیں۔ اس عمارت کا ایک حصّہ میرے داماد ڈاکٹر عبد العلی نے اسکول کھولنے کے لیے دے دیا ہے۔ اس محلّے کے عام طور پر غریب خاندانوں کے لڑکے اور لڑکیاں پڑھنے کے لیے آتے ہیں۔ میں اسی اسکول میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک خاتون اپنے دو بچوں کو لے کر آئیں اور اپنی افتاد سنانے لگیں۔ یہ دونوں بچے حالت میں سڑکوں پر گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ آدھی رات ہو گئی تو کہیں دکان کے سامنے سو جاتے ہیں۔ باپ پینے کا عادی ہے۔ کبھی کبھی گھر کی صورت دیکھ لیتا ہے۔ میں ان بچوں کو آپ کے حوالے کرتی ہوں۔ محترمہ نے کہا بیٹا تم بڑے ہو کر رکشا چلاؤ گے یا میری طرح موٹر کار میں اڑتے پھرو گے اس کے لیے تعلیم ضروری ہے۔ بچوں نے کہا ہمیں رکشا نہیں چلانا ہے۔ موٹر کار چلانا ہے۔ بس انھیں اپنے اسکول میں جہاں پہلے ہی سے ۱۸ بچوں کے قیام و طعام کا مفت انتظام ہے ان دو بچوں کے رہنے، کھانے پینے، کتابیں کاپیاں سب مفت انتظام کر دیا۔ یہ دونوں لڑکے کوئی دو ماہ سے پڑھ رہے ہیں، ذہین ہیں۔ خود محترمہ روزانہ ان کا ہوم ورک دیکھتی ہیں۔ چند برسوں بعد عجب نہیں کہ یہ سماج میں کسی اچھے درجے تک پہنچ جائیں۔

میں نے کہا کسی کو ایک وقت مدد دے کر نجات حاصل کر لینا آسان ہے لیکن آپ تو ان بچوں ہی کی نہیں ان کے خاندان کی دیکھ بھال کی ذمہ داری لیتی ہیں یہ تو جان کا جھنجھٹ ہے۔ کون یہ پریشانی اپنے سر لیتا ہے کہنے لگیں۔ دیکھیے یہ میرا لائف مشن ہے۔ اگر میں یہ کام نہ کروں تو میری زندگی کے دس سال کم ہو جائیں گے۔ میں نے مسلمان ہی نہیں تین ہندو بچوں کی خاموش مدد کی ہے۔ ان کے نام لینا نہیں چاہتی۔ ان میں ایک ڈاکٹر، ایک انجینئر ایک کالج کے پرنسپل ہیں۔

اب چلیے آخری سوال رہ گیا۔ آخر یہ ماہانہ ہزاروں کا خرچ آپ کیسے برداشت کرتی ہیں۔ میرے بچے میرے کام سے واقف ہیں وہ میری مدد کرتے ہیں۔ میں نے آج تک کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلایا اور نہ کبھی اخبار میں کوئی اپیل کی۔ میری پنشن کی ساری رقم غریب، ذہین بچوں کی تعلیم پر خرچ ہو جاتی ہے۔ میں نے آج تک اپنی پنشن کی رقم کا ایک روپیہ بھی اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا۔

اگر کسی ایک خاتون میں خدمتِ خلق کا ایسا جذبہ ہو تو وہ تعلیم کے ذریعے کئی ایک خاندان ہی نہیں بلکہ ان کی آنے والی نسلوں کو نامعلوم وقت کے دھارے تک اپنے اس احسان کی بارش سے ہرا بھرا رکھ سکتی ہیں۔ شاید اس کا اندازہ خود عائشہ بیگم کو بھی نہ ہوگا۔

میں نے کہا کوئی پیام:

چلیے آپ کی خاطر اقبال کا ایک شعر پڑھ دیتی ہوں ؎

ہر دردمند دل کو رونا مرا رُلا دے
بے ہوش جو پڑے ہیں شاید انھیں جگا دے

میں نے یہ شعر پڑھا ؎

بہت ہی خوش ہوا حالیؔ سے مل کر
ابھی کچھ لوگ "ایسے" ہیں جہاں میں

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۳، شمارہ ۲ (فروری ۹۴ء)

تعلیمی چیلنج اور مسلم ادارے

محمد لیسین ★

علم انسانیت کا زیور ہے اور تعلیم بنی نوع انسان کی مادی اور روحانی ترقیوں کا بہترین وسیلہ۔ تاریخ عالم گواہ ہے کہ دنیا کی تمام معروف قومیں مثلاً یونانی، مصری، ہندی یا چینی تعلیم کی بدولت ہی معراج کمال کو پہنچیں اور پھر اس میدان میں پچھڑ جانے کے بعد زوال پذیر ہوئیں۔ مغربی قوموں نے تحصیل علم کے ذریعے نہ صرف قدرت کے سربستہ راز حقائق کا انکشاف کیا ہے بلکہ سمندر کی لہروں پر بھی حکمرانی کی ہے اور فضا کی وسعتوں میں بھی اپنے پرچم لہرائے ہیں۔ علم کے ذریعے تسخیر فطرت کے اسی عمل کے سلسلے میں علامہ اقبال نے کہا ہے:

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

ماہرین تعلیم کی متفقہ رائے ہے کہ تعلیم کا مقصد محض لکھنے پڑھنے کی استعداد پیدا کرنا نہیں ہے بلکہ طالب علم کی ذہنی، اخلاقی اور جسمانی صلاحیتوں کو اس طرح فروغ دینا ہے کہ وہ ذاتی زندگی میں خود کفیل اور سماجی زندگی میں اچھا شہری اور بہتر انسان بن سکے۔ یہ امر قابل غور ہے کہ تاریخ کے ہر دور میں زندگی کے دوسرے شعبوں کی طرح تعلیم کے تقاضے بھی بدلتے رہے ہیں اور ہر نئی نسل کے سامنے نئے چیلنج بھی آتے رہے ہیں۔ جمہوری نظام میں ہر فلاحی حکومت کا فرض ہے کہ ابتدائی لازمی تعلیم سے لے کر اعلیٰ تعلیم کی منزلوں تک افرادی صلاحیتوں کی تکمیل اور سماجی مقاصد کے حصول کے لیے ٹھوس اقدامات کرے اور شہریوں کو لازم ہے کہ سرکاری منصوبوں کی کامیابی کے لیے اسباب حل و عقد سے تعاون کریں۔

آزادی سے پہلے انگریزی راج میں راجہ رام موہن رائے، سرسید احمد خاں، مہاتما گاندھی اور ڈاکٹر ذاکر حسین نے تعلیم کے نئے نئے پہلوؤں پر غور و فکر کر کے اپنے دور میں جو لائحہ عمل پیش کیے ان کی افادیت سے آج بھی انکار ممکن نہیں۔ ان تمام مشاہیر نے روایتی تعلیم کے مقابلے میں جدید مغربی تعلیم کو ترجیح دی لیکن ہندوستانی عوام، ان کی مذہبی ثقافتی زندگی، سماجی ضروریات اور قومی تقاضوں کو بھی مدنظر رکھا۔ آزادی کے بعد ہم برطانوی دولت مشترکہ کے ممتاز رکن بن گئے اور ہم نے انگلستان سے اپنا رشتہ نوآبادیاتی دور سے بھی زیادہ استوار کر لیا۔ یہاں تک کہ ہمارا آئین بھی برطانوی پارلیمانی نظام کے نمونے پر مرتب ہوا۔ تعلیم کے فروغ کے لیے انگریزی طرز پر کالج اور یونیورسٹیاں قائم کی گئیں اور

★ پروفیسر شعبۂ انگریزی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

ان کی نگرانی کے لیے یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اور دوسرے ادارے وجود میں آئے۔ ماہرین تعلیم، وزارت تعلیم اور سرکاری افسروں نے کسی خاص پالیسی کے تحت اعلیٰ تعلیم پر ہی سارا زور صرف کیا جس سے ملک میں یونیورسٹیوں، کالجوں اور سائنسی اداروں کی بھرمار ہو گئی لیکن بنیاد کمزور رہ گئی۔ ممتاز ماہرین اور سائنس دانوں، ڈاکٹروں اور انجینئروں نے ہندوستان میں تعلیم حاصل کر کے روزی کی تلاش میں مغرب یا وسط مشرق کی راہ لی مگر لاکھوں فارغ التحصیل طالب علموں کے لیے تلاش معاش ہفت خواں ثابت ہوئی یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے دوسری طرف ابتدائی تعلیم سے بے اعتنائی اور نئے نئے تعلیمی تجربوں سے ملک کے سامنے نئے چیلنج کھڑے ہو گئے ہیں رادھا کرشنن کمیشن کے بعد کئی دوسرے کمیشن مقرر ہوئے کمیٹیوں کی تشکیل ہوئی لیکن سفارشات پر عمل نہ ہونے سے تعلیمی میدان میں نتائج کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہے۔ ایک اندازے کے مطابق دنیا کے ایک تہائی جاہل اور ناخواندہ لوگ ہندوستان میں ہی بستے ہیں۔ اس ضمن میں ۷ ستمبر ۱۹۹۳ کا ٹائمز آف انڈیا کا اداریہ "ناخواندگی یعنی غلامی" (Unlittered Meanness) ہماری آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہے۔ ابتدائی جملے ملاحظہ ہوں:

> "ہندوستانی قوم کے لیے یہ بہت شرمناک بات ہے کہ دنیا میں سب سے زیادہ ان پڑھ اس ملک میں موجود ہیں۔ اس سے بھی شرمناک یہ حقیقت ہے کہ مستقبل قریب میں جب ساری دنیا میں خواندگی کی شرح فی صد کافی بڑھ جائے گی تو کروڑوں ہندوستانی جہالت کے بھنور میں پھنسے نظر آئیں گے۔"

ممکن ہے یہ صورت حال بھی شیئر گھوٹالے (Securities Scam) کی طرح نظام کی ناکامی کی بدولت پیدا ہوئی ہو لیکن پھر سوال یہ اٹھتا ہے کہ اس کے ذمہ دار کون ہیں؟

اس پس منظر میں اب اصل موضوع کی طرف آئیں۔ یہ تلخ انکشاف حکومت کے لیے بھی باعث حیرانی ہے کہ گزشتہ چالیس برسوں کے دوران ہندوستانی مسلمان ثانوی اور اعلیٰ تعلیم سے بہت حد تک محروم رہے ہیں۔ ابتدائی تعلیم کی سطح پر بھی ان کی خواندگی شرح درج فہرست قوموں کو چھوڑ کر سب سے کم ہے۔ اس کا نتیجہ ہے پستی اور پس ماندگی۔ اس سیاق و سباق میں ہمارے سامنے ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ تعلیمی پس ماندگی کے پیش نظر اس ملک میں مسلمانوں اور ان کی آئندہ نسلوں کا کیا مستقبل ہے یہ صحیح ہے کہ وہ آزاد ملک کے شہری ہیں اور آئین ہند میں انھیں دوسرے باشندوں کی طرح جملہ شہری حقوق حاصل ہیں۔ بحیثیت اقلیت بھی ان کو چند قابل ذکر مراعات کی یقین دہانی کرائی گئی ہے لیکن صورت حال کے معروضی جائزے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بدستور غربت، جہالت، مایوسی اور ضعیف الاعتقادی کے شکار ہیں اور بحیثیت مجموعی عزت و فراغت کی زندگی گزارنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ ملک میں پندرہ کروڑ مسلمانوں کو دو فی صد سے زیادہ اعلیٰ ملازمتیں نصیب نہیں۔ تیسرے اور چوتھے درجے کی ملازمتوں میں بھی ان کا تناسب پانچ فی صد سے زیادہ نہیں ہے تجارت، صنعت کاری، سائنسی اداروں اور دوسرے اہم شعبوں میں ان کی نمائندگی برائے نام ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ بدحالی تعلیمی پس ماندگی کی وجہ سے ہے یا سیاسی کمزوری اور معاشی استحصال کے باعث وہ تعلیم کے میدان میں اس حد تک پچھڑ گئے ہیں کہ ان کا شمار درج فہرست ذاتوں اور قبیلوں میں ہونے لگا ہے۔ لازمی ابتدائی تعلیم سے ابھی تک دیہاتی و قصباتی مسلمان پوری طرح مستفید نہیں ہو سکے ہیں۔ اسکول کی سطح پر پڑھائی چھوڑ دینے والے طالب علموں میں شاید مسلمانوں کا تناسب

سب سے زیادہ ہے۔ جہاں تک اعلیٰ تعلیم کا تعلق ہے کالجوں اور یونیورسٹیوں میں مقررہ ضابطوں کے تحت مسلمان طالب علموں کو داخلہ کی پوری آزادی ہے لیکن یہ بات یہ ہے کہ بیشتر مسلم طالب علموں کو بھی اعلیٰ تعلیمی اداروں تک پہنچنے کی نوبت نہیں آتی۔ جو طالب علم امتحان وغیرہ ان اسکول کی تعلیم مکمل کرکے آگے بڑھنے کا حوصلہ رکھتے ہیں، ان کا داخلہ سخت مسابقت کے باعث اچھے کورسوں میں نہیں ہو پاتا ہے۔ انجینئرنگ، میڈیکل، بزنس مینجمنٹ اور اعلیٰ سائنسی اداروں میں مسلمان طالب علموں کی تعداد دوسرے ہم وطنوں کے مقابلے میں بہت کم ہے۔

ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ صاحب استطاعت مسلمان ملت کے نونہالوں کی مذہبی تعلیم اور دینی تربیت کے لیے مدرسے قائم کرکے ثواب دارین حاصل کرتے ہیں۔ آج کے دور الحاد میں دینی مدرسوں کی اہمیت سے کسی مسلمان کو انکار بھی نہیں ہو سکتا لیکن اب ملت کو "روحانی غذا" کے ساتھ "ذہنی غذا" کی بھی اشد ضرورت ہے۔ ملک میں آزادی کے بعد دوسرے طبقوں بالخصوص عیسائیوں، سکھوں، پارسیوں اور جینیوں کے قائم کردہ اداروں پر نظر ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ وہ مذہبی اور سیکولر دونوں طرح کے ادارے قائم کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جمہوری نظام میں مسلمان اپنی تمام تعلیمی ضروریات کے لیے حکومت کے محتاج رہ کر کبھی ترقی نہیں کر سکتے ہیں۔ سر سید نے اس (۲) مسئلہ پر اب سے سو سال پہلے اظہار خیال کیا تھا:

> "قومی تعلیم اور قومی عزت ہرگز اس وقت
> تک حاصل نہیں ہو سکتی جب تک ہم اپنی
> تعلیم کا کام خود اپنے ہاتھ میں نہ لیں
> گورنمنٹ کی قدرت سے خارج ہے کہ
> وہ ہمارے تمام مقاصد کی تکمیل کر سکے"

آزادی کے بعد شمالی ہند میں مسلمانوں کے کئی نئے تعلیمی ادارے وجود میں آئے ہیں۔ [illegible] نے بہار [illegible]، کرناٹک اور کیرالا میں [illegible] ایسے کارنامے نمایاں انجام دیئے ہیں [illegible] ملی ہے۔ سرزمین دکن میں ڈاکٹر عبدالحق کے [illegible] اور ان کے رفقا نے تکنیکی اور پیشہ ورانہ اداروں کی جس طرح توجہ کی ہے وہ قابل ستائش بھی ہے اور قابل تقلید۔ افسوس کا مقام ہے کہ شمالی ہند میں مسلم اداروں کی طرف خاطر خواہ اضافہ نہیں ہو سکا ہے۔ [illegible] کمیٹی کے تیار کردہ ڈائرکٹری اور دوسرے اعداد و شمار کے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اتر پردیش میں بھی ریاست دینی مدرسوں کی تعداد خاصی ہے لیکن [illegible] اسکول اور کالج نہیں ہیں۔ ریاست میں ایسی بستیاں ہیں جہاں طالب علم اور مدرسے [illegible] صرف یہ ہے کہ مدارس [illegible] رکھنے کے لیے انتہائی ضروری ہیں لیکن ایسے اداروں قیام کی بھی سخت ضرورت ہے جن کا تعلق [illegible] روزی روٹی کے مسئلوں سے ہے۔

راقم الحروف کو شمالی ہند کی بیشتر یونیورسٹیوں میں منصبی فرائض کے سلسلے میں بیشتر لوگوں سے اس موضوع پر بات چیت کرنے کا موقع ملا ہے۔ اکثر تعلیم یافتہ مسلمانوں سے یہ بات سننے کو ملی کہ ہم اگر [illegible] پالی ٹیکنک اور انجینئرنگ کالج قائم کر بھی لیں لیکن [illegible] مسلمان طالب علموں کی تعداد بہت کم ہوگی۔ [illegible] ہمارا مقصد نہیں پورا ہوگا۔ اس منطق میں [illegible] سے [illegible] جھلک نظر آتی ہے۔ [illegible]

کمیشن، علی گڑھ یونیورسٹی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور جامعہ ہمدرد نے
ثابت ہو چکا ہے کہ وہ صرف مسلمانوں کے لیے تعلیمی ادارے
نہیں ہیں۔ اگر یہ پہلے قائم کردہ اداروں میں سو
فیصد مسلمان طالب علموں کا انتخاب کرتے رہتے تو یہ خواب
شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا۔ قرطبہ اور بغداد کی مثال بھی
ہمارے سامنے ہے جہاں غیر مسلم اساتذہ اور طالب علموں
کے تعاون سے تاریخ ساز کارنامے انجام دیے گئے۔
ملک کے بیشتر مسلم اداروں کا یہ حال ہے کہ
انتظامیہ کے بیشتر ممبر ذاتی منفعت اور ذات برادری کی
سیاست میں الجھے رہتے ہیں اور تنازعوں کے شکار ہیں۔ اکثر اوقات
ذاتی مفادات اور رشتے داروں کی خاطر اعلیٰ معیار کو قربان
کیا جاتا ہے۔ ہمارے زوال پذیر معاشرے کا یہ حال
ہے کہ ہم اپنے تمام قبرستان، مسجدیں اور اوقاف کی
زمینیں [illegible] محفوظ تھے لیکن اب
[illegible] مسلمانوں کے نام پر قبضہ سے
محفوظ نہیں ہیں۔ ابھی بھی قوم کے بہت سارے لوگ ایسا ہی کرتے
ہیں [illegible] شہر سے جھلکتی ہے۔
جامعہ ملیہ دہلی، شبلی نیشنل کالج، میرٹھ اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
کے علاوہ دوسرے بہت سے مدرسوں اور اسکولوں کی زمینوں پر
ناجائز قبضہ [illegible] وجوہات
[illegible]
[illegible] ذاتی منافع [illegible] اور مالی مفاد
[illegible] ہمارے دینی مدرسے [illegible] تقسیم ہو چکے ہیں۔
[illegible] آ سکتے ہیں جو ملت کی
[illegible] دیے گئے ہیں اور
[illegible] حیثیت [illegible]
[illegible] کسی بھی زندہ قوم کی اس
[illegible] حقیقت یہی
[illegible]

نہیں ہے۔ ضرورت ہے کہ [illegible] ناقص اور تعلیمی سہولیات
کے فقدان [illegible] ثابت ہوتے ہیں
اقلیتی فرقہ [illegible] اساتذہ کی کمی، [illegible] نصاب اور درسی
کتابوں کی فراہمی میں دشواریاں [illegible] متوسط
[illegible] ہے۔ اگر اسکولوں کی ترقی بھی نہیں ہو سکتی ہے۔ دیکھئے
تو اسکول [illegible] ملک کے تعلیمی نظام میں
[illegible] تعلیمی منصوبہ بندی اور مالی [illegible] کے
[illegible] مسلم اداروں کی حالت زیادہ
ہی خراب نظر آتی ہے۔ اگر ایک مسلم ادارے میں تمام [illegible]
مسلم [illegible] میڈیکل [illegible] تکنیکی اور طبیہ کالجوں
کو بھی شامل کر لیں جو [illegible] گزشتہ دس پندرہ
برسوں کے دوران قائم کیے گئے ہیں تو یہ سلسلہ [illegible] ملت
کے تعلیمی حال و مستقبل کو "روشن" کر رہا ہے۔
"نئی تعلیمی پالیسی" (۱۹۸۶ء) [illegible] کی دستاویز میں
مسلمانوں کا شمار [illegible] پسماندہ قوموں اور [illegible] کے
ساتھ ہوا تھا۔ لہٰذا امید ہو گئی کہ اس حقیقت کے پیش نظر
تعلیم کے شعبے میں مسلمانوں کے ساتھ خصوصی رعایت برتی
جائے گی لیکن یہ خواب پورا نہیں ہوا۔ حسب معمول اس پالیسی
[illegible] پر بھی عمل نہیں ہوا تھا کہ سیاسی مصلحتوں کے تحت
کے بعد [illegible] "راما مورتی کمیٹی" (۱۹۹۰ء) اور "ایڈیشنل کمیٹی"
(۱۹۹۲ء) کے فیصلے [illegible] نظرثانی کی نوبت آگئی۔ اب اندازہ
ہوا کہ نئی تعلیمی پالیسی [illegible] تعلیمی پالیسی تھی
جسے [illegible] نے تعلیمی دستاویز [illegible] پیش کیا تھا۔
[illegible] کوشش
کی گئی [illegible] سیکنڈری اور
ہائر ایجوکیشن میں [illegible] اور
یونیورسٹی [illegible] امر واقع
ہے کہ آزادی کے بعد [illegible] تحت
[illegible] تعلیمی نظام میں تبدیلی [illegible]

[illegible] رپورٹ [illegible] ۵۲-۱۹۵۵ [illegible]

[illegible] رپورٹ [illegible] (۱۹۶۳ء) پیش کی گئی [illegible]

[illegible] سفارشات [illegible]

[illegible] کیا جاتا تو آج [illegible]

[illegible] ہوتا [illegible] لیکن [illegible] سیاست

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

سائنس [illegible] مطابق [illegible]

[illegible]

[illegible]

سے کہ زیادہ [illegible] میں وطن

[illegible] مرکزی و

ریاستی حکومتوں کے [illegible] اور سرکاری

اور [illegible] نظر آتا ہے۔ پروفیسر

موصوف نے خود [illegible] اسکولوں [illegible] اداروں

اور تمام [illegible]

[illegible] میں ذکر

کیا ہے [illegible] اور

[illegible] موصوف

کے نزدیک سب سے زیادہ تشویش ناک پہلو یہ ہے کہ

[illegible] اور کہ [illegible]

[illegible]

[illegible] کے سلسلے

میں [illegible] کرنے

[illegible] کے جنرل

سکریٹری جناب محمد ریاض الدین [illegible] ریاست

میں [illegible]

پیش کیا [illegible]

میں [illegible] آج بھی [illegible]

ممکن [illegible]

۱۔ آئین میں اقلیتوں کو اپنے تعلیمی ادارے

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

[illegible]

- نصابی کتابوں کی تیاری میں اقلیتی طبقے کے ماہرین تعلیم کی نمائندگی نہ ہونے سے ان کی مذہبی و ثقافتی زندگی کی ترجمانی نہیں ہوتی۔
- ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں یو۔پی میں لسانی اقلیتوں بالخصوص اردو میڈیم اسکولوں کی منظوری پر پابندی ہے۔
- سہ لسانی فارمولہ کے تحت اردو ٹیچروں کا تقرر نہیں ہوتا ہے۔
- اقلیتی ادارے پیشہ ورانہ اور تکنیکی تعلیم سے مستفید نہیں ہو سکتے کیوں کہ ان میں اساتذہ کی تعداد کم ہوتی ہے اور وہ معاش ملازمت ترقی کی راہوں سے محروم رہتے ہیں۔

۹ نئی تعلیمی پالیسی کے تحت مسلم لڑکیوں کی تعلیم کے لیے کوئی معقول انتظام نہیں ہو سکا ہے۔ ریاستی حکومت اقلیتی ہائر سیکنڈری اسکول کھولنے کی منظوری نہیں دیتی اور جو پرانے اسکول ہیں ان میں نئے سیکشن کھولنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔

- اقلیتی اداروں کے مسائل کو حل کرنے یا ان کی اصلاح کی کوئی کوشش نہیں کی جاتی ہے۔
- ریاستی سطح پر نئی تعلیمی پالیسی کے تحت اقلیتی اداروں کے حقوق کا مسئلہ ابھی تک معلق ہے۔

سب سے اہم بات یہ ہے کہ یو۔پی میں کانگریس، جنتا پارٹی اور جنتا دل حکومتوں کی کارکردگی اور مسلم اقلیت کے مفاد [illegible] تک محدود رہی ہے۔ ۱۹۹۱ء میں سیاست کی باگ ڈور بھارتیہ جنتا پارٹی کے ہاتھ آئی جس نے حکم کرنے ہندوستانی تہذیب کا نعرہ اٹھایا اور مسلمانوں کی زندگی اجیرن کر دی۔ اس فسطائی جماعت کے دور اقتدار میں اقلیتوں کے لیے تعلیمی مواقع تو درکنار ان کا وجود بھی خطرے میں پڑ گیا۔ حالیہ انتخابات (نومبر ۹۳ء) میں کامیابی کے بعد دیکھنا ہے کہ ملائم سنگھ سرکار کس حد تک ہماری مدد کرتی ہے۔

۵ پردہ اُٹھنے کی منتظر ہے نگاہ

مسلم تعلیمی اداروں کی مجموعی حالت تسلی بخش نہیں ہے۔ مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے وضع کردہ قوانین و ضوابط نفاذ کی سطح پر بے سود نظر آتے ہیں کیوں کہ سرکاری دفتروں کے منصب جو نے افسران اب بھی وہی کر رہے ہیں جو گزشتہ چالیس سال سے ان کا شعار رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں ہمارا تعلیمی کارواں ابھی "منجدھار" کے گرداب کی زد میں ہے۔ دسمبر ۱۹۹۲ء میں بابری مسجد سانحہ کے بعد کچھ بیداری آئی ہے۔ ملک کے طول و عرض خصوصاً شمالی ہند میں مختلف تعلیمی و اصلاحی انجمنیں سرگرم عمل ہیں لیکن ان میں کوئی مرکزی نظم نہیں ہے۔ لہٰذا کامیابی کی رفتار سست ہے۔ مثال کے طور پر ایک ہی شہر میں ترقی اردو، فروغ اردو اور تحفظ اردو جیسی تنظیمیں محض اس لیے قائم ہیں کہ زیادہ سے زیادہ لوگوں کو صدر، نائب صدر، سکریٹری اور دوسرے عہدوں پر فائز ہونے کا موقع مل سکے۔ یہی حال دوسرے تعلیمی فلاحی اور اصلاحی اداروں کا ہے۔ اس بات سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ اگر ہم مقامی، ضلعی اور ریاستی پیمانے پر کسی مشترکہ پروگرام کے تحت کام کریں تو نتائج بہتر ہو سکتے ہیں۔ ہمارے لیے اب نہایت ضروری ہے کہ اپنے حالات اور مسائل اور حقیقی ضروریات کا معروضی جائزہ لیں اور [illegible] کے لیے ٹھوس اور مؤثر قدم اٹھائیں۔ دینی تعلیمی کونسل، [illegible] رابطہ کمیٹی اور دہلی میں فرینڈس فار ایجوکیشن کے کام ہمارے سامنے ہیں۔ یہ تنظیمیں ہمارے لیے ایک [illegible] [illegible] چند سال کے اندر [illegible] اسکول [illegible] پبلک اسکول [illegible]

قائم ہوئے ہیں۔ اسے ملت کے حق میں فال نیک سمجھنا چاہیے۔ دلی میں محترم حکیم عبدالحمید صاحب اور سید حامد صاحب کی بدولت ہمدرد اسکول، کوچنگ سینٹر اور ہمدرد یونیورسٹی وجود میں آئے ہیں۔ بلاشبہ ان اداروں کے ذریعے ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ترقی کے نئے دروازے کھل رہے ہیں۔

اقلیتی اداروں کی مالی حالت عموماً تسلی بخش نہیں ہوتی اسی لیے وہاں اساتذہ کے تقرر میں تاخیر اور تعلیمی سہولیات کی فراہمی میں کمی ہوتی ہے۔ جو ادارے منظور شدہ ہیں ان کے لیے عمارتوں، تجربہ گاہوں یا لائبریریوں کے لیے جزوی سرکاری امداد مل جاتی ہے لیکن ان کی توسیع و ترقی کا کام بخوبی انجام نہیں پاسکتا۔ لہٰذا انھیں چلانے کے لیے دوسرے مالی ذرائع کا بھی پتہ لگانا چاہیے۔ اسکولوں کا معیار بلند کرنے اور اچھے اساتذہ کی خدمات حاصل کرنے کے لیے فیس بڑھانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ البتہ غریب اور مستحق طلباء کے لیے فری شپ بھی ضروری ہے۔ اب تمام پرائیویٹ اسکولوں اور کالجوں میں ترقیاتی فنڈ کے نام پر رقمیں حاصل کی جاتی ہیں۔ اقلیتی ادارے بھی ضابطے کے مطابق اس قسم کے فنڈ قائم کر سکتے ہیں بشرطیکہ کسی کو استحصال کا احساس نہ ہو۔ اگر علاقائی حضرات یا گرد و پیش کے مخیر حضرات کو ان اداروں کی افادیت کا احساس ہو جائے تو شاید وہ بھی اس کار خیر میں حسب توفیق مدد کر سکتے ہیں۔ مسلمانوں کی ضروریات سمجھنے کے لیے وقف بورڈوں کی ازسرِ نو تنظیم بھی ضروری ہے تاکہ اوقاف کے تعلیمی فنڈ سے بڑے پیمانے پر غریب مسلمان بچوں کی تعلیم کا بندوبست ہو سکے۔

ہمارے مسائل پیچیدہ ہیں لیکن اگر ہم سیاست بازی، انا پرستی، اقربا پروری اور خود غرضی سے بلند ہو کر فلاح ملت کے لیے تعلیم کی ترویج و اشاعت پر توجہ کریں تو فضا ہماری پُرخلوص محنت اور ایثار و قربانی سے ہموار ہو سکتی ہے اور ہم خود اعتمادی سے آگے کی منزلیں طے کر سکیں گے۔ سیاست داں ہمیں سبز باغ دکھاتے رہیں گے اور ہمارے لیے انواع و اقسام کے منصوبے بناتے رہیں گے لیکن ہماری ترقی باہمی اتحاد و تنظیم، مخلصانہ جدوجہد اور تعمیری فکر کے بغیر ممکن نہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
"جو چھوڑے نہ قول زور (جھوٹ بات)
نہیں چھوڑے اور نہ اس پر عمل کرنا
چھوڑتا تو اللہ کو اس کی کوئی ضرورت
نہیں کہ وہ اپنا کھانا پینا چھوڑ دے"
ترمذی

تدریسِ سائنس کے اغراض و مقاصد

عبدالباری*

یہ ایک مسلّمہ حقیقت ہے کہ تعلیمی ترقی ہی وہ زینہ ہے جس پر ہر ملک، قوم اور آدمی کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ ہر قوم کے افراد اپنی [illegible] فلسفۂ [illegible] نظریے [illegible] ایک آزاد قوم کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ [illegible] کو [illegible] کے جائے [illegible] کر از سر نو تعمیر کرنے۔ یہی وجہ ہے کہ تعلیم کے اغراض و مقاصد فلسفۂ زندگی کے مطابق ہی ڈھالے ہوئے ہوتے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ تعلیمی نظر مقاصد تک پہنچنے کے لیے وقتاً فوقتاً اس میں تبدیلی بھی ہوتی رہتی ہے اور اسی لحاظ سے مناسب اقدام بھی کیے جاتے ہیں چونکہ ہر قوم کی فلسفۂ زندگی مختلف ہوتی ہے لہٰذا ایک کا نظریۂ تعلیم دوسری قوم سے مختلف ہونی چاہیے۔ مقاصدِ تعلیم دراصل ایک کامل شخصیت پر ایک پختہ شخصیت کا سوچے سمجھے اور منظم شکل میں اثر انداز ہونے کو کہتے ہیں۔ یہ پختہ شخصیت طالب علموں کے سامنے اس کے استاد کی ہی ہوتی ہے۔

ہر مضمون کی تعلیم کے اپنی جگہ کچھ عمومی اور خصوصی مقاصد ہوتے ہیں جسے نصابِ تعلیم میں اس کا مقام متعین کرکے اور طریقۂ تدریس کے ذریعے حاصل کیا جاتا ہے۔ سائنس کے مضامین کی تدریس کے مقاصد میں گزشتہ چند دہائیوں میں جزوی تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ [illegible] تبدیلیاں [illegible] دو سال [illegible] سائنس کی ابتدا [illegible] سائنس کی تدریس کے [illegible] پر [illegible] پہنچا ہے کہ اس وقت دنیا [illegible] سائنس کے [illegible] جہاں [illegible] سائنس [illegible] دہائی کے ابتدائی سالوں میں [illegible] اور [illegible] دہائی میں سائنس کی تدریس کے اغراض و مقاصد کے سلسلے میں خود ہمارے ملک اور بیرونِ ملک میں بہت ساری کمیٹیاں بنائی گئیں جن کی مفید سفارشیں سامنے آئیں۔ ۱۹۴۰ء میں نیویارک سے "عمومی تعلیم میں سائنس کا حصہ" کے عنوان سے ایک رپورٹ شائع ہوئی تھی جس میں سائنس کا تعلق زندگی سے قریب تر کرنے اور روزمرہ کے استعمال میں گہرا کرنے پر زور دیا گیا تھا۔ ۱۹۴۶ء کے "ہندوستانی ایئر بک" (Year Book) میں یہ لکھا گیا ہے کہ تیسری دہائی کی ابتدا سے معلومات اور اصولوں کے ذہن نشین کرنے پر کم اور سائنس کے معاشرتی مضمرات پر زیادہ سے زیادہ زور دینے کی روش پیدا ہوتا

---

* لیکچرر، شعبۂ علم کیمیا، ڈیڈ اے اسلامیہ کالج، سیوان

رونما ہو گئے ہیں۔

سائنسی تعلیم میں [illegible] تجربہ گاہ کے کام میں منہمک رہنے اور مسائل کا حل [illegible] سائنسی رویہ اور قدر شناسی پر زیادہ سے زیادہ زور دینے کا عمل تجربہ گاہ کے ذریعہ ظہور میں آیا۔ مختلف شعبہ ہائے سائنس کے ماہرین خود [illegible] نے اس بات پر زور دیا ہے کہ طلبا کو تجربہ گاہوں میں انہیں حالات کے تحت کام کرایا جائے جن کے تحت ایک سائنس داں کام کرتا ہے تاکہ ان کے اندر حقیقی سائنسی اسپرٹ پیدا ہو سکے۔

سائنس کی تدریس کے مقاصد یوں تو بہت سارے ہیں مگر ان میں سے چند خاص مقاصد ذیل عنوانات کے تحت ہو سکتے ہیں۔

۱۔ معلومات (Knowledge)
۲۔ مہارتیں (Skills)
۳۔ صلاحیتیں (Ability)
۴۔ سائنسی انداز فکر یا سائنسی رویہ (Scientific Attitude)
۵۔ سائنسی عادتیں (Scientific Habits)
۶۔ زندگی کو بہتر بنانے کی تڑپ (Thrust - to make human life better)
۷۔ پیشہ ورانہ تعلیم اور اختصاص کی بنیاد فراہم کرنا (Professional Skills and to provide base for livelihood)
۸۔ کائنات میں ہم آہنگی کی جستجو (Thrust - for Unification in Universe)

۱۔ معلومات: سائنس پڑھنے والے طلبا کے اندر چند بنیادی چیزوں کی معلومات لازمی طور پر ہونا چاہیے۔ جیسے بنیادی سائنسی اصول و تصورات کی جانکاری، سائنٹفک مضامین کو سمجھنے کی صلاحیت

— سائنس کی مختلف شاخوں کا باہمی تعلق اور ایک دوسرے پر انحصار [illegible]
— فطری مظاہر عالم کی جانکاری [illegible]
— کائناتی اشیا کی [illegible]
— کائنات میں [illegible]

۲۔ مہارتیں: طلبا کے اندر مندرجہ ذیل [illegible] جس سے سائنسی [illegible] تجربہ گاہ [illegible]
[illegible]

— حاصل شدہ مواد کو منظم اور واضح کرنے کی صلاحیت
— تجربہ کرنے اور نتیجہ اخذ کرنے کی صلاحیت
— تفہیم کی صلاحیت
— مشاہدات سے نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت
— مناسب اور حاصل شدہ خیالات کی [illegible]
— سائنسی اصطلاحات [illegible] کرنے کی صلاحیت
— استدلال اور [illegible] کی صلاحیت

۴۔ سائنسی انداز فکر یا سائنسی رویہ: سائنسی انداز [illegible] سائنس کی تدریس کا سب سے اہم مقصد ہے [illegible] سائنس [illegible] سائنسی انداز فکر پیدا [illegible]

ایک مخصوص نصب العین کے انداز فکر سے سوچنے اور سمجھنے لگیں۔ بقول ڈاکٹر ذاکر:

"اگر سائنس کی تدریس بے روح ہو اور سیکھنے والے اسے بے دلی سے حاصل کریں تو سائنس کی تعلیم محض کورس کی معلومات سے بھر دینے کے مترادف ہوگا اور یہی تحقیق بھی بجائے توہمات میں ایک اضافہ ہو کر رہ جائے گا۔"

ذہنی ... معلومات کے حصول کی خواہش، حصول کے ... پر اعتماد اور ہر لحظے کے سیکھنے کا عمل صرف علم کو ... ممکن ہے وغیرہ وغیرہ، سائنسی انداز فکر میں شامل ہیں۔ کسی بھی مسئلے کو سائنسی انداز سے حل کرنے کے کسی طریقے کو جس میں معقول تدابیر اختیار کی گئی ہوں سائنسی طریقہ کہلاتا ہے۔ اس کام کے لیے مسلسل مشق، محتاط انداز اور مستقل مزاجی درکار ہوتی ہے۔ ایک شخص جس کے اندر سائنسی سوجھ بوجھ ہوگا وہ کسی بھی مسئلے کے حل کے لیے سائنسی طریقہ ہی اختیار کرے گا خواہ کسی میدان میں مسئلے ہی کیوں نہ ہو۔ ایک سائنس داں کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ ایک متعین نتائج تک پہنچنے کے لیے ایک خاص راہ عمل ہی اختیار کرتا ہے۔

سب سے پہلے وہ مسئلہ کا شعور حاصل کرتا ہے، پھر اس کی وضاحت اور شہادت ڈھونڈھتا ہے۔ پھر اعداد و شمار اور مشاہدات کو منظم کر کے اس کی تعبیر کرتا ہے۔ مفروضے کو تشکیل دیتا ہے اور اس کے جانچ کی صحت کی جانچ پڑتال کرتا ہے اور پھر تجربہ کر کے اس کے نتائج اخذ کرتا ہے۔ یہ سارے مراحل سائنسی رویہ کہلاتے ہیں۔

طالب علم میں سائنسی رویہ پیدا کرنے کے لیے مسٹر ہیلپ (Hannah ...) نے ہائی اسکول کے طلبہ کو دو گروپ میں تقسیم کیا۔ ایک کو استقرائی استخراجی (Instruction and Deduction (Method) سے پڑھایا اور دوسرے کو استخراجی طریقہ (Abstraction Method) سے گزر کر عمل کیا۔ ... کے متعلق دونوں گروپ کو بنیادی حقائق کا علم اور اصول کے حصول میں یکساں کامیابی ملی مگر جہاں تک سائنسی طریقے اور سائنسی انداز فکر کو کام میں لانے کا سوال تھا استقرائی استخراجی طریقہ (Instruction and Deduction Method) والے گروپ کے لڑکوں میں بہت زیادہ پایا گیا۔ سائنسی انداز فکر پیدا کرنے کے لیے طلبہ کے اندر مندرجہ ذیل صفات پیدا کرنے کی کوشش اساتذہ کو کرنا چاہیے۔

- مشاہدے اور فکر میں تنقیدی انداز پیدا ہو۔
- دوسرے کے نقطۂ نظر کا احترام کرے اور نئی جانکاری پر اطمینان و خوشی محسوس کرے
- اپنے چاروں طرف پائے جانے والی اشیاء کی معلومات کا تجسس ہو۔
- توہمات اور بے بنیاد باتوں پر اندھا اعتماد نہ کر کے تحقیق و جستجو جاری رکھے
- اپنے نتائج میں سچائی اور ایمانداری سے کام لے
- کسی مسئلہ کے حل کے لیے منصوبہ بند طریقہ اختیار کرے اور اپنے نتیجوں کو بغیر مرعوب ہوئے غیر جانب دار ہو۔
- علت اور معلومات کے باہمی تعلق کا قائل ہو۔
- کائنات پر کھلے ذہن سے غور و خوض کو اپنا مشغلہ بنائے۔
- حقائق کا متلاشی ہو اور مبالغے سے پرہیز کرے۔

۵۔ سائنسی عادتیں: سائنس کی تدریس کے ذریعے طلباء میں پسندیدہ اخلاقی و سماجی عادتیں پیدا ہونی چاہییں جیسے:

دیانت داری، سچائی، رواداری، خود اعتمادی
محنت و لگن، تلاش و جستجو اور کامیابی
کا یقین وغیرہ وغیرہ۔

۶۔ زندگی کو بہتر بنانے کی تڑپ: سائنس کے طلباء کے اندر گھریلو، سماجی، ملی اور قومی ماحول، معاشی اور تمدنی حالات کو بہتر کرنے کی تڑپ بدرجۂ اولیٰ پیدا ہونی چاہیے ساتھ ہی سائنس کے طالب علموں کے اندر حفظانِ صحت کے اصولوں کی پابندی سختی سے ہونی چاہیے۔

۷۔ پیشہ ورانہ تعلیم اور اختصاص کی بنیادیں فراہم کرنا: تدریس سائنس کا یہ کام ایسا ہونا چاہیے جو طلبا میں پیشہ ورانہ مہارت پیدا کر سکے اور جو طالب علم کو اعلیٰ تعلیم یا سائنس کے میدان میں آگے بڑھنے کی بنیادیں فراہم کرے اس عمل میں نصاب تعلیم کا بنیادی عمل ہوتا ہے۔

۸۔ کائنات میں ہم آہنگی کی جستجو: یہ کائنات جس میں ہم رہتے بستے ہیں ایک منظم اور باقاعدہ اصول ضابطہ کے تحت چل رہی ہے۔ اس کائنات میں ہر شے ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے اور ایک ربط کے ساتھ جڑی ہوئی ہے اور ایک قانونِ قدرت سے گویا بندھی ہے۔ مطالعہ و مشاہدۂ قدرت سائنسی ذہن بنانے میں بڑی بڑی لائبریریوں اور دارالعمل (Library & laboratory) سے زیادہ مفید ہے۔ بلکہ یہ کائنات خود سب سے بڑا دارالعمل ہے جس کے مطالعے و مشاہدے صحیح شکل میں موجود اصول سمجھنے کی دور اندازیں ابھارتی ہیں۔

جارج واشنگٹن کارور (George washington Carver) کے مطابق خالق کائنات ہم سے مخاطب ہے اور ہم اس کی آواز سن سکتے ہیں بشرطیکہ ہم اس نشریاتی آلے کا صحیح استعمال جانیں۔ سائنس کی تعلیم کا بنیادی مقصد کائنات ہم آہنگی کی تلاش کرنے کا شعور اور ربط کی کھوج کی تڑپ ہی ہونا چاہیے ساتھ ہی ایک سائنس داں کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ سائنس کو انسانی فطرت سے ہم آہنگ کرے۔ اشیاء ہی نہیں بلکہ یہ پوری کائنات ایک کل کی حیثیت سے ہے اور اسی حیثیت سے ایک سائنس داں کو اس کے خاص Property کا طالب بھی ہونا چاہیے اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب طلبا کے اندر سائنسی ذہن کے ساتھ صحیح معلومات کا ذخیرہ موجود ہو، ساتھ ہی وہ ایمانداری سے صحیح نتائج بھی اخذ کر سکے اور بقول علامہ اقبالؒ ؎

حقیقت ایک ہے ہر شے کی خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرہ کا دل چیریں

باقی متعلقہ صفحہ نمبر ۳۵

کی فراہمی شامل ہیں، دریا پر آنے والے افسروں کے بنگلے، سکول، بازار، کم از کم ایک سرکاری ہوٹل سیاحوں کے لیے کمرے اور مکان، تفریح کے لیے باغات اور آمد و رفت کے لیے سڑکیں شامل ہیں، نہر اور بیراج سے ضروری پانی کے نکاس پہ ندی نالات مقرر کی جاتی ہے اور یہ کام جو دروازے ہوں گے بڑے لوہے کے دروازوں سے لیا جاتا ہے۔

... اگر ذرہ کا دل چیریں!

وہاب تسنیم ★

زندگی گزارتے ہوئے ہمیں چاہیے کہ فطری سلسلہ، امور کو نظر انداز نہ کریں ہم اس فریب میں مبتلا رہ سکتے ہیں کہ چونکہ مخلوقات میں ہم ایک مقام خاص کے مالک ہیں، اس لیے عام قانونِ فطرت کی گرفت سے آزاد رہ سکتے ہیں۔

"اشرف" اور "آزاد" ہونے کے احساس نے ہمیں مغالطہ انگیز اعتماد پیدا کر دیا ہے۔ ہم نے بے لاگ تجربے کے بغیر ہی یہ یقین کر لیتے ہیں کہ درختوں پودوں اور جانوروں کے مقابلے میں ہم برتر و بزرگ ہیں۔ ان حالات میں یہ بات بہت اہم ہو جاتی ہے کہ واضح طور پر ہم یہ جان لیں کہ اس کارگاہِ فطرت میں ہمارا صحیح مقام کیا ہے؟

ارسطو کے زمانے سے یہ بات بطور ایک مسلمہ کے چلی آتی ہے کہ انسانی جسم ایک خود کار اکائی ہے جس میں تمام اعضائے جسمانی ایک مشترکہ کارکردگی کے رشتے میں منسلک ہیں۔ یعنی ہر جزو اپنی جگہ ایک مشترکہ کل کی خدمت پر مامور ہے۔

انسانی جسم، خلیوں، خون اور شعور سے مرکب ہے۔ یہ تینوں عناصر بظاہر منفرد ہیں مگر ایک دوسرے لاینفک بھی ہیں، مرزا محمد عبد الغفار آپ نے خلیے کے عناصر فزیکل، کیمیکل اور بیالوجیکل ماحول سے غیر منفک بھی ہیں۔

خون اور خلیے بنانے والی تمام اشیا بلاواسطہ یا بالواسطہ ہمارے مزاج کے پودوں اور جانوروں کے ذریعے ہمیں ملتی ہیں۔ ہمارے جسم کا ایک بڑا حصہ، جھرنوں، ندیوں یا بارش کے پانی کا پروردہ ہے — زمین کے اندر سے ملنے والا پانی، مقررہ تناسب میں معدنی افرات بھی رکھتا ہے۔ یہی پانی خلیوں کی نچلی سطح اور خون کا جزو بنتا ہے۔ جھرنوں اور ندیوں کے پانی کی طرح اس میں بھی سوڈیم (Sodium) پوٹاشیم (Potassium) میگنیشیم (Magnesium) کیلشیم (Calcium) لوہا (Iron) تانبا مینگنز، جست اور آرسنک کے کمیاب جزو بھی شامل ہوتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہمیں جانوروں کے گوشت، دودھ، دالوں، ترکاریوں اور پھلوں سے حاصل ہوتے ہیں۔ درخت اور جانور ہمیں نائٹروجن اشیا، چربی، شکر، نمک اور حیاتین ہمیں فراہم کرتے

★ ریڈر اِن اردو۔ وی۔آر۔ کالج نیلور۔

ہیں جو ہماری نشوونما کے لیے ضروری ہیں۔ ہمارے جسم سے متعلق کیمیائی مرکبات، اسی طرح کے مرکبات ہوتے ہیں جو سورج، چاند اور ستاروں کی بناوٹ میں کام آتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ ہم اپنے جسم کی ساخت پرداخت کے لیے زمین، ہوا اور پانی سے جو کیمیائی اجزا حاصل کرتے ہیں یہی اجزا نظامِ کائنات کی کارکردگی میں ممد و معاون بھی ہیں۔

مختصر یہ کہ ہمارا جسم بھی اس نظام کائنات کا ایک جزو ہے جو اسی طرح قانونِ فطرت کا اتباع کرتا ہے جس طرح دنیا کی دوسری مخلوقات کرتی ہیں۔ ہمارا جسم انھیں اجزا سے نشوونما پاتا ہے جو طبعی ماحول اسے فراہم کرتا ہے۔ مزید براں ہم اپنے افعال و اعمال کے لیے اپنے ماحول سے ایک رشتۂ خاص رکھتے ہیں۔ اس رشتۂ خاص پر نظر رکھنے والے کہتے ہیں کہ ماحول ایک قفل ہے اور آدمی اس کی چابی۔

ہمارا یہ کرۂ ارض ہوا کا ایک ایسا دبیز حلقہ رکھتا ہے۔ جو پہاڑوں کی اونچی اونچی چوٹیوں پر رہنے والے جانوروں کی زندگی میں بھی معاون ہوتا ہے۔ یہی ہوا کا دبیز پردہ، درختوں، پودوں اور جانوروں کو سخت سردی سے اور سورج کی نقصان دہ تیز کرنوں سے محفوظ و مامون رکھتا ہے۔

مشتری پر ہم خود اپنے وزن سے غیر متحرک ہو جاتے ہیں۔ چاند پر بہت ہلکے لگتے ہیں۔ بقول ہنڈرسن (Henderson) ہمارا ماحول اپنی خصوصیات میں تین مخصوص عوامل کا رہینِ منت ہے۔ آکسیجن، ہائیڈروجن اور کاربن جو پانی اور کاربونک ایسڈ کا مرکب ہے پانی اور کاربونک ایسڈ زمین کی گرمی متعین کرتی ہیں مزید یہ کہ پانی تقریباً تمام کیمیائی عوامل کو مایہ کی شکل میں مبدل کر دیتا ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو درخت اور پودے اپنی غذا سے محروم رہ جائیں۔ ہائیڈروجن، آکسیجن اور کاربونک ایسڈ اپنی جگہ متحرک ترین عوامل ہیں یہ مرکبات تیار کرتے ہیں اور سب سے زیادہ پیچیدہ طبعی اور کیمیائی سالماتی مادوں کی تیاری کا کام بھی یہی کرتے ہیں۔ یہ پانی کا احسان ہے کہ وہ کیمیکل مادوں کو محلول میں تبدیل کر دیتا ہے، جب کہیں پودے، درخت جانور اور انسان اپنی مرکب غذائیں تیار کرنے کے قابل ہوتے ہیں۔ اس طرح اگر ہم اپنے ماحول پر ایک گہری نظر ڈالیں تو محسوس کریں گے کہ یہ ہماری زندگی کا سامان فراہم کرتا ہے اور زندگی اپنے وجود کے قیام کے لیے موزوں اور مناسب ساز و سامان اپنے ماحول سے اخذ کرتی ہے۔

زندگی اس فریضہ کی انجام دہی دو طریقوں سے کرتی ہے۔ پہلا کام اپنی نشوونما کے لیے غذا کو اپنے ماحول سے جذب کرنا یا جمع کرنا ہے۔ اس ضمن میں ہمارے عضویات بھی ہوا سے آکسیجن جذب کرتے ہیں اور خود اپنی نشوونما کے وسائل حاصل کر لیتے ہیں۔

دوسرا کام ماحول کے خلاف پیدا ہونے والے یا پائے جانے والے ردِ عمل کو آہستہ آہستہ ماحول سے مانوس کرانا ہے۔ یہ انس یا سمجھوتہ فطری مطابقت پذیری سے پیدا ہوتا ہے۔ اس میں مداومت سے اس فطری مطابقت پسندی میں عمق اور وسعت پیدا ہوتی ہے۔ یعنی خلیے رگ و ریشوں کے مراکز، پٹھے، غدود، دل اور تمام اعضا اپنے ماحول سے مانوس ہو کر اپنے وظیفۂ حیات کو انجام دیتے رہتے ہیں۔

[انگریزی سے استفادے کے ساتھ]

مولانا عبدُالواحِد سندھی

غفار اشدی *

مولانا عبدالواحد سندھی سندھ سے ہند تک جانے پہچانے جاتے تھے۔ انھوں نے جس تسلسل و انہماک سے سندھی اور اردو علوم و ادبیات کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں عدیم المثال خدمات انجام دیں، کئی نسلوں کی ذہنی نشو و نما، تعلیمی ترقی، صالح ماحول اور معاشرے کی تعمیر و تشکیل میں جس اخلاص و ایثار کے ساتھ اہم کردار ادا کیا وہ کبھی فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کا علمی، تعلیمی تہذیبی اور ادبی سفر نصف صدی سے زاید چھ دہائیوں پر محیط ہے۔ ان کی جد و جہد سے بھرپور زندگی اپنی مثال آپ تھی۔

مولانا عبدالواحد سندھی انصر راج پوت کے اس ہند و قبیلے سے تعلق رکھتے تھے جس کے بزرگوں نے ساتویں صدی ہجری میں شیخ الاسلام حضرت شیخ بہاءالدین زکریا ملتانی رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھوں اسلام قبول کیا تھا۔ مولانا عبدالواحد سندھی اس لیے کہلاتے ہیں کہ ۱۹۰۵ء میں "سندھ" کے ایک گاوں" ہالے جی قربت" تحصیل منوماتن ضلع سکھر میں پیدا ہوئے۔ خود مولانا سندھی کا بیان ہے کہ جب وہ نو سال کے تھے تو ان کے والد عبدالوارث ڈیسنے کا انتقال ہوگیا مولانا کے ایک قریبی رشتہ دار حاجی عماد اللہ نے ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت پہ خاص توجہ دی۔ ان ہی کے زیر عاطفت عبدالواحد صاحب نے قریبی گاوں گھوٹکی اور سلیمان پور کے دینی مدارس میں مولانا حبیب اللہ اور مولوی نور محمد جاجیڑا سے عربی، فارسی اور سندھی کی ابتدائی تعلیم خالص دینی و اسلامی ماحول میں حاصل کی۔

مولانا نے ایک گفتگو میں بتایا تھا:

"۱۹۲۲ء کا ذکر ہے کہ مجھے اپنے گاوں میں ایک اخبار ملا اس میں میں نے جامعہ ملیہ کے قیام اور اس کے تعلیمی اغراض و مقاصد سے متعلق ایک خاکہ پڑھا تو میرے دل میں یہ تمنا جاگ اٹھی کہ میں بھی جامعہ ملیہ میں تعلیم حاصل کرنے کی سعادت حاصل کروں لیکن میری حالت ایسی نہ تھی کہ میں علی گڑھ جا سکتا۔ میں نے اس کا

---

* معتمد اعزازی دائرہ ادب پاکستان، بی ۴۸، شاہ فیصل ٹاون، ملیر ہالٹ، کراچی، پاکستان

تذکرہ اپنے ایک بزرگ حاجی نور محمد سے
کیا تو انھوں نے فرمایا کہ تم علی گڑھ ضرور
جاؤ، وہاں تعلیم حاصل کرو۔ یہ بات اہلِ
سندھ کے لیے قابلِ فخر ہوگی۔

سچ ہے اللہ تبارک و تعالیٰ بڑا کارساز ہے جب وہ کسی سے کام لینا چاہتا ہے تو اس کے لیے اسباب مہیا کر دیتا ہے۔ اسی لیے تو کہتے ہیں "جہاں چاہ وہاں راہ" ارادہ نیک ہو تو اللہ تعالیٰ کی مدد شاملِ حال ہوتی ہے۔ عبدالواحد صاحب یکہ و تنہا کشاں کشاں علی گڑھ پہنچے، وہاں ڈاکٹر محمود حسین خاں صاحب سے ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں جو جامعہ ملیہ کے سربراہ تھے، مولانا سندھی کے عزائم اور تعلیم حاصل کرنے کے جذبۂ شوق سے متاثر ہوئے۔ ۱۹۲۳ء میں عبدالواحد صاحب کا داخلہ جامعہ ملیہ میں ہو گیا۔ ۱۹۲۵ء میں جامعہ ملیہ علی گڑھ سے دہلی منتقل ہو گئی جامعہ ملیہ اس وقت بھی پورے ہندوستان میں مثالی درس گاہ تھی۔ قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ وہاں ذریعۂ تعلیم اردو تھی۔ عبدالواحد صاحب جب علی گڑھ گئے تھے اردو سے نابلد تھے۔ انھوں نے اپنی بیگم محترمہ نور فاطمہ صاحبہ کے ماموں سے اردو سیکھی۔

عبدالواحد صاحب ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے لائق شاگردوں میں شمار کیے جاتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت پر عبدالواحد صاحب نے ۱۹۳۰ء میں اعلیٰ تربیت کے لیے موگا ٹیچرز ٹریننگ انسٹی ٹیوٹ فیروز پور (پنجاب) میں داخلہ لیا۔ وہاں جدید طرزِ تعلیم اور درس و تدریس کی سائنٹیفک تربیت حاصل کر کے ۱۹۳۲ء میں واپس آئے تو ڈاکٹر ذاکر حسین خاں نے انھیں جامعہ ملیہ کا استاد مقرر کر دیا۔ تنخواہ اڑھائی سو روپے ماہانہ دی جانے لگی۔ ۱۹۳۳ء میں ہی ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کی خواہش پر عبدالواحد صاحب کی شادی دلی۔ سید انور علی شاہ صاحب کی صاحب زادی محترمہ نور فاطمہ سے ہو گئی۔ محترمہ طبیہ کالج دہلی کی سند یافتہ ہیں اور ملیہ میں استاد رہ چکی ہیں۔ بفضلہ تعالیٰ بقیدِ حیات ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی عمرِ عزیز دراز کرے۔

اسی زمانے میں مولانا عبدالواحد سندھی نے سندھ کے مشہور قومی رہنما سر عبداللہ ہارون سے رابطہ قائم کیا۔ جامعہ ملیہ کی ترقی، توسیع اور استحکام کے لیے ان کی توجہ مبذول کرائی۔ عبداللہ ہارون سندھ کے ان چیدہ مخلص رہنماؤں میں سے تھے جو قوم کے نونہالوں کو زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنے، مسلمانوں کے وقار کو بلند کرنے کی خاطر کام کرنے کو اپنی زندگی کا نصب العین سمجھتے تھے۔ عبداللہ ہارون نے جامعہ ملیہ کی کارکردگی، تعلیمی منصوبہ بندی کی تفصیلات سے آگہی حاصل کی۔ جامعہ کی مستقل مالی امداد کا انتظام کیا۔ عبداللہ ہارون نے سندھ کے بے شمار طالب علموں کو اپنے اخراجات پر تعلیم دلوائی۔ مولانا سندھی کو بھی وظیفوں کے اجرا سے نوازا۔ عبداللہ ہارون ہی کی خواہش پر مولانا نے بحیثیت استاد دو سال مدرسہ مظہر العلوم کراچی میں بھی فرائض انجام دیے۔

مولانا عبدالواحد سندھی اپنے جن اساتذہ کے نام انتہائی افتخار و احترام سے لیا کرتے تھے، ان میں ڈاکٹر ذاکر حسین خاں کے علاوہ ڈاکٹر انصاری (حکیم اجمل خاں کے رفیقِ خاص اور گاندھی جی کے قریبی ساتھی) اور تاریخ کے استاد پروفیسر محمد مجیب قابلِ ذکر ہیں۔

مولانا کے ایامِ طالب علمی کے ساتھیوں میں ڈاکٹر محمود حسین کے علاوہ پنجاب کے عبدالخالق، دکن کے عبدالغفار، سندھ کے پیر الٰہی بخش، قاضی فضل اللہ

شمس الدین علوی اور محمد مرتضیٰ قاسمی وغیرہ کے نام بڑی معروف مجلات سے لیا کرتے تھے۔

مولانا نے تقریباً پچاس کتابیں تصنیف کیں ان میں [illegible] جن کتابیں [illegible] ان کی تعداد تین ہے [illegible] مولانا نے ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کی تلقین پر [illegible] تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب مولانا کی تحریروں کو بہت پسند فرماتے تھے۔ ان [illegible] سے [illegible] کا [illegible] بعض [illegible] اور [illegible] کے نصاب [illegible] تعلیمات [illegible] سے متعلق [illegible]

[illegible]

[illegible] آپ [illegible]

[illegible] کون تھے؟

[illegible]

[illegible] اسلام کے [illegible]

[illegible] مولانا [illegible] نہیں کیا جا سکتا [illegible] تہذیب، ادب، ثقافت، [illegible] اور [illegible] کے متعلق [illegible] میں [illegible] مقالات [illegible] کراچی میں شائع ہوئے مولانا اس رسالے کے چیف ایڈیٹر تھے۔ انھوں [illegible] نے ان کا بہترین [illegible] جلدوں میں مرتب کر کے شائع کیا۔ ان میں [illegible]

[illegible]

[illegible]

ماک بنارا ابل (ادب کا شگفتہ پھول) [illegible] کی گئی تھیں [illegible] درج [illegible]

[illegible]

ہیں اور آج بھی اہل تحقیق کے لیے حوالے کے کام میں آتی ہیں۔ خوش قسمتی سے مولانا سندھی کی عطا کی ہوئی یہ تمام کتابیں راقم کے ذاتی کتب خانے میں موجود ہیں جن سے وقتاً فوقتاً مطالعہ و استفادہ کی سعادت حاصل ہوتی رہتی ہے۔

دیکھنے والوں نے دیکھا ہے کہ مولانا کی قد آور شخصیت کراچی شہر کے کسی ہجوم میں بھی دور سے پہچانی جاتی تھی۔ لمبا قد، سر پر جناح کیپ، ہلکے رنگ کی شیروانی، چھوٹے پائنچے کا پاجامہ زیب تن کیے ہاتھ میں چرمی بیگ تھامے تیز تیز چلتے ہوئے دکھائی دیتے تھے۔ دفتر میں گھنٹوں جم کر کام کرنا، پریس میں جا کر خود کام کی نگرانی کرنا، اول تا آخر ہر کام کو تکمیل تک پہنچانا مولانا کا معمول تھا۔ ہمیشہ ہشاش بشاش رہتے ہوئے ہر وقت چاق و چوبند نظر آتے تھے۔ بات بات پر مسکراہٹ ان کی شخصیت میں عجیب دلکشی پیدا کر دیتی تھی۔

مولانا "[illegible]" سے ریٹائر ہوئے تو ڈاکٹر محمود حسین نے انھیں جامعہ ملیہ ملیر کے شعبۂ تصنیف کا نگران مقرر کیا۔ بچوں کا رسالہ "ستارہ" ان ہی کی ادارت میں پانچ سال تک شائع ہوتا رہا۔ "ستارہ" کی مکمل جلدیں اس خاکسار کے بھی کتاب خانے میں موجود ہیں۔ جن دنوں مولانا جامعہ ملیہ ملیر سے وابستہ ہوئے یہ سعادت راقم الحروف کے حصے میں آئی کہ وہ اپنے گھر جانے سے پہلے ڈاکٹر [illegible] کے غریب خانے میں گزارتے۔ کبھی کبھی ستارہ کے لیے مضمون بھی لکھوا کر لے جاتے۔ بلاشبہ ستارہ کی اشاعت سے بچوں کے ادب میں گراں قدر اضافہ ہوا ہے۔

ڈاکٹر محمود حسین کی وفات کے بعد ستارہ [illegible]

بند ہوا تو مولانا بیگم داؤد پوتہ کے سندھی ماہنامہ "ادیون" برائے خواتین کے اڈیٹر ہو گئے۔ ان ہی دنوں ۲، ۱۹۷۹ میں مولانا کا ایک جواں سال بیٹا سہیل اچانک اللہ کو پیارا ہو گیا۔ بیٹے کی جواں مرگ نے باپ کی کمر [illegible] لگے۔ لیسے [illegible] کا انگ انگ ایسا ٹوٹا کہ ۳ جنوری ۱۹۸۸ کو اس جہان رنگ و بو سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے۔

مولانا عبدالواحد سندھی بے حد دلآویز اور باوقار شخصیت کے مالک تھے مشرقی تمدن کا سراپا نمونہ تھے۔ سادہ لوح، منکسر المزاج، محنت [illegible] میں اپنی مثال آپ۔

ایک روز سر سید ڈھونڈے ہوئے [illegible] بالک کے سامنے، جو زیر تعمیر تھا، بیٹھے تھے کہ ایک چھوٹا لڑکا زار و قطار روتا ہوا ان کے پاس پہنچا اور شکایت کی کہ مجھ کو فلاں بڑے لڑکے نے مارا ہے۔ اس کے رونے سے وہ اس طرح مضطرب ہوئے کہ فوراً اس کے ساتھ چل کھڑے ہوئے اور کہا کہ وہ لڑکا کہاں ہے؟ اس کے کمرے پر پہنچ کر اس سے بلا کچھ دریافت کیے اپنے ڈنڈے سے اس کو پیٹ ڈالا۔ وہ ایک دو ڈنڈے کھا کر بھاگ گیا اور سید صاحب اپنی کوٹھی تشریف لے آئے۔ اس کے بعد چند بڑے لڑکے سید صاحب کے پاس گئے اور حقیقت حال اس طرح بیان کی کہ یہ چھوٹا لڑکا بہت شیطان ہے اور لڑکوں کو تنگ کیا کرتا ہے اس وجہ سے انہوں نے [illegible] ہو کر اسے مارا تھا۔ یہ سن کر سید صاحب کو بہت افسوس ہوا [illegible] اور اس لڑکے کو اپنی کوٹھی پر بلا کر معذرت چاہی۔ یہ وہ باتیں تھیں جن کی وجہ سے لڑکے سر سید پر [illegible] تھے۔

مسلمانوں کے لیے ایک روشن نظامِ عمل

محمد مختار اصلاحی *

افسوس کہ اس وقت مسلمان عام طور سے دو گروہ میں بٹ گئے ہیں:

۱- ایک گروہ تو وہ جو خوف زدہ اور مایوس ہے۔

۲- دوسرا وہ جو غافل اور بدمست ہے۔

اور یہ دونوں ہی صورتِ حال مسلمانوں کے لیے انتہائی تشویش ناک و خطرناک ہے۔ خوف اور مایوسی کے بعد انسان کے لیے ترقی و کامیابی کی ساری راہیں بند ہو جاتی ہیں اور ایک غافل و بدمست کو سوا تباہی و بربادی کے اور کچھ نہیں ملتا۔

مسلمان اگر چاہیں تو آج بھی آسانی کے ساتھ خوف و مایوسی اور غفلت و بدمستی کی دلدل سے نکل کر خوش حالی اور ترقی کے میدان میں بہت ہی آگے بڑھ سکتے ہیں انہیں صرف چند باتوں پر خاص طور سے دھیان دینا ہوگا۔

۱- آج سے کوئی کسی کو برا نہ کہے اور خود اپنی کمزوری و برائی کو دور کرنے میں ہمہ تن مصروف ہو جائے۔

۲- کوئی کتنا ہی اشتعال دلائے لیکن اس اشتعال کو ہرگز قبول نہ کیا جائے کیوں کہ اشتعال طاقت کو گھٹا دیتا ہے۔

۳- کتنا ہی نقصان کیوں نہ ہو لیکن صبر و ضبط کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اس لیے کہ صبر و تحمل کے بعد نقصان کی تلافی آسان ہو جاتی ہے۔

۴- نقصان پہنچانے والے سے بھی انتقام و بدلہ لینے کی کبھی کوشش نہ کی جائے، اس میں اپنا قیمتی وقت برباد ہو جائے گا۔

۵- ہر طرح کی ابتری لت، فضول خرچی اور بے ہودہ رسومات کو چھوڑ کر اسی پیسے سے ہر قسم کی تعلیم گاہیں، صحتی ادارے، ہسپتال اور کارخانے قائم کرنے کی طرف پوری توجہ دی جائے۔

۶- گھر میں کوئی شخص ایسا نہ ہو جو علم و ہنر سے بے بہرہ ہو۔ جس طرح وہ اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ بھرنے کے لیے ہر جتن کرتا ہے بالکل اسی طرح علم و ہنر اور اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کرنے

* اصلاحی دواخانہ، محمد علی روڈ، بمبئی، مہاراشٹر۔

کے لیے بھی ہر ممکن کوشش و تدبیر اختیار
کرے۔

۷۔ باتیں کم کی جائیں، وقت ضائع
نہ کیا جائے اور سارا وقت بچا کر
ضروری کاموں میں لگایا جائے۔

۸۔ باہمی مدد کے اصول پر ایک بھائی
دوسرے بھائی کی صدق دل اور خدا
واسطے مدد کرے۔

۹۔ ہر شخص روزانہ بستر پر جانے سے
پہلے اپنا محاسبہ خود کرے کہ اس
نے اوپر کے دستور العمل پر کتنا عمل
کیا ہے اور قوم و ملک کی بہبودی
اور ترقی کے لیے کون سی خدمت انجام
دی ہے۔

۱۰۔ اس نظام عمل کو ایک تحریک
کی شکل دیجیے اور اس تحریک کو ہر گھر
اور ہر فرد تک پہنچانا اپنا فرض سمجھیے
اور اسے کامیاب بنانے کے لیے ایک
دوسرے کی مدد کیجیے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے
کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:
"جس نے بغیر کسی رخصت و اجازت
کے اور بغیر کسی بیماری کے روزہ افطار
کرلیا تو عمر بھر کے روزے اس کی
تلافی نہ کرسکیں گے اگرچہ وہ سارے
زمانے کے روزے رکھ لے۔"
ترمذی۔

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد نمبر ۱۳- شمارہ ۲ (فروری ۱۹۹۴ء)

آب پاشی کی خاص نہر

سید شفیق النبی*

یہ نہر دریا سے نکلتی ہے اور اس کو ہم بڑی نہر بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ نہر شاخ در شاخ ہو کر کھیت میں پانی لے جاتی ہے اس نہر پر کاموں کی تفصیل بہت طویل ہے۔ یہاں صرف ان کاموں کا تذکرہ ہے جو نہر کو دریا سے نکالنے کے لیے ضروری ہیں۔ ان کی تفصیل مندرجہ ذیل ہے۔ یہ کام چھوٹے باندھ جس کو بیراج بھی کہتے ہیں، اس سے متعلق ہیں:

الف۔ نہر پر بنا ہوا وہ پل جو دریا سے نہر میں پانی داخل کرنے میں مدد دیتا ہے۔

ب۔ دریا پر بنا ہوا پل جو دریا کا پانی روک کر نہر میں داخل کرتا ہے۔

ج۔ نہر کے پل کے نیچے پائے جو چھ سے آٹھ میٹر کے فاصلے پر ہوتے اور دریا کے پل کے نیچے پائے جو دس سے بیس میٹر کے فاصلے پر ہوتے ہیں۔

د۔ پایوں کے نیچے کنکریٹ کا فرش جو ایک میٹر سے تین میٹر تک موٹا ہوتا ہے، دریا پر کنکریٹ کے فرش کی لمبائی دریا کی چوڑائی کے برابر ہوتی ہے اور اس کی چوڑائی ساڑھے ستر میٹر تک ہوتی ہے۔

ہ۔ فرش کے نیچے دریا کی پوری چوڑائی میں فولاد کی کھڑی چادریں جن کی تعداد دو سے چار تک ہوتی ہے لگائی جاتی ہیں ان چادروں کی گہرائی چار سے چھ میٹر تک ہوتی ہے

و۔ نہر اور دریا کے پایوں کے درمیان لوہے کے بڑے دروازے لگے ہوتے ہیں جو بجلی کی مدد سے اوپر اٹھانے سے کھلتے ہیں۔ ان کی مدد سے دریا اور نہر کا پانی روکا اور نکالا جاتا ہے۔

ز۔ دریا کے پل پر سڑک عام راستے کے طور سے اور نہر کے پل پر سڑک خاص طور سے استعمال ہوتی ہے۔ ان سڑکوں کے ایک طرف لوہے کے دروازے اٹھانے اور گرانے کی مشین لگی ہوتی ہے۔

ح۔ نمی کو اوپر چڑھنے سے روکنے کے لیے فرش کے اوپر اور پایوں کے نیچے تانبے کی چادر لگائی جاتی ہے۔

---

* سابق پروفیسر (ریٹائرڈ) شعبہ سول انجینئرنگ، اے ایم یو علی گڑھ ۔ بیت النبی دودھ پور، علی گڑھ

ط کنکریٹ کا فرش جس کا اوپر تذکرہ ہوا ہے دریا کی تلی میں ہوتا ہے اور اس پر کنکریٹ کی ایک دیوار جو ایک سے ڈیڑھ میٹر ہوتی ہے بنائی جاتی ہے۔ اس کنکریٹ کی دیوار پر لوہے کے دروازے آکر رُکتے ہیں۔ لیکن جس طرف سے نہر نکلتی ہے اس طرف دریا پر بنے ہو۔ یہ چار یا پانچ دروں کے دروازے فرش تک جاتے ہیں۔ ان دروں کو ریت صاف کرنے کے لیے کام میں لایا جاتا ہے اور ان چار یا پانچ دروں میں کنکریٹ کے فرش پر کنکریٹ کی دیوار نہیں ہوتی ہے۔

ریت صاف کرنے والے دروں اور باقی دروں کے درمیان دو چھوٹی نہریں بنائی جاتی ہیں جو اوپر کی طرف سے دریا کا پانی بیرج کے نیچے کی طرف لے جاتی ہیں۔ ان میں سے ایک نہر سیدھی ہوتی ہے اور اس سے پانی تیزی سے بہتا ہے۔ کسی زمانے میں یہ نہر درخت کے تنے اور اوپر کی طرف سے نیچے کی طرف بہانے کے کام آتی ہے۔ آج کل اس کا استعمال دریا کے نیچے کی طرف پانی کی ضرورت پورا کرنے کے لیے اس وقت ہوتا ہے جب بیرج کے تمام دروازے بند ہوں۔ اس نہر میں سے پانی دن رات برابر بہتا ہے۔ دوسری نہر میں پانی گھوم کر جاتا ہے جس سے پانی کی رفتار بہت کم ہو جاتی ہے۔ یہ نہر مچھلی کے لیے راستے کا کام کرتی ہے اور اس کو مچھلی سیڑھی کہتے ہیں۔ سردی کے موسم میں مچھلی کم سرد پانی کی تلاش میں اوپر کے علاقے سے نیچے میدان میں آجاتی ہے اور برسات میں صاف پانی کے لیے پھر واپس چلی جاتی ہے۔

پہلے جب مچھلی کی سیڑھی نہیں بنتی تھی ہزاروں مچھلیاں تیز پانی کی نہر سے اوپر جانے کی کوشش میں مر جاتی تھیں۔

ی بیرج سے نوے ڈگری کے زاویے سے دریا کے اندر پایوں کے ساتھ چند درمیانی دیواریں بنائی جاتی ہیں جو پانی کو بیرج سے سیدھا آنے میں مدد دیتی ہیں۔ ان درمیانی دیواروں میں سے نہر کی طرف بنی ہوئی دیوار زیادہ لمبی ہوتی ہے اور اس کو نہر کے نکاس کے مطابق دائیں یا بائیں کنارے کی دیوار کہتے ہیں۔

ک دریا کے دونوں جانب کناروں کو پکا بنایا جاتا ہے اور بیرج کو ان میں جوڑ دیا جاتا ہے تاکہ دریا کنارا کاٹ کر نہ جا سکے۔

ل کنکریٹ کے فرش کی حفاظت کے لیے اس سے ملے ہوئے کنکریٹ کے وزنی چوکور ٹکڑے دریا کی تلی میں اوپر اور نیچے دونوں طرف قطاروں میں رکھے جاتے ہیں۔ اوپر کی طرف تین یا چار قطاریں ہوتی ہیں اور نیچے کی طرف آٹھ یا دس قطاریں ہوتی ہیں یہ بغیر سمنٹ سے جڑے ہوئے برابر برابر رکھے جاتے ہیں

م بیرج کے اوپر اور نیچے کی سمت کئی کلومیٹر تک دریا کے راستے کو سدھارنے کے کام کیے جاتے ہیں تاکہ بیرج بننے کے بعد دریا اپنے راستے کو بدل نہ سکے۔

ن بیرج کے ضروری کاموں میں ملازمین

باقی صفحہ نمبر ۲۰ پر ملاحظہ فرمائیے

موجودہ نظامِ تعلیم

نیاز فاطمہ نسیم

موجودہ نظامِ تعلیم سے بحث کرتے ہوئے جن نکات پر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ نصابِ تعلیم ۲۔ ذریعۂ تعلیم ۳۔ معلم و متعلم کا رشتہ ۔ ۴۔ مخلوط تعلیم

آزادئ ملک کے بعد سے ہندوستان میں جو نظامِ تعلیم مروج ہے وہ پوری طرح فرنگیت یا مغربیت سے متاثر ہے بلکہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ پورے کا پورا مغربی نظامِ تعلیم ہندوستان میں رائج ہے اور یہ ہم ہندوستانیوں، خصوصاً مسلمانوں کی بہت بڑی بدنصیبی یا اخلاقی کمزوری اور فقدانِ خوداعتمادی ہے کہ ہم ایک آزاد قوم اور دینِ حق کے پیرو ہونے کے باوجود ذہنی غلامی کے شکنجوں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ایسا کیوں ہے؟ اس سوال کے پیچھے ایک وسیع و عریض تاریخی پس منظر ہے جس کے بیان کی اس مختصر مقالے میں چنداں گنجائش نہیں۔ لیکن زیرِ بحث عنوان کو سمجھنے کے لیے ان اسباب و علل کو سمجھنا ضروری ہے جن کی زد میں موجودہ نظامِ تعلیم کا وجود ہوا چنانچہ ہمیں اس دور کی سیاسی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالنی ضروری ہے۔

ہندوستان میں صدہا سال تک مسلمانوں کی حکومت رہی لیکن مسلم حکمرانوں نے سوائے اپنے سیاسی اقتدار کو قائم رکھنے، اپنی جاہ و ثروت کو بڑھانے اور عیش و عشرت میں غرق رہنے کے، دینی یا علمی خدمات کی طرف خاطرخواہ توجہ نہ دی۔ حکمرانوں کا عوام کے مزاج پر شعوری یا غیر شعوری بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ عوام بھی اس طرف سے بے بہرہ ہوتے چلے گئے اور ان میں صرف دنیاداری، فکرِ معاش اور اپنی فرسودہ رسوم و روایات کو گلے سے لگائے رکھنے کا جذبہ ہی دین کہلایا۔

مسلمانوں کے بعد ہندوستان میں تقریباً ڈیڑھ سو سال تک انگریزوں کی حکومت رہی۔ اس عقل مند قوم نے اپنے دورِ اقتدار سے پہلے ہی یہاں کے حکمران طبقے کی عیش پرستی اور عوام کی دنیا دارانہ ذہنیت کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔ عیسائیوں کی اسلام دشمنی بہت پرانی ہے جس کو ہندوستان میں مسلمانوں کے زوال نے ہوا دی۔ چنانچہ اس قوم کی شاطرانہ چالوں نے اسلام کی جڑوں کو کاٹنا شروع کیا کیوں کہ ان کا اصل مقصد سیاسی

ایک نقطۂ نظر یہ بھی ہے۔ جن حضرات کو اس سے اختلاف ہو ان کے لیے تہذیب الاخلاق کے صفحات حاضر ہیں۔

اقتدار کے ساتھ مشرقی اقوام کو ان کے اصل روحانی وجود سے کھوکھلا کر دینا تھا۔ اس مقصد کو بروئے کار لانے کے لیے درس گاہوں کو آلۂ کار بنایا گیا اور جو نصاب مرتب کیا گیا وہ انہی اغراض و مقاصد کو مدِ نظر رکھ کر کیا گیا۔

سترویں صدی سے یورپ میں صنعتی ارتقاء کا دور شروع ہوتا ہے۔ جو پورے کا پورا لادینی اور مادہ پرستانہ نظریات پر قائم تھا۔ عوام کی کلیسا اور مذہبی پیشواوں یہاں تک کہ خود مذہب سے بیزاری انتہا درجے کو پہنچ چکی تھی اور لادینیت اور بے خدا کائنات کا تصور بڑھ گیا تھا جس کے نتیجے میں مادہ پرستی کا عروج ہوا۔ چنانچہ جس میدان میں بھی ترقی ہوئی خواہ وہ علمی و ادبی میدان ہو، خواہ سیاسی و صنعتی سب میں یہی نظریہ کارفرما ہے۔

یورپ کے اس انقلاب نے جو تاریخ میں نشاۃ ثانیہ کے نام سے مشہور ہے ایک تاثر اور چھوڑا کہ دینی و دنیوی امور کو دو حصوں میں بانٹ دیا۔ دنیاوی امور میں انسان بے لگام قرار دیا گیا اور اس کی روحانی تسکین کا بار کلیساوں پر چھوڑ دیا گیا۔

مادہ پرستی لادینیت اور بے خدا کائنات کا تصور جو سب سے پہلے یورپ سے اٹھا تھا، آہستہ آہستہ پورے مغرب پر چھا گیا۔ یورپین اقوام کے حاکمانہ اقتدار نے اس تصور و تاثیر کو پوری دنیا پر مسلط کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج کسی ملک میں چلے جایئے، کہیں کا نصاب تعلیم اٹھا کر دیکھیے، طریقۂ تعلیم پر غور کیجیے وہی مغربیت یا لادینی عناصر کے عکس نمایاں نظر آئیں گے۔

۱۔ نصابِ تعلیم: یہ تھا وہ پس منظر جس میں ہمارا نصاب تعلیم مرتب ہوا ہے۔ اب قارئین اس نصاب کے تدریسی مضامین کی طرف متوجہ ہوں۔ موجودہ نصاب تعلیم میں جو مضامین پڑھائے جاتے ہیں ان میں افضلیت و اہمیت ان سائنسی علوم کو حاصل ہے جو محض مادہ پرستی پر مبنی ہیں۔ مثلاً فزکس (Physics) علم کیمسٹری (Chemistry) اور میتھمیٹکس (Mathematics) وغیرہ۔ ان علوم نے جن ذہنوں سے گزر کر ارتقا کے مدارج طے کیے ہیں وہ اسی بے خدا کائنات کے پروردہ ہیں جن کے مطابق کائنات کا وجود اتفاقیہ طور پر چند مادوں کے مل جانے کا نتیجہ ہے اور اسی طرح اس کا خاتمہ بھی ہو جائے گا۔ چکبست ان ہی نظریات کے مطابق کہتے ہیں ؎

زندگی کیا ہے؟ عناصر میں ظہورِ ترتیب
موت کیا ہے؟ ان ہی اجزا کا پریشاں ہونا

اسی طرح دوسرے علوم جدیدہ جو ہمارے نصاب میں داخل ہیں، جیسے معاشیات (Economics) سیاسیات (Political Sciences) اور عمرانیات (Sociology) وغیرہ میں بھی لادینیت کا تصور پوری طرح کارفرما ہے۔ ان علوم کو جس دور میں ترقی حاصل ہوئی وہ سرمایہ دارانہ نظام کے استحصال اور اشتراکیت کے ارتقا کا دور تھا۔ چنانچہ یہاں انسان کے مادی وجود اور اس کی مادی ضروریات کو پورا کرنے کی زیادہ کوشش کی گئی۔ اسی طرح روزی روٹی کا مسئلہ اہم ترین مسئلہ قرار پایا۔ ان علوم کے ذریعے جہاں انسان کے روزی روٹی کے مسئلے کو حل کرنے میں یک گونہ آسودگی ہوئی وہاں طلب زر کی تلاش نے خود غرضی و خود پرستی کو دعوت دی اور انسان کا اخلاق کمزور اور توکل کا فقدان ہوتا گیا۔ بالآخر جس کے نتائج پر اسی وقت پہنچ چکی تھیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں:

عصرِ حاضر ملک الموت ہے تیرا جس نے
قبض کی روح تری دے کے تجھے فکرِ معاش

مسلمان رہنماوں کو جب یہ خطرہ محسوس ہوا کہ دین ہاتھ سے جا رہا ہے تو انھوں نے اسلامی روح کو برقرار رکھنے کے لیے علوم عقلیہ کے اس لادینی کتب خانے میں

یک طاق علوم نقلیہ کے لیے وقف کر دیا۔ چوں کہ اس بڑھتے ہوئے سیلاب کو روکنے کا اس کے علاوہ کوئی ذریعہ ان کے پاس نہ تھا لیکن اس کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے۔ ظاہر ہے کہ جب طالب علم پورے نصاب کا مطالعہ کرتا ہے تو اسے کہیں بھی خدا کا تصور نظر نہیں آتا، اپنے اردگرد بکھری اشیاء اور یہ متحرک کائنات اُسے "عناصر میں ظہور ترتیب" کی تعلیم دیتی ہیں، اس نے نصابی کتب سے بھی یہی تعلیم حاصل کی ہے، ماہرین کے نظریات بھی یہی بتلاتے ہیں اور تجربہ گاہوں کی اطلاعات بھی اسی سے مطابقت رکھتی ہیں۔ پھر کیوں کر اس کا ذہن قبول کرے گا کہ اس کائنات کا خالق و مالک ایک ہی خدا ہے جس کا حکیمانہ نظام قدرت کائنات میں جلوہ گر ہے اور ذرّہ تا آفتاب اسی نظام کا پیرو ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ایسے نظام کا پروردہ ذہن علوم نقلیہ کی کتب کا مطالعہ کرتا ہے تو انتشار و ہیجان کا شکار ہو جاتا ہے۔ وہ اپنے دل میں ایمان کی چنگاری کمزور ہونے کی وجہ سے نہ اس کو غلط کہہ سکتا ہے اور نہ ہی موجودہ زمانہ اور ماحول میں اس کی گنجائش دیکھ پاتا ہے۔ چنانچہ وہ اُن علوم کو محض اپنے مذہبی تبرکات سمجھ کر احتراماً اسے پڑھ یا سیکھ لینا ہی کافی سمجھتا ہے لیکن نتیجتاً مذہب کے بارے میں غلط نظریات کا شکار ہو جاتا ہے اور مذہب کو دقیانوسی روایات پر محمول کر کے بے دین و مادہ پرست ہوتا چلا جاتا ہے۔

۲۔ ذریعۂ تعلیم

یہ تو ہوئی نصاب کی بات، آیئے اب ذرا غور کریں کہ ذریعۂ تعلیم یا (Medium of Instruction) نے کس حد تک فرد یا معاشرے پر اثر ڈالا ہے۔

ہندوستان میں ذریعۂ تعلیم کی بحث کا آغاز تاریخی طور پر ۱۸۳۳ء کے چارٹر ایکٹ کو کہا جاتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی ہندوستان پر حاکمانہ اقتدار قائم کر چکی تھی تو انگلستان کے چارلس گرانٹ پادری نے انگریزی زبان کے ذریعے ہندوستان میں عیسائی مشنری کی تبلیغ کرنے کی تجویز پیش کی۔ چنانچہ لارڈ ولیم بینٹگ کے زمانے میں یہاں بہت سے تبلیغی اسکول قائم کیے گئے جن کا مقصد عیسائیت کو فروغ دینا تھا لیکن ہندوستان میں اس اسکیم کو خاطر خواہ کامیابی نصیب نہ ہو سکی تو ایسٹ انڈیا کمپنی نے انگریزی زبان میں مغربی علوم پڑھانے پر زور دیا۔ چنانچہ ۱۸۲۹ء میں فارسی کو دفتری زبان سے حکماً خارج کر کے انگریزی سرکاری زبان قرار دی گئی۔

جب ۱۸۳۴ء میں لارڈ میکالے گورنر جنرل کی کونسل کے لاممبر کی حیثیت سے ہندوستان آیا تو اس عہدے پر اس کا تقرر ۱۸۳۳ء چارٹر ایکٹ کے مطابق ہو چکا تھا۔ اس نے نہ صرف یہ کہ مغربی تعلیم کے لیے انگریزی ذریعۂ تعلیم کی وکالت کی بلکہ اس تعلیم کے اغراض و مقاصد بھی واضح کر دیے۔ اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ مشرقی جسم کے اندر مغربی روح بیدار کی جائے خواہ وہ رنگ و نسل کے اعتبار سے ہندوستانی ہوں۔ چنانچہ اس نے مشرقی تعلیمی اداروں کو امداد نہ دینے کی سفارش کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا کہ مسلم و ہندو لاء کے مطالعے کے لیے بھی عربی، فارسی و سنسکرت کے بجائے ان کے انگریزی تراجم پڑھے اور پڑھائے جائیں۔

ان تمام باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ میکالے اور اس کے ساتھیوں کا منشا کیا تھا؟ ایک مرتبہ اس نے اپنے والد کو انگلستان خط لکھا تھا جس میں اس نے وضاحت کی تھی کہ

"ہماری تعلیمی پالیسی کا بہت اثر ہندوؤں پر پڑ رہا ہے اور اس کو پڑھنے کے بعد کوئی بھی ہندو اپنے مذہب پر ایمان رکھنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اور یہ سب کام بغیر کسی مذہبی تبلیغ کے ہو رہا ہے۔"

ان واقعات کی روشنی میں جو بات سامنے آتی ہے وہ

یہ ہے کہ یہ ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی جس کی زد میں مذہبی جذبہ کارفرما تھا اور دوسری بات جو اس پالیسی سے ظاہر ہوتی ہے وہ یہ کہ "مادری زبان" کی کوئی اہمیت ضرور ہے جس کو میکالے نے بار بار محسوس کیا ہے۔ اس کی اہمیت کا خاص نکتہ جو اس کے بیان سے ملتا ہے وہ یہ کہ اگر ذریعۂ تعلیم فارسی، عربی و سنسکرت جیسی زبانیں رہیں تو ان علوم کا پڑھانا (تاریخ، علم طب، ریاضی و علم نفس وغیرہ) بھی ضروری ہوگا جن کا تعلق (اس کی نظر میں) دقیانوسی مذہب سے ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذریعۂ تعلیم صرف "ذریعۂ تعلیم" ہی نہیں بلکہ خود ایک تہذیب، تاریخ اور ایک علم ہے۔

لہذا ہم کہہ سکتے ہیں کہ جو مشکلات میکالے کی نظر میں مشرقی علوم سے ہو سکتی ہیں وہی مشکلات ہمیں مغربی زبانوں، انگریزی، فرانسیسی اور جرمن وغیرہ سے ہیں۔

مگر افسوس کی بات ہے کہ آج ہمارے ملک سے غیر ملکی اقتدار کے رخصت ہو جانے کے بعد بھی ہماری درس گاہوں میں، خواہ وہ ابتدائی سطح پر ہوں، خواہ ثانوی یا اعلیٰ تعلیمی ادارے غیر ملکی زبان کو ذریعۂ تعلیم مقرر کیا گیا ہے اور قومی و ملکی زبانوں کی طرف توجہ نہیں دی جاتی۔ انگریزی ذریعۂ تعلیم سے جہاں بہت سے فائدے سامنے آئے ہیں اور علوم جدیدہ سے واقفیت اور ارتقا کی راہیں کھلی ہیں وہاں ہمیں بہت زیادہ نقصانات کا خمیازہ بھی بھگتنا پڑ رہا ہے۔ مثلاً:

۱۔ سب سے اہم ترین نقصان یہ ہوا ہے کہ ہماری اپنی زبان و ادب سے لاتعلقی نے ہماری دینی و ملی تاریخ کو نئی نسل سے منقطع کر دیا ہے اور مغربی تہذیب و تمدن کی فوقیت کا نقش اس طرح مسلط ہو گیا ہے کہ اپنی صحیح بات میں بھی ہمیں شک ہوتا ہے اور ان کی ہر بات ہمارے لیے تقلید کا موجب بنتی ہے بقول اکبر الہ آبادی ؎

چیز وہ ہے بنے جو لندن میں
بات وہ ہے جو پائنیر میں چھپے

اور

گھر سے آیا ہے خط کل ہے جیل ان کا
پائنیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے

۲۔ دوسرا اہم نقصان یہ ہے کہ بے شمار افراد ذہنی توانائی اس غیر ملکی زبان کے سیکھنے میں اتنی زیادہ صرف ہو جاتی ہے اور ان میں مختلف علوم و فنون سے درجۂ کمال تک استفادہ کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔

۳۔ تیسری بہت اہم خرابی یہ ہوئی ہے کہ جب انتہائی عرق ریزی و کاوش کے باوجود طالب علم اس غیر زبان پر پوری طرح عبور حاصل نہیں کر پاتا تو وہ اس زبان کے مقابلے میں خود کو کمتر سمجھنے لگتا ہے اور یہ احساس اس کے لاشعور پر بہت لرزہ خیز نشان چھوڑتا ہے۔

ذریعۂ تعلیم کے بارے میں خود ایک انگریز کی بات دلچسپی سے خالی نہیں۔ ایک مرتبہ کسی انگریز نے ہندوستان کے اسکولوں کا معائنہ کرتے ہوئے بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب سے کہا کہ:

"اگر میں اپنے وطن انگلستان جا کر یہ تجویز پیش کروں کہ انگریز بچوں کو اردو، فارسی یا چینی وغیرہ زبانوں میں تعلیم دی جائے تو مجھے فوراً پاگل خانے بھیج دیا جائے گا لیکن آپ کے ملک میں چھوٹے چھوٹے بچوں کو بدیسی زبانوں میں تعلیم دی جاتی ہے اور کوئی اس پر غور نہیں کرتا۔"

متذکرہ بالا بحث کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ذریعۂ تعلیم بجائے غیر ملکی زبان کے، اگر مقامی اور ملکی زبانیں ہوں، ساتھ ہی انگریزی تعلیم بحیثیت زبان کے دی جائے تو انگریزی کی صلاحیت بڑھنے کے زیادہ امکان ہو سکتے ہیں اور مادری زبان ذریعۂ تعلیم ہونے کی وجہ سے زیادہ بہتر نتائج فراہم ہو سکیں گے، چوں کہ مادری زبان میں پڑھنے اور سمجھنے سے اس کی فطری و شعوری صلاحیتیں ابھر کر سامنے آئیں گی۔

معلم و متعلم کا رشتہ:

معلم و متعلم کا رشتہ بہت گہرا ہوتا ہے مگر حالات کے ساتھ ساتھ اس کی قدریں بدلتی رہتی ہیں۔ دورِ قدیم میں جب نہ تعلیم عام تھی نہ درس گاہیں زیادہ تھیں اور نہ طالبانِ علم کی کثرت تھی تو یہ رشتہ انتہائی قریبی اور شخصی تھا لیکن عصرِ حاضر میں جب کہ طلبا کی تعداد بکثرت ہے اور بڑی بڑی درس گاہیں بے شمار ہو گئی ہیں تو یہ رشتہ محض رسمی و واجبی ہو کر رہ گیا ہے۔ تعلیم کا پیشہ جو ماضی میں محض اخلاقی فریضہ سمجھا جاتا تھا وہ آج تجارتی اور معاشی ضرورت بن گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے ماحول میں یہ رشتہ اپنی افادیت و اہمیت کھو بیٹھا ہے۔

اس کمزوری کی اولین وجہ تعلیم کا عام ہونا بتائی جاتی ہے یعنی یہ کہ جب تعلیمی ادارے صنعتی کارخانوں کی طرح زیادہ تعداد میں سند یافتہ انسانی آلات ڈھال رہے ہوں تو ان کی شخصیت کی تشکیل اور کردار کے ارتقاء کا سامان کیوں کر ممکن ہو سکتا ہے بلکہ ان آلات کو برسرِ کار لانے کے لیے مارکیٹ میں ان کی کھپت بھی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید نظامِ تعلیم میں استاد و شاگرد کا رشتہ بہت کمزور ہو گیا ہے اس کی بڑی وجہ کسی حد تک طلبا کی کثیر تعداد ضرور ہے جو استاد و شاگرد کے شخصی تعلق میں مانع ہوتی ہے مگر دراصل اس رشتے کے کمزور

ہونے کی وجہ اخلاق و دینی تعلیم کا فقدان ہے۔ اس نظامِ تعلیم میں استاد طالب علم کے اندر اعداد و شمار اور ان کے طریقۂ استعمال کا تصور تو پیدا کر دیتا ہے مگر کسی اعلیٰ ترین مقصد کے لیے درکار کردار نہیں ابھار سکتا۔

موجودہ طرزِ تعلیم طلبا کے علمی ذوق و شوق کی نمائندگی کرتی ہے اور مختلف علم کے ماہرین پیدا کرتی ہے۔ اس قسم کی تعلیم سے ایک طرف بہت سے فائدے ہوئے ہیں جیسے عوام میں علم کی شمع روشن ہو گئی ہے اور ہر انسان کے لیے ترقی کی راہیں کھلی ہیں اسے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کو ابھارنے کے مواقع فراہم ہوئے ہیں تو دوسری طرف تعلیم کا مقصد حصولِ علم نہ رہ کر فکرِ معاش و تلاشِ روزگار بن گیا ہے۔ ان حالات میں نہ طالب علم کا مقصد طلبِ علم رہتا ہے اور نہ استاد کا مقصد تعلیم و تربیت کے ذریعے نئی نسلوں کے ذہن کی بہتر تعمیر۔ استاد و شاگرد کے رشتہ کی کمزوری کا ایک اور سبب یہ ہے کہ اس نظامِ تعلیم میں (Junior Students) کو (Senior Students) کی تعلیم پر مامور کر دیا جاتا ہے اور اس طرح استاد و شاگرد کا رشتہ ایک ہی نسل اور ہم عمر طلبا کے درمیان قائم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ استاد و شاگرد کے اس رشتہ کی افادیت مشتبہ ہو جاتی ہے۔ کیوں کہ ایک طالب علم دوسرے طالب علم کو علم تو سکھا سکتا ہے مگر اس کی اخلاقی تربیت نہیں کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے استادوں میں نہ طالب علم کو واقعی کچھ سکھا دینے کی تڑپ ہے نہ شاگرد میں استاد کے مرتبے کا لحاظ و ادب۔

علامہ اقبال فرماتے ہیں ؎

تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض
دل چاہتا تھا ہدیۂ دل پیش کیجیے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق
کہتا ہے ماسٹر سے کہ بل پیش کیجیے

مخلوط تعلیم:

ہندوستان میں مخلوط تعلیم یا Co-education کی سفارش ۳۸-۱۹۳۷ء کی Basic Education Commission کی رپورٹ کے مطابق کی گئی اور طلبا و طالبات کے نفسیاتی فرق کو مدنظر رکھتے ہوئے ان کے نصاب میں جزوی اختلاف کا مشورہ دیا گیا اس کے بعد ۴۹-۱۹۴۸ء کی University Education Commission نے رپورٹ پیش کی کہ:

"ڈگری کالجوں میں جہاں طلبا و طالبات
کی عمر اٹھارہ سال سے زیادہ ہوتی
ہے، مخلوط طریقۂ تعلیم ہونا چاہیے۔"

اور اس کی وجہ اعلیٰ تعلیم پر علیحدہ علیحدہ اخراجات کو غیر ضروری قرار دیا گیا۔ پھر رفتہ رفتہ ثانوی سطح پر بھی مخلوط تعلیم کی سفارشات ہوتی رہیں اور لڑکے لڑکیوں کے لیے یکساں علوم کے حصول کو ضروری سمجھا جانے لگا۔ نیز لڑکیوں کے لیے ہوم سائنس وغیرہ کی تعلیم کا خصوصی انتظام بھی کر دیا گیا۔

آہستہ آہستہ مخلوط طریقۂ تعلیم کا رواج عام ہوتا گیا اور یہاں تک کہ ابتدائی تعلیم سے اعلیٰ تعلیم تک یہی طریقہ فروغ پا گیا ہے۔ آزادیٔ نسواں کی تحریک نے اس طریقۂ تعلیم کو کامیاب بنانے میں کافی معاونت کی اور عورت و مرد میدان عمل میں شانہ بشانہ آ گئے۔ مرد و زن کے اس آزادانہ اختلاط سے جو تلخ نتائج ظاہر ہوئے اور ہو رہے ہیں وہ کسی ذی ہوش کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں۔ اس لیے ان پر زیادہ روشنی ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ لیکن مخلوط طریقۂ تعلیم کی سفارشات میں جو دلایل پیش کیے جاتے ہیں اس طرف توجہ دلانا ضروری ہے۔

اس ضمن میں جو پہلی اور ٹھوس دلیل پیش کی جاتی ہے وہ یہ کہ مخلوط تعلیم کے ذریعے درسگاہوں میں ڈسپلن (Discipline) برقرار رہتا ہے اور طلبا و طالبات نازیبا حرکتیں (مثلاً بے ضرورت کلاس چھوڑ کر جانا، کلاسوں میں دیر سے آنا وغیرہ) کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ کلاسوں میں طلبا کی تعداد زیادہ رہتی ہے اور وہ تدریس میں دلچسپی لیتے ہیں چونکہ اپنی ہم جماعت لڑکیوں کی موجودگی انھیں شائستہ اخلاق کا مظاہرہ کرنے پر مجبور کرتی ہے اور وہ بطور تفریح استاد سے غیر ضروری سوالات نہیں کرتے۔ ممکن ہے یہ بات کسی حد تک درست ہو، مگر اس کی وجہ تدریس میں دلچسپی اتنی نہیں ہوتی جتنا ہم جماعتوں کو متاثر کرنا مقصد ہوتا ہے۔ جہاں تک شائستگی کا سوال ہے یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام طلبہ یکساں مزاج کے ہوں بلکہ بعض طلبا کا مقصد ہی طالبات کی توجہ اپنی طرف مرکوز کرانا ہوتا ہے جس کے لیے بارہا استاد سے سوالات کرنا ان کا دلچسپ مشغلہ بن جاتا ہے دوسری جانب عموماً طالبات کے اندر یہی چیز رکاوٹ کا سبب بنتی ہے اور وہ بیشتر اپنے تعلیمی مسایل پر استاد سے کھل کر گفتگو نہیں کر پاتیں اور یہ امر ان کی ذہنی صلاحیتوں کے ابھرنے میں مزاحم ہوتا ہے۔

مخلوط طریقۂ تعلیم نے ایک بڑا نقصان یہ پہنچایا ہے کہ طلبا و طالبات کی توجہ تدریس سے ہٹ کر اپنی ذاتیات پر زیادہ ہو گئی ہے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی لڑکی کی نظر اتفاقیہ بھی کسی لڑکے پر پڑ جائے تو وہ فوراً اپنے سراپا کا جائزہ لینے لگتا ہے غرض یہ وہ قیمتی وقت جو اپنی تخلیقی و تدریسی صلاحیتوں کے ابھار میں صرف ہونا چاہیے وہ اپنے رکھ رکھاؤ اور زیبائش میں زیادہ صرف ہوتا ہے جس سے طالب علم کی توجہ یکسو نہیں رہ سکتی۔

رضوان لائبریری تمبور

ایک تعارف

مفتی محمد خبیر ندوی*

ضلع سیتاپور جغرافیائی تقسیم کے لحاظ سے دو حصوں میں منقسم ہے۔ اپر ہر اور گانجر۔ گانجر ضلع کا شرقی و شمالی حصہ ہے جو نشیب میں واقع ہے۔ تجارت اور سرکاری انتظامات کے لحاظ سے گانجر کا مرکز قصبہ تمبور ہے جس کو دو دریاؤں "چوکا" اور "دہاور" نے چاروں طرف سے گھیر رکھا ہے اسی لیے یہ قصبہ ضلع کا جزیرہ نما کہلاتا ہے۔ قصبہ کی مجموعی آبادی تقریباً چالیس ہزار نفوس پر مشتمل ہے جن میں تین چوتھائی مسلمان آباد ہیں۔ قصبہ کے پوربی حصے میں ایک وسیع و عریض بلند چبوترے پر حضرت شاہ برہان الدینؒ کا مزار واقع ہے جس پر املی کے کہنہ اور عظیم درختوں نے سایہ کر رکھا ہے جس سے سیکڑوں نفوس روحانی فیض حاصل کرتے ہیں۔ یہ بزرگ حضرت سید سالار مسعود غازی رحمۃ اللہ علیہ کے رفقاء میں سے ہیں جو بہرائچ جاتے ہوئے راستے میں شہید ہو گئے۔

یہ قصبہ تقریباً سات سو سال پرانا ہے اور مشرق و مغرب دو حصوں میں منقسم ہے مشرقی حصہ کا نام تمبور اور مغربی حصہ کا نام احمد آباد ہے۔ احمد آباد کی مجموعی آبادی مسلم اور غیر مسلم دونوں پر مشتمل ہے۔ احمد آباد کی نسبت احمد نامی ایک بزرگ کی طرف ہے جن کے بارے میں دو باتیں مشہور ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ باہر سے کسی فرماں روا کے بھیجے ہوئے تھے دوسرے یہ کہ وہ اس علاقے کے رہنے والے تھے۔ اس قصبے میں پان کی کاشت بہت ہوتی تھی۔ چنانچہ دو چھوٹے ٹیلے قصبے کے شمال و جنوب میں بطور یادگار آج بھی باقی ہیں۔ پان کو فارسی میں تمبول ([illegible]) کہتے ہیں اس سے اس قصبہ کا نام تمبول پڑ گیا جو کثرتِ استعمال کی وجہ سے تمبور ہو گیا۔ فارسی نام کی نسبت سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ قصبہ مغل دورِ حکومت میں خاص امتیاز کا حامل رہا ہوگا جب مغل حکومت اپنے شباب پر تھی اور فارسی زبان کا سکہ رائج تھا۔ اس قصبہ کی گزشتہ مشہور شخصیتوں میں مولوی صوفی محمد اسمٰعیل نقش بندیؒ، مولانا احمد علی شاہؒ، ٹھاکر مہتم اسنگھ، محترمہ ملانی صاحبہ تاز، منشی فقیر بخش اور حکیم احمد خاں کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

رضوان لائبریری کا قیام

اس قصبے کی تاریخ کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ یہ قصبہ مختلف ثقافتوں سے معمور اور اودھ کی تہذیب و ثقافت کا علم بردار رہا ہے اور آج بھی اودھ کے علاقوں میں

---

* جنرل سکریٹری رضوان لائبریری تمبور، سیتاپور، اتر پردیش۔

شامل ہے۔ دیگر مواضعات کی طرح یہ قصبہ بھی انگریزوں کے خرد برد کا شکار ہو کر تعلیم و تعلم اور علوم و معارف کا مرکز رہنے کے باوجود اپنی سابقہ شناخت کھو چکا ہے اور اس وقت جہالت و پس ماندگی کا گہوارہ ہے۔ اسی جہالت کے خاتمے کے لیے جب قصبے کے چند ذمہ داران نے اس طرف توجہ کی تو حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی ایما پر چند ذمہ داران کی ایک نشست راقم کے مکان پر ۱۹۸۰ء میں ہوئی اس میں طے پایا کہ قصبے کی سابقہ روایات کے احیا اور جہالت کے خاتمے کے لیے ایک پبلک لائبریری قایم کی جائے۔ اس تجویز نے ۱۹۸۱ء کو عملی جامہ پہنا اور پھر راقم کے مکان کے ایک حصے کو باقاعدہ طور پر منتخب کر کے رضوان لائبریری نامی ایک پبلک لائبریری قایم ہو گئی۔ اس لائبریری نے اپنا سفر بہت معمولی طور سے شروع کیا اور ہر حال میں اپنا سفر جاری رکھا۔ یہاں تک کہ آج اس مرتبے کو پہنچ گئی کہ تقریباً ہر علم کا پیاسا اپنی پیاس بجھا سکتا ہے۔ یہ لائبریری باقاعدہ سوسائٹی کے تحت قایم ہے جو حکومت اتر پردیش سے منظور شدہ ہے اور علم و ادب کے ممتاز افراد اس سوسائٹی میں شامل ہیں۔

لائبریری کے اغراض و مقاصد

اس لائبریری کے اغراض و مقاصد دیگر کتب خانوں کے مقابلے میں قدرے طویل ہیں کیوں کہ یہ لائبریری ایک تحریک کے نام سے وجود میں آئی ہے۔ اس کے اغراض و مقاصد یہ ہیں:

۱- قرآن کریم اور احادیث نبویہ کی تعلیمات کو عام کرنا، علوم اسلامیہ کی ترویج و اشاعت میں حصہ لینا، معاشرے میں پھیلے ہوئے عقائد فاسدہ، بدعات اور خرافات کو مٹانے کی اچھی تدبیر سے ہر ممکن کوشش کرنا، اخلاق حسنہ پر عمل کے لیے ابھارنا، انسانیت کی بقا و تحفظ کے لیے جد و جہد کی حد تک بذریعہ لٹریچر فروغ دینا۔ ایسے محققین و مصنفین تیار کرنا جو ہر میدان میں اسلام کے خلاف ہونے والے حملوں کا دفاع کر سکیں، اسلامی دینی تعلیمات کو مادری زبان میں عام کرتے ہوئے اسلامی روایات کا مظاہرہ کرنا، معاشرے کے کمزور لوگوں کو کتابوں کی فراہمی تاکہ وہ غریبی کے باعث تعلیم سے محروم نہ رہیں۔ طلبا کے لیے مفت اردو کوچنگ درجات قایم کرنا، قومی یک جہتی، اتحاد اور بھائی چارہ کو فروغ دینا، حفظان صحت پر خصوصی لٹریچر فراہم کرنا، اردو کے فروغ کے لیے ممکنہ ذرایع کا استعمال کرنا، لائبریری کے قیام کی سب سے اہم غرض اسلام کی صحیح اور پاکیزہ تصویر کو غیر مسلموں میں سیرت و کردار اور تعلیمات صحیحہ کے ذریعے یا اسلامی لٹریچر عام کرنا ہے جس میں سے اردو کوچنگ کا نظم قایم ہو گیا ہے اور مزید کے لیے کوششیں جاری ہیں۔

لائبریری تاثرات کے آئینے میں

جن مفکرین اور دانش وروں نے اس مبارک ا پر تمبور جیسے پس ماندہ قصبے میں لائبریری کے قیام پر تاثرات کا اظہار کیا ان کی فہرست خاصی طویل ہے مگر تاثرات کے اقتباسات نقل کر کے باقی کے نام ذکر کرنا اکتفا کریں گے۔ ممتاز عالم دین اور مشہور مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی الندوی نے افتتاح کے موقع درج ذیل الفاظ میں اپنے تاثر کا اظہار کیا:

''سیتاپور کے قصبہ تمبور میں چند باہمت تعلیم یافتہ نوجوانوں نے جن میں مولوی مفتی محمد ظفیر

ندوی پیش پیش ہیں۔ ایک لائبریری قایم کی ہے
ان کا مقصد اس کے ذریعے علم کی اشاعت اور
شائقین علم کے لیے مفید علمی اور اسلامی مواد
فراہم کرنا ہے۔ لائبریری کا نام رضوان لائبریری
رکھا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ ذہنوں کی
تربیت اور سیرت و کردار کی تشکیل میں من جملہ
دوسرے فکری، ادبی ذرائع کے لائبریری بھی
بڑا اہم کردار ادا کرتی ہے۔ وہ زندگیوں کو
صحیح راستہ دکھانے میں مفید خدمات انجام
دیتی ہے۔ مولوی محمد خبیر ندوی کے پیش نظر
یہی افادیت تھی جس کی طلب میں انھوں نے
لائبریری کے قیام کی کوشش میں خصوصی دلچسپی
لی۔ ان کی یہ کوشش قابلِ تعریف ہے۔ امید
ہے کہ ان کا اور ان کے رفقا کا جذبہ اچھے
ثمرات و نتائج کا حامل ہوگا اور لائبریری اپنے
مقصد کو بہتر طریقے سے پورا کرے گی اور
وقت کے ساتھ ترقی کرتی رہے گی، میں
دُعا گو ہوں۔"

پروفیسر محمد سالم قدوائی ڈائرکٹر انسٹی ٹیوٹ آف
اسلامک اسٹڈیز مسلم یونیورسٹی علی گڑھ رقم طراز ہیں:
"سیتاپور ہندوستان کا بہت ہی مردم خیز
خطہ ہے۔ ہندوستان کے علما کا کوئی
تذکرہ اُٹھائیے اس علاقے کے بے شمار
علما کا ذکر ملے گا جنھوں نے علم و ادب کے
کے میدان میں اپنے نمایاں جوہر دکھائے ہیں
تمبور اس سیتاپور کا ایک اہم قصبہ ہے
یہاں بھی بہت سے علما نے جنم لیا ہے، اس
قصبے کے نوجوانوں نے ایک کتب خانہ تھوڑے
دن قبل رضوان لائبریری کے نام سے قایم
کیا ہے..... ان کی یہ لائبریری کافی ترقی
کر گئی ہے اور تھوڑے ہی عرصے میں اندازہ
یہ ہوتا ہے کہ اس کی اہمیت اور افادیت بہت
بڑھ جائے گی۔ مجھے خود تو تمبور جانے کا اتفاق
نہیں ہوا لیکن جو لوگ اس لائبریری سے متعلق
ہیں ان سے متعدد بار ملاقاتیں ہوئیں اور
وہاں کی کیفیات معلوم کرکے خوشی ہوئی یہاں
تفسیر، حدیث، فقہ، کلام اور دوسرے علوم و
فنون سے متعلق خاصی کتابیں جمع ہو گئی ہیں
اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ان نوجوانوں کی
ہمتوں کو بلند کرے اور ان کی غیر معمولی کوششوں
اور محنت کو قبول عام عطا ہو۔"

ممتاز ماہر اقتصادیات اور انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز
نئی دہلی سے شائع ہونے والے انگریزی ماہنامہ "جرنل
آف آبجیکٹیو اسٹڈیز" اور اردو ماہنامہ "زندگی نو" کے
چیف ایڈیٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن فریدی لکھتے ہیں:
"مسلمانان ہند کی تعلیمی اور اقتصادی پسماندگی
کو دور کرنے کے لیے ضلع سیتاپور کے
قصبہ تمبور میں کچھ مسلمان نوجوانوں کی لائبریری
کے قیام کی کوشش قابل ستایش ہے.....
رضوان لائبریری اگرچہ نام کے اعتبار سے
محض ایک لائبریری ہے لیکن اس کی جدوجہد
مختلف تعلیمی اور فکری میدان میں اپنے اثرات
پیدا کر رہی ہے۔ میں اس کی سرگرمیوں اور
اس کے امید افزا اثرات سے بالواسطہ واقف
ہوں، تعلیم، مطالعہ اور تعمیری فکر کی اشاعت
اس کا مقصود ہے۔ میں رب العزت
سے دعا کرتا ہوں کہ اس طرح کے تعمیری کاموں
کا حوصلہ دوسرے نوجوانوں کو بھی حاصل ہو۔

اور یہ شوق متعدی بن جائے "

اترپردیش اردو اکاڈمی کے سابق چیرمین لکھنؤ یونیورسٹی بڑ عربی کے چیرمین اور آل انڈیا مسلم انٹلکچول فورم کے ریٹری جنرل پروفیسر محمد یونس نگرامی نے افتتاح کے موقع پر ثر ظاہر فرمایا:

"کتب خانے اور لائبریریز ہر معاشرے اور سماج کے لیے اس لیے ضروری ہیں کہ یہ اس کے لیے فکری و ثقافتی و تعمیری غذا فراہم کرتے ہیں۔ مسلمانوں کا یہ امتیاز رہا ہے کہ انھوں نے ہر دور میں اس کا اہتمام کیا کیا ہے اور کتب خانوں کے قیام میں دلچسپی لی ہے۔ برادرم مفتی محمد خبیر ندوی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے تمبور میں رضوان لائبریری نامی دارالمطالعہ کے قیام میں دلچسپی لی ہے جو اس علاقے کی ایک مفید علمی و دینی خدمت ہے جس پر وہ مبارکباد کے مستحق ہیں "

- وزارت ترقی وفروغ انسانی وسائل کے شعبہ اردو ے ادارہ پبلی کیشن کے آفیسر جناب ابوالفیض سحر نے پنے خط کے ذریعے یہ تاثر ارسال کیا:

" مجھے یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ تمبور ضلع سیتاپور جیسے دور افتادہ علاقے میں آپ نے لائبریری قایم کر کے علمی، ادبی اور تہذیبی پروگرام منعقد کرنے کا سلسلہ جاری رکھا اور آپ کے پروگراموں کی تفصیل کی اطلاع ملی، اترپردیش کے آج کے جیسے حالات میں جہاں جمود، سکوت و تعطل اور مردنی سی چھائی ہوئی ہے آپ (مولانا مفتی محمد خبیر ندوی صاحب) کے اس جوش و جذبے کو دیکھ کر جس میں کچھ زندگی کے آثار ہیں مجھے ذاتی طور پر بے حد خوشی ہوئی۔ کاش کو، ر زندگی کی لہر پورے یو۔پی میں دوڑ جائے "

ان حضرات کے علاوہ مندرجہ ذیل نام بھی تاثرات کی فہرست میں شامل ہیں۔ مولانا مرغوب الرحمٰن صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند، مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی صدر شعبۂ عربی ندوۃ العلما، لکھنؤ، پروفیسر عبداللہ عباس ندوی ام القری یونیورسٹی مکۃ المکرمہ، مولانا سعید الرحمٰن الندوی چیف ایڈیٹر مجلہ "البعث الاسلامی" لکھنو، سیّد واضح رشید ندوی چیف ایڈیٹر "الرائد"، حسن واصف عثمانی چیف ایڈیٹر روزنامہ عزایم لکھنؤ، سیّد شہاب الدین ایم پی، پروفیسر منظر عباس نقوی سابق صدر شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔

معائنہ جات

لائبریری میں وقتاً فوقتاً ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں اور دانش گاہوں کے نمائندوں کی آمد بھی مختلف پروگراموں کے انعقاد کے تحت ہوتی رہتی ہے۔ اس سلسلے میں مختلف حضرات نے معائنہ کیا۔ ہم یہاں پر صرف دو افراد کے معائنہ کا ذکر کریں گے۔ چنانچہ مشہور مفکر اور دانشور جناب سید حامد صاحب سابق وائس چانسلر مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۱ دسمبر ۸۸ء کو تمبور تشریف لائے اور لائبریری کی مختلف ثقافتی اور علمی سرگرمیوں سے متاثر ہو کر یہ معائنہ تحریر فرمایا:

" ۱۱ دسمبر ۸۸ء، مجھے آج رضوان لائبریری کو دیکھنے کا اتفاق ہوا، مفتی صاحب اور اہل تمبور نے جس اخلاص و اہتمام سے یہ لائبریری قایم کی ہے وہ ہر آئینہ قابل ستائش ہے۔ جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔"

جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی شعبۂ کامرس کے سربراہ جناب ڈاکٹر محمد مصطفیٰ صاحب کی قیادت میں ایک وفد سنہ ۱۹۹۰ء

آیا۔ لائبریری کی مختلف سرگرمیوں، مطالعہ کرنے والوں
کثرت اور کتابوں کی روز افزوں ترقی سے متاثر ہو کر یہ
ائنہ لکھا:

" آج ۸ جون ۱۹۹۰ء بروز جمعہ ہم لوگوں (ڈاکٹر
شکیل احمد شعبۂ تاریخ، ڈاکٹر خلیل احمد شعبۂ
ریاضی) کو رضوان لائبریری دیکھنے کا موقع ملا
مولانا محمد ضمیر ندوی نے اس میں بہت کوشش
کر کے نایاب اور مفید کتب کو جمع کیا ہے اس
مکتبہ میں عربی، اردو، فارسی، ہندی اور
انگریزی کی کتابیں موجود ہیں۔ مولانا محمد ضمیر
ندوی صاحب کی یہ کاوش بہت قابلِ ستائش
ہے کہ اس قدیم اور دور آباد بستی تمبور میں
اس لائبریری کو قایم کیا..... اللہ تعالیٰ اس
کو خوب ترقی عطا فرمائے "۔

علمی و ثقافتی سرگرمیاں

رضوان لائبریری اپنے اغراض و مقاصد کی روشنی میں
تلف علمی، ادبی، فکری اور ثقافتی سرگرمیاں جو اپنے اپنے
ت پر منعقد کرتی رہتی ہے اس کے متعلق ادارہ قومی آواز
نؤ نے اپنے ایک مضمون میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"اس گانجر علاقے میں رضوان لائبریری تمبور
کتابوں ہی نہیں علم، تہذیب اور ثقافت کے
ایک مشترکہ مرکز کی حیثیت سے ابھر رہی
ہے اور کتابوں کے ذریعے عوام کے علمی ذوق
کی تسکین کا سامان فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ
اردو کی ترویج و اشاعت، دینی مدرسوں اور
جدید تعلیم کے کالجوں کے طلبا میں بھائی چارہ
عوام میں فرقہ وارانہ اتحاد، امن و امان کے
جذبے کو فروغ اور اترپردیش خاص طور پر
اودھ کی تہذیبی قدروں کی بقا و استحکام کے
کے لیے بھی سرگرم عمل ہے "۔
(قومی آواز لکھنؤ ایڈیشن ۲۳ نومبر ۱۹۹۲ء)

اب ہم لائبریری کی مختلف علمی، ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں
کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ لائبریری ہر جمعہ اور اتوار کو کالج اور
مدارس کے طلبا کے لیے خصوصی دعوتی خطاب کا اہتمام کرتی
ہے، ہر ماہ کے آخری ہفتے میں کسی صحافی، مفکر، دانش ور
یا عالم کی تقریر کا نظم ہر سہ ماہی کے موقع پر مفکرین اور مسلم
داعیوں کا خصوصی اجتماع • ماہانہ شعری نشست کا انعقاد،
چھ ماہ بعد نعتیہ مشاعرہ، سالانہ آل انڈیا مشاعرے کا انعقاد
کالج کے طلبا کو اردو سے واقف کرانے کے لیے مفت
اردو کوچنگ کا نظم، اردو زبان کی ترویج و اشاعت کے لیے
سعی ممکن، دینی اور دنیاوی دونوں طبقوں میں یگانگت پیدا
کرنے کے لیے باہمی سالانہ جوڑ اور عام جلسے کا انعقاد، سالانہ
مضمون نویسی کے انعامی مقابلے، کثرت سے مطالعہ کرنے والوں
کو خصوصی تشجیعی انعام، یہ انعامی مقابلہ اردو، ہندی، انگریزی
اور عربی چاروں زبانوں میں تین طبقات اعلیٰ، وسطیٰ، ابتدائی
کے معیار کے مطابق ہوتے ہیں اور اس میں علی الترتیب
اوّل، دوم اور سوم آنے والوں کو 500، 300 اور
200 روپیے کے نقد انعامات اور ایک توصیفی سند
بھی دی جاتی ہے۔

ان تمام سرگرمیوں کے پس منظر میں یہ بجا طور پر کہا
کہا جا سکتا ہے کہ اب یہ لائبریری اس مقام پر پہنچ گئی ہے
جس سے کہ ہر پیاسا اپنی پیاس بجھا سکے اور ان ہی سرگرمیوں
کے نتیجے میں جب میں نے ماہنامہ تہذیب الاخلاق کے چیف
ایڈیٹر پروفیسر کبیر احمد جائسی سابق ڈائرکٹر اسلامک اسٹڈیز
سے تہذیب الاخلاق لائبریری کے نام جاری کرنے کی درخواست
کی تو موصوف نے قبولیت سے نوازا میں اُن کا اور ان
تمام مصنفین کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں جو اپنی گراں قدر
تصنیفات لائبریری کو ارسال کرتے رہتے ہیں۔

منصوبے

لائبریری بہت جلد ایک وسیع دار المطالعہ بڑے ہال کی شکل میں ایک نشریاتی ادارہ اور ماہ نامہ کی اشاعت کے سلسلے میں اقدام کی فکر مند ہے۔

اس لائبریری میں کتب وجراید کی روز افزوں دستیابی نے نیز اس کی مجلس منتظمہ میں پروفیسران کی موجودگی نے لائبریری کو مزید چار چاند لگا کر سدا رآمد بنا دیا ہے اور اب یہ اتنی مشہور ہو چکی ہے کہ صرف "رضوان لائبریری تمبور" کے حروف سے پورے ہندوستان میں متعارف ہے اور بہت سے اخبارات صرف اسی پتے پر لائبریری کی زینت بن رہے ہیں۔

بہرحال کہ کتب خانوں کی علمی حیثیت کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے اس لیے کہ جب سے دنیا میں علوم کی ترویج واشاعت ہوئی ہے تبھی سے یہ کوشش کی جانے لگی ہے کہ تحریری سرمایے کو مناسب طور سے یکجا کر دیا جائے تاکہ جب بھی ضرورت ہو ہر شخص آسانی سے اپنی ضرورت کے مضامین کا مطالعہ کر سکے، پھر اسلامی، دینی، تبلیغی اور دعوتی تحریک کے لیے لائبریری ایک اہم جزو ہوا کرتی ہے جس سے معاشرے میں صلاح وتقویٰ کے ساتھ ساتھ بدعات کے قلع قمع کرنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ نیز مفید اسلامی لٹریچر کا مرکز لائبریری ہی ہوتی ہے۔ ان ہی تمام وجوہات کو مدّنظر رکھتے ہوئے یہ رضوان لائبریری نامی ایک پبلک لائبریری قایم کی گئی ہے اور یہی اس کی اصل غرض ہے۔

حضرت ابوہریرۃ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جس نے رمضان کے روزے رکھے اور رمضان میں ایمان کے ساتھ اور حصولِ ثواب کی نیت سے نماز پڑھی اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیے گئے اور جو شخص لیلۃ القدر میں ایمان کے ساتھ اور ثواب کی خاطر (نماز میں) کھڑا رہا اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیے گئے۔"

(جامع ترمذی۔ باب الصوم)

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ - جلد ۱۳۔ ش ۲۔ (فروری ۹۴ء)

سب کے لیے تعلیم

ایک حسین خواب یا حقیقت

راحت ابرار*

دنیا کی سب سے زیادہ آبادی والے نو ملکوں کی چوٹی کانفرنس "سب کے لیے تعلیم" ایک بنیادی مقصد کے لیے ابھی کوشش ہے مگر یہ حسین خواب صرف ایک سنہری نعرہ ہی ہے جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے کیوں کہ ان ممالک میں ستر فی صد لوگ آج بھی ناخواندہ ہیں خود اس چوٹی کانفرنس کا اہتمام کرنے والی اقوام متحدہ کی تینوں تنظیموں کا بھی یہی خیال ہے کہ ۲۰۰۰ء تک سب کے لیے تعلیم مہیّا کرنا اتنی کم مدّت میں ممکن ہی نہیں ہے۔

یونیسکو نے حال ہی میں جو رپورٹ جاری کی ہے اس کے مطابق اس صدی کے اختتام تک دنیا میں ۸۶ کروڑ ۹ لاکھ افراد ناخواندہ رہ جائیں گے۔ خود ہمارے ملک میں بھی دو کروڑ ۸۰ لاکھ بچے آج بھی بنیادی تعلیم کی نعمتوں سے محروم ہیں جب کہ ان میں سے آدھے بچے کسی نہ کسی روزگار کے ذریعے اپنے اور اپنے والدین کا پیٹ پال رہے ہیں اور ہندوستان کے آئین کی خلاف ورزی ہو رہی ہے۔ آئین کی دفعہ ۴۵ کی رو سے ہر بچے کو ابتدائی تعلیم مہیّا کرانا لازمی قرار دیا گیا تھا اور بچہ مزدوری کو ایک "قومی جرم" قرار دیا گیا تھا۔

ایک انگریز مصنف مائرن ونر کی کتاب کے مطابق ہندوستان کے ۶۵ فی صد بچے اسکولوں میں تعلیم حاصل نہیں کرتے اور جو بچے تعلیم حاصل کرتے ہیں، ان میں ساٹھ فی صد بچے درجہ پانچ تک جاتے جاتے ہی اسکول چھوڑ دیتے ہیں۔ یونی سیف کے سروے کے مطابق بھی ہندوستان میں صرف ۴۰ فی صد بچے ہی اسکولی تعلیم حاصل کرتے ہیں جب کہ ۵۳ فی صد بچے درجہ چار کے درمیان ہی تعلیم چھوڑ دیتے ہیں۔ درمیان میں ہی تعلیم چھوڑ دینے کا تناسب لڑکوں کے مقابلے میں لڑکیوں میں کہیں زیادہ ہے۔ اس تعلیمی رپورٹ کے مطابق درجہ اول سے آٹھویں کلاس تک ساٹھ فی صد لڑکے تعلیم چھوڑ دیتے ہیں جب کہ لڑکیوں کا تناسب ۷۰ فی صد سے زاید ہے۔ دیہی علاقوں میں تعلیم چھوڑ دینے کا رواج شہری علاقوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔

ہندوستان نے اپنے ہمسایہ ملک پاکستان اور بنگلہ دیش کے مقابلے میں خواندگی کی شرح میں آزادی کے بعد سے کافی اضافہ کیا ہے۔ ناخواندگی کو دور کرنے کے لیے سرکاری اور غیر سرکاری سطح پر خواندگی مہم چلائی گئی، نئے اسکول قایم کیے گئے اور تعلیم کے حصول پر دوسرے ملکوں

---

* رابطہ عامہ، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

کے مقابلے خرچ بھی کیا گیا لیکن بڑھتی ہوئی آبادی کے پیش نظر ہندوستان میں تعداد کے اعتبار سے سب سے زیادہ ناخواندگی ہے اور خاص طور سے عورتوں میں تو ناخواندگی کی شرح سب سے زیادہ ہے۔ آندھرا اور اڑیسہ میں ۳۴ فی صد مدھیہ پردیش میں ۲۸ فی صد، بہار میں ۲۳ فی صد، اترپردیش میں ۲۶ فی صد، راجستھان میں ۲۰ فی صد اور اروناچل پردیش میں ۲۹ فی صد خواتین کی شرح خواندگی ہے۔ اترپردیش کی سالانہ رپورٹ ۱۹۹۲ء کے مطابق خواندگی کی مجموعی شرح ۴۱٫۶۶ فی صد ہے جس میں مردوں کی خواندگی ۵۵٫۱۶ فی صد ہے شہری علاقوں میں خواندگی کا تناسب ۶۱ فی صد ہے جس میں مردوں کی خواندگی ۶۹٫۹۸ اور عورتوں کی خواندگی کی شرح ۵۰٫۳۸ فی صد ہے۔

۱۹۸۱ء کی مردم شماری کی روشنی میں حکومت ہند نے پہلی مرتبہ اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ ہندوستان کے مسلمان تعلیم کے میدان میں سب سے زیادہ پس ماندہ ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں جب "نئی قومی تعلیمی پالیسی" وضع کی گئی تو اس کے ایکشن پلان میں "اقلیتوں کے لیے تعلیم" کے عنوان سے الگ سے ایک باب کا اضافہ کیا گیا اور سرکاری سطح پر ملک کے مسلمانوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کرنے کے لیے طریقے تلاش کیے گئے مگر بدقسمتی سے سرکاری افسران کے متعصب رویے اور حکومت ہند کی بے عملی نے اس جانب کوئی پیش قدمی نہیں کی، خود مسلم رہنماؤں نے بھی مسلمانوں کے ان بنیادی مسایل کو حل کرنے کے لیے صدائے احتجاج بلند نہیں کی۔

مسلمانوں میں تعلیم کی کمی کی ایک وجہ جہاں ان کی معاشی بدحالی ہے وہیں علم سے "بے توجہی" بھی ایک اہم وجہ ہے اقتصادی تنگ دستی کی وجہ سے مسلم بچے تعلیم کی اعلیٰ نعمتوں سے محروم ہیں۔ بچہ مزدوری کا جتنا رواج مسلمانوں میں ہے شاید ہی ملک کی کسی دوسری ذات یا برادری میں دیکھنے میں آتا ہو۔

مسلمانوں میں ناخواندگی کی دوسری اور اہم وجہ تعلیم نسواں کا فقدان بھی ہے۔ مسلم مردوں نے عورتوں کو علم و ہنر سے بے بہرہ رکھ کر اپنی طاقت آدھی کرلی ہے۔ جب تک ہم ان کو جاہل رکھیں گے، اپنے بچوں کو وہ اعلیٰ صفات نہیں سکھا سکتے جو ایک مہذب سماج کے لیے باعث فخر ہوں۔ ماں کی گود ہی بچے کی پہلی تربیت گاہ ہوتی ہے اور گھر کی ٹکسال میں ہی اخلاق گڑھے جاتے ہیں۔ عہد طفلی میں بچوں کے لیے ایک مجسم نمونہ اور قابل تقلید مثال ان کی ماں ہوتی ہے۔ جاہل اور دنیا سے بے خبر عورتیں اپنے بچوں کو کس طرح تربیت دے سکتی ہیں۔

مرکزی حکومت نے مسلمانوں کی تعلیمی، سماجی اور اقتصادی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے گوپال سنگھ کی سربراہی میں ایک اعلیٰ اختیاراتی پینل مقرر کیا تھا جس کی رپورٹ کے مطابق درمیان میں ہی تعلیم چھوڑ دینے کا رواج مسلم بچوں میں سب سے زیادہ ہے۔ چھ سے بارہ سال کی عمر کے مسلم بچوں کے اسکول چھوڑ دینے کا تناسب ۹۴٫۷ فی صد ہے جب کہ لڑکیوں کی یہ شرح ۹۵ فی صد سے بھی زائد ہے۔

ملک میں مسلمانوں کی شرح خواندگی ایک اندازے کے مطابق ۳۶ فی صد ہے جب کہ قومی شرح ۵۰ فی صد سے اوپر ہے۔ خود مسلم زیر انتظام تعلیمی اداروں میں بھی مسلم طلبا کی تعداد غیر مسلم طلبا سے بہت کم ہے۔ حکومت کی جانب سے بھی ان مسلم تنظیموں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی جو مسلمانوں کی تعلیمی خواندگی کے لیے سرگرم عمل ہیں۔ مسلمانوں اور سماج کے کمزور طبقوں کی تعلیمی پس ماندگی کو دور کیے بغیر "مکمل خواندگی" کا تصور ہی نہیں کیا جاسکتا۔ مرکزی وزارت بہبود جن رضاکارانہ تنظیموں کی مالی معاونت کرتی ہے اس میں بھی مسلمانوں کی فلاحی

تنظیموں کو انہیں میں بھی گنا جاسکتا ہے۔ وزارت بہبود کی سالانہ رپورٹ کے مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ چند مسلم تنظیموں کو بھی مالی امداد فراہم کرائی جاتی ہے جس کے لیے انہیں خاصی رقم رشوت کے طور پر ادا کرنی پڑتی ہے۔

ہندوستان میں "سب کے لیے تعلیم" کے حصول کے لیے "سب" کے معانی کو سمجھنا چاہیے اور تعلیمی بیداری کے لیے سب سے تعاون حاصل کرنا چاہیے۔ سماج کے کمزور طبقوں اور معاشی طور پر بدحال لوگوں کے لیے الگ سے تعلیمی پروجیکٹ بنانے ہوں گے اور مسلم محلوں میں پولس چوکیاں بنانے کے بجائے اسکول کھولنے ہوں گے اور غیر رسمی تعلیم کو فروغ دینا ہوگا تاکہ مسلم دست کاروں اور کاریگروں میں تعلیمی بیداری پیدا ہو سکے اور مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے عملی اقدامات کرنے ہوں گے تاکہ ۲۰۰۰ تک سب کے لیے تعلیم کے نصب العین کو حقیقت کا روپ دیا جاسکے۔ اس کے ساتھ ہی خود مسلم نوجوانوں، مسلم دانش وروں اور مسلم تنظیموں کو بھی اسلام کے حقیقی پیغام کو گھر گھر پہنچانا چاہیے تاکہ مسلم بستیاں علم کے نور سے منور ہو سکیں اور ملک و ملت کی خوش حالی کی ضامن بن سکیں۔

"انسانوں کو یہ خوش قسمتی ہے کہ سلیقے کی دولت کو وہ کوشش، مشقت اور ریاضت سے حاصل کر سکتے ہیں۔ زندگی کے سفر میں سلیقہ ایک قابلِ اعتبار رفیق ثابت ہوتا ہے جو ماں باپ ابتدائی تربیت سے اپنے بچوں کی رگ و پے میں سلیقے کو پیوست کر دیتے ہیں وہ زندگی کے سفر کو ان کے لیے بہت آسان بنا دیتے ہیں اور ان کی صلاحیتوں اور اکتسابات اور امکانات کو اظہار کے نادر مواقع فراہم کر دیتے ہیں۔ انسان زندگی کی کسی منزل میں کیوں نہ ہو وہ سلیقے سے خود کو لیس کر سکتا ہے سلیقہ باقاعدگی کا دوسرا نام ہے اور باقاعدگی اپنے ساتھ سکون اور آسائش لاتی ہے اور یہ سلیقہ باقاعدگی سے زیادہ وسیع، زیادہ دلکش اور دل نواز ہوتا ہے۔

سید حامد

مقابلہ جاتی امتحانات کے نتائج اور مسلمان

مرتبہ م۔ ندیم علیگ *

مقابلہ جاتی امتحانات میں مسلمانوں کی پوزیشن پر پہلی نظر ڈالنے سے ہی یہ پتہ آسانی سے چل جاتا ہے کہ کامیابی کی شرح کیا ہے۔ ہم آئے دن اپنی ناکامیوں اور نامرادیوں کا رونا روتے رہتے ہیں لیکن عملی زندگی میں ہماری کوششیں کس قدر سنجیدہ ہوتی ہیں اس کا اندازہ درج ذیل نتائج سے نکالا جاسکتا ہے۔ آئی اے ایس یا آئی پی ایس کے نتائج تو مایوس کن ہیں لیکن دوسرے مقابلہ جاتی امتحانات میں ہماری حیثیت کیا ہے اس کا اندازہ درج ذیل ٹیبل سے لگایا جاسکتا ہے۔

	امتحان	کل کامیاب امیدوار	مندرجہ فہرست ذات	مندرجہ فہرست قبائل	مسلمان	
۱۔	انڈین سول سروسز (۱۹۹۲ء) ICS	۷۶۱	۲۸	۵۹	۲۴	
۲۔	اترپردیش منصفی (۱۹۸۹ء) P.C.S (J)	۴۶	؟	؟	۴	(۲۔ امیدوار مسلم پس ماندہ طبقے سے متعلق)
۳۔	اترپردیش ایگزیکیٹو (۱۹۹۰ء) P.C.S. (E)	۳۵۸			۱۴	(امیدوار مسلم پس ماندہ طبقے سے متعلق)
۴۔	انجینئرنگ سروسز (۱۹۹۲ء)					
	سول انجینئرنگ	۲۶۹			۳	
	میکینیکل	۹۴			۱	
	الیکٹریکل	۶۲			۱	
	الیکٹرانکس ٹیلی کمیونیکیشن	۳۰۸			۳	

* جمال منزل، سول لائنز، علی گڑھ۔

۱	۲		۳	۴	۵	۶	۷
۵	کمبائنڈ دفاعی خدمات مئی ۱۹۹۱ء کمبائنڈ ڈیفنس سروس مئی ۹۲ء امتحان (Combined Defence Service)						
	ملٹری اکیڈمی		۲۰۶			۲	
	نیوی (بحریہ)	Navy	۹۶			صفر	
	ہوائی فوج	Air Force	۴۴			صفر	
	بحری ہوائی فوج		۴۹			صفر	
۶-	دفاعی خدمات (امتحان (اکتوبر ۱۹۹۲ء)		۲۹۸			۶	
	• نیشنل ڈیفنس اکیڈمی						
۷	نیوی اکیڈمی (اپریل ۹۳ء)						
	• آرمی/نیوی		۲۹۸			۵	
	• ایئرفورس	Air Force	۱۲۴			۱	
	• نیوی (بحریہ)		۳۸			۲	
۸	نیشنل ڈیفنس اکیڈمی						
	• نیوی اکیڈمی (ستمبر ۱۹۹۲ء)						
	• آرمی/نیوی		۹۳۰			۹۰	
	• نیوی اکیڈمی (بحریہ)		۷۴			صفر	
	• ایئرفورس		۲۱۴			۲	
۹-	میڈیکل سروسز (۱۹۹۲ء)		۹۷۰	۱۰۳	۵۱	۷	
۱۰	جیالوجسٹ (۱۹۹۲ء)						
	الف	Geologists	۳۰	۶	۱۱	۱	
	ب	Hydrologists	۱۵			صفر	
۱۱-	اکنامکس اور اسٹیٹسٹیکل سروسز ۱۹۹۲ء	(Eco & Statistical Services	۵۲	۱۵	۳	۱	
۱۲-	انکم ٹیکس/سیلز ٹیکس/ایکسائز انسپکٹر امتحان (۱۹۹۱ء)		۲۲۸۰	۲۹۳	۲۲۹		نوٹ: اخبارات میں صرف رول نمبر دیئے گئے ہیں اس لیے مسلم کامیاب امیدواروں کی تعداد نہیں معلوم ہو سکی۔

اترپردیش کے پندرہ ۱۵ گرلز ہائی اسکولوں و انٹر کالجوں میں اپنے مضمون کا نتیجہ بہتر کرنے پر

سینتیس ۳۷ لائق ٹیچرز کو شیروانی ایوارڈ ۱۹۹۳ء

بیگم نصرت شیروانی *

اترپردیش کے ہمارے قریب چالیس گرلز ہائی اسکولوں اور انٹر کالجوں سے ۱۹۹۳ء کے رزلٹ آئے۔ اپنے اپنے مضمون کا نتیجہ بہتر کرنے پر پندرہ گرلز ہائی اسکولوں اور انٹر کالجوں میں سینتیس ۳۷ لائق پرنسپلز اور ٹیچرز کو الحاجہ بیگم تارا رشید شیروانی صاحبہ (چیرمین بھارت سیوا ٹرسٹ منیجنگ ڈائرکٹر جیپ انڈسٹریل سنڈیکیٹ لمیٹڈ اور منیجنگ ڈائرکٹر شیروانی شوگر سنڈیکیٹ لمیٹڈ) کی طرف سے ایوارڈ پیش کیے گئے۔ ان اداروں اور ایوارڈ جیتنے والی لائق پرنسپلز اور ٹیچرز کے نام پیش ہیں۔

گورنمنٹ گرلز ہائیر سکنڈری اسکول۔

حاتم سرائے، سنبھل - ضلع مرادآباد۔

۱۔ محترمہ مسرت جہاں لودی صاحبہ
۲۔ محترمہ عشرت جلیل صاحبہ
۳۔ محترمہ اندرا گپتا صاحبہ
۴۔ محترمہ شاہ جہاں صاحبہ
۵۔ پرنسپل محترمہ شمسہ صدیقی صاحبہ

محمدیہ بنکر نسواں ہائر سکنڈری اسکول۔ سکان پور

۱۔ محترمہ طلعت صاحبہ
۲۔ محترمہ خوشنودی بیگم صاحبہ
۳۔ محترمہ نجمہ بیگم صاحبہ
۴۔ پرنسپل محترمہ ناظرہ بیگم صاحبہ

نجیب الدولہ گرلز انٹر کالج نجیب آباد - ضلع بجنور۔

۱۔ محترمہ ماہ نور خانم صاحبہ
۲۔ محترمہ توضیحہ سلطانہ صاحبہ
۳۔ محترمہ رضوانہ صدیقی صاحبہ
۴۔ محترمہ زرّیں اختر صاحبہ

مسلم فرقانیہ گرلز ہائیر سکنڈری اسکول، لہوالی ضلع سیتاپور

۱۔ محترمہ پشپا مشرا صاحبہ
۲۔ محترمہ شمیم فاطمہ صاحبہ
۳۔ محترمہ عطیہ خاتون صاحبہ

دارالعلوم ہائی اسکول۔ مئو ناتھ بھنجن

۱۔ محترمہ عائشہ خاتون صاحبہ

---

* سکریٹری مسلم گرلز ایجوکیشن کمیٹی۔

۳۔ محترمہ نشاط افروز صاحبہ

۴۔ محترمہ عائشہ خاتون صاحبہ

فیاض بیگم گرلز انٹر کالج۔ بلند شہر

۱۔ محترمہ عفت جمال صاحبہ

۲۔ محترمہ ریحانہ بیگم صاحبہ

۳۔ محترمہ سابرہ پروین صاحبہ

فتحپور گرلز انٹر کالج۔ مئو

۱۔ محترمہ ستارہ بیگم صاحبہ

۲۔ محترمہ فہمیدہ خاتون صاحبہ

حافظ محمد صدیق اسلامیہ گرلز ہائی اسکول۔ اٹاوہ

۱۔ محترمہ نزہت آرا صاحبہ

۲۔ پرنسپل محترمہ عطیہ ادمی صاحبہ

شریمتی صغریٰ بیگم گرلز ہائیر سکنڈری اسکول۔ فیروزآباد

۱۔ محترمہ ذکیہ سلطانہ صاحبہ

۲۔ محترمہ راج رانی صاحبہ

مسلم نسواں ہائیر سکنڈری اسکول۔ سیتاپور

۱۔ محترمہ بلقیس بانو صاحبہ

۲۔ محترمہ رفعت جہاں صاحبہ

نیشنل گرلز انٹر کالج۔ شاہجہاں پور

۱۔ محترمہ معین فاطمہ صاحبہ

۲۔ محترمہ صبیحہ زماں صاحبہ

رفیع میموریل گرلز ہائیر سکنڈری اسکول سملی ضلع بلند شہر

۱۔ محترمہ ثروت نسیم صاحبہ

۲۔ محترم کیلاش چندر صاحب

عالیہ گرلز ہائی اسکول۔ مئو

۱۔ محترمہ نیلوفر جبیں صاحبہ

رحمانیہ گرلز ہائیر سکنڈری اسکول

چاندپور۔ ضلع بجنور

۱۔ محترمہ شاہینہ سوبی صاحبہ

قدوائی بالیکا انٹر کالج۔ انجان شہید

ضلع اعظم گڑھ

۱۔ محترمہ رومانہ شاہین صاحبہ

کچھ اور گرلز اداروں میں نتائج کا تجزیہ اور موازنہ کیا جا رہا ہے۔ ان کی بابت رپورٹ آئندہ پیش کی جائے گی۔ کچھ اداروں سے معلومات مکمل نہیں آئی ہیں یا خطوں کے جواب نہیں آئے ہیں۔ متعلقہ پرنسپل صاحبان کو لکھ دیا گیا ہے۔ مکمل معلومات اور خطوں کے جواب آنے پر ان اداروں کے مضمون وار نتائج کا تجزیہ اور موازنہ بھی کیا جائے گا اور ایوارڈز کے لیے غور کیا جائے گا۔

البتہ ابھی اتر پردیش میں ہمارے قریب دس گرلز ہائی اسکول اور انٹر کالج ایسے ہیں جن کی پرنسپل صاحبان نے ۱۹۹۳ء کے رزلٹ ابھی تک نہیں بھیجے۔ متعدد خطوط کا کوئی جواب نہیں دیا۔ یہ پرنسپل صاحبان اب برائے کرم مزید تاخیر بالکل نہ کریں اور جلد از جلد ۱۹۹۳ء کے رزلٹ بھیج دیں۔

”علم کو اس طرح حاصل کرو کہ عبادت کو نقصان نہ دے اور عبادت اس طرح کرو کہ علم کو نقصان نہ ہو۔“

خواجہ حسن بصریؒ

ماہنامہ تہذیب الاخلاق علی گڑھ ۔ جلد ۱۳ ۔ شمارہ ۲ (فروری ۱۹۹۴ء)

HAMDARD EDUCATION SOCIETY
TALIMABAD, SANGAM VIHAR, NEW DELHI - 110 062
TEL. : 6475063 - 6475064

دینی مدارس و مکاتب کے پتے درکار

ہندوستانی مسلمانوں کی زندگی میں دینی مدارس و مکاتب ہر دور میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں اور یہ مدارس و مکاتب ہندوستانی مسلمانوں کو علم و آگہی دینے میں ہمیشہ پیش پیش رہے ہیں۔ گزشتہ چند سال میں ملک کے بدلتے ہوئے حالات اور مسلمانوں کی بدلتی ہوئی ضروریات نے ان دینی مدارس و مکاتب کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ کیا ہے۔ چند سال پیشتر ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کے بانی اور صدر جناب حکیم عبدالحمید صاحب کی خواہش پر عربی دینی مدارس و مکاتب کے ایک کل ہند سروے کی ابتدا کی گئی تھی جو چند ناگزیر وجوہات کی بناپر پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا اس سروے کی تشکیل کا ایک منصوبہ حال ہی میں بنایا گیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ سروے سے حاصل ہونے والی معلومات ارباب اہتمام کے لیے مدارس کی توسیع اور نظم کے واسطے مفید ثابت ہوں اور انھیں رائے عامہ کی باخبر تائید بھی حاصل ہوسکے۔

سروے کی اس ضرورت اور اہمیت کے پیش نظر قارئین سے گزارش ہے کہ اپنے گرد و نواح کے مدارس و مکاتب کے مکمل پتے ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی کو ارسال فرماکر اس اہم کام میں ہمارا ہاتھ بٹائیں۔ تاکہ سروے کی تکمیل کے لیے مزید اقدامات کیے جاسکیں۔

مدارس و مکاتب کے مکمل پتے

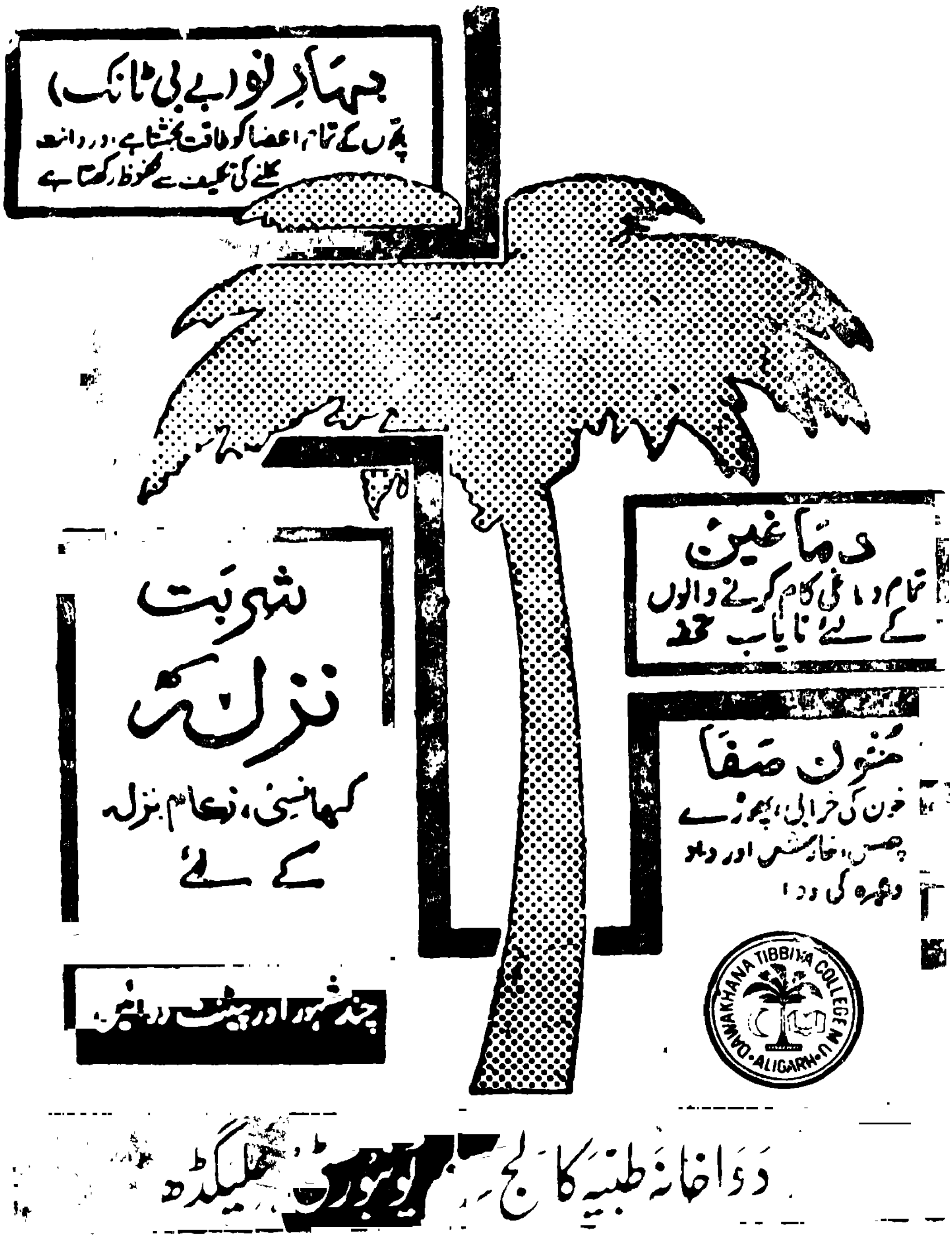
نام مدرسہ / مکتب ____________________

نام مہتمم / صدر مدرس ____________________

مکمل پتہ ____________________

محلہ ________ موضع / شہر ________ ڈاک خانہ ________ پن کوڈ ________

ضلع ________ صوبہ ____________________


بِھارِ نو (بےبی ٹانک)
بچوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے، اور دانت
نکلنے کی تکلیف سے محفوظ رکھتا ہے
شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ
کے لئے
چند مشہور اور ہیٹنٹ دوائیں
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں
کے لئے نایاب تحفہ
صافی خون
خون کی خرابی، پھوڑے
پھنسی، خارش اور داد
وغیرہ کی دوا
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE M.U. ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

تہذیب الاخلاق

اگست ۱۹۹۴ء

6/11/96

ادارۂ تہذیب الاخلاق اور نشانات
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

مجلس ادارت

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۳ اگست ۱۹۹۴ء شمارہ ۸

بانی : سرسید احمد خاں

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

مدیر

پروفیسر مسعود عالم

نائب مدیر

احمد مجتبیٰ قریشی

سرکولیشن انچارج : شفیق احمد

فی شمارہ	4.50	روپے	ترسیل زر کا پتہ :-
زر سالانہ	45.00	روپے	ایڈیٹر : تہذیب الاخلاق اور نشانت
بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک)	20.00	امریکی ڈالر	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ
بیرونی ممالک (عام ڈاک)	8.00	امریکی ڈالر	۲۰۰۲۰۲ (یوپی) انڈیا فون : 401027

ترتیب

اداریہ

آزادی کی سالگرہ

۱۵ اگست بیسویں صدی کے آزاد ہندوستان کی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ کیا آپ 'بیسویں صدی کے آزاد ہندوستان کی تاریخ' پر چونکے نہیں؟ آپ کو یہ نہیں محسوس ہوا کہ یہ کیسی اٹ پٹی سی بات کہہ دی گئی! آپ چاہے اس سے اتفاق کریں یا نہ کریں لیکن ہم نے یہ نکتہ بڑے سوچ بچار اور چھان بین کے بعد ڈھونڈ نکالا ہے۔ کیا آپ اس بات سے بے خبر ہیں کہ کافی عرصے سے ہندوستان کی تاریخ نئے سرے سے لکھنے کی کوشش کی جارہی ہے۔ ایک مخصوص قسم کے "تاریخی شعور" کی آفرینش ہورہی ہے جس کو نفرتوں اور عداوتوں سے سینچا جارہا ہے۔ یہ احساس پیدا کیا جارہا ہے کہ ہندوستان تو تقریباً ایک ہزار سال تک غلام رہا ہے اور یہاں کے اصل باشندے یعنی ہندو ہزار سالہ جدوجہد کے بعد اپنے کو آزاد کرا پائے ہیں۔ لہٰذا ایسے تمام لوگ جنھوں نے باہر سے آنے والوں کا مذہب اور اس کی چند رسوم اختیار کرلیں بوجہ اپنے خلاف ہزاروں سال سے چلے آرہے تعصب کے چشم زدن میں ان کی قومیت بدل گئی، ان کا رنگ روپ، اُن کے خدوخال اُن کی زبان، ان کے رسم ورواج سب کچھ غیر ہوگئے باوجود گہری مماثلت کے، بے چارے اپنے ہی وطن میں بے وطن ہوگئے۔ قصور صرف اتنا تھا کہ ہزاروں سال کے ستم رسیدوں کو جب بھی امید کی نئی کرن دکھائی دی اور ڈوبتے کو تنکے کا سہارا ملا تو وہ حکمرانوں کی سرپرستی میں چلے گئے۔ آج اُن پر فردِ جرم عائد کی جاتی ہے کہ انھوں نے اپنی عبادت گاہیں تعمیر کیں پرانی عبادت گاہوں کو گرا کر۔ تاریخ شاہد ہے کہ آٹھویں اور نویں صدی میں ہزاروں بودھ بستیاں اور مندر مسمار کیے گئے استوپ ٹیلوں میں بدل گئے۔ صدیوں بعد یہ پرانا طے اور ملبوں کے اونچے اونچے ٹیلے چند عبادت گاہوں کی بنیاد بنا دیے گئے اب سینکڑوں سال گزر جانے کے بعد ان ہندوستانیوں سے اس کا حساب مانگا جارہا ہے جن کی رگوں میں وہی لہو دوڑ رہا ہے جو محتسب کی رگوں میں۔ آپ تو سمجھ ہی گئے ہوں گے کہ ہم نے کس 'تاریخی شعور' کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ محض عبارت آرائی نہیں اور نہ ہی یہ کوئی جذباتی گفتگو ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ہندوستان اکیسویں صدی میں اسی 'تاریخی شعور' کی چھتر چھایا میں داخل ہونے جارہا ہے۔

● "۶ دسمبر ۱۹۹۲ء کی رات۔ مقام: لال بہادر شاستری نیشنل اکاڈمی آف ایڈمنسٹریشن، مسوری۔ سول سروسز کے اٹھاونویں بیچ کے تربیت حاصل کرنے والے افسروں کی اکثریت نے بابری مسجد کے گرائے جانے کا جشن منایا۔ اس کے اگوا اس بیچ میں امتیازی کامیابی حاصل کرنے والے تھے۔" پرفل بھائی۔ ٹائمز آف انڈیا دہلی۔ ۲۷ جولائی ۱۹۹۴ء

ہم اس خبر کا حوالہ نہ دیتے اگر اس کی تردید کردی گئی ہوتی۔ ایسی خبریں دودھاری تلوار کا کام کرتی ہیں۔ مگر کیا کیا جائے حقائق سے منہ بھی تو نہیں موڑا جاسکتا، امید کی کرن یہ ہے کہ اس جشن میں سب کے سب شامل نہیں تھے اور اس خبر کو نامہ نگار تک پہنچانے والے اور خود نامہ نگار کے اندر کا انسان شیطان نہیں بن سکا۔

نگریزوں پر الزام عائد کیا جاتا ہے کہ انھوں نے تاریخی واقعات کو توڑ مروڑ کر پیش کیا ہے تاکہ ہندوستان کے رہنے

والوں کو آپس میں لڑایا جا سکے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسا ہوا ہے کیونکہ حکمرانی کرنے والوں کا یہ ایک ہتھکنڈا ہے اور وہ مجبور ہیں کہ ایسی چالیں اقتدار قائم رکھنے کے لیے چلتے رہیں۔ دل پر ہاتھ رکھ کر اور ایمان کی قسم کھا کر کہیے کیا آج کے ہندوستان میں ایسا نہیں ہو رہا ہے۔

پچھلی چار دہائیوں میں پرائمری کلاسوں کی زبان، سوشل سائنس اور تاریخ کی جو کتابیں لکھی گئیں اور ان میں جان بوجھ کر جو نفاق انگیز، تعصب خیز، شرانگیز اور حیرت خیز مواد فراہم کیا گیا، یہ نگر بہادر کی روایت کی توسیع نہیں تو اور کیا ہے۔ ایسا نہیں کہ اس بارے میں چیتاونی نہیں دی گئی، بار بار کہا گیا، لکھا گیا (ان تمام تحریروں کو جمع کر لیا جائے تو دفتر کے دفتر بن سکتے ہیں) لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہیں رینگی اور جب NCERT نے تاریخ کی ٹکسٹ کی کتابیں تیار کیں تو اس کے خلاف وہ شور و غوغا بلند ہوا کہ الحفیظ الاماں۔ کچھ عرصہ پہلے جب قطب مینار اور تاج محل کے بارے میں بے سر پیر کے مضامین چھپا کرتے تھے تو بیشتر ان کو نظر انداز کر دیا جاتا تھا لیکن آج یہ جھوٹ سچ بن کر ہمیں آپ کو منہ چڑا رہا ہے۔ بہرحال ہمیں ان مسائل پر ٹھنڈے دل و دماغ سے سوچنا چاہیے کہ یوم آزادی صرف جشن منانے کے لیے ہی نہیں بلکہ خود احتسابی کے لیے بھی ہے قومی Balance Sheet پر بھی نظر ڈالنے کا دن ہے۔

● کہتے ہیں کہ عوام کی یادداشت کمزور ہوتی ہے۔ وہ بڑے سے بڑے واقعہ اور حادثہ کو جلد بھلا دیتے ہیں۔ دراصل زندگی کے جبر کا یہی تقاضا ہے۔ روزی روٹی کا چکر ایسا چلتا ہے کہ اُن کو مہلت ہی نہیں دیتا کہ وہ کچھ یاد رکھ سکیں۔ لیکن جب یہی واقعات اور حادثات تاریخ کا جز بن جاتے ہیں اور فرقہ وارانہ آن شکست خوردگی کا شکار ہو کر اپنے زخموں کو چاٹتے چاٹتے تھک جاتی ہے اور وہ بھر نہیں پاتے تو رفتہ رفتہ نفرت، عداوت، کینہ اور بغض دلوں پر اثر کر کے رگوں سے بہتا ہوا دماغ میں سرایت کر جاتا ہے اور پھر جذبۂ انتقام وقتاً فوقتاً اپنا خراج وصول کرتا رہتا ہے۔ ہمارے ملک میں عرصے سے یہی چکر چل رہا ہے۔ ... ہم ۱۹۴۷ء میں آزادی تو ملی لیکن نفرت کی امٹ لکیر چھوڑ گ ملک کا بٹوارہ ہوا، صرف زمین ہی نہیں بٹی دل بھی بٹ گئے تقسیم کا المیہ یہ ہے کہ اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی سرحد دونوں طرف بعض سیاسی عناصر اس راکھ کو کریدتے رہتے جس سے اب بھی ہلاکت خیز چنگاریاں اُڑتی رہتی ہیں۔ بہرحال کی وجہ سے سب سے زیادہ گھاٹے میں مسلمان اور اُردو زبا رہے۔ سرحد پار سے جو یہاں آئے ان کی آبادکاری دنیا کی میں پذیرائی اور بھائی چارہ کا ایک بے مثل کارنامہ ہے لیکن جن لوگوں نے بڑی امیدوں کے ساتھ سرحد پار ہجرت کی تھی آج تک مہجور بھی ہیں اور مہاجر بھی۔

● ہم نے اُردو زبان اور مسلمان کے گھاٹے کا ذکر کیا ہندوستان میں جہاں تک اُردو کا تعلق ہے اگر کھل کر چند با کر لی جائیں تو کوئی مضائقہ نہیں۔ کچھ دل کا بوجھ ہی ہلکا ہو جائے اور چند ایک غلط فہمیوں کا ازالہ بھی ہو سکے گا۔

> "اردو زبان صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔ یہ ہندوستانی زبان ہے اور اس پر ہر ہندوستانی کا حق ہے۔" "اردو صحافت کو چاہیے کھلا ذہن"۔ موہن چراغی۔ قومی آواز ہفتہ وار ضمیمہ۔ مورخہ ۳۱ جولائی ۱۹۹۴ء

عنوان پڑھ کر ہی آدمی چونک پڑتا ہے اور مضمون پڑھتے پڑھتے جب اس جملہ تک پہنچتا ہے تو عجب گومگو میں پڑ جاتا ہے۔ چراغی نے جو بات لکھی ہے اُن کی حد تک تو قابلِ قبول ہے لیکن ۴۷ سال میں کئی اُردو لکھنے والے ہندو ادیب، صحافی اور یہی بات اپنے اپنے ڈھنگ سے کہہ چکے ہیں لیکن بدقسمتی سے کی تعداد چند ایک سے آگے نہیں بڑھتی۔ سچ تو یہ ہے کہ نے اُردو کو ہندوستان میں ہندوستانی مسلمانوں کی زبا ان کی پہچان بنا دیا ہے۔ ہوا یوں تھا کہ اردو خانقاہوں او سے بازاروں اور بازاروں سے قلعہ معلی پہنچ کر زبانِ معلّی

انگریزوں نے اسے تخت نشین کر دیا لیکن ۱۹۴۷ء کے بعد ہندوستان میں اس کے ساتھ جو سلوک ہوا، اس کے بعد وہ ایک بار پھر لوٹ رہی ہے خانقاہوں کی طرف اور پناہ گزیں ہو رہی ہے اسلامی مکاتیب میں اور شاید اسی لیے ترجمانی کرتی ہوئی نظر آتی ہے اُن مسائل کی جن کا تعلق 'مسلمان'، اس کے کلچر اور اس کے مذہب سے ہے۔ رہے وہ تمام آثار جو کسی زبان کے پھلنے پھولنے کے ہیں جیسے ترقی اُردو بورڈ، صوبائی اُردو اکیڈمیاں، خطاطی کے اسکول، اُردو ٹیچرس کی بھرتی اور مجوزہ اردو یونیورسٹی (جس پر ہم آئندہ کسی شمارے میں اظہارِ خیال کریں گے) تو اگر کسی صورت سے ووٹ بٹورنے کی سیاست سے الگ کر لیا جائے تو یہ سب بڑے کام کی چیزیں ثابت ہوں گی۔ دراصل اردو زبان کے ساتھ محبت اور نفرت کا یہ کھیل ایک لمبے عرصے تک چلتا رہے گا۔ یہ بھی ایک دلچسپ بات ہے کہ اُردو کے سرکاری سرپرست اس کو صرف ایک پسماندہ اور مظلوم طبقہ کی زبان سمجھتے ہیں اور جو اُردو کے درپے ہیں وہ اس زبان کو اور اس کے بولنے والوں کے کلچر اور ان کے تشخص کو ہی ختم کر ڈالنا چاہتے ہیں لیکن شاید انھیں معلوم نہیں کہ اُردو نے اب ایک بین الاقوامی Status حاصل کر لیا ہے، اس نے اپنے لیے چھوٹے بڑے ٹھکانے تلاش کر لیے ہیں ویسے ہمیں امید ہے کہ اردو ہندوستان میں اکیسویں صدی میں بھی جی سکے گی۔ علیٰ ہذا القیاس یہی بات ہندوستانی مسلمانوں کے بارے میں بھی کہی جا سکتی ہے۔

● ہندوستانی سماج کے تنوع میں وحدت 'جیو اور جینے دو' کے اصول پر قائم ہے۔ اس میں جب بھی ذرا سا خلل واقع ہوتا ہے سماج ٹوٹتا ہوا نظر آتا ہے لیکن عوام الناس کی صلح پسندی اور امن کے ساتھ جینے کی خواہش اس کو سنبھال لیتی ہے۔ یہ عوام کی قوت ارادی ہی ہے جو ہندوستان میں جمہوریت کی بقا کی ضامن ہے۔ ورنہ سیاست گری تو ہمہ وقت مذہب، ذات پات اور علاقائیت کی بنیادوں پر استحصال کے لیے تیار رہتی ہے۔ شکایت یہ نہیں ہے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے سوال یہ ہے کہ ایسا کب تک ہوتا رہے گا؟ جواب یہ ہے کہ . . . . ایسا اس وقت تک ہوتا رہے گا جب تک اسے ہونے دیا جائے گا جب عوام جذباتی ہوں اور ان میں یہ احساس بیدار کر دیا جائے کہ وہ سینکڑوں سال تک غلام رہے ہیں تو آزادی کی ترنگ میں من کا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے وہ کچھ کر گزرتے ہیں جو کسی بھی حالت میں اتنی پرانی تہذیب کی حامل اور شائستہ قوم کو نہیں کرنا چاہیے۔ دراصل ساری خرابی کی جڑ ووٹ بینک کی سیاست ہے۔ مشرق میں چونکہ جمہوریت ابھی ابتدائی حالت میں ہے لہٰذا الکشن کی سیاست کا انحصار ووٹوں کو بٹورنے پر ہے اور اس کے لیے مذہب، ذات پات، سازشیں، جرائم پیشہ افراد کی سرپرستی، اُن کے ذریعہ عوام کا استحصال، ووٹ "چھپوانا" وغیرہ وغیرہ ایسے شارٹ کٹ ہیں جن کے ذریعہ سیاسی اقتدار حاصل کرنا آسان نظر آتا ہے لہٰذا بلا تخصیص اس کا استعمال الکشن کے زمانے میں عام ہو جاتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ اس کو روکنے کی کوشش نہیں کی جاتی، کی جاتی ہے لیکن بادل نخواستہ۔

● ہمارے ملک کو اس وقت داخلی تحفظ کی بڑی سنگین صورتِ حال کا سامنا ہے۔ کشمیر، آسام، ناگا لینڈ، منی پور اور تری پورہ اور کسی حد تک پنجاب میں دہشت گردی کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے، کبھی کبھی اس قسم کی صورت حال ملک کے باقی ماندہ حصوں میں بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ آخر اسباب کیا ہیں؟ آج ساری دنیا دہشت گردی کی لپیٹ میں ہے۔ مزید برآں خانہ جنگیاں، تیز رفتار زندگی، بین الاقوامی سطح پر سماجی جرائم میں غیر معمولی اضافہ عام طور پر لوگوں میں اپنی خواہشات کو پورا کرنے میں انتہائی خود غرضی، منشیات کا بڑھتا ہوا استعمال اور اس کی بے دھڑک تجارت، چھاپہ ماروں، دہشت گردوں اور جرائم پیشہ افراد کو ناجائز اسلحہ کی فراہمی کا نفع بخش کاروبار، جسم و جاں کی فروخت، بوالہوسی اور شہوانیت کے بڑھتے ہوئے کاروبار وغیرہ وغیرہ۔ دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کے نفع خور تاجروں کی سرپرستی اور ترقی پذیر ممالک میں اس کی دلالی نے ان مسائل کو اور زیادہ گمبھیر بنا دیا ہے۔ ان مسائل سے

نپٹنے کے لیے ہر جگہ نئے قوانین بنائے جاتے ہیں اور پرانے قوانین میں ترمیم و تنسیخ کرکے ان کو موثر بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ہماری حکومت نے اس صورت حال سے عہدہ برآ ہونے کے لیے DIR اور MISA جیسے (استحصالی) قوانین کا ایک جانشین قانون جس کا مختصر عنوان TADA ہے ۱۹۸۵ء میں وضع کیا تھا، اس وقت پنجاب کے حالات بہت خراب تھے، اعداد و شمار کے مطابق سب سے زیادہ گرفتاریاں بھی پنجاب ہی میں ہوئیں۔ اس کے بعد شمالی مشرقی ریاستوں میں اور آندھرا پردیش میں بلکہ تقریباً سارے ملک میں لوگوں کو اس قانون کے تحت قید و بند کی صعوبتیں غیر معینہ مدت کے لیے جھیلنی پڑیں، پچھلے دو برسوں میں مہاراشٹر اور گجرات میں اس کے تحت جو لوگ پکڑے گئے ہیں اُن میں غالب اکثریت مسلمانوں کی ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ ان گرفتاریوں میں بوڑھوں اور بچوں تک کو نہیں چھوڑا گیا۔ قانون بنایا جاتا ہے لوگوں کی حفاظت کے لیے لیکن قانون کے محافظ اپنی کارکردگی دکھانے میں اتنے زیادہ جوش و خروش کا اظہار کرتے ہیں کہ وہ انسان دوستی اور ہمدردی نام کی کسی چیز کے بارے میں سوچتے ہی نہیں اور پھر معصوم اور بے گناہ لوگوں پر مظالم کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ لوگ عدالتوں کے دروازے کھٹکھٹاتے ہیں لیکن انصاف بڑا مہنگا اور دیر طلب ہونے کی وجہ سے نہ معلوم کتنے لوگ انتظار کی گھڑیاں گنتے گنتے موت کی آغوش میں سو جاتے ہیں۔ پولس ریمانڈ اور جوڈیشیل ریمانڈ کے دوران سچائی جاننے کے لیے بے گناہوں پر کیا کیا گزر جاتی ہے، تفصیلات سے اخبارات اور رسائل بھرے رہتے ہیں۔ انسانی حقوق کمیشن اور اقلیتی کمیشن کی رپورٹیں اکثر ان واقعات پر اپنا ردِ عمل ظاہر کرتی رہتی ہیں۔ حال میں عدلیہ نے ان معاملات کو نپٹانے میں خاصی مستعدی کا ثبوت دیا ہے جو اس کی کارکردگی کا ایک خوش آیند پہلو ہے۔ امید کی جا رہی ہے کہ جلد ہی اس کالے قانون کو واپس لے لیا جائے گا۔

● دہشت گردی کا مقابلہ اور اس پر قابو پانے کا مسئلہ

بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا TADA کے ذریعہ لوگوں پر سب و شتم اور ظلم و ستم کے سلسلے کو روکنے کا۔ کوئی بھی حکومت عوام کو دہشت گردوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتی، ان کی من مانی کو روکنے کے لیے قانون اور طاقت دونوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ بعض دفعہ مروجہ قوانین ناکافی ہوتے ہیں لہٰذا صورت حال کا سامنا کرنے کے لیے سخت قسم کے قوانین کا وضع کرنا ضروری ہو جاتا ہے۔ ہماری تجویز ہے کہ مروجہ قوانین ہی میں ترمیم کرکے ان کو اور سخت بنایا جا سکتا ہے اور کئی بار ایسا ہوا بھی ہے کہ Cr. PC اور IPC میں اس قسم کی ترمیمات کی گئی ہیں۔ سارا معاملہ قانون کے نفاذ اور اس پر عمل درآمد کا ہے، جن ایجنسیوں کے ذریعہ اس کا نفاذ کیا جاتا ہے ان کی کارکردگی پر گہری نظر رکھنے کی ضرورت ہے اس سلسلہ میں انسانی حقوق کے کمیشن کو اور زیادہ با اختیار بنانے کی ضرورت ہے۔ دہشت گردی کی پیدائش اور افزائش کے عوامل پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے۔ دہشت گردی یوں ہی نہیں شروع ہو جاتی۔ ہو سکتا ہے کہ کسی علاقے کے رہنے والے، کسی زبان کے بولنے والے، کسی مذہب کے ماننے والے، کسی ثقافتی اقلیت کے لوگ، تجربات اور معقول اسباب کی بنا پر ایک عرصہ تک محسوس کرتے رہے ہوں کہ اُن کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے وہ نہیں ہونا چاہیے تھا، اُن کو جو ملنا چاہیے تھا وہ نہیں ملا۔ غرضیکہ اُن کے ساتھ انصاف نہیں ہو رہا ہے۔ ایسے میں وہ چھپا ہوا ہاتھ جو قطعی طور پر دشمن ہے اور موقع کی تلاش میں رہتا ہے اپنا کام شروع کر دیتا ہے اور ہم غافل رہتے ہیں یہاں تک کہ وہ سب کچھ ہونے لگتا ہے جس کو نہیں ہونا چاہیے، تب ہم چونک اٹھتے ہیں اور جب پانی سر سے اونچا ہونے کے قریب ہوتا ہے تو کارروائی شروع کرتے ہیں۔ یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے اس کی بھی طویل کہانی ہے قصہ مختصر یہاں بھی مصلحتیں، عمل کی کوتاہی عادتاً اور کبھی کبھی بالارادہ کہ بات بڑھ جائے تو ایک مسئلہ لاینحل بنا کر سامنے لایا جائے، اقتدار کی رسہ کشی، ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہرانے کے مناظر اور مظاہرے، ریلیاں اور بند جس کی تان ٹوٹتی ہے ووٹروں و

اپنی اپنی طرف کھینچنے پر۔ ان ہزار خرابیوں کے باوجود دہشت گردی کو پھلنے پھولنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی اور دنیا کی کوئی حکومت جس کا ضمیر چاہے بلیب ہی کیوں نہ ہو اس صورتِ حال کو برداشت نہیں کرسکتی۔ عوام کو اس کام میں حکومت کا ہاتھ بٹانا چاہیے بشرطیکہ حکومت صحیح معنوں میں غیر جانب داری سے کام لے کر ملکی قوانین کی پابندی کرے اور کرائے۔

● ایک اہم مقدمہ سیکولرازم کا بھی ہے کیونکہ مستقبل کے ہندوستان کا نقشہ کیا ہوگا اس کا بڑا انحصار سیکولرازم کے ایسے تصور اور تصویر پر ہے جو ہندوستان کے عام آدمی کو قبول ہوں اور اس کو زندگی خوشگوار اور جینے کے لائق دکھائی دے۔ سیمینار، مباحثے تقریریں اور تحریریں تو بہت ہو چکیں، قانون بھی بہت سے بنائے جاچکے اب اس سلسلہ میں عمل کی ضرورت ہے جس سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ مذہبی، نسلی، ذاتی، لسانی، علاقائی اور ثقافتی تعصبات کسی فردِ واحد کی زندگی کو بدحظ نہیں کر رہے ہیں، کسی کو مذکورہ اسباب کی بنا پر بنیادی حقوق اور سہولتوں سے محروم نہیں کیا جارہا ہے، لوگوں کو ایک دوسرے کی دل آزاری کی اجازت نہیں ہے، طاقت کے بل پر کسی کا استحصال نہیں کیا جارہا ہے، بوڑھوں اور عورتوں کا احترام کیا جاتا ہے۔ عام بچوں کی صحت، تعلیم و تربیت کا خیال رکھا جاتا ہے، کم عمری میں زندگی کا بوجھ ڈھونے کے بجائے کھیلنے اور دو وقت کھانے کی سہولتیں ان کو میسر آجائیں یہی سیکولرازم ہے۔ تعصبات سے پاک زندگی اس کی سب سے جامع تعریف ہے۔

● مسائل تو اور بھی ہیں، مثلاً ملکی معیشت اور خارجہ پالیسی بہت اہم پہلو ہیں قومی زندگی کے لیکن یہ دونوں ہی آج کے دور میں تابع ہیں عالمی معیشت اور بین الاقوامی سیاست کے۔ سوویت یونین کے خاتمہ کے بعد امریکہ ساری دنیا پر، اقوام متحدہ، جی 7 اور GATT جیسی تنظیموں کے واسطے سے حاوی ہی نہیں بلکہ حکمراں ہے جو لوگ اخبارِ عالم سے باخبر رہتے ہیں وہ اچھی طرح واقف ہیں اس نکتہ سے کہ دور دور تک دکھائی نہیں دیتا کہ آج کی دنیا اس تسمہ پائی سے نجات پاسکے گی۔ معیشت کے سلسلہ میں اندرونی پالیسی ہیں: جمع خوری، کالا بازاری، قیمتوں میں من مانے اضافے، بینکنگ Banking کے کاروبار میں دھوکہ دھڑی کو روک کر سدھار لایا جاسکتا ہے جن سے عوام کو قدرے راحت کا احساس ہوسکتا ہے لیکن جہاں جمہوری نظام کی بہت سی خوبیاں ہیں کچھ خرابیاں بھی ہیں مثلاً الکشن اور اس کے بے پناہ اخراجات اور ان میں کامیابی حاصل کرنا، جب تک ان میں سدھار نہیں ہوگا بات نہیں بن سکے گی۔ داخلی مسائل میں خاص و عام کی جان و مال کی حفاظت، عزت و آبرو کے ساتھ جینے کے مسائل ہیں، یہاں بھی کمزور انتظامی پالیسی نے جا حمایت، سیاسی مصالح، مذہب ذات پات اور علاقائیت کی بنیادوں پر جانب داری اور اس سے بھی بڑھ کر بھائی بھتیجاواد ایسی انسانی کمزوریاں ہیں جو روڑے اٹکاتے ہیں اور رکاوٹ بن جاتے ہیں حالات کو ٹھیک کرنے میں اور معاشرے کو نارمل بنانے میں اور نہیں کہا جاسکتا کہ ہم ان حالات پر کب تک قابو پاسکیں گے۔ ہاں ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیے خوشگوار مستقبل سے اور امید رکھنی چاہیے کہ ہماری آنے والی نسلیں ہمارے مقابلہ میں زیادہ پُرسکون اور خوشگوار زندگی گزار سکیں گی۔

● جہاں تک قومی سطح پر تعلیم اور اس کے مسائل کا تعلق ہے ہم اپنے اس ناچیز جریدے کے ذریعہ مختلف پہلوؤں پر صائب الرائے اہلِ قلم کے خیالات آپ تک پہنچاتے رہتے ہیں۔ آئندہ اس بات کی کوشش ہوگی کہ ان کو ایک منصوبہ بند انداز میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اتنے بڑے اور غریب ملک میں جہاں کروڑوں بچے اسکول میں تعلیم پاتے ہیں اور تقریباً اتنے ہی اس سے محروم ہیں یہ اتنا بڑا مسئلہ ہے کہ جس کو حل کرنا صرف حکومت کے بس کی بات نہیں، اور صورت حال بھی یہی ہے کہ ہزار رضاکار تنظیمیں اس کام میں لگی ہوئی ہیں لیکن ان میں اتنے تضاد ہیں کہ بات بن نہیں پارہی ہے اور ایسا بھی نہیں دکھائی دیتا کہ حکومت اس سلسلہ میں کوئی انقلابی قدم اٹھا سکے گی۔ بدوسرے یہ ایک ایسا نازک مسئلہ ہے جو آئینی تحفظات کی وجہ سے اور بھی پیچیدہ بن گیا ہے۔ ایک بار پھر ہم یہی عرض کریں گے کہ مستقبل کے روشن امکانات پر ہم کو نظر رکھنی چاہیے۔

مدیر

سرسید احمد خان

عورتوں کے حقوق

تربیت یافتہ ملک اس بات پر بہت غل مچاتے ہیں کہ عورت اور مرد دونوں باعتبار آفرینش کے مساوی ہیں اور دونوں برابر حق رکھتے ہیں کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورتوں کو مردوں سے کم اور حقیر سمجھا جاوے اگر تمثیلاً کہا جاوے کہ عورت انسان کے لئے بمنزلہ بائیں ہاتھ کے ہے اور مرد بمنزلہ دائیں ہاتھ کے یا قدر و قیمت میں عورت بمنزلہ سولہ آنے کے ہے اور مرد بمنزلہ روپیہ کے تو بھی اس پر راضی نہیں ہوتے بااینہمہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس قدر قدر و منزلت عورتوں کی مذہب اسلام میں کی گئی ہے اور ان کے حقوق اور ان کے اختیارات کو مردوں کے برابر کیا گیا ہے۔ اس قدر آج تک کسی تربیت یافتہ ملک میں نہیں ہے انگلینڈ جو عورتوں کی آزادی کی بڑی حامی کار ہے جب اس کے قانون پر جو عورتوں کے باب میں ہے نظر کی جاتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے عورتوں کو نہایت حقیر اور لاعقل اور لاشئی سمجھا ہے۔

انگلینڈ کے قانون کے بموجب عورت شادی کرنے کے بعد معدوم الوجود متصور ہوتی ہے اور ذات شوہر سے مبدل ہوجاتی ہے۔

وہ کسی قسم کے معاہدہ کی صلاحیت نہیں رکھتی اور اس لئے وہ کسی دستاویز کی جو اس نے خود اپنی مرضی سے بلا شوہر کی مرضی کے لکھی ہو ذمہ دار نہیں ہو سکتی۔

جو ذاتی اسباب اور مال و نقد و جائداد قبل شادی عورت کی ملک ہو وہ سب بعد شادی کے مقبضہ شوہر آجاتی ہے۔

جو جائداد کہ عورت کو وراثتاً قبل شادی کے یا بعد شادی کے ملی ہو اس سب پر اس کا شوہر تاحین حیات قابض ہوجاتا ہے اور وہی اس کا محاصل لیتا ہے۔

وہ مثل لاعقل شخص کے نہ کسی پر دعویٰ کر سکتی ہے اور نہ اس پر کوئی دعویٰ رجوع کر سکتا ہے۔

وہ بلا اجازت شوہر کے کوئی اسباب نہیں خرید سکتی اور کوئی چیز بیع نہیں کر سکتی۔

وہ بجز روٹی کھانے اور کپڑا پہننے اور ایک مکان میں رہنے کے آج کے جو ضروریات زندگی کے لئے درکار ہے اور کوئی خرچ بغیر مرضی شوہر کے نہیں کر سکتی۔

سنہ ۱۸۷۰ء میں پارلیمنٹ میں منکوحہ عورتوں کی جائداد کا ایک بل پیش ہوا تھا اس میں صرف یہ بات چاہی گئی تھی کہ وہ قانون جس کے ذریعہ سے بعد شادی کے عورت اپنی جائداد سے محروم ہوجاتی ہے منسوخ کیا جاوے۔

آنریبل مسٹر رسل گرے ممبر پارلیمنٹ نے یہ مسودہ قانون کا پیش کیا تھا اس وقت انہوں نے نہایت لطیف بات یہ کہی تھی کہ حال کے قانون کے بموجب جو کچھ جائداد عورت کے پاس قبل شادی ہوتی ہے اور بعد شادی ملتی ہے اور جو کچھ کہ وہ اپنی محنت ولیاقت سے کماتی ہے بعد شادی کے وہ اس کا نہیں رہتا سب پر شوہر مالک ہوجاتا ہے پس شادی کا اثر اس عورت پر ایسا ہوتا ہے جیساکہ کسی جرم قابل ضبطی جائداد کا اثر ہوتا ہے۔

اس گفتگو پر تمام ہوس آف کامنز ہنس پڑا اور اکثر ممبروں نے آنریبل مسٹر رسل گرے کی تائید کی پس انگلستان کے قانون کا عورتوں کی نسبت یہ حال ہے اور غالباً کوئی قانون اس سے زیادہ خراب اور مضرت رساں اور ناانصاف نہ ہوگا۔

ذکر مسلمانی قانون کا نسبت عورتوں کے

اب خیال کرو کہ مسلمانی قانون میں عورتوں کو کس

☆ تہذیب الاخلاق۔ جلد دو، شارہ نمبر ۹، جولائی ۱۸۷۱ء

طرح عزت دی گئی ہے اور مردوں کے برابر ان کے حقوق اور اختیار تسلیم کئے گئے ہیں۔

حالت نابالغی میں جس طرح مرد اسی طرح عورت بے اختیار اور ناقابل معاہدہ متصور ہے الا بعد بلوغ وہ بالکل مثل مرد کے مختار اور ہر ایک معاہدہ کے لائق ہے۔

جس طرح مرد اسی طرح عورت اپنی شادی کرنے میں مختار ہیں جس طرح کہ مرد کی بے رضامندی نکاح نہیں ہوسکتا اسی طرح عورت کی بلا رضامندی نکاح نہیں ہوسکتا۔

وہ اپنی تمام ذاتی جائداد کی خود مالک اور مختار ہے اور اور ہر طرح اس میں تصرف کرنے کا اس کو اختیار کامل حاصل ہے۔

وہ مثل مرد کے ہر قسم کے معاہدے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اس کی ذات اس کی جائداد ان معاہدوں اور دستاویزوں کی بابت جواب دہ ہے جو اس نے تحریر کی ہوں۔

جو جائداد قبل شادی اور بعد شادی اس کی ملکیت میں آئی ہو وہ خود اس کی مالک ہے اور خود اس کے محاصل کی لینے والی ہے۔

وہ مثل مرد کے دعویٰ بھی کرسکتی ہے اور اس پر بھی دعویٰ ہوسکتا ہے۔

وہ اپنے مال سے ہر ایک چیز خرید سکتی ہے اور جو چاہے اس کو بیع کرتی ہے وہ مثل مرد کے ہر قسم کی جائداد کو ہبہ اور وصیت اور وقف کرسکتی ہے۔

وہ رشتہ داروں اور شوہر کی جائداد میں سے بہ ترتیب وراثت ورثہ پاسکتی ہے۔

وہ تمام مذہبی نیکیوں کو جو مرد حاصل کرسکتا ہے حاصل کرسکتی ہے۔

وہ تمام گناہوں کے عوض میں دنیا اور آخرت میں وہی سزائیں پاسکتی ہے جو مرد پاسکتا ہے۔

کوئی قید خاص عورت پر بجز اس کے جو خود اس نے بسبب معاہدہ نکاح کے اپنے پر قبول کی ہیں یا اس تفاوت ستر عورت میں جو نیچر یعنی قدرت نے دونوں میں مختلف طور سے بنایا ہے ایسی نہیں ہے جو مرد پر نہ ہو پس حقیقت میں مذہب اسلام میں جس طرح کہ عورت و مرد کو برابر سمجھا ہے ویسا نہ کسی مذہب میں ہے اور نہ کسی قوم کے قانون میں ہے۔

مگر تعجب اور کمال تعجب اس بات میں ہے کہ تمام تربیت یافتہ ملک مسلمانوں کی عورتوں کی جو حالت ہے اس پر بہت کچھ نام رکھتے ہیں اور اس میں کچھ شک نہیں کہ تربیت یافتہ ملک کی عورتوں کی حالت مسلمانوں اور مسلمان ملک کی عورتوں کی حالت سے بدرجہا بہتر ہے حالانکہ معاملہ بالعکس ہونا چاہئے تھا۔

عورتوں کی حالت کی بہتری جو تربیت یافتہ ملکوں میں ہم نے تسلیم کی ہے اس میں کچھ بھی خیال ہم نے بے پردگی کی آزادی کا نہیں کیا ہے کیونکہ ہماری رائے میں ہندوستان میں اس باب میں جس قدر کہ تفریط ہے اسی قدر تربیت یافتہ ملکوں میں افراط ہے اور جو حد کہ شرع نے مقرر کی ہے اور جہاں تک کہ انسان اس پر غور کرسکتا ہے اور اپنی عقل کو کام میں لاسکتا ہے بلا شبہ وہی حد نہایت درست اور ٹھیک معلوم ہوتی ہے اس مقام پر جو ہم کو بحث ہے وہ صرف مردوں کے عورتوں کے ساتھ حسن سلوک اور حسن معاشرت اور تواضع اور خاطرداری اور محبت اور پاس خاطر اور ان کی آسائش اور آرام اور خوشی اور فرحت کی طرف متوجہ ہونا اور ان کو ہر طرح پر خوش رکھنا اور بعوض اس کے کہ عورتوں کو اپنا خدمت گذار تصور کریں ان کو اپنا انیس اور جلیس اور رنج وراحت کا شریک اور اپنے کو ان کی اور ان کو اپنی باعث مسرت اور تقویت کے سمجھنے پر بحث ہے بلا شبہ جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے تربیت یافتہ ملکوں میں عورتوں کے ساتھ یہ تمام مراتب بخوبی برتے جاتے ہیں۔ اور مسلمان ملکوں میں ویسے نہیں برتے جاتے اور ہندوستان میں تو ایسی نالائقی اور خاک اڑتی ہے کہ نعوذ باللہ منہا

جو لوگ کہ ان خرابیوں کو مذہب اسلام کی طرف

باقی صفحہ ۱۱ پر

سید حامد ☆

پہلو

انسان لفظوں کے ساتھ طرح طرح سے بے تکلفی برتتا ہے۔ گویا وہ اپنے بنائے ہوئے الفاظ کے جبر کے خلاف احتجاج کرتا ہے۔ چنانچہ وہ کہتا کچھ ہے اور مراد کچھ لیتا ہے لفظوں کے ابتدائی معنی سے انحراف اس طرح کیا جاتا ہے کہ جو بات کہی جارہی ہے وہ سننے والے کی سمجھ میں آجائے۔ کبھی ظرف کہہ کر مظروف مراد لیتے ہیں، کبھی اس کے برعکس، یہ بھی ہوتا ہے کہ کل کہہ کر جزو مراد لیا جائے اور اس کا الٹا بھی۔ چنانچہ پہلو دل کے مفہوم میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ بدلے ہوئے معانی کبھی محاورہ کا بھیس بدل لیتے ہیں۔ الفاظ کو نئی نئی طرح اور نرالے معنوں میں استعمال کرنے کا ہنر سیکھنا چاہتے ہوں تو شاعروں سے رجوع کیجئے۔ اچھے اشعار اکثر پہلودار ہوتے ہیں یعنی ان سے ایک سے زیادہ مطلب نکلتے ہیں۔ مفاہیم کی ایک تہ بڑے شاعر اپنے اشعار میں سجا دیتے ہیں۔ آپ کس تہ تک پہنچتے ہیں یا کس تہ تک نہیں پہنچتے ہیں یہ آپ کے ذوق اور شعور پر منحصر ہے۔

افلاطون سے لے کر تیزگام ٹیکنولوجی کے اس عہد تک جس میں ہم رہ رہے ہیں شعروشاعری کو بارہا موردِ الزام ٹھہرایا گیا ہے۔ اسے بیکاروں کا مشغلہ بتایا گیا اس کی افادیت سے انکار کیا گیا۔ شاعروں نے بھی اکثر ایسے طور طریقوں سے سماج کو برگشتہ کیا لیکن ہم آج اس بحث میں نہیں پڑنے والے۔ جن لوگوں کو پروردگار نے گہری نگاہ دی ہے وہ جانتے ہیں کہ ٹیکنولوجی کے سائے میں مادیت بے قابو ہوتی جارہی ہے۔ اس کے جگرناث کے پاؤں تلے قدریں کچلی جا رہی ہیں، کچھ دنوں بعد شاید ان کا نشان بھی مٹ جائے۔ قدروں کو زندہ رکھنے میں ادب اور شاعری کا بڑا دخل ہے حالانکہ بہ ظاہر شاعری ان میں شگاف ڈالتی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ قدریں جسے شاعری پروان چڑھاتی ہے ادب و ضوابط سے بالاتر ہیں۔ ان کا بڑا کام یہ بات منوالینا ہے اور منواتے رہنا ہے کہ زندگی صرف مادہ نہیں ہے۔ اور نہ وہ جسم کے مختلف تقاضے پورا کرنے کا نام ہے۔ زندگی مادے کی چٹان سے جست لے کر اڑان بھرتی ہے اسے افادیت کے پیمانے سے ناپنا اس کا خون کرنا ہے۔ فلسفہ، مذہب اور ادب انسان کو مادہ کا اسیر ہونے سے بچاتے ہیں تینوں کے طریقے الگ الگ ہیں تینوں میں بظاہر فاصلہ بھی بہت ہے لیکن انسانیت کو اس کے جوہر کی طرف لے جانے میں تینوں کا ہاتھ ہے اور اس محبت کا بھی جو خالق اور مخلوق دونوں کا احاطہ کرتی ہے اکثر ان تینوں چاروں کے درمیان حدیں واضح نہیں رہتیں۔ یہ باہم گڈمڈ بھی ہو جاتے ہیں۔

ہمارے تیزرو مادہ پرست اور افادیت پیشہ دور میں جب مادی طاقت اور آسائش نے چپہ چپہ پر اپنی دوکانیں سجا رکھی ہیں، ادب عالیہ اور شاعری کی ضرورت، ہرچند کہ وہ پسپا اور بے قدر ہو رہی ہیں اور زیادہ ہو گئی ہے لیکن ہمارا مقصد آج کی صحبت میں شاعری کے اس وصف کی طرف دھیان دلانا ہے جسے پہلو داری کہتے ہیں اور اس وصف سے عام زندگی کے لئے کچھ سبق حاصل کرنا ہے۔

پہلو صرف اچھے اشعار میں نہیں ہوتے۔ زندگی کا ہر تجربہ، ہر مشاہدہ، ہر فیصلہ پہلو دار ہوتا ہے۔ کوئی ان پہلوؤں کو رخوں سے تعبیر کرتا ہے، کوئی انہیں مضمرات کہہ کر اپنا مفہوم ادا کرتا ہے۔ زاویہ نگاہ کی ترکیب اسی وصف سے نکلی ہے۔ ہر شئے خواہ وہ مادی اور جسمانی ہو، خواہ ذہنی اور خیالی، کئی پہلو

☆ سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی

رکھتی ہے۔ بیشتر لوگ ایک ہی پہلو دیکھ پاتے ہیں وہ دوسرے پہلو کو دیکھنے یا ان پر غور کرنے کے لئے نہیں رکتے وہ یہ بھی نہیں سوچتے کہ اونٹ آگے چل کر کس کروٹ بیٹھے گا ایک بے نمایاں پہلو کو دیکھ کر جو فیصلہ کرنے اور قدم اٹھانے جارہے ہیں ان کے مضمرات اور نتائج کیا ہوں گے۔ ان مضمرات اور نتائج سے وہ عہدہ بر کیوں کر ہو پائیں گے جس کی انھیں آہٹ ہی نہ ملی۔ جیت اسی کی ہوتی ہے جو پہلے سے تیار رہتا ہے۔ پریشانی اور پشیمانی سے بچنے کا یہی طریقہ ہے۔ نگاہ اگر پہلو گیر اور جامع مضمرات ہو تو انسان بہت سی زحمتوں اور خفتوں سے بچا رہتا ہے۔

ہوشمند لوگ اپنا ذہن سان رکھتے ہیں اور اسے ایسی تربیت دیتے ہیں کہ زیر نظر شئے یا مسئلہ کے سارے پہلو ذرا سی دیر میں اس کے سامنے آجائیں۔ سارے پہلوؤں پر غور کرکے جو فیصلہ ہوتا ہے وہ عموماً صحیح ہوتا ہے۔ یا کم از کم اس کے متعلق یہ حسرت یا پشیمانی نہیں ہوتی کہ فیصلہ عجلت میں کیا گیا اور یک رخا رہ گیا اسی لئے یہ بھی ضروری ہے کہ گھبراہٹ میں کوئی قدم نہ اٹھایا جائے' کوئی فیصلہ نہ کیا جائے' گھبراہٹ پریشانی یا جذبہ کے زیر اثر جو فیصلہ کیا جائے گا اس میں سارے پہلو درکنار ایک پہلو بھی صفائی سے دکھائی نہیں دے گا۔

انسانوں کو مختلف زاویوں سے خانوں میں بانٹا گیا ہے۔ فیصلہ کرنے کے لحاظ سے دیکھئے تو انسان دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک وہ جن میں فیصلہ کی طاقت ہوتی ہے' دوسرے وہ جن میں نہیں ہوتی ہے۔ جن میں فیصلے کی طاقت نہیں ہوتی وہ گو مگو کے عالم میں رہتے ہیں انھیں ادھیڑبن سے فرصت ملے تو کوئی رائے قائم کریں۔ ان کی نگاہوں میں اکثر مسئلے کے کئی پہلو ہوتے ہیں اور فیصلہ نہیں کرپاتے کہ کسے اختیار کریں کسے قابل اعتبار سمجھیں۔ دوسری جانب فیصلہ کن ذہن رکھنے والا گروہ ہے۔ وہ فیصلہ' مناسب فیصلہ جلد اس لئے کر لیتا ہے کہ سارے پہلو ذرا دیر میں اس کی نظر میں آجاتے ہیں۔ جن لوگوں کا ذہن اتنا تیز اور ہمہ گیر نہیں ہے انھیں چاہئے کہ مطالبہ پر فوری انداز سے کبھی کوئی فیصلہ نہ کریں۔ کبھی کوئی قدم نہ اٹھائیں بلکہ سائل یا طالب یا اصرار کرنے والے سے مہلت ضرور لے لیں۔ مسئلہ کو دماغ میں گھمائیں تاکہ ہر پہلو ذہن کے سامنے آجائے' اس کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچیں جب کوئی مسئلہ آپ کے سامنے آئے اس پر اس طرح نگاہ کیجئے جیسے کسی بڑے شاعر کے اشعار پر غور کیا جاتا ہے۔ شعر کا حظ اور جینے کا لطف اسی میں ہے۔

باقی 'عورتوں کے حقوق'

نسبت کرتے ہیں یقینی ان کی غلطی ہے بلکہ ہندوستان میں جس قدر کہ عورتوں کی حالت میں تنزل ہے صرف اس کا باعث احکام مذہب اسلام کی بخوبی پابندی نہ کرنا ہے اگر ان کی پابندی کی جاوے تو بلاشبہ یہ تمام خرابیاں دور ہوجاویں مع بڑا بڑا باعث اس کا ان سولیزڈ یعنی نامہذب ہونا مسلمانوں کا ہے مہذب قوموں نے باوجود یہ کہ ان کے ہاں کا قانون نسبت عورتوں کے نہایت ہی ناقص اور خراب تھا اپنی عورتوں کی حالت کو نہایت اعلیٰ درجہ کی ترقی پر پہنچایا ہے اور مسلمانوں نے باوجود یہ کہ ان کا مذہبی قانون نسبت عورتوں کے اور ان کی حالت کی بہتری کے تمام دنیا کے قانون سے بہتر اور عمدہ تھا مگر انہوں نے اپنے نامہذب ہونے سے ایسا خراب برتاؤ عورتوں کے ساتھ اختیار کیا ہے جس کے سبب تمام قومیں ان کی حالت پر ہنستی ہیں اور ہماری ذاتی برائیوں کے سبب اس وجہ سے کہ قوم کی قوم ایک حالت پر ہے الا ماشاء اللہ اس قوم کے مذہب پر عیب لگاتی ہیں پس اب یہ زمانہ نہیں ہے کہ ہم ان باتوں کی غیرت نہ کریں اور اپنے چال چلن کو درست نہ کریں اور جیسا کہ مذہب اسلام روشن ہے خود اپنے چال چلن سے اس کی روشنی کا ثبوت لوگوں کو نہ دکھاویں۔

محمد اللہ خاں ☆

تواضع

تواضع کے لغوی معنی خاطر مدارات یا مہمان نوازی ـــــ جی ہاں مہمان نوازی۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے سماج میں تواضع کی عمل آوری اس کے لغوی مفہوم سے کافی مختلف ہوتی ہے۔ کسی شخص کا ہاضمہ کمزور ہے۔ وہ کھانے پینے میں احتیاط سے کام لیتا ہے یا اسے کوئی ایسا مرض لاحق ہوگیا ہے کہ کسی خاص غذا کے کھانے سے اس کی تکلیف میں اضافہ ہوجاتاہے اور محض اسی وجہ سے اس نے اس غذا کا استعمال ترک کردیا ہے۔ وہ شخص اپنے کسی مخلص دوست یا رشتہ دار کے گھر اس سے ملنے جاتا ہے۔ وہاں اس کی خوب آؤ بھگت ہوتی ہے۔ گھر کے سب لوگ اسے گھیر لیتے ہیں لطف و محبت کے ساتھ بٹھاتے ہیں۔ حسب مراتب اس سے دلچسپ گفتگو کرتے ہیں۔ اس کے بعد چائے ناشتہ کا نمبر آجاتا ہے۔ واضح رہے کہ آج کا سماج کھانے پینے کے اوقات متعین کرنے کا قائل نہیں ہے۔ صبح سے رات تک کوئی مہمان کسی بھی وقت گھر میں آجائے اس کی چائے یا کافی کے بدرقہ کے ساتھ بھرپور ناشتہ سے تواضع کرنے کا عام رواج ہے۔ ناشتہ میں عموماً کئی قسم کے چھوٹے بسکٹ، مٹھائی، نمکین، پھل اور خشک میوے ہوتے ہیں۔ کچھ تلی ہوئی چیزیں بھی ہوسکتی ہیں۔

ان لوازمات کو دیکھ کر مہمان پہلو بدلنے لگتا ہے اور اسے تواضع نہیں اپنے لئے مصیبت سمجھتا ہے۔ لیکن اسے اپنے میزبانوں کی دل شکنی بھی منظور نہیں ہوتی۔ اس لئے بہ پاس خاطر درمیانی راہ نکالنے کی کوشش کرتا ہے اور بڑی عاجزی سے مسکراتے ہوئے کہتا ہے "بھائی! آپ نے اتنی زحمت کیوں کی؟" ارے صاحب کھائیے۔ یہ بسکٹ بہت لذیذ ہے۔ برفی کا پیس لیجئے۔ کیلا اٹھائیے۔ آپ تو بلاوجہ تکلف کررہے ہیں۔ ٹھیک طرح کھاتے پیتے نہیں ہیں۔ جب ہی تو اتنے دبلے ہورہے ہیں۔ خوب کھایا کیجئے۔

محبت و مروت کی اس فضا میں مہمان صاحب کچھ زیادہ ہی کھالیتے ہیں جس کا انہیں بعد میں خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ادھر میزبان پیسہ سے زیر بار ہوتے ہیں۔ ان کے مہمان تو تھوڑا ہی کھاپاتے ہیں لیکن میزبان اپنی بات اونچی رکھنے کے لئے کافی لمبی رقم خرچ کردیتے ہیں۔

اس انداز کی غیر دانشمندانہ خاطر مدارات سے لوگوں کو دوسری تکلیفیں اور نقصانات بھی برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ مثلاً مہمان علی الصبح کسی ٹرین سے سفر کرنا چاہتا ہے۔ اسی وقت اپنے میزبان سے اسٹیشن جانے کی اجازت مانگتا ہے۔ ٹرین کی روانگی میں زیادہ وقت بھی نہیں ہے لیکن میزبان چائے پی کر جانے کے لئے اصرار کرتا اور ناشتہ تیار کرانا شروع کرا دیتا ہے۔ مہمان گھبرا رہا ہے۔ کسمسا رہا ہے۔ لیکن میزبان ناشتہ تیار کرانے میں اس درجہ منہمک ہے کہ اس کی طرف آنکھ اٹھاکر نہیں دیکھتا۔ بھلے آدمی یہ بھی نہیں کرتے کہ اس قسم کے موقعوں پر ایک پیالی چائے پلاکر مہمان کی جان چھوڑ دیں۔ مہمان کو مجبوراً ناشتہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ جلدی جلدی فارغ ہوکر اسٹیشن پہنچتا ہے تو ٹرین کے چلے جانے کی اطلاع ملتی ہے۔ اس سے اسے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ وقت ضائع ہوتا ہے اور نقصان بھی ہوجاتا ہے۔

ہمارے سماج میں بالکل اسی انداز سے اجتماعی تواضع کا طریقہ رائج ہے۔ شادی بیاہ اور دوسری تقریبات کے موقعوں پر خاطر تواضع کا طوفان اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ طعام کی سجاوٹ۔ انواع واقسام کے مرغن کھانوں اور دیگر لوازما

☆ چوک ساور۔ ضلع ایٹہ۔

پر بڑی عاقبت نااندیشی سے پیسہ خرچ کیا جاتا ہے بلکہ ضائع کیا جاتا ہے۔ جو لوگ زیادہ متمول نہیں ہوتے وہ قرض لینے میں بھی تکلف نہیں کرتے یہ نہ ہوسکے تو اپنی جائدادیں بگاڑ دیتے ہیں۔ اور خوش ہوتے ہیں کہ سماج میں ان کا نام ہوگیا۔ ہمارے پیارے مذہب اسلام نے اس قسم کی پر تکلف او نمائشی تواضع کو سخت ناپسند کیا ہے اور فضول خرچوں کو شیطان کا بھائی قرار دیا ہے۔

اردو میں تواضع کے لغوی معنی خاطر مدارات اور مہمان نوازی لیکن عربی میں عاجزی اور انکساری کے ہیں۔ یعنی مہمان کے ساتھ عاجزی اور انکساری کا برتاؤ کیا جائے۔ یہی اسلام کی تعلیم اور صحابہ کرام کا اسوہ ہے۔ اسلام مہمانوں کی خاطر تواضع کی نفی نہیں کرتا بلکہ اس کا حکم دیتا ہے۔ لیکن دوسرے معاملات کی طرح اس معاملہ میں بھی اپنے پیروں کو سادگی اور حقیقت پسندی اختیار کرنے اور مہمان کے مزاج' اس کی سہولت اور ضروریات کو ملحوظ رکھنے کی بھی تلقین کرتا ہے۔ دکھاوا اور زیر باری اسلامی تہذیب سے میل نہیں کھاتی۔ یہ فضولیات مسلمانوں نے دوسری تہذیبوں سے اخذ کی ہیں جس کی تفصیل میں جانے کا یہ موقع نہیں ہے۔ بس مختصر بات یہ ہے کہ اسلامی احکام پر بلا چون وچرا عمل کرنے میں ہی ہماری بھلائی ہے۔ زندگی کے سارے معاملات میں اسلامی اصولوں پر خوش دلی سے عمل کیا جائے تو مسلمانوں کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب آجائے گا۔ ان کے معاملات سدھر جائیں گے اور وہ ذلت ونکبت میں مبتلا رہنے کے بجائے خیر وبرکت اور عزت و آبرو کا مقام حاصل کرسکیں گے۔

اس وقت ملت اسلامیہ انفرادی اور اجتماعی تواضع پر جتنی بھاری رقمیں صرف کررہی ہے وہ تعمیر وترقی کے کاموں میں صرف کی جائیں تو مسلمانوں کو ذاتی اور اجتماعی سطح پر عظیم الشان فوائد حاصل ہوسکیں گے کہ جس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔

خدا کا شکر ہے کہ مسلمانوں میں اپنی اصلاح اور زندگی کے اکثر معاملات میں اسلامی اصولوں سے روشنی حاصل کرنے کا جذبہ پیدا ہورہا ہے لیکن یہ جذبہ ابھی پختہ نہیں ہوا ہے۔ پختہ ہوجائے گا اور ہم صرف قولاً نہیں عملاً اسلامی اصولوں سے جڑ جائیں گے تو ہماری تمام مشکلیں اور تکلیفیں رفع ہوجائیں گی۔ ہم نے ازخود اپنے اوپر جو وزنی بوجھ لاد لئے ہیں وہ اتر جائیں گے اور ہم عملی زندگی کی کٹھن راہوں پر اسی انداز سے گرم سفر ہوسکیں گے جس انداز سے کہ ہمارے بزرگ تھے۔ اس صورت میں ہم دوسری قوموں سے پیچھے نہیں آگے رہیں گے۔

ڈاکٹر محمد حبیب الحق انصاری ☆

اسلامی فکر میں یونانی فلسفہ کے عناصر

مستشرقین کے نقطۂ نظر سے کہا جاتا ہے کہ ایک نظام فکر کے طور پر، اسلامی فکر و فلسفہ ایک طرف یہودی اساطیر (Mythology) واثولوجیا(الہیات)Theology اور عیسائی معادیات (Eschatology) تو دوسری طرف قدیم یونانی فلسفے اور سائنس کے عناصر کا حامل ہے، جن کو عربوں کی بدوی زندگی کے تجربے سے جوڑ کر نہایت فصیح عربی زبان میں حکیمانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ طبیعات (Physics) علم آفرینش (Cosmogony) علم کائنات (cosmology) عملیات Epislemology اور اخلاقیات یہ سب فلسفہ اور سائنس کے زمرے میں شامل ہیں۔ واضح رہے کہ قرون قدیم و وسطی میں سائنسی علوم فلسفے ہی کی شاخ سمجھی جاتی تھیں۔ ان کا الگ وجود نہ تھا معروضی نقطۂ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے کہ قرآن کریم خصوصیت سے نہ تو یونانی، نہ ہی ہندی اساطیر کے کسی اسطوری کردار کا ذکر کرتا ہے جبکہ یہ عبرانی اساطیر کے حوالوں سے پر ہے۔ اسلامی نظریہ معاد، جس میں حشر کے دن مردوں کا اٹھایا جانا (Resurrection) اور جنت اور دوزخ میں ان کے اعمال کے لحاظ سے رکھا جانا شامل ہے، عیسائی معادیات سے مشابہ ہے(۱) اس کے علاوہ کہا جا سکتا ہے کہ قرآن میں دوزخ کی آگ کے بیان میں خاص کر اور قرآن کے عام اسلوب بیان اور اس کے اظہار میں عموماً عربی ریگستان کی خانہ بدوشانہ زندگی کا عکس ملتا ہے۔

روائی (Stoics) : لفظ اسلام کا مطلب خدا کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنا ہے۔ چوتھی سے چھٹی صدی قبل مسیح میں قدیم یونانی فلسفے میں ایک رواقی مکتب فکر زینو نیوں یعنی فلسفی زینو کے پیروں نے اسلام کے معاد کے متعلق اسلامی عقیدے سے کسی قدر ملتے جلتے خیالات کا پرچار کیا تھا۔ زینو نیوں کے مطابق " تقدیر رضامندوں کی رہبری کرتی ہے اور نا رضامندوں کو گھسیٹ لے جاتی ہے" ایک سچے زینونی کی بابت بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایسا شخص ہوتا تھا جو تقدیر پر ہمت و صبر کے ساتھ قناعت کرتا تھا۔ (یہ جانتے ہوئے کہ کسی قسم کی مقاومت بے سود ہے) زینونیوں کے مطابق "زندگی قدرت سے ہم آہنگی میں بسر ہونی چاہئے جس کا یہ مطلب ہوتا ہے کہ ایک انیک زندگی جہاں نیکی سے مراد وہ منزل ہے جس کی طرف قدرت ہماری رہبری کرتی ہے۔ زینونیوں نے یہ بھی سکھایا کہ عقلمند انسان سیاست یعنی طاقت کے لئے دنیوی جد و جہد میں حصہ لے گا۔ چونکہ اسطرح وہ برائی کو روکنے اور اچھائی کو بڑھاوا دے سکنے کے قابل ہو سکے گا

فیثاغورثی (Pythagoreans): فیثاغورث کے ماننے والوں نے چھٹی صدی قبل مسیح میں یہ پرچار کیا تھا کہ اختیار اعلیٰ خدائے تعالیٰ کا ہوتا ہے فیثاغورثیوں کا ذکر کرتے ہوئے ارسٹوکسنس (Aristoxenus) کہتا ہے کہ "ہر امتیاز جو وہ (یعنی فیثاغورثی) عاید کرتے ہیں، کیا کرنا چاہئے یا نہیں کرنا چاہئے۔ یہ مقصد رکھتا ہے کہ منشائے خداوندی سے

☆ ریسرچ آفیسر، شعبہ طبیعات۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مطابقت پیدا کی جاسکے۔ یہیں سے ان کی شروعات ہوتی ہے ان کی ساری زندگی خدا کی پیروی کرنے کے خیال سے ترتیب دی گئی ہوتی ہے اور یہی ان کے فلسفے کا حاوی اصول ہوتا ہے"۔

اکسماٹا (Acustmata) : یعنی "اقوال" کا فیثاغورثی نظام ' اسلام میں پیغمبر کی باتوں یا " احادیث" کے نظام کی طرح تھا۔ علاوہ ازیں فیثاغورثیوں کے لئے مثلاً یہ ہدایت تھی کہ انگاروں کو چاقو سے نہ ہلائیں جلائیں۔ غلہ ناپنے کے برتن پر نہ بیٹھیں۔ اپنے سونے کے کپڑوں کو تہہ نہ کریں۔ بدن سے پڑی شکنوں کو بستر پر ویسا ہی رہنے دیں۔ رات میں کسی برتن کے پڑے نشان کو مت مٹائیں۔ پہلے بایاں پیر نہ دھوئیں وغیرہ وغیرہ یہ ہدایتیں اسلام میں " سنت" کے نظام کی ہدایتوں سے کسی قدر ملتی جلتی معلوم ہوتی ہیں۔ (۲)

اکساغورث (Anaxagoras) : اکساغورث (۵۰۰ تا ۴۲۰ ق م) نے حرکت کی شروعات کو سمجھانے کے لئے ایک کائناتی ذہن (Naus) کے وجود کا تصور پیش کیا تھا۔ اسی لئے اس کو یونانیوں میں پہلا " خدائے آغاز کا پرستار" (Deist) کہا جاتا ہے۔(۳)

کلبی (Cynics) : پانچویں تا تیسری صدی قبل مسیح میں کلبیوں نے نہ صرف ایک خدا (کائنات کے ذہن) کے وجود پر زور دیا۔ (دوسرے سب دیوتاؤں کو محض اسطوری بتاتے ہوئے) بلکہ انہوں نے دولت' عیش اور اسراف کی سختی سے مخالفت کی۔ انہوں نے سادہ طرز زندگی و معتدل مشقت کا پرچار کیا جو ذہنی سکون اور روح و بدن کی تقویت کے لئے مددگار ہوتی ہے۔ معاشرے میں کچلے ہوئے طبقوں میں کلبیت ایک مضبوط اور دیر پا دلکشی کی حامل رہی۔ یہ رواقیت (Stricism) ہی کا ایک روپ ہے

افلاطون (Plato): افلاطون(۴۲۷ تا ۳۴۷ ق م)نے اپنے نظریہ عین (شے سے مختلف) وضع کیاجس کی مدد سے اس نے ایک نظریہ آفرینش اور ایک نظریہ کائنات کی وضاحت کی اس کے مطابق 'عین' یا خیال کی دنیا (عالم مثال) لافانی اور عدم تغیرپذیر ہوتی ہے عقل کوکائنات (بشمول سب چیزوں) کے صانع یا آفریدگار (demiurge) کے طور سے پیش کیا گیا۔ آفریدگار دنیا کی روح اور باقی سب روحوں کی تخلیق بھی کرتا ہے اور انہیں مناسب طور پر ترتیب بھی دیتا ہے۔ افلاطون کے مطابق روح لافانی ہوتی ہے نظریہ روح کو افلاطون نے بطور اپنے نظریہ اخلاق کی بنیاد کے استعمال کیا۔ اس کے مطابق کسی شخص کے فوت ہونے کے بعد اس کی روح ایک جگہ چلی جاتی ہے جو جائے انصاف ہوتی ہے اور جہاں سے پھروہ اپنے مسکن' کی طرف لوٹتی ہے غلط کاروں کو اس طرح سزا سے ڈراتے ہوئے' اور نیکو کاروں سے آنے والی دنیا میں انعام واکرام کا وعدہ کرتے ہوئے' افلاطون کوشش کرتاہے کہ لوگوں کو نیک کرداری کی راہ پر چلنے کی تلقین دے۔(۴)

ایلیائی (Eleatics) : ایلیا (جو ایک جگہ کا نام تھا) سے تعلق رکھنے والے فلسفیوں پرمنائڈس (Parmenides) سے میلسس (Melissus) تک نے "ہمہ اوست"یعنی ایک " کمیلی" خدا کے تصورکا پرچار کیا ہمہ اوست' کو وسطی ایشیا اور ہندوستان میں عہد وسطی کے مسلم صوفیوں اور شاعروں نے مقبول عام کرنے کی کوشش کی۔

سقراط(Socrates): سقراط' جیساکہ افلاطون نے بیان کیاہے' باطنیت کی تائید میں بحث کرتاہے وہ خدا کی ارادے میں یقین رکھتاہے۔ اپنے مشہور مکالموں میں سے ایک میں وہ کہتا ہے "تب یہ کافی ہے کرائیٹو! آو ہم خداکی مرضی پوری کریں' اور جہاں وہ لے جاتاہے چلیں۔"

اپیکیورس(Epicurus): اپیکیورس (پانچویں صدی قبل مسیح) نے غم اورخوف سے آزادی اور داخلی چین کے حصول کا درس دیاتھا۔ یہ قرآن کے مومنوں کے متعلق بیان ہے کہ انہیں نہ تو خوف ستائیگا نہ ہی حزن' اور یہ کہ جنت میں داخل ہونے والے نفس مطمئنہ کے حامل ہوتے ہیں

مشابہ ہے۔

ارسطو(Aristotle): ارسطو (۳۸۴ تا ۳۲۲ قبل مسیح) نے فلکی سماوات میں حرکت کی باقاعدگی کو مذہبی عقیدے کی بنیاد قرار دیا۔ فطرت میں کوئی شئے بنا مقصد کے نہیں ہوتی بلکہ ہر شئے ایک منزل کی طرف مائل رہتی ہے۔ غائیت (Teleology) کا یہ نظریہ ارسطو اور اسلام ہر دور میں ملتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کائنات ایک مخصوص مقصد کی تابع ہے جو مظاہر فطرت کی حرکت کے مشاہدے سے دریافت کی جاسکتی ہے۔ اسی سے آگے چل کر یہ بات نکلتی ہے کہ ایک خدا کا وجود ہے جو خدا کائنات کا "سبب" اوراولین اصول ہے۔ ارسطو نے خدا کو محرک اصلی۔ (Primemner) صورتوں کی صورت (Form of Forms) علت العلل (First Cause) اور تصورِ تصور (Thought of thought) کے نام دیے تھے۔ ہیولیٰ (Matter) ایک معروض یا امکان ہوتا ہے جو صورت پاکر حقیقی وجود کا حصہ بن جاتا ہے۔ جو قوت یاطاقت یہ تبدیلی لاتی ہے ارسطو اسے "کمال" یا Entelechy کہتا ہے "کمال" قدرتی اعمال وحرکات میں غایت یا مقصد کے ہونے کا ذمہ دار ہوتا ہے اور قدرت میں چیزیں، امکان اور کمال دونوں کی بیک وقت حامل ہوتی ہیں۔ کمال کئی اقسام کا ہوتا ہے۔ نباتاتی، حیواناتی یا معقولی۔ اسی طرح ارواح بھی نباتاتی، حیواناتی یا معقولی ہوتی ہیں۔ ادراک، حیواناتی اور معقولی ارواح سے متعلق ہوتا ہے یہاں ادراک سے مراد، صورت کے بنا مادے کے قبول کرنے کی قدرت ہے۔ انسانی عقل کے دو رخ ہوتے ہیں۔ ایک عقل منفعل (Passive Reason) جسے مادے اور امکان کی بنیاد سمجھا جاسکتا ہے، اور دوسری عقل فعال (Creative Reason) (۵) جو صورت وجود اور کمال سے وابستہ ہوتی ہے عقل فعال، عقل کل کی طرح لافانی اور ابدی ہوتی ہے۔ عقل فعال اشیا کو ان کا تصور کرکے، تخلیق، کرتی ہے۔ دنیا خدا کے تصور کے طور پر خدا کی تخلیق ہے، جب کہ خدا خود تصور کا تصور ہے۔

"مکان" اور شے ایک دوسرے کے ہم معنی ہوتے ہیں۔ وقت پہلے اور بعد کے اعتبار سے حرکت کا ایک بعد (Dimension) یا پیمانہ ہے۔ کائنات اگرچہ مکان میں محدود ہے لیکن وقت میں لامتناہی ہوتی ہے۔ وقت عقل یا خدا سے مربوط ہوتا ہے۔ کائنات، زمین اور سماوات (یعنی افلاک) پر مشتمل ہوتی ہے۔ سماواتی کرے منظم طور پر حرکت میں ہیں۔ سب سے باہری کرہ ثابت تاروں (ثوابت) کا فلک ہے۔ جس کے بعد سورج، سیارے، چاند وغیرہ کے افلاک ہوتے ہیں۔ زمین کائنات کا مرکز ہے۔ آگ، ہوا، پانی اور زمین تحت قمری دنیا کے عناصر ترکیبی ہیں۔ پانچواں عنصر ایتھر(Ether) فلکی کروں اور فلکی اجسام کا (جو ان کروں پر واقع ہیں) ترکیبی جز ہے اور از خود غیر تخلیق شدہ، لافانی، عدم تغیر پذیر ہے۔ بالفاظ دیگر افلاک اور فلکی اجسام، عقل کل یا "خدا" کا خاص جز ہیں۔ خدا کائنات پر محیط بھی ہے اور لاہوتی یعنی ماورا بھی۔

اخلاقیات کی حد تک ارسطو کا کہنا تھا کہ خیر(نیکی) عالم ادراک کی ایک قابل عمل منزل ہے لذت یا مسرت عقلی اور اخلاقی کارکردگی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ نیکی، سنہرے، متوسط (Golden Mean) کے اصول پر چلنے پر مبنی ہوتی ہے۔ انصاف جو سب سے عمدہ نیکی ہے وسطی راہ کا نام ہے۔ ارسطو کے الفاظ میں "عادل درمیانی ہوتا ہے اور غیر عادل وہ ہوتا ہے جو تناسب کی خلاف ورزی کرتا ہے، کیونکہ تناسب درمیانی ہوتا ہے، اور عادل تناسب ہوتا ہے" وغیرہ۔ (۶)

سیاسیات میں ارسطو ریاست کو مساوی شہریوں کی ایک برادری سے تعبیر کرتا ہے۔ ریاست سماج کا کمال ہوتی ہے۔ امیروں کو وہ غریبوں کی مدد کرنے کی تلقین کرتا ہے اور شہریوں کے باہمی مساویانہ اور دوستانہ اتحاد کو ریاست کی بڑی نیکی کہتا ہے۔ مجرموں سے وہ انسانیت کا برتاؤ کرنے کا درس دیتا ہے۔ بقول اس کے "جہاں تک ایک غلام ایک انسان ہے وہ ایک

دوست بھی ہو سکتا ہے۔" نیکی کے چلن کے لئے فرصت درکار ہوتی ہے اس لئے ارسطو نجی ملکیت کے نظام کی وکالت کرتا ہے۔ بہترین زندگی کے حصول کے لئے ریاست کے شہریوں کو نیکی پر چلنا ہوگا اور انہیں ان آداب کا مطالعہ بھی کرنا ہوگا جن کا تعلق مسرت، دولت، طاقت اور اچھی صحت لطف پانے سے ہے اور ساتھ ہی سماجی انصاف اور شجاعت کو فروغ بھی دینا ہوگا۔ اس طرح ارسطو سماج اور ریاست کے مابین تفریق نہیں کرتا۔

ایوڈیمس (Eudemus) : ایوڈیمس نے جو ارسطو کا شاگرد تھا، انسانی اعمال کو خدا سے وابستہ کیا۔ ایک انسان کو بقول اس کے خدا کی طرف ہدایت کے لئے اسی طرح دیکھنا چاہئے جیسے ایک عبد یا غلام اپنے مالک کی طرف احکامات کے لئے دیکھتا ہے۔ ایوڈیمس کا اخلاقی نصب العین حسن کمال اور نیکی کی وہ وحدت تھا جو خدا پر غیر مختتم کے طور پر گیان اور دھیان سے حاصل ہوتا ہے۔

ارسٹو کسینس (Aristoxenus) : ارسٹو کسینس بھی ارسطو کے مدرسے کا فارغ التحصیل تھا۔ فیثاغورثیوں کی طرح اس کے فلسفے کی بنیاد یہ بات تھی کہ روح ایک ہم آہنگی یا خوش ترتیبی کا نام ہوتا ہے۔

اسلام اور قرآن حکیم : مذکورہ بالا چند مثالوں سے واضح ہو جاتا ہے کہ خدا اور کائنات کے ایک روحانی اور اخلاقی تصور کو فلسفیانہ طور پر واضح کرنے کا عمل ہزاروں برس سے جاری تھا۔ تاریخ شاہد ہے کہ اسکندریہ کے فائلو (Philo) اور فلاطونی (Plolinus) نے عبرانی اور عیسائی مذہبوں کو فلسفے سے ہم آہنگ کرنے کی قابل ذکر کوشش کی تھیں۔ قرآن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ کس طرح خدا کا تصور محض چند فلسفیوں میں محدود نہ رہ کر ایک عالم کے لئے مذہب کی شکل میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ فلسفہ اور خیال جسے سمجھا جاتا تھا کہ محض چند مخصوص حضرات ہی اپنے دائرہ غور و فکر کا سامان بناسکتے ہیں، اب ساری خلقت کے سامنے اور معقول بن کر اظہر من الشمس ہوگیا ساتھ میں ایک نئی امت کی تشکیل بھی ہوتی۔ اور محض فلسفے سے ایک عظیم الشان مذہب کی بنیاد بھی پڑ ہے جس نے دنیا میں معاشرتی، معاشی، سماجی اور فکری انقلا کے لئے فضا سازگار کی۔ زیادہ نہیں قرآن حکیم کی چند آیا یہ بتانے کے لئے کافی ہیں کہ مذکورہ بالا خیالات کی طرح قرآ میں نہایت فصیح اور بلیغ انداز میں ظاہر کئے گئے ہیں۔ قرآ حکیم میں ہے کہ خدا مردوں کو زندہ کرتا ہے(۷) (۲/۴۳) آفریدگار سماوات وارض ہے اور جب وہ کسی امر کا ارادہ کر ہے تو کہتا ہے ہوجا اور وہ ہوجاتی ہے۔ (۲/۱۱۷) خدا زندہ ا قائم ہے اور علیم، بصیر اور حکیم ہے۔ وہ واسع اور عزیز ہے جو چیز بھی ارض وسما میں ہے وہ کسی نہ کسی طرح اس تسلیم کرتی ہے (۳/۸۳) حکمت، بڑی نیکی ہے۔ جس کو ملے (۲/۲۶۹۔ ۳/۱۴۴) قدرت میں خدا کی آیات، بکھری پڑ ہیں جو عاقل بندوں کے لئے ذکر و فکر کا وسیلہ ہیں۔ (۲/۱۵ (۲/۲۱۹) (۲/۲۲۱) اللہ عالمین کی طرف سے غنی ہے۔ (۲/۷ اس نے انسانوں کو پیدا کیا کہ وہ اس کے اطاعت گزار متقی بنیں (۲/۲۱)۔ سارے ارض وسما میں سب کچھ اس ہے۔ وہ مالک ہے اور ہم غلام ہیں۔ اسی کی طرف سار امور لوٹ جاتے ہیں (۲/۱۰۹)۔ حکم ہوتا ہے "اچھائی کرو" اچھوں کو پسند کرتا ہے۔" (۲/۱۹۵) جہاں تک انصاف، آہنگی، اور تناسب کا تعلق ہے قرآن کہتا ہے کہ امت و قائم ہو (۲/۱۴۳) جس کے لئے خدا نے (قرآن مجید) فر (Criterion) نازل کیا (۳/۳) اور اسے (خیر و شر کی) میزا بنایا (۷/۵۵) بہترین راستہ سواالسبیل یعنی میانہ روی۔ (۲/۱۰۸) اچھائی کی تلقین اور برائی کے روکنے کو کہا گیا۔ اور کہا گیا ہے کہ اچھی اور حلال اشیا سے استفادہ کرو۔ کہ ہے کہ شیطان تم کو محتاج اور فقیر بنانے کے درپے۔ (۲/۲۶۸) باربار تلقین فرمائی ہے کہ آسمانوں اور زمین تخلیق پر غور کرو۔ چاند سورج کے نکلنے اور ڈوبنے اور ان اپنے افلاک پر چلتے رہنے پر غور کرو کہ کس طرح عرش بر

پر سے اللہ تعالیٰ حکومت کر رہا ہے اور ہر بات قاعدے کے مطابق ہوتی چلی جاتی ہے۔ وہ اول ہے اور آخر ہے۔ ہر شے کی منزل وہ ہی ہے (۴۶/۴) وہ مصور ہے وہ نور کا نور ہے۔ سورہ عصر میں اللہ تعالیٰ دہر کی قسم کھاتا ہے۔ سورہ تکاثر میں دولت وعیش کی لالچ سے ڈرایا جاتا ہے۔ سورہ احد میں اللہ کی وحدانیت کا ذکر ہے۔ بندوں کو صبر کرنے' اللہ سے ڈرنے اور صبر کی تلقین کرتے رہنے کو کہا گیا ہے۔ سماوات سات ہیں ور ان میں سے بعض پر چاند' سورج وغیرہ منظم باقاعدگی سے مصروف حرکت ہیں۔ اللہ قادر مطلق ہے پیغمبر پر اللہ اور اس کے فرشتے درود وسلام بھیجتے ہیں۔ پیغمبروں کی پیروی عین نیکی ہے۔ اس کی حدیث پر عمل اور اس کی سنت کی پیروی کرنی چاہئے خدا صرف ایک ہے۔ خدا محض ایک تصور نہیں ہے لیکن یہ تصور ہی محرک اور آفریدگار بھی ہے' اور کائنات کے ذرے ذرے میں سمایا ہوا بھی ہے۔ خدا روحوں کا تخلیق کار بھی ہے۔ حشر کے دن مردے دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور انصاف ہوگا۔ برے لوگ دوزخ میں اور اچھے لوگ جنت میں جائیں گے۔ جہاں وہ ہمیشہ کے لئے رہیں گے۔ مومنوں کو نہ تو خوف ستائے گا اور نہ غم۔ نفس مطمئنہ' جنت میں داخل ہوگا۔

مومنوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی تلقین ہے۔ غریب مسکینوں' یتیموں اور رشتہ داروں کی اعانت کا سبق دیا گیا ہے۔ ہر طرح کے ظلم واستبداد اور غرور و تکبر سے پرہیز کی ہدایت ہے۔ پیغمبران ماقبل کی توثیق ہے اور ماضی سے حال تک ایک مربوط رویہ اپنانے کو کہا گیا ہے۔ غلاموں کو آزاد کرنا اور آزاد کروانا عین نیکی تصور کیا گیا ہے (۲/۱۷۷) اس سے واضح ہوتا ہے کہ قرآن نے ہزاروں سال سے بحث ومباحثے کے موضوع نئے خیالات کو اپنے میں سموتے ہوئے سارے عالم کے انسانوں کے سامنے ایک مکمل نظام حیات یا مذہب پیش کیا اور یوں یہ خیالات' انسانی کردار سازی کا موثر ذریعہ بن گئے۔

حواشی

۱) اس کا بنیادی سبب یہ ہے کہ اسلام سامی مذاہب کے اس سلسلے کی آخری کڑی ہے جو یہودیت اور عیسائیت کو مربوط کرتا ہے' رسول اکرمؐ نے بار بار یہ فرمایہ کہ وہ دین حنیف ابراہیم کی تجدید و احیا کے لئے مبعوث ہوئے ہیں اس لئے ان آسمانی مذاہب کے عقائد و افکار کے عناصر کا اسلامی فکر میں ملنا فطری ہے لیکن یونانی نوفلاطونی ہندوی اور بدھ مت کے فلسفوں کو اسلامی فکر کے بنیادی عناصر ماننا غلط ہوگا خود قرآن کریم میں ایسی آیتیں موجود ہیں جن میں حصول علم و حکمت و دانش پر زور دیا گیا ہے۔ تکلیف اور عظمت کا درس دیا گیا ہے سینکڑوں احادیث نبوی اس کی مزید توثیق کرتی ہیں اسلام میں فکر کا آغاز قرآن و حدیث کی تعلیمات ہی میں تلاش کرنا چاہئے۔ یہ مستشرقین کی پھیلائی ہوئی گمراہی ہے کہ عربوں کے عملی مزاج اور دور جاہلیت میں علم و سائنس سے ان کی معاشرت کی بنا پر اسلام کی بنیادی تعلیمات میں فلسفہ فکر کے عناصر نہیں ملتے۔ اسلام میں ذات و صفات جبر و قدر' توحید' معاد' معراج' خیر و شر اور اس طرح کے دوسرے مسایل پر بحث کا آغاز حضرت علیؓ کے دور خلافت میں اختلافات کے ابھرنے کے ساتھ ہی ہوگیا تھا۔ اس وقت تک مسلمان خواہ وہ عرب ہوں یا غیر عرب یونانی فلسفہ سے نابلد تھے۔ یونانی فلسفہ کی کتابوں اور افلاطون و ارسطو سے ان کی شناسائی منصور کے دور سے ہوئی مامون الرشید کے عہد میں بار آور ہو کر ایک تناور درخت بنی یہ بھی اہم نقطہ ہے کہ ابتدائی مسلمان مفکرین ارسطو اور افلاطون سے براہ راست متعارف ہونے کے بجائے ان کے نوفلاطونی شارحین کے توسط سے واقف ہوئے۔ نوفلاطونیت میں سریت (Mysticism) اور مذہبی تجربہ کے ساتھ وحدانیت اور اشراق (Emanation) کے عقاید کی بھی یونانی فکر کے ساتھ آمیزش تھی۔ ان اثرات کا سراغ دوسری صدی ہجری میں بنو امیہ کے زوال کے بعد اسلامی فلسفہ و کلام اور تصوف میں ضرور نظر آتا ہے۔

اس لئے یہی بات کہی جا سکتی ہے کہ اسلامی فلسفہ غیر اسلامی فکر سے متاثر ہوا خصوصاً یونانی افکار سے۔ لیکن اپنی نشو و نما کے دوسرے مرحلے میں پہلا مرحلہ قرآن و حدیث کی تعلیمات کے فیضان ہی کا کرشمہ مانا جا سکتا ہے۔

ہم اس مقالے میں اسلام پر صرف چند یونانی فلاسفہ کے اثر اور ان کے نظریات کی اسلامی فکر سے مماثلت کی نشاندہی کریں گے۔

(۲) فیثا غورثی فکر میں عدد کی جو اہمیت ہے' مصنف نے اس کا ذکر نہیں کیا حالانکہ بعد کی اسلامی فکر خصوصاً اخوانی فلسفے میں یہی تصور نمایاں ملتا ہے جیسے فیثا غورثی سیرت کا قابل لحاظ اثر مانا جاتا ہے لیکن ایک کتب فکر پر فیثا غورثی فلسفہ اعداد کے اثر کو مجموعی اسلامی فکر کا پیش رو ماننا صحیح نہیں (ادارہ)

(۳) اکسا غورث کے اس تصور کو سامی مذاہب کے تصور الہ سے ماخوذ بھی مانا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ حالیہ تحقیقات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ یونانی فلسفہ مشرقی افکار کے زیر اثر پروان چڑھا ہے (ادارہ)

(۴) افلاطونی نظریہ مثل کی یہ تفسیر بڑی حد تک نوافلاطونی شارحین کی طرز فکر کا نتیجہ ہے (ادارہ)

(۵) اس کے لئے زیادہ صحیح اور مناسب اصطلاح Agent intellect ہے جو خدا اور کائنات کے درمیان تخلیقی واسطہ ہے (ادارہ)

(۶) طلائی متوسط کا تصور اسلام کی اخلاقیات کا جز ہے لیکن اسے ارسطو کے مماثل تصور کا توازن کہا جا سکتا ہے نقل نہیں۔ اس لئے کہ قرآن و سنت دونوں نے جادہ اعتدال ہی کو صراط مستقیم یا نیکی کا راستہ اور اخلاقی درستی کا معیار مانا ہے (ادارہ)

(۷) امر (۳/۷،۲) سے مراد قرآن شریف کے دوسرے سورہ کی ۳۷ ویں آیت ہے اور اسی طرح بعد میں بھی ہے۔

حوالے

(۱) تاریخ فلسفہ قدیم (انگریزی میں) اے۔ ایس۔ بوگو مولو' دارالاشاعت ترقی' ماسکو (۱۹۸۵)

(۲) قرآن مترجم' ترجمہ کار محمود زاید' دارالشوریٰ' بیروت (۱۹۸۰)

شرجیل احمد خان (علیگ)☆

ڈیمو کریٹس کے اقوال زریں

مشہور یونانی حکیم ڈیمو کریٹس (Democtritus) سقراط کا ہم عصر تھا۔ وہ ۴۵۰ سال قبل مسیح کے قریب پیدا ہوا' اس نے شہر ابدیرا (Abdera) میں سکونت اختیار کی اور ۹۰ سال کی طویل عمر پائی۔

ڈیمو کریٹس " نظریہ ذرات" (Atomism) کا زبردست حامی تھا۔ گرچہ اس نظریہ کی بنیاد لیو کیپس (Leucippus) نے رکھی تھی لیکن ڈیمو کریٹس نے اس بنیاد کو مضبوط کیا۔ وہ اس نظریہ کا شارح تھا۔ اس کے نظریہ کے مطابق دنیا کی ہر شے بہت چھوٹے چھوٹے ذرات سے بنی ہے۔ ان ذرات کا نہ آغاز ہے نہ انجام اور ان کا تجزیہ ناممکن ہے۔ ذرات (Atoms) ہی چیز کی اصل ہے ذرات کی مخصوص ترتیب اشیاء کو مختلف شکلیں دیتی ہیں۔ مثلاً آگ نہایت چھوٹے اور گول ذروں سے سیاہ رنگ ملائم ذروں سے مٹھاس بڑے بڑے گول ذروں سے بنتی ہے یہاں تک کہ روح بھی چھوٹے چھوٹے آتشی ذروں سے بنی ہے اس لحاظ سے فیثا غورث کے اعداد' ہرکلیوس کا تحرک ہرمندس کا سکون اور ڈیمو کریٹس کے ذرات ایک مفہوم کے مختلف نام ہیں۔

ڈیمو کریٹس (Democritus) نے اپنے پیچھے بہت سی تصنیفات چھوڑی ہیں۔ ان میں سے بعض میں ایک آئڈیل (Ideal) زندگی گذارنے کے سنہرے اصول درج ہیں۔ آج ہم اگر ان اصولوں پر کاربند ہوں اور ڈیمو کریٹس کے اقوال کی پیروی کریں تو گیسوئے گیتی سنور جائیں۔ ڈیمو کریٹس کے اقوال زریں کا انگریزی سے ترجمہ درج ذیل ہے

ترتیب اور اقتباس Bake Well کی کتاب Source Book In Ancient Philosophy سے لئے گئے ہیں۔

اقوال زریں

(۱) سچی خوشی جسمانی قوت اور دولت سے میسر نہیں ہوتی بلکہ اس کا راز سمجھ داری کی پختگی اور اعلیٰ کردار میں پوشیدہ ہے۔

(۲) باعث ڈر کے نہیں بلکہ' بقدر ادائیگی فرض گناہ سے پرہیز کرو۔

(۳) جو دوسروں کو تکلیف پہونچاتا ہے وہ اس شخص سے زیادہ مغموم ہے جو خود تکلیف سے گذرتا ہے۔

(۴) بے وقوف برے وقت میں عقل سیکھتے ہیں۔

(۵) حیوان کی خوبی اس کی جسمانی طاقت ہے جب کہ انسان کا حسن اس کا اعلیٰ اخلاق ہے۔

(۶) دوسروں کی غلطیوں کو ڈھونڈنے سے بہتر اپنی غلطیوں کی اصلاح ہے۔

(۷) صالح عمل صرف برائی سے پرہیز ہی نہیں بلکہ نفس برائی کا سد باب بھی ہے۔

(۸) ایسے بہت سے لوگ ہیں۔ جو بہت سی باتوں سے واقف ہیں پھر بھی دانا نہیں ہیں۔

(۹) شہرت اور دولت دانشمندی کے بغیر غیر محفوظ سرمایہ ہے۔

(۱۰) حصول دولت کی اپنی اہمیت ہے لیکن غلط ذرائع سے دولت جمع کرنے سے ذلیل کوئی فعل نہیں۔

(۱۱) ناقص لوگ بڑی بڑی باتیں کرتے ہیں لیکن عمل میں صفر ہیں۔

(۱۲) تم ایک سچے انسان کی پہچان اس کے دماغ اور اس کے اعمال سے ہی نہیں اسکی نفسانی خواہشات سے بھی کرسکتے ہو۔

(۱۳) ایک دانا سے دوستی ہزار ناداں سے دوستی سے بہتر ہے۔

(۱۴) وہ انسان جس کا کوئی ایک سچا دوست نہیں' جینے کا مستحق

☆ وائٹ ہاؤس کمپاؤنڈ' گیا

نہیں۔

(۱۵) خیر بڑی محنت و کاوش سے حاصل ہوتی ہے جب کہ شر خود بخود بن مانگے دامن گیر ہو جاتا ہے۔

(۱۶) انسان اپنی ناسمجھی کے عذر میں قسمت کا بت تراشتا ہے لیکن قسمت شاذ و نادر ہی دانائی سے نبرد آزما ہوتی ہے زندگی کی زیادہ تر مشکلات فہم و فراست سے حل کی جا سکتی ہیں۔

(۱۷) ایک راسخ العقیدہ انسان جو ہمیشہ راستی کی راہ پر گامزن ہے' ایک بے فکر' توانا اور پر مسرت زندگی کا مالک ہے لیکن وہ شخص جسے راستی کا کوئی پاس نہیں اور اپنے فرائض کی ادائیگی سے کتراتا ہے وہ ہمیشہ احساس ناکردگی کی بوجھ سے دبا رہتا ہے اور اسکی زندگی ذہنی تناؤ اور انتشار کا شکار ہو جاتی ہے۔

(۱۸) ایسی زندگی جس میں فرصت کے اوقات میسر ہوں ایسے لمبے سفر کے مترادف ہے جس کی راہ میں کوئی آرام گاہ نہ ہو

(۱۹) اگر ہم میانہ روی کو تیاگ دیں تو بے انتہا لطف اندوزیاں' اپنے ساتھ بے انتہا رنج و آلام لائیں گی۔

(۲۰) لوگ خداؤں سے اپنی صحت کی دعا مانگتے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ اچھی صحت خود اس کی استطاعت میں ہے۔ وہ اپنی لاپرواہی اور غلط کاریوں سے اپنی صحت بگاڑ لیتے ہیں۔

(۲۱) جو شخص لذات شکم کا دلدادہ ہے اور خورد و نوش و شہوت کی تمام حدیں توڑ دیتا ہے اس پر بھی یہ راز کھلتا ہے کہ یہ لطف اندوزیاں محض عارضی تھیں۔ اور انہیں لمحوں تک میسر رہیں جب تک وہ ان سے ہمکنار رہا جب کہ ان کے بدلے مول لئے ہوئے رنج و آلام عرصہ دراز تک قائم رہیں گے۔ مادی اشیاء کی تمنائیں بار بار دل میں اٹھتی ہیں اور جیسے ہی وہ چیزیں میسر ہو جاتی ہیں' لذت معدوم ہو جاتی ہیں لذت عارضی ہوتی ہے اور ایک بار پھر اس کی تمنا دل میں جاگ اٹھتی ہے۔

(۲۲) ایک اچھی حکومت کا نصب العین رعایا کی فلاح و بہبود ہے حکومت کے نظم و نسق کے سلسلے میں کسی کو اپنا رقیب نہ بناؤ اور نہ طاقت کا اتنا استعمال کرو کہ رعایا کے حقوق پر آنچ آئے۔ کیونکہ عدل و انصاف پر مبنی حکومت رعایا کی بہترین محافظ ہوتی ہے۔ صحت مند حکومت کے زیر سایہ تمام چیزیں پھلتی پھولتی ہیں اور ناقص حکومت اپنے چاروں طرف تباہی و بربادی بکھیر دیتی ہے۔

(۲۳) انسان لذت جسمانی میں کمی کر کے اور زندگی میں نظم پیدا کر کے سکون و طمانیت حاصل کر سکتا ہے۔ مادی خواہشات کی بہتات انسان کی روح کو مضطرب کر دیتی ہے۔ جب روح طرح طرح کی نفسانی خواہشات کی آماجگاہ بن جائے تو سکون رخصت ہو جاتا ہے۔ اسی لئے انسان کو چاہئے کہ اپنے ذہن کو انہی اشیاء تک محدود رکھے جو اس کے استطاعت میں ہے جو بھی مواقع میسر ہیں ان پر اکتفا کرے۔ معروف اور قابل رشک زندگیوں کا خواب دیکھنے کے بجائے انسان کو چاہئے کہ ایسے لوگوں کو یاد کرے جن کی زندگیاں دکھ اور درد میں گذری ہوں تاکہ اسے اپنی موجودہ حالت اہم اور قابل رشک نظر آئے اور وہ اپنی روح کو مزید نفسانی خواہشات سے آلودہ نہ کرے کیوں کہ اگر کوئی شخص محض ایسے لوگوں کا خواب دیکھتا ہے جن کی زندگیاں عیش و عشرت میں گزریں اور جنہیں قدرت نے اپنی خاص نعمتوں و برکتوں سے نوازا ہو' تو وہ ایسے اعمال اختیار کرنے پر بھی مجبور ہو گا جو قانوناً جرم ہے اور اس لئے ہمیں دوسروں کی نعمتوں کی آرزو نہیں کرنی چاہئے اور نہ ان سے حسد کرنا چاہئے بلکہ اگر ہم اپنے سے بدتر زندگیوں اور ان کے رنج و الم کا اپنی زندگیوں سے موازنہ کریں تو معلوم ہو گا کہ ہم بدرجہا بہتر حالات میں ہیں۔ اگر تم میری اس نصیحت پر عمل کرو گے تو تمہاری زندگی پر سکون ہو گی اور تم حسد' کینہ اور ذہنی اذیت کی لعنتوں سے پاک رہو گے۔

محمد اسحاق ☆

اردو میڈیم اسکولوں کا معیار تعلیم اور تعلیمی پروگرام

آج سے کوئی ۲۵ برس پہلے ملک کے ایک ممتاز دانشور کی ایک طویل تقریر بعنوان "اردو کے مستقبل" پر حیدر آباد ہی میں ہوئی تھی۔ موصوف نے پورے اعتماد کے ساتھ یہ پیش گوئی کی تھی کہ "آج سے ۲۵ برس بعد ہندوستان میں یونیورسٹیز کے اردو ڈیپارٹمنٹ میں اردو رہ جائے گی۔ اس کو پڑھنے اور لکھنے والا شاید ہی کوئی رہ جائے گا۔ اگر اس زبان کو زندہ رکھنا ہو تو یہودی قوم کا ساجگر چاہئے جنہوں نے اپنی عبرانی زبان کو چار ہزار برس تک صحرانوردی کے باوجود سینہ سے لگائے رکھا۔ اس مضمون کے لکھتے وقت میرے سامنے وہ مایوسی کا عالم ہے جو سارے ہال پر چھا گیا تھا۔ اور دل افسردہ سے زبان پر یہ مصرع آیا تھا۔

عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے۔

اتفاق کی بات ہے کہ وہ دانشور ابھی زندہ ہیں اور وہ تقریر سننے والے مجھ جیسے بہت سے ابھی بقید حیات ہوں گے۔ زہے نصیب کہ وہ پیش گوئی پوری نہ ہوئی ۔ بلکہ اردو کے اچھے دن آگئے ہیں۔ اس زبان کی چاہت نے اس کو زندہ ہی نہیں بلکہ اس کو پروان چڑھانے کے لئے ہندوستان ہی نہیں ساری دنیا میں کوشش جاری ہیں؟۔

یوں تو موسم بدلتے ہی رہتے ہیں پت جھڑ کے موسم میں درختوں کے پتے گرنے لگتے ہیں اور وہ ننگ دھڑنگ موسم بہار کے انتظار میں کھڑے رہ جاتے ہیں' چند برسوں سے ایسا محسوس ہونے لگا ہے کہ ان خزاں رسیدہ درختوں پر نسیم بہار کے جھونکے چلنے لگے ہیں۔ عابد علی خاں اردو تعلیمی ٹرسٹ کے تحت اردو سیکھنے کی گرمائی کلا سیس میں کافی گرمی آچکی ہے۔ اس پروگرام کا عوام نے جس جوش و خروش سے استقبال کیا اسے دیکھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ سرپرستوں میں اپنے بچوں کو اردو سکھلانے کا جذبہ کس قدر شدید ہے ۔ مشاعروں کی آب و تاب وہی باقی ہے۔ ریڈیو اور ٹی وی سے ہندی' اردو یا ہندوستانی زبان کہہ لیجئے یہی عوام کی زبان ہے۔ اس کا کوئی گھر نہیں لیکن سارا ملک اس کا وطن ہے۔ اگر کوئی زبان سیکولرازم کا دعوی کرسکتی ہے تو وہ اردو زبان ہی ہے۔ اے سخت جان اردو تیری پیدائش جنگی لشکروں کے درمیان ہوئی۔ ہندوستان کے بازاروں میں تیرا بچپن ہنستے بولتے گزر گیا' مشاعروں اور ادبی محفلوں نے تیرا شباب دیکھا' ادیب و شاعر' افسانہ و ناول نگار' کالجوں اور جامعات کے اساتذہ نے تیری زلفوں کو سنوارا عوام نے تجھے گلے لگایا اب وہی تیری زندگی کی ضمانت دے سکتے ہیں۔

ذریعہ تعلیم :۔ قریب ڈیڑھ سال قبل روزنامہ "سیاست" میں کسی نے یہ سوال کیا تھا کہ بچوں کے لئے کون سا ذریعہ تعلیم مناسب ہے ؟ دنیا کے سارے ماہرین تعلیم اس ایک بات پر متفق ہیں کہ بچہ کے لئے تعلیم مادری زبان ہی ہونا چاہئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین کا قول ہے کہ "بچہ مادری زبان ماں کے دودھ کے ساتھ پیتا ہے" مادری زبان بھی بچہ کے جسم

☆ جاوید منزل' مکان نمبر ۶/ ۷۴۴ ـ ۳ ـ ۱۱' بازار گارڈ' حیدر آباد

وجدان کا حصہ بن جاتا ہے۔ بلکہ خون کے ساتھ اس کے رگ وپے میں دوڑنے لگتی ہے۔ مادری زبان کا مطلب ذرا وسیع ہے۔ گھر میں بھائی بہن' دوست و رشتہ دار' محلّے کے بچوں کی زبان کا سارا ماحول مادری زبان کا حصہ ہے۔ اب جو لوگ اپنے بچوں کو کسی دوسری زبان میں تعلیم دلوانا چاہتے ہیں تو وہ اپنے بچوں پر ظلم کرتے ہیں۔ کیوں کہ بچہ پہلے پانچ برس میں جتنا کچھ سیکھتا ہے' بعض ماہرین کا خیال ہے کہ وہ باقی ساری عمر کے حصہ میں اسی پانچ برس کے سیکھنے کے مساوی سیکھ پاتا ہے۔ یہی بچہ کی زندگی کا زرخیز زمانہ ہے۔ لیکن وہ ایسی مصنوعی کاوشوں میں ضائع ہوجاتا ہے جو بچہ کو نامانوس زبان سیکھنے کے لئے کرنی پڑتی ہے اکثر دانشور حضرات کا خیال ہے کہ اگر ہم اپنے بچوں کو انگریزی میڈیم اسکول میں نہ پڑھائیں تو پھر وہ اعلیٰ تعلیم اور آل انڈیا سروسز میں نہیں آسکتے۔ چونکہ یہ حقیقت ہمارے سامنے ہے کہ انگلش میڈیم کے طلبہ ہی ہر سال میڈیسن' انجینرنگ' زراعت' وٹرنری' بزنس ایڈمنسٹریشن وغیرہ جیسے اعلیٰ تعلیم کے شعبوں میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو آپ کا دعوی ہے کہ مادری زبان ہی میں تعلیم دینا چاہئے اور دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ اردو میڈیم اسکولوں کے میٹرک کی سطح کے نتائج افسوسناک حد تک پست ہیں۔ آندھرا پردیش اقلیتی کمیشن کی رپورٹ کے مطابق سال گذشتہ ۲۰ فی صد اردو میڈیم اسکولوں کے میٹرک کے نتائج صفر رہے اور ۴۰ فی صد اسکولوں کا نتیجہ ۵ فی صد سے بڑھ کر نہ تھا۔ اب آپ ہی بتلایئے کہ اپنے بچوں کو اردو میڈیم اسکولوں میں پڑھاکر ان کی ساری زندگی کون برباد کرے گا اور سارے حوصلوں پر پانی پھیرنے کے لئے کون تیار ہوگا۔ اردو سچ ہے میری مادری زبان ہے' پیاری زبان ہے' دل اور روح کی زبان ہے مگر دنیا میں عزت و آبرو کی زندگی گذارنے کے لئے کچھ روپیہ پیسہ کی بھی ضرورت ہے۔ سرسید کی زبان میں گو یہ دنیا دو روزہ ہے لیکن یہ دو روز کی زندگی بھی بڑے معرکہ اور مصیبت کی ہے' یہاں پر عزت و وقار کی زندگی کی قیمت ہے' جاہل وکاہل بن کر' دوسروں کے رحم و کرم پر زندہ رہنا زندگی کی توہین ہے اگر بچہ اردو میں تعلیم پائے گا تو اس کے ڈاکٹر انجینئر بننے کے مواقع ۹۰ فیصد کم ہوجائیں گے ہمیں یہاں ان ہی سوالوں کا جواب دینا ہے۔جو بڑی ذہنی الجھن کا باعث بنے ہوئے ہیں۔

حیدر آباد و سکندر آباد ہی میں نہیں بلکہ اضلاع پر بھی ہزاروں انگلش میڈیم اسکول چل رہے ہیں۔ ان میں بس دوچار فی صد ایسے اسکول ہیں جو گذشتہ ساٹھ ستر برس سے اپنے اعلیٰ تعلیمی معیار کو برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی شہرت کا راز یہ نہیں کہ ان کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہے بلکہ یہاں پر داخلہ ہر کس و ناکس کو ملتا ہی نہیں۔ داخلے کے وقت وہ بچے سے زیادہ وہ ماں اور باپ کی تعلیمی قابلیت عہدہ اور سماجی مرتبہ کو جانچتے ہیں۔ اس طرح وہ ابتدا ہی میں سوسائٹی کے Creamy Layer(بالائی سطح) سے Cream (کریم) نکال لیتے ہیں۔ ایک اندازہ کے مطابق ۲۰ فیصد تعلیم اسکول میں ہوتی ہے اور ۸۰ فیصد تعلیم گھر پر ہوتی ہے۔ اگر آپ گھر پر ٹیوٹر کا انتظام نہ کریں یا خود ماں یا باپ دو گھنٹے ان کا ہوم ورک نہ دیکھیں تو بچہ کا گریڈ گرتا جاتا ہے۔ اگر فیل ہوگیا تو وہ اسی دن اسے ٹی۔ سی۔ دے کر بڑھا دیتے ہیں۔ پھر اسکول کا انتظامیہ بھی غیر معمولی موثر اور اساتذہ قابل اور کارکردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے نام کو اونچا رکھنا چاہتے ہیں۔ کوئی پندرہ برس پہلے مجھے لٹل فلاور (Little Flower) اسکول کے پرنسپل سے نجی گفتگو کا موقع ملا میں نے کہا کہ آپ کے ہاں منسٹر' سکریٹریز' ڈائرکٹرس کے بچے پڑھتے ہیں کیوں آپ کالج اور پوسٹ گریجویشن کالج قائم نہیں کرتے۔ آپ کے لئے کالج کی منظوری حاصل کرنا کون سی بڑی بات ہے۔ برادر نے جواب دیا کہ ہاں ہم کالج کھولنا چاہیں تو بس ایک دو دن میں منظوری حاصل کرلیں گے۔ دوسروں کے لئے شاید تین برس بھی کافی نہ ہوں گے۔ ہم کوئی کالج اسٹارٹ کرنا اس لئے نہیں چاہتے کہ دیکھئے گذشتہ سال ایک سو طلبہ انٹرمیڈیٹ میں سب کے

سب فرسٹ کلاس پاس ہوگئے۔ ان میں ۲۱ میڈیکل کالج میں، ۲۹ انجینئرنگ کالج ۱۱ ای۔ ای۔ ٹی، چند اگریکلچر کالج، وٹرنری اور باقی سب کے سب رہنما پور گورنمنٹ پالی ٹیکنیک میں شرکت کے مستحق ہوئے۔ بس ہم انٹرمیڈیٹ کورس تک اپنے طلبہ کو لے جاتے ہیں جو تمام فنی اور پروفیشنل کورس کا باب الداخلہ ہے۔ گورنمنٹ کے اعلیٰ تعلیم کے کالجوں میں ہمارے ہی اسکول کے طلبہ کا قبضہ ہے۔ پھر ہمیں کوئی کالج اسٹارٹ کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

باقی ۹۰ فیصد سینکڑوں انگلش میڈیم اسکول جو ہر موڑ پر نظر آئیں گے ان کا معیار تعلیم نہایت پست ہے۔ لہذا تمام اسکول کچھ ظاہری ٹپ ٹاپ کے ساتھ تجارتی نوعیت کے (Education Shops) ہیں جہاں پر بچہ کو اسباق رٹنے پڑتے ہیں۔ جن کا رٹو حافظہ Rote Memory اچھا ہوتا ہے وہ کچھ آگے جاتے ہیں۔ ورنہ ان کی مہارتیں اردو تلگو میڈیم طلبہ سے بہت کم ہوتی ہیں۔ لیکن یہ اسکول سرسبز و شاداب اس لئے ہیں کہ سرپرست ایک بڑے دھوکے میں مبتلا ہیں کہ بچہ انگریزی میڈیم اسکول میں پڑھے گا تو کچھ نہ کچھ بن جائے گا "ولی کالونی" کے سلم ایریا کے کوئی دس بارہ بچے انگلش میڈیم اسکولوں میں شریک ہیں جن کے باپ رکشا چلاتے ہیں یا پھر ٹھیلے کا کاروبار کرتے ہیں اور عورتیں گھروں میں کام کرتی ہیں۔ ان کے بچوں کا تعلیمی معیار معلوم کرنے کے لئے میں خود ان کے ساتھ بیٹھ گیا۔ تعجب ہے کہ پانچ سے سات سال تک انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھنے کے باوجود ایک طالب علم بھی نہ تو ایک جملہ بول سکتا ہے اور سبق عنوان کے معنی تک نہیں معلوم ہیں۔ لیکن رپورٹ میں نمبرات ۷۵ فی صد سے کامیاب ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہزاروں سرپرست اس جال میں پھنس چکے ہیں اردو داں طبقہ کی مصیبت یہ ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں کا معیار تعلیم بہت پست ہے وہ ان اسکولوں میں پڑھانا نہیں چاہتے۔ مکان کے قریب ہی جو اسکول انگلش میڈیم کا ہے اس میں شریک کروادیتے ہیں اس سے تو بہتر تھا کہ وہ تلگو میڈیم میں شریک کرواتے اگر کوئی ان اسکولوں کے معیار تعلیم پر ریسرچ کرے تو عوام کی بہت سی غلط فہمیاں دور ہوجائیں گی۔

اب تیسرا رخ اردو میڈیم اسکولوں کا دیکھئے۔ اردو اکیڈمی روڈ (کی جانب سے) ایک گورنمنٹ گرلز اپر پرائمری اسکول کی عمارت ہے، جو کھنڈر میں تبدیل ہو چکی ہے۔ اس کی حالت دیکھ کر ہی آپ سمجھ جائیں گے کہ یہاں کا تعلیمی معیار کیا ہوسکتا ہے۔ بعض اسکولوں میں دس دس برس سے کوئی ٹیچر نہیں۔ نصابی کتب ندارد بلاک بورڈ اور چاک بھی نصیب نہیں تو پھر تعلیم کیا ہوتی ہوگی۔ یہ کہہ دینا آسان ہے کہ اردو میڈیم اسکولوں کا معیار تعلیم بہت پست ہوتا ہے لیکن یہ تہمت کہاں تک درست ہے۔ ان اسکولوں کو بھی وہی سہولتیں فراہم کر دیجئے جو اچھے انگلش میڈیم مشنری اسکول میں، پھر ان طلبہ کا پانچ سال کی تعلیم کے بعد مقابلہ کروائیے۔ آپ یہ دیکھ کر حیرت میں پڑجائیں گے اردو میڈیم طلبہ ان سے کسی طرح کم نہیں۔ لاڑ بازار میں اردو میڈیم اقامتی اسکول کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے۔ میٹرک امتحان میں ہر سال ۸۰ فی صد طلبہ فرسٹ ڈویژن میں کامیاب ہوتے ہیں اور نتیجہ سو فی صد رہتا ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ یہاں پڑھانے کی تمام سہولتیں حاصل ہیں۔

اردو میڈیم اسکول کے نام کے ساتھ ہی غربت کا سایہ سامنے آجاتا ہے۔ اس شہر کے محلہ تاڑبن میں گورنمنٹ اردو میڈیم ہائی اسکول ہے جہاں تعداد گیارہ سو سے اوپر ہے۔ ۳۵ ٹیچرس کی جائیدادیں منظور نہیں لیکن گذشتہ پانچ سال سے صرف تین ٹیچرس اس اسکول پر کام کرتے رہے۔ کوئی دو ماہ قبل ہائی کورٹ کے حکم سے ان خالی جائیدادوں کو پُر کیا گیا یہ ایک کلاسیکل مثال اردو میڈیم اسکول کی دی جاسکتی ہے۔

تعلیمی پروگرام:۔ حالات کی تبدیلی کے ساتھ ہی مساجد اور مکاتب کے ذمہ داروں نے اردو کی حفاظت کا ذمہ اپنے سر لے لیا۔ اردو اور دینیات کی تعلیم کا سلسلہ صباحی مدرسوں میں

آج ہر محلہ اور بستی میں جاری ہے۔ اس طرح اردو کا رشتہ ہر جگہ بنیادی سطح پر آج بھی باقی ہے۔ بعض سرپرست اپنے بچوں کو اچھے انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھا رہے ہیں لیکن وہ اپنی مادری زبان سے بچوں کو اجنبی رکھنے کے بجائے انھیں گھر پر اردو پڑھا رہے ہیں انھیں اس بات کا احساس ہے کہ ان کی نسل کسی طرح اردو سے اپنا رشتہ جوڑے رکھے۔

(۱) انجمن ترقی اردو ہر سال ایک ماہ کے لئے اردو ٹیچرس' ان ٹرینڈ یا ٹرینڈ کا ریفریشر کورس چلائے تو ہر سال کم از کم ۲۰۰ اساتذہ کی تربیت سے اسکولوں میں پڑھائی کے حالات بہت کچھ بدل سکتے ہیں اس سلسلہ میں اسلامک سوشیل سروس نے کوئی ۸۶ ان ٹرینڈ ٹیچرس کے لئے ان گرمائی تعطیلات میں اس قسم کا کورس چلا رہے ہیں جس سے بہت مفید نتائج برآمد ہو سکتے ہیں۔

(۲) عابد علی خان اردو تعلیمی ٹرسٹ کا ٹارگٹ ۵ لاکھ کا سرمایہ ہے لیکن اسے ایک کروڑ کے کارپس فنڈ میں تبدیل کیا جائے تو اردو کی تعلیم اور ترقی کے بہت سے کام کئے جا سکتے ہیں۔ یہ کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ لیکن اردو کے پریمیوں کو ایک مہم چلانے کی ضرورت ہے تاکہ یہ ٹارگٹ ایک سال کے اندر پورا ہو جائے۔

(۳) اتر پردیش میں سید حامد صاحب کی قیادت میں ایک تعلیمی کارواں کوئی دو سال قبل نکالا گیا۔ یہی کارواں اب تک ۲۷ اضلاع کا دورہ کر چکا ہے۔ اس کارواں میں پروفیسر' دانشور' ڈاکٹر' انجینئر' ماہرین تعلیم' تاجر' صحافی سب ہی شریک تھے۔' مقصد عام تعلیم پر اور اصلاح معاشرہ کے کاموں پر توجہ دینا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس کے بہتر نتائج سامنے آ رہے ہیں جب تک تعلیم کے کام کو ایک تحریک میں تبدیل نہ کیا جائے اس وقت تک حالات کے بدلنے کی کوئی توقع نہیں۔

(۴) ریاست کے چار اردو میڈیم رزیڈنشیل اسکولوں میں شرکت کے لئے دو جماعتوں میں ۳۶' ۳۶ ایسے طلبہ نہیں مل رہے ہیں جو چوتھی جماعت کامیاب ہوں اور داخلہ امتحان میں ۱۰۰ میں ۱۵ نمبر ہیں۔ یہ ایک افسوسناک حقیقت ہے جب کہ تلگو میڈیم کے ایک سو سے زائد رہائشی اسکولوں میں شرکت کے لئے اس ضلع کے طلبہ ان نشستوں کے لئے پانچ ہزار سے زائد داخلہ ٹیسٹ میں شریک ہوتے ہیں۔ اس ٹیسٹ میں کامیابی کے لئے خانگی سطح پر ہر ضلع میں کوچنگ انسٹی ٹیوٹس کا جال بچھا ہوا ہے۔ کیا اچھا ہو کہ ہمارے ادارے ان طلبہ کی کوچنگ کا انتظام کریں۔ ہر سال طلبہ کی کمی کی وجہ سے پانچ چھ سیٹ خالی رہ جاتے ہیں دوسرے معنوں میں طلبہ کے قحط کی وجہ سے یہ گورنمنٹ اسکول سسک رہے ہیں۔

(۵) اسی تعلیمی پروگرام کے تحت اس بات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ماں باپ کی غربت اور جہالت آج لا تعداد بچے جن کی عمریں ۴-۵ سال کی ہو چکی ہیں وہ معمولی کارخانوں میں چھوٹے موٹے کام کرنے اور خاندان کی آمدنی بڑھانے کے لئے مصروف ہیں۔ یہ بچے ناخواندہ ہی نہیں بلکہ تعلیم سے ہمیشہ کے لئے محروم رہ جاتے ہیں۔ چودہ سال کی عمر تک یعنی ساتویں جماعت تک ہمارے جمہوری نظام میں تعلیمی کمیٹی بنائی جائے اور ایسے بچوں کو اسکولوں میں شریک کروایا جائے چاہے وہ انگلش میڈیم کے ہوں یا تلگو میڈیم کے۔ لیکن ان کی تعلیم کسی حال ضروری ہے۔ یہ کام چھوٹے پیمانے پر ہر کوئی کر سکتا ہے آپ باہر نکل جائیں کسی ایک لڑکے ہی کے ماں باپ سے بات کیجئے۔ اس کی انگلی پکڑ کر کسی اسکول میں لے جا کر شریک کروا دیجئے۔ ہو سکا تو کمیٹی یا خود اس کی فیس' کتب کاپیوں کا انتظام کر دیجئے۔

اگر ہر سال ایسے دس طلبہ ہی کو آپ شریک کروادیں تو ۵ سال کے عرصہ میں اس محلہ یا بستی میں کوئی بچہ ان پڑھ نہیں رہے گا۔ یہ کام بظاہر چھوٹا معلوم ہوتا ہے لیکن ہمارے لئے یہ نہایت عظیم الشان کام کا رتبہ رکھتا ہے۔ اصل میں یہی ایک کام کرنے کا ہے۔ ضرورت ہے کہ لوکل لیڈر شپ کو متحرک کر دیا جائے اور انھیں مالی وسائل حتی المقدور فراہم کئے جائیں۔

باقی صفحہ ۳۸ پر

ڈاکٹر مظہرالدین فاروقی ☆

مسلمان، ہندو اور عیسائی طلبہ کا تعلیمی اکتساب
(ایک تقابلی جائزہ)

ماہرین سماجیات اور ماہرین تعلیم نے تعلیمی اکتساب (Educational Achievement) پر اثر انداز ہونے والے مختلف عوامل کو پیش کیا ہے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں اس موضوع پر تحقیقات بھی کی گئی ہیں۔ امریکی محکمہ صحت تعلیم و بہبود نے اپنی تحقیقاتی رپورٹ A study of The Achievement ofOur Nations student میں ان عوامل کو پیش کیا ہے جو اکتساب سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

اہم عوامل حسب ذیل ہیں:

١ طلبہ کی سماجی و معاشی حیثیت Socio- Economic Status (SES)
٢ گھر کا ماحول Home Background (HB)
٣ خاندانی پس منظر Family Background (FB)
٤ تعلیمی منصوبہ بندی Educational Planning (EDPLN)
٥ تحریکی و ترغیبی معیارات Motivational Measures (MTVTN)
٦ توقعات برائے فضل Expectation for (Exptn) Excellence
٧ نسلی تعلق Racial and Ethnic group-(RETH) Membershi
٨ رجحان زندگی Attitude towards Life (ATTUD)
٩ مدرسہ کی خصوصیات School characteristics (SCH)

اس سے ہٹ کر مختلف تحقیقاتی معاملات میں ذیل کے عوامل کو بھی شامل کیا گیا ہے جو تعلیمی اکتساب سے گہرا تعلق رکھتے ہیں۔

١٠ نصاب (Curriculum)
١١ تعلیمی شعور و بیداری (Educational Awareness)
١٢ تعلیم و ملازمت کے مواقع کی دستیابی (Availability of Educational and Employment opportunities)
١٣ نظریہ تعلیم خواتین (Concept of Women Eduction)
١٤ مستحکم تعلیمی مستقبل (Stable Educational Career)
١٥ احساس مایوسی، محرومی و بیگانگی (Sense of frustration deprivation and alienation)
١٦ ذہانت (Intelligence) وغیرہ

زیر نظر مضمون میں آندھرا پردیش کے تین اہم مذاہب کے ماننے والے ہندو، مسلم، عیسائی طلبہ کی دہم جماعت (S.S.C پبلک امتحان) کے دس سالہ تعلیمی اکتساب اور ان میں پائے جانے والے فرق اور اس تعلیمی اکتساب کے فرق کی وجوہات پر بحث کی گئی ہے۔

ہندو، مسلم اور عیسائی طلبہ کی دس سالہ اکتسابی کارکردگی (ایس۔ ایس۔ سی) پبلک امتحانات کے نتائج کی شرح فیصد درجہ ذیل جدول میں پیش کی گئی ہے۔

☆ پرنسپل، المدینہ کالج آف ایجوکیشن، محبوب نگر، آندھرا پردیش

سال	ہندو	مسلم	عیسائی	مجموعی
	(F.C)			فیصد
1984	54.65	40.23	50.35	48.12
1985	45.32	37.24	48.22	41.57
1986	51.04	42.65	54.68	47.48
1987	48.09	39.58	57.71	44.26
1988	48.37	39.65	60.12	43.66
1989	45.52	36.79	61.17	40.95
1990	45.86	39.82	59.97	42.20
1991	52.51	47.32	67.91	48.10
1992	50.42	38.75	63.91	45.61
1993	52.17	40.82	66.19	46.30
جملہ	493.95	402.85	590.95	448.25
اوسط	49.395	40.285	59.025	844.825

مسلم طلبہ کے کمترین وناقص تعلیمی اکتساب کی وجوہات

یہ ایک حقیقت ہے کہ مسلم طلبہ کا تعلیمی اکتساب نہ صرف ایس ایس سی امتحان بلکہ مختلف کورسس اور مسابقتی امتحانات (Competative Examination) میں نہایت ناقص اور کمتر پایا جاتا ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور و فکر ہے کہ وہ کون سے عوامل یا وجوہات ہیں جو مسلم طلبہ کی تعلیمی ترقی اور اکتساب کے راستے میں حائل ہیں۔ کیا ان کا مذہب یا پھر نسلی تعلق رکاوٹ بن رہا ہے یا دوسرے عوامل جیسے ان کی سماجی معاشی پستی و بدحالی کے ان کے گھر کا غیر تعلیمی اور ابتر ماحول ان کے ہاں تعلیمی منصوبہ بندی کی کمی' ان کے مدارس کی خصوصیات' اعلیٰ توقعات کی کمی تحریکی ترغیبی معیارات کی کمی' تعلیم اور ملازمت کے مواقع کی عدم دستیابی عورتوں کی تعلیم اور ان کا غیر مستحکم تعلیمی مستقبل' ان میں پائے جانے والا احساس محرومی' مایوسی و بیگانگی ان کے تعلیـ اکتساب پر اثر انداز ہو رہا ہے؟

مسلمانوں کے مذہب اور خاص طور پر ان کی مقدـ کتاب قرآن پاک میں علم حاصل کرنے کی بار ہا تاکید کی گـ ہے۔ قرآن حکیم میں اس قسم کے فقرے جابجا ملتے ہیں لعلکم تعقلون (تاکہ تم سمجھو) لعلکم تتفکرون (تاکہ سوچو) لعلکم تشعرون (تاکہ تم جانو) اور اس نے آدم ـ سب چیزوں کے نام بتائے و علم آدم الاسماء مسلمانوں ـ پیغمبر آنحضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ طلب العلم فریضۃ عا کل مسلم و مسلمۃ (علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد ـ عورت پر فرض ہے) "اسلام کی تیرہ سو سال کی ایک شاند تاریخ ہے۔ اس نے دنیا کے ہر گوشے اور علم و عمل کے دائرے پر اپنا گہرا اثر چھوڑا ہے۔ ازمنہ وسطیٰ میں ایک طور دنیا کی قیادت مسلمانوں کے ہاتھ میں تھی' مگر جدید دور ـ صورت حال بدل گئی۔" (پروفیسر آل احمد سرور) "ظاہر ہے باخبری تعلیم سے ہی آتی ہے۔ تعلیم ہی نسخہ کیمیاء ہے۔ ط دینی و دنیوی فلاح کا سرچشمہ ہے۔ حیرت ہے کہ اس ـ باوجود مسلمان علم سے در ماندہ ہیں۔ اسے پیچھے دئے جـ ہیں۔" (سید حامد' سابق وائس چانسلر' علی گڑھ' مسـ یونیورسٹی' علی گڑھ) "اسلام نے سائنس کو جتنا ابھارا ہے کبھی کسی مذہب نے نہیں کیا۔ اسلامی تعلیمات سے علوم فنون' سائنسی تحقیق کی جو ہمت افزائی ہوئی اس کا نتیجہ امیہ' عباسی اور ہسپانیہ کی عرب حکومت کے دور کی شاند تہذیبی ترقیوں کی شکل میں میں ظاہر ہوا۔ اسلام کبھی بھی ـ اور سائنس کی راہ میں حائل نہیں ہوا۔ وہ انسانوں کی عـ سرگرمیوں کو اتنی وقعت دیتا ہے کہ اس کی بناء پر انہیـ فرشتوں سے بھی افضل قرار دیتا ہے۔ ہمیں اس کا احـ ہونا چاہئے کہ موجودہ انحطاط کی وجہ اسلامی تعلیمات کی ـ نہیں بلکہ مسلمانوں کی غفلت ہے۔" (محمد اسد؛ لیوپولڈو اسلام دو راہے پر)

مسلم طلبہ کی کمترین تعلیمی اکتساب کی ایک وجہ ان کی معاشی پسماندگی ہے۔ مختلف سرکاری اور غیر سرکاری سروے اور تحقیقاتی رپورٹس اور ماہرین تعلیم کے مقالات بشمول ڈاکٹر مسعود علی خان' ایم کے اے صدیقی اور ڈاکٹر مظہر فاروقی نے مسلمانوں کو معاشی طور پر پسماندہ طبقہ قرار دیا ہے۔ پروفیسر عبدالحمید "نظام تعلیم کا اساسی تخیل" میں مسلمانوں کی پسماندگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "انگریزوں کے ابتدائی دور سے ہی مسلمانوں کے خلاف ایک سازش کام کر رہی ہے۔ اور عظیم انسانی روایات کی حامل قوم دنیا میں یوں بے وقعت کر کے رکھ دی گئی کہ ان کی جماعت کا نظام درہم برہم ہوگیا' اور ساری قوم جہالت کا شکار ہوگئی اس پر مزید یہ اسکوپیٹ کی مار دی گئی۔ معیشت کے دروازے اس پر ایک ایک کرکے بند کر دئے گئے۔ اس کو ایک قلیل مدت کے اندر فقیروں اور قلاشوں کی قوم بنا کر رکھ دیا گیا۔"

جناب محمد اسحاق اپنی کتاب "تعلیمی مسائل اور ہماری ذمہ داریاں" میں لکھتے ہیں کہ "مسلم قوم غریب اور مفلس ہے اس لئے تعلیم نہیں پاتی اور وہ تعلیم سے نابلد ہے اس لئے تو غریب ہے۔ غربت تب ہی دور ہو سکتی ہے جب کہ لوگ تعلیم یافتہ ہوں اور تعلیم کے راستے میں غربت ایک بڑا پتھر ہے جو ہٹتا نہیں۔ غربت اور جہالت ایک ایسا منحوس چکر ہے جس کا سرا ملتا نہیں۔" پس! مسلم طلباء کی معاشی پسماندگی بھی ان کے بہتر تعلیمی اکتساب میں ایک رکاوٹ ہے۔

عام طور پر مسلم طلبہ کے گھر کا ماحول غیر تعلیم یافتہ اور بگڑا ہوا ہے۔ ان کے گھر والوں' رشتہ داروں اور دوستوں کے ہاں نہ تعلیم کا ماحول ہے اور نہ اس کی وقعت۔ غریب تو افلاس اور روزی روٹی کی چکر میں گم ہیں اور ان کے بچے تعلیم سے نابلد ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو کسی قدر متمول ہیں ان کے گھر میں فضول خرچی کے پورے سامان جیسے ٹیپ ریکارڈ' ٹی' وی' اسٹار' ٹی وی' وی۔ سی۔ آر اور دوسرے عیشات' دلبستگیوں کی بھرمار اور دولت کا غلط استعمال ہے۔ اور یہ تمام تعلیمی اکتساب کے راستے کی اہم رکاوٹیں ہیں۔ تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ وہ طلبہ جن کے سرپرست عرب ممالک میں ملازم ہیں ان کے ہاں عام طور پر نگرانی کا نہ ہونا تعلیمی صلاح و مشورہ اور رہبری کی کمی' صلاحیتوں' دلچسپیوں اور اہمیت کے مطابق مناسب کورسس' مضمون یا شعبہ کے انتخاب کی کمی اور تعلیمی سازگار ذہن و ماحول کا فقدان پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر محمد خلیل عباس صدیقی لکھتے ہیں کہ "والدین کا تعلیم یافتہ ہونا بچوں کی رہنمائی اور علمی طور پر ان کی اعانت کے لئے ضروری ہے۔ اگر والدین پڑھے لکھے نہ ہوں یا ان کی علمی استعداد بہت ہی محدود ہو تو بچوں کو اپنے مسائل آپ حل کرنے ہوتے ہیں اور نہ تو ان کی روز مرہ کی ضرورتوں میں والدین سے مدد ملتی ہے اور نہ طویل المیعاد تعلیمی منصوبے میں ان سے اعانت و رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔" اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ مسلم طلبہ کی اکثریت غیر پیشہ وارانہ Non-Professional غیر صنعتی Non-Technical اور کم مدتی صنعتی کورسس Short- term Technical Courses میں پائی جاتی ہے۔ مسلم طلبہ وقت اور قدر کے میزان پر پورے نہیں اترتے' ان کے ہاں اپنے تعلیمی مستقبل کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔ یہ وقتی طور پر کچھ کما بھی لیتے ہیں لیکن ان کا کوئی دیرپا مستقبل نہیں ہوتا۔ ان کی ایک بڑی تعداد وقفہ' وقفہ سے ناانصافی' ناکامی' محرومی اور ناسازگار حالات کی وجہ سے ذہنی کشمکش اور تناؤ کی کیفیت میں مبتلا ہو کر نفسیاتی طور پر کمتری' مایوسی اور بیگانگی جیسے احساسات کا شکار ہوجاتی ہے۔ اور یہی احساسات سماجی بیماریوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ طلبہ میں یا افراد میں ان بیماریوں کا پایا جانا بہتر تعلیمی اکتساب اور ترقی میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔

تعلیم جیسے اہم مقصد کے حاصل کرنے کے لئے منصوبہ بندی نہایت ضروری ہے۔ ماہرین تعلیم بشمول ڈاکٹر ذاکر حسین نے تعلیمی منصوبہ بندی پر زور دیا ہے اور مقصد کے حاصل کرنے کے لئے "شدت+مدت=مقصد" کا فارمولہ پیش

کیا ہے۔ جناب محمد اسحاق نے اپنی کتاب "اقلیتی مسائل" میں لکھتے ہیں۔ "تعلیم قسمت کی بات نہیں بلکہ تعلیم منصوبہ بند کوشش کا نتیجہ ہے۔" لیکن مسلم طلبہ میں تعلیمی منصوبہ بندی کا تصور نہ ہونے کے برابر ہے۔ "مسلم طلبہ کی اکثریت غیر معیاری اور خستہ حال مدارس میں پڑھتی ہے جہاں حوصلہ شکن نتائج، کمزور ڈسپلن، خستہ حال عمارتیں، تعلیمی آلات کی کمی، درسی کتب کی عدم دستیابی اور صدر مدرسہ کی عدم دلچسپی جیسے اہم مسائل سے دو چار ہے" (ڈاکٹر مظہر فاروقی "مسلمانوں کی تعلیم" (۱۹۹۳)

مسلم طلبہ کے لئے نہ گھر میں تعلیمی ماحول اور نہ ہی تعلیمی تحریکات و ترغیبات (MTVTN) اور نہ ان کے ہاں مستقبل سے اعلیٰ توقعات (EXPTN) کا کوئی وجود پایا جاتا ہے جو ماہرین تعلیم کی نظر میں بہتر تعلیمی اکتساب (ACHV) کے لئے ضروری قرار پاتے ہیں۔ "تعلیم کے میدان میں کامیابی کا گہرا تعلق سماجی توقعات سے ہے یعنی یہ کہ کوئی گروہ تعلیم کے میدان میں تب تک ہی نمایاں کامیابی حاصل کرتا ہے جب تعلیم کے ذریعہ اس کے مقاصد حاصل کرنے کا امکان نظر آتا ہو۔ اگر اس کو یقین ہو کہ تعلیم اس کی معاشی اور معاشرتی ترقی کا ذریعہ بن سکتی ہے تو دل و جان سے تعلیم حاصل کرنے کی کوشش کرے گا۔ اس کے برعکس اگر معاشی میدان میں تعلیم کے ذریعہ کامیابی کا امکان نظر نہ آتا ہو اور ترقی کے راستے اوروں کی طرح اس کے لئے کھلے نہ ہوں تو وہ تعلیم حاصل کرنے میں اپنی پوری توجہ صرف نہیں کرے گا اور اس میدان میں نمایاں کامیابی حاصل نہ ہو سکے گی۔" (ڈاکٹر محمد خلیل عباس صدیقی: (۱۹۸۷)

مسلمانوں کا مذہب عورتوں کی تعلیم پر اتنا ہی زور دیتا ہے جتنا کہ مردوں کی تعلیم پر اور اس کے حاصل کرنے کو ہر دو کا مقدس فرض ٹھہراتا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ ایک مرد کی تعلیم اس کی اپنی شخصیت و بہتر معیاری زندگی کے لئے ضروری ہے۔ لیکن ایک عورت کی تعلیم سارے گھر و خاندان کی تعلیم کا باعث بنتی ہے۔ مسلم طالبات اکتسابی صلاحیت میں کسی سے پیچھے نہیں، لیکن ان کی ایک بڑی تعداد مستحکم تعلیمی مستقبل اور تعلیم کے صحیح استعمال کے فقدان کی وجہ سے یا تو ناکامی (Stagnation) کا شکار ہو جاتی ہے یا پھر ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع (Dropout) ہو جاتا ہے۔ اور خاص طور پر مسلم گھرانوں میں عورتوں کی تعلیم کے لئے تحریکی و ترغیبی معیارات کی کمی ان کے تعلیمی اکتساب میں عام کمی (General Decrease) کا باعث بنتی ہے۔

ماہرین تعلیم بہتر اکتساب کے لئے اکتسابی بنیادوں پر بہتر مستقبل کی توقع کو ضروری قرار دیتے ہیں۔ اور یہ تعلیم و نفسیات کا بنیادی اصول بھی ہے کہ جب تک واضح مقاصد اور منزل کا تعین نہ ہو، مقصد، اکتساب متزلزل رہے گا تعلیم کو جب تک قدر (Value) اور استعمال (Use) کی ترازو میں نہ رکھا جائے اس کی اکتسابی رغبت کمزور اور غیر واضح رہے گی۔ اس طرح مسلم طلبہ کے ذہن میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد ان کے لئے بیروزگاری، تعصب ناانصافی جانب داری کے احساسات کا پایا جانا یا اس کا خوف ان کے بہتر تعلیمی اکتساب میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے۔ یہاں یہ بات واضح کرنا ضروری ہے کہ ہندوستانی سماج میں ان باتوں کا وجود ہو یا نہ ہو وہ ایک الگ مسئلہ ہے لیکن طلبہ کے ذہنوں میں اس کا وجود بھی نقصان کا باعث بنتا ہے۔ اس لئے مسلم طلبہ کو چاہئے کہ اس کو ذہن سے نکال دیں اور اپنی دلچسپی، صلاحیت، محنت و لگن اور بہتر اکتساب کے ذریعہ اخلاق و کردار کے زیور سے آراستہ ہو کر میدان عمل میں اتریں اور معاشی بدحالی، تعلیمی و معاشرتی پسماندگی اور سماجی برائیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کریں اور زندگی کے ہر شعبہ میں اپنے وجود کو منوائیں۔

ہندوستان ایک سیکولر ملک ہے۔ "ہندوستانی سیکولرزم کو ہم مذہب لا تعلق تو کہہ سکتے ہیں لیکن اسے مخالف مذہب کہنا درست نہیں" (پروفیسر مشیر الحق) ہندوستانی دستور ہر جماعت، مذہب و فرقہ کے لوگوں کو اپنی صلاحیتوں کے اقتبا

سے ترقی کرنے کی پوری ضمانت دیتا ہے۔ پس مسلم طلبہ کو سمجھنا چاہئے کہ ملک وقوم کو ان کی ضرورت ہے اور ان کی ترقی کے بغیر ملک کی ترقی ادھوری ہے۔ انہیں اپنی پسماندگی اور اکتسابی کمزوری کا مقابلہ ایک چیلنج کی طرح کرنا چاہئے۔

عیسائی طلبہ کے بہتر اکتساب کا راز :

اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ عیسائی طلبہ کا تعلیمی اکتساب (ACHV) ہندو اور مسلم طلبہ کے مقابلے میں بہتر ہے اور تحقیقات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مجموعی طور پر عیسائی طلبہ' ہندو طلبہ سے معاشی اور سماجی طور پر (SES) پسماندہ ہیں۔ ان کے والدین یا آباء و اجداد نہ صرف ماضی میں ہندوؤں کے پسماندہ طبقات سے تعلق رکھتے تھے بلکہ آج بھی ان کی بڑی تعداد پسماندہ ہونے کی دعویدار ہے۔ یہاں یہ بات قابل غور و فکر ہے کہ مذہب کی تبدیلی کے بعد آخر ان میں کون سی صلاحیتیں پیدا ہوئیں یا ان کا تعلیمی شعور بیدار ہوا کہ وہ اعلیٰ ذات کے ہندو اور مسلم طلبہ سے بھی تعلیمی اکتساب میں سبقت لے گئے؟ ماہرین تعلیم و سماجیات' عیسائی طلبہ کی بہتر اکتسابی کارکردگی کے مختلف وجوہات بیان کرتے ہیں۔ اس مضمون کی طوالت کے پیش نظر یہاں چند مختصر اقتباسات کو ہی شامل کیا جا رہا ہے جو اس موضوع سے متعلق ہیں۔

Methew P. M کا کہنا ہے کہ "عیسائی طلبہ کی بہتر کارکردگی کا راز ان کی سرگرم مشنریاں ہیں۔" یہ مشنریاں عیسائی طلبہ میں تعلیمی شعور کو بیدار کرتی ہیں اور ان میں ایک سماجی انقلاب لے آتی ہیں۔ NAIR لکھتے ہیں کہ "عیسائیوں کی رضاکارانہ تنظیمیں عیسائی طلبہ کے معاشی و تعلیمی مسائل کو حل کرنے کی پر خلوص کوشش کرتی ہیں" ہندوستان کے ہر شہر و گاؤں میں ان کی ایک تنظیم ہے جو ہر فرد و خاندان کو بہبودی سماج اور تعلیمی خدمات کے ذریعہ اپنی طرف راغب کرتی ہے۔

Burnett John لکھتے ہیں کہ "سماجی خدمت اور تعلیم عیسائی مشنریوں کے اہم کام ہیں۔ ان کا پہلا کام شعور کو بیدار کرکے مذہب سے ہمدردی اور اس کو مقبول عام بنانا ہے تو دوسرا' گھر' خاندان اور سماج کو سنوارتا ہے۔" Velorian Rodri Gues عیسائیوں کی مختلف تنظیموں جیسے Young Student Movement, Young Children Worker, All India Catholic University Federation (AICUF) کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں "یہ تمام تنظیمیں پسماندہ عیسائیوں کا تعاون اور ان کی سرپرستی کرتی ہیں۔" یہ تنظیمیں ہر ضرورت مند اور خاص طور پر کمزور طبقات کی مصیبت میں مدد کرتی ہیں۔ اس طرح ان کو اپنا ہمدرد اور گرویدہ بنا لیتی ہیں۔ John B.S. کا کہنا ہے کہ "ہندوستان میں عیسائیوں کے تعلیمی شعور کی ایک اہم وجہ مرد اور عورت کے گھریلو ذمہ داریوں کا یکساں احساس ہے۔ بلکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ عیسائی عورت اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے معاملے میں مردوں پر سبقت رکھتی ہے۔" Samuel C.G کا کہنا ہے کہ "تعلیم کے لئے روپیئے کی فراوانی اور سہولتوں کی موجودگی سب کچھ نہیں ہوتے' اس کے لئے تعلیمی شعور' مناسب ماحول اور اعلیٰ توقعات کا ہونا نہایت ضروری ہے اور عیسائی خاندانوں میں ان کا پایا جانا ایک صحت مند معاشرہ کی علامت ہے۔"

آج ہندوستانی مسلمانوں کو عیسائیوں کے تعلیمی شعور' خدمت کے جذبے اور ان کی اصلاحی اور تعلیمی سرگرمیوں سے کچھ سیکھنا چاہئے۔ ہندوستان میں ان کی تعلیمی اور فلاحی خدمات کی شروعات سیرام پور کے مقام سے ہوئی جہاں سب سے پہلا مشن ولیم کیرے اور اس کے رفقاء کار کی زیر نگرانی قائم ہوا' اور اس مشن نے ۱۷۹۳ء میں یہاں اپنا پہلا کالج قائم کیا۔ لارڈ میکا لے کی تعلیمی پالیسی نے اس تحریک کو استحکام و دوام بخشا۔ ان کی تعلیمی پالیسی اور تحریک کی اہمیت کا اندازہ میکا لے کے خط کے الفاظ سے ہوتا ہے جو اس نے اپنے والد کو لکھا تھا "مجھے پورا اعتماد ہے کہ اگر ہماری تعلیمی پالیسی کامیاب ہوئی تو بنگال میں کوئی بت پرست باقی نہ رہے گا۔ یہ

سب فطری طور پر ہوگا' بغیر کسی مذہبی وعظ اور مداخلت کے" (ہندوستانی تعلیمی تاریخ بی۔ سی۔ رائے)۔ عیسائی مشنریاں تعلیم اور انسانیت کی خدمت کے ذریعے اپنی مقصدی تحریک کو کچھ اس طرح آگے بڑھائے کہ وہ بہت جلد نہ صرف مقبول عام ہوئے بلکہ گھر گھر اور گاؤں گاؤں ان کے اعتماد اور اعتقاد میں آتے گئے۔ اور آج ہر چھوٹے سے چھوٹے شہر اور گاؤں میں ان کی تنظیم کا ایک مدرسہ اور دوا خانہ ضرور ملتا ہے جس کے اپنے معیارات ایک مسلمہ حیثیت رکھتے ہیں۔ کلکتہ کے ایک سروے کے مطابق عیسائیوں نے اپنی آبادی کے فیصد سے چھ گنا زیادہ (فیصد) تعلیمی مدارس قائم کر رکھے ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تعلیمی خدمات صرف عیسائیوں کے لئے ہی نہیں بلکہ ان کے دروازے بلا لحاظ مذہب سب کے لئے کھلے ہیں۔ یہاں حقیقت پسند اور معقول ذہن رکھنے والے ہر ہندوستانی کو ان کی اس خدمت کا اعتراف کرنا ہی پڑے گا۔

مسٹر منی شنکر ایر' ایم پی نے سیاست ۲۹ جون ۹۴ اپنے مضمون "نفرت کا پرچارکیوں" میں لکھتے ہیں کہ "ہندوستان میں کرسچن مشن کی جتنی بھی سرگرمیاں رہی ہیں انہوں نے زندگی کے تقریباً ہر شعبہ میں فلاح و بہبود کے اچھے کام کئے کرسچن مشنریز کو وہیں بڑی بڑی کامیابیاں ملیں جہاں پانچ ہزار برسوں میں بھی ہندوازم رسائی حاصل نہ کرسکا۔" ہندوستانی سماج فادر ہرمن راس شائرٹ Herman Rasschaert مدر ٹریسا اور ایسی سینکڑوں شخصیتوں کو کبھی فراموش نہیں کر سکتا جو اپنی ساری زندگیاں شہروں' گاؤں اور دور دراز پہاڑی اور جنگلاتی علاقوں میں انسانیت کی خدمت کے لئے وقف کر چکی ہیں۔

یہی وجوہات ہیں کہ عیسائی گھرانوں میں تعلیمی ماحول' تعلیمی شعور' منصوبہ بندی اور مسابقتی ذہن اور ان کے سماج میں عورتوں اور مردوں کے لئے یکساں تعلیمی ترغیبات اور توقعات پائے جاتے ہیں جو بہتر تعلیمی اکتساب کے لئے ضروری ہیں۔

مسلمانوں کا مذہب نہ صرف بنی نوع انسان کی خدمت' بہبودی و تعلیم بلکہ زندگی کے ہر شعبہ حیات کے لئے ایک بہترین دائمی نظام رکھتا ہے لیکن آج مسلمانوں میں خدمت کا جذبہ اور تعلیمی شعور کا فقدان پایا جاتا ہے' صحت عامہ اور مفت تعلیم کے وسائل نہ ہونے کے برابر ہیں اور ان کی چند ایک گنی چنی تعلیمی تنظیمیں ہیں بھی تو وہ صرف مٹھی بھر متمول طلبہ کے لئے جن سے وہ بھاری فیس اور گیراں عطیات وصول کرکے تعلیم کا انتظام تو کرسکتی ہیں۔ لیکن بے شمار غریب' مزدور پیشہ' چھوٹے تاجر اور دیہاتی مسلم طلبہ جو معاشی طور پر پسماندہ ہیں ان کا کوئی پرسان حال نہیں۔ کاش! مسلمانوں کی بھی تعلیمی اور فلاحی تنظیمیں ہوتیں جو غریب مسلم طلبہ کو سہارا دیتیں اور جو تنظیمیں موجود ہیں وہ کم از کم اپنی خدمات کا کچھ حصہ غریب و نادار' مفلس و مفلوک الحال بچوں کی جھولی میں بھی ڈالتیں۔

ڈاکٹر اقتدار حسین فاروقی ☆

مَنّ

يبني اسرائيل قد انجينكم من عدوكم وواعدنكم جانب الطور الايمن و نزلنا عليكم المن و السلوى

اے بنی اسرائیل ہم نے تم کو تمہارے دشمن سے نجات دی اور طور کی دائیں جانب تمہاری حاضری کے لئے وقت مقرر کیا اور تم پر مَنّ و سلویٰ اتارا (سورہ طٰہٰ۔ ۸۰)

مَنّ کے لفظی معنی یوں تو احسان اور انعام کے ہیں لیکن اصطلاحی معنوں میں وہ ایک قسم کا شبنمی گوند ہے جس کو اللہ تعالیٰ صحرائے سینا میں بھٹکنے والے اسرائیلیوں کے لئے غذا کے طور پر نازل فرماتا تھا۔ یہ گوند درختوں کے پتوں پر جمع ہوجاتا تھا اور بنی اسرائیل روز اسے اکٹھا کرکے کھاتے۔ یہ واقعہ ۱۴۹۱ سے ۱۴۵۱ قبل مسیح کا ہے جب کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام مصر سے اپنی قوم کے کئی لاکھ افراد کو فرعون کے پنجہ ظلم سے نجات دلاکر سینا کے علاقے میں لے آئے تاکہ انہیں کنعان پہنچایا جا سکے۔

مَنّ کا ذکر قرآن پاک میں تین مرتبہ کیا گیا ہے اس کی بابت زیادہ تر مفسرین کا خیال ہے کہ وہ کوئی غیر طبعی چیز نہ تھی بلکہ پودوں سے حاصل کردہ ایک شئے تھی جو بہت شیریں اور لذیذ تھی۔ مولانا عبد الماجد دریا بادی کی رائے میں من ایک قدرتی غذا تھی جو بنی اسرائیل کو سینا کی مسافرت کے دوران بلامشقت و تعب مل جاتی تھی۔ وہ یہ بھی فرماتے ہیں۔

"انزل سے مراد لازمی طور پر یہ نہیں ہوتی کہ وہ چیز کسی معجزانہ طریقہ پر اتری ہو۔"

مولانا نے مزید فرمایا ہے کہ اکثر لوگوں کے خیال میں مَنّ ترنجبین کے مرادف ہے۔

موضح القرآن میں مَنّ و سلویٰ کی بابت کہا گیا ہے کہ جب بنی اسرائیل فرعون سے نجات پاکر سینا کے جنگل میں داخل ہوئے تو ان کے پاس کھانے کو کچھ نہ تھا۔ اس وقت ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے مَنّ فراہم کیا جو دھنیا کے مانند ایک میٹھی شئے تھی اور سلویٰ نازل کیا جو ایک جانور (بٹیر) کا نام ہے' جسے وہ لوگ پکڑ لیتے اور کباب بنا کر کھاتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد کے خیال میں من درخت کا شیرہ ہے جو گوند کی طرح جم جایا کرتا تھا خوش ذائقہ اور مقوی ہوتا ہے۔ علامہ محمد ثناء اللہ عثمانی فرماتے ہیں کہ من سے مراد ترنجبین ہے اور سلویٰ سے مراد ایک پرند ہے جو بٹیر کے مشابہ ہوتا ہے۔

تفسیر حقانی تفہیم القرآن تفسیر عثمانی اور بیان القرآن میں بھی من کو ایک شیریں گوند نما شئے ہی بتایا گیا ہے۔ لیکن اس پودہ کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے جس سے یہ گوند (من) حاصل ہوتا ہو یا جس پر یہ جم جاتا ہو۔ جناب عبداللہ یوسف علی نے اپنی انگریزی تفسیر میں ضرور تحریر فرمایا ہے کہ من کا ذریعہ ٹمارکس نام کے پودے ہوا کرتے تھے۔

مختلف تفاسیر کی روشنی میں یہ بات تو یقیناً واضح اور عیاں ہوجاتی ہے کہ من ایک نباتاتی چیز تھی لیکن یہ کس پودے سے حاصل ہوئی تھی اور اس کی کیمیاوی ہیئت کیا تھی' یہ تفصیلات عام طور سے تفسیروں میں نہیں ملتی ہیں۔

ابوریحان محمد ابن البیرونی (۱۰۵۰ء- ۹۷۳ء) نے غالباً پہلی بار اس رائے کا اظہار کیا کہ "حاج" نامی پودے سے حاصل کردہ گوند بنام ترنجبین کو اصلی من کا مترادف کہا جا سکتا ہے۔ ترنجبین فارسی لفظ ترانگبین کا بگڑا ہوا روپ ہے۔ انگبین فارسی میں شہد کو کہتے ہیں گویا کہ ترانگبین وہی چیز ہے

☆ اسسٹنٹ ڈائرکٹر' نیشنل بوٹنیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ' لکھنؤ

جس کو انگریزی میں Honey Dew کہا جاتا ہے۔ اس طرح "حاج" سے نکلا ہوا گوند بھی شہد کے مانند میٹھا اور مفید سمجھا گیا۔ البیرونی کی تحقیقات کے بعد کئی صدیوں تک کوئی سائنسی جائزہ ایسا نہیں لیا گیا' جس سے سینا اور عرب کے دوسرے علاقوں کے نباتات کی بابت صحیح معلومات فراہم ہوتیں ۱۸۲۲ میں برکھارڈ نامی سائنسداں نے (جو بعد میں مصر میں شیخ برکات کے نام سے مشہور ہوا) اپنی کتاب Travels in Syria and Holy land میں لکھا ہے کہ من کی پیداوار کے ذمہ دار کچھ خاص قسم کے کیڑے ہوتے ہیں جو بعض درختوں کی چھال میں سوراخ کر دیتے ہیں اور ان سے شدید گرمی کے دوران ایک رطوبت نکلتی ہے جو رات کی ٹھنڈک میں درختوں پر جم جاتی ہے۔ برکھارڈ کے خیال کو تقویت اس وقت ملی جب ۱۸۲۹ء میں اہرن برگ اور ہم پریش نامی سائنسدانوں نے ایک رپورٹ شائع کی اور بتایا کہ Coccus manniparus نام کا کیڑا صحرائے سینا کے ٹمارکس نامی پودوں پر پایا گیا جو من کی پیداوار کا ذمہ دار تھا۔ گویا کہ انیسویں صدی کے نصف ہی میں یہ بات واضح ہو گئی کہ سینا کے درختوں پر من پیدا ہوتا ہے جو بہت شیریں ہوتا ہے اس کے کچھ بعد ہی اس امر کا علم بھی ہوا کہ اس علاقہ میں بسنے والے لوگ ان پودوں سے نکلے ہوئے گوند (من) کو مٹھائی کے طور پر کھاتے ہیں۔

آج تک ہوئی تحقیقات کی بنیاد پر یہ بات کسی حد تک یقین سے کہی جا سکتی ہے۔ کہ جس من کا تذکرہ قرآن حکیم میں کیا گیا ہے وہ دو قسم کے پودوں سے حاصل ہوتا ہے ایک تو وہ پودہ ہے جس کو عربی میں "الحاج" یا "عاقول" کہتے ہیں۔ اس کا نباتاتی نام Alhagi Maurorum دیا گیا ہے یہ خاردار پودہ ہوتا ہے اور عرب کے علاقوں میں اونٹ کی اچھی غذا ہے لہذا "شوک الجمل" بھی کہلاتا ہے فارسی میں اسے "خار شتر" کے نام سے جانا جاتا ہے۔ یہ چھوٹی جھاڑیوں کی شکل میں پایا جاتا ہے اور عموماً تین فٹ سے زیادہ بلندی نہیں پاتا ہے گو کہ اس کی جڑیں زمین میں دس سے پندرہ فٹ تک جاتی ہیں۔ یہ عرب کے علاوہ ایران' افغانستان اور ترکی میں بکثرت پایا جاتا ہے لیکن من کی پیداوار کے اعتبار سے ایران کا علاقہ خراسان ہی اہمیت رکھتا ہے کیوں کہ یہاں کے پودوں سے حاصل کیا گیا من جو ترنجبین کہلاتا ہے دنیا کے بازاروں کو سپلائی کیا جاتا ہے۔ ہندوستان میں "الحاج" کی جنس کا ایک پودہ کافی پایا جاتا ہے جس کو "جواسا" کہتے ہیں لیکن اس میں من پیدا نہیں ہوتا جس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان پر وہ کیڑے نہیں پائے جاتے ہیں جو میٹھی رطوبت کی پیداوار کے ذمہ دار ہوتے ہیں۔

"حاج" کے علاوہ ایک دوسرا پودہ جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں صحراء سینا میں بڑی تعداد میں ملتا تھا اور جو اب بھی وہاں کسی قدر پیدا ہوتا ہے وہ "طرفا" نامی پودا ہے جس کو نباتاتی سائنس کے اعتبار سے Tamarix mannifera نام دیا گیا ہے۔ یہ عربی میں "طرفا" کے علاوہ غاز اور فارسی میں "گاز" نام سے بھی جانا جاتا ہے اور اسی نسبت سے اس سے نکلا ہوا شیریں گوند گزا انگبین گزانجبین یا غزاانگبین کہلاتا ہے۔ ہندوستان میں "طرفا" کی جنس کا ایک دوسرا پودہ بنام "جھاؤ" دستیاب ہوتا ہے اسے Tamarix Qallica کہتے ہیں لیکن ان میں من کبھی بھی نکلتے نہیں دیکھا گیا ہے۔

"حاج" اور "طرفا" سے پیداشدہ من کی تجارت آج کے دور میں بھی کسی حد تک ہوتی ہے۔ گنے کی شکر عام ہو جانے کی بنا پر ان دونوں اقسام کے شیریں من کا استعمال مٹھائی بنانے کے کام میں تو نہیں ہوتا ہے لیکن طبی اہمیت کی بنا پر یونانی طریقہ علاج میں ان کا استعمال ہنوز باقی ہے۔ یہ انتہائی فرحت بخش ہوتے ہیں معدہ اور دل کو تقویت پہنچاتے ہیں۔

قرآن کریم میں تینوں مرتبہ من کا ذکر سلوی یعنی بٹیر کے ساتھ ہوا ہے اور دو آیات میں یہ بھی ارشاد ہوا کہ "ہم نے تم پر ابر کا سایہ کیا۔" گویا کہ حضرت موسیٰ کی قوم کو مٹھائی اور بٹیر کے گوشت سے نوازا گیا جو ہر اعتبار سے ایک مکمل

ں' ورنہ صرف شیریں چیز کھا کر کئی لاکھ افراد برسہا برس
ت زندگی نہ گزار سکتے۔ "ابر کا سایہ" کرنے کا قرآنی
بھی بہت معنی خیز ہے۔ گویا کہ ریگستانی علاقہ کہ لاکھوں
جو من پیدا کرتے تھے وہ سایہ دراز نہ تھے واضح رہے کہ
ج" کا پودا ایک چھوٹی سی جھاڑی کی مانند ہوتا ہے لہذا
کے سایہ دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ "طرفا" بھی
چھوٹا درخت ہوتا ہے جس کی پتیاں باریک ہوتی ہیں اور
فراہم نہیں کرتیں۔ چنانچہ سینا کے بیابان و ریگستان میں
پودوں کی تعداد تو یقیناً بہت ہوگی لیکن سایہ کے اعتبار سے
محض۔ مزید برآں یہ پودے خاص طور سے "حاج" کے
زی وار پودے اسلوئی یعنی بٹیریا بٹیوں کی قسم کے پرندوں
افزائش کے لئے نہایت موزوں پودے رہے ہوں گے۔

من کا ذکر بائبل میں بھی کئی بار کیا گیا ہے جس کے
ق مولڈنکے نے خیال ظاہر کیا ہے کہ وہ صرف شیریں گوند
نہ تھا بلکہ کچھ خاص قسم کی لائی کن (Lichen) اور الگی
Alg) کو بھی من کہا گیا تھا۔ ان کی نظر میں کتاب بروج
جس من کا حوالہ دیا گیا ہے وہ یقیناً میٹھی شے تھی لیکن
ب خروج اور کتاب گنتی کے ابواب میں جس من کی
ت کہا گیا ہے کہ وہ آسمان سے برستی تھی' وہ کوئی شیریں چیز
تھی بلکہ ایک خاص قسم کی کائی تھی' جس کو سائنسی
طلاح میں Lichen کہتے ہیں یہ سوکھ کر زمین سے جدا
باتی تھی اور تیز ہواؤں کی مدد سے فضا میں اڑتی ہوئی دور
ز کے علاقوں پر "پر برستی" (گرتی) تھی بنی اسرائیل اس
ئی" کو اکٹھا کر لیتے اور پیس کر اس کی روٹیاں یا پھلکیاں
تے اور سیر ہو کر کھاتے' مولڈنکے نے اپنے اس نظریہ کی
ت میں ۱۸۵۴ء کے زبردست ایرانی قحط کا تذکرہ کیا ہے کہ
ب ایک زبردست ہوائی طوفان کی مدد سے Lecanora
affi نام کی لائی کن کئی سو میل کی دوری سے اڑتی ہوئی
زدہ علاقہ میں اس طرح برسی اور جمع ہوگئی کہ زمین پر اس
تہیں جم گئیں۔ وہاں کی باشندوں نے جو لائی کن کی غذائی
خوبی سے خوب واقف تھے' خدا کی اس آسمانی رحمت و نعمت
کا شکر ادا کیا اور اس کی روٹیاں کھا کر فاقہ کشی سے بچ گئے۔
مولڈنکے نے من کی ایک تیسری قسم بھی بیان کی ہے جس کو
الگی (Algae) کہتے ہیں۔ یہ رات میں شبنم کے ساتھ زمین
پر نمودار ہوتی تھی اور صبح کو جمع کر لی جاتی تھی۔ جو بچ جاتی وہ
سورج کی گرمی کی تاب نہ لاکر ختم ہوجاتی تھی۔

مولڈنکے کے خیال میں من کا صرف میٹھی چیز ہونا
اس لئے ممکن نہیں کیوں کہ بیس لاکھ انسانوں کے لئے کم از
کم دو ہزار ٹن من درکار ہوگا اور اتنی مقدار کسی ایک علاقہ
سے حاصل کرنا ناممکن رہا ہوگا۔ مزید یہ کہ چالیس سال تک
لائی کن کی شکل میں من کا تیز ہواؤں کی مدد سے متواتر مہیا
ہونا بھی سمجھ میں آنے والی بات نہیں ہے۔ اسی طرح الگی
کے روپ میں من کا ہر موسم میں پیدا ہونا قرین قیاس نہیں۔
انہیں وجوہات کی بنا پر مولڈنکے نے اپنی رائے ظاہر کی کہ
پورے امکانات اس بات کے ہیں کہ بنی اسرائیل من کے
ساتھ بٹیوں کا گوشت بھی بھون کر کھاتے ہوں۔ کیوں کہ وہ
علاقہ بٹیوں کے لئے مشہور تھا۔ مولڈنکے نے اگر قرآنی آیات
کا بھی مطالعہ کر لیا ہوتا تو "من و سلوی" کا نظریہ قائم کرنے
میں دقت نہ ہوتی۔ یہاں ایک بات کی وضاحت ضروری ہے۔
وہ یہ کہ قرآن شریف کے ارشادات سے یہ تو ثابت ہوتا ہے
کہ یہ دونوں غذائی اشیاء (من و سلوی) اسرائیلیوں کے لئے
عام تھیں لیکن یہ کسی اور غذا کی نفی کو مستلزم نہیں (تفسیر
ماجدی) چنانچہ ہو سکتا ہے کہ شیریں من یعنی ترنجبین کے علاوہ
لائی کن اور الگی بھی ان کی غذا رہی ہو یا پھر اور بھی دوسری
اشیاء جو ان کو سفر میں میسر آتی ہوں۔ یہ بھی قیاس کیا جا سکتا
ہے کہ ہر وہ کھانے والی شئے جسے انہوں نے پہلی بار صحرا سینا
میں دیکھا ہو اس کو انہوں نے من کا نام دیا ہو کیوں کہ سامی
عبرانی اور عربی زبان میں من کے معنی "کیا" یا "کون" کے
بھی ہیں گویا کہ جب انہوں نے نئی چیز دیکھی تو حیرت سے کہا
"من" رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد کی

روشنی میں بھی من کا ایک سے زیادہ قسم کی چیز ہونا ثابت ہوتا ہے۔ ایک حدیث کے مطابق آپ نے من کو الکماۃ فرمایا ہے جس کے معنی اردو میں کھمبی اور انگریزی میں (Mushroom) کے ہیں کچھ خاص قسم کی کھمبی کا غذائی طور سے استعمال بہت سے ممالک میں ہمیشہ سے ہوتا رہا ہے سائنسی اعتبار سے کھمبی لائی کن اور اگی کا قریبی تعلق ہے۔ مختصر یہ کہ بنی اسرائیل کے لئے برسہا برس جو غذا فراہم کی جاتی رہی اس میں شیریں گوند' کھمبی' لائی کن' (جو کاربوہائیڈریٹ کا ذریعہ ہیں) کے ساتھ بٹیوں (حیاتین اور چربی کا ذریعہ) شامل ہوتی تھیں جو سائنسی اعتبار سے ایک مکمل غذا ہے اور اسے کھا کر طویل عرصہ تک زندہ سلامت رہنا عین ممکن ہے۔

ترنجبین اور گزنجبین کے علاوہ دنیا کے مختلف ممالک میں درجنوں ایسے پودوں کی جنس (genus) اور ذاتیں Species پائی جاتی ہیں جن سے شیریں گوند حاصل کیا جاتا ہے یہ سب انگریزی اصطلاح میں (manna) کہلاتے ہیں۔ مثلاً جنوبی یورپ کا مشہور پودا Fraxinusornus جس سے تجارتی من حاصل کیا جاتا ہے اس کا اصل مرکز سسلی (Sicily) کا وہ پہاڑی خطہ ہے جو جبل من (Gibleman) کہلاتا ہے کچھ سائنسدانوں نے اس من کو بھی بائیبل کا من لکھا ہے۔ اسی طرح ایران میں Cotoneaster Nummularia نام کا پودہ چٹانوں پر پایا جاتا ہے جس سے بہت شیریں گوند نکلتا ہے اور چٹان پر ٹپک کر جم جاتا ہے۔

اسی لئے اسے "شیر خشت" یعنی پتھر کا دودھ کہتے ہیں

ایران ہی میں ایک اور من کی قسم پیدا ہوتی ہے ج Axtragalus adscendens نامی پودوں پر ملتی ہے اسی جنس کے پودے سے کتیرہ (Tragacanth) گوند دستیاب ہوتا ہے Quercus incana نام کا درخت بھی من کا ذریعہ ہے : عراق میں کافی پایا جاتا ہے ہندوستان میں مدار alotropis Gigantea سے کسی زمانہ میں سکرتگال نامی من حاصل ہوتا تھا جو اب بازاوں کمیاب ہے۔ کچھ لوگ بانس کے درختوں Bambus arundinacea سے حاصل کردہ شیریں بنس لوچن"اردو تباشیر کو بھی من کہتے ہیں جو درست نہیں ہے۔ آسٹریلیا میں ایک درخت کافی پایا جاتا ہے جس کا نا Mayoporum Playtycaruim ہے۔ یہ بھی من کا خاص اچھا ذریعہ مانا جاتا ہے۔ زیتون کے درختوں پر بھی من پایا جاتا ہے۔

عام گوند (gums) خواہ ببول کے ہوں یا کتیرہ یا صمغ عربی میٹھے نہیں ہوتے اور کیمیاوی اعتبار سے polysccharide کے زمرہ میں آتے ہیں جبکہ من ترنجبین گزنجبین شیر خشت وغیرہ Monosaccharide کا ذریعہ ہوتے ہیں یعنی ان میں فرکٹوز (Fructose) گلوکوز (Glucose) ملی زی ٹوز (Melizitose) ڈلسی ٹال (Dulcitol) اور منی ٹال(Mannitol) نام کی شکر ہوتی ہیں اس طرح گوند اور من دونوں ہی کاربوہائیڈریٹ ہیں' لیکن غذائی اعتبار سے گوند کی خاص اہمیت نہیں ہے جب کہ من بنام ترنجبین میں بھرپور غذائیت پائی جاتی ہے۔

احمد مجتبیٰ قریشی ☆

چیونٹی

عام طور پر یہ بات کہی جاتی ہے کہ ایک چیونٹی ہاتھی کو مار ڈالتی ہے۔ تشریحاً اس کو یوں بیان کیا جاتا ہے کہ چیونٹی ہاتھی کی سونڈ میں داخل ہو کر جگہ جگہ کاٹ لیتی ہے جس کے سبب سوجن پیدا ہوجاتی ہے اور ہاتھی بیمار پڑجاتا ہے جسم میں زہر پھیل جاتا ہے اور جانوروں میں سب سے گراں ڈیل ڈول اور طاقت ور جانور ایک انتہائی حقیر اور معمولی سی چیونٹی کے ذریعے مارا جاتا ہے۔ ممکن ہے اس میں مبالغہ محسوس ہو لیکن چیونٹی جو بظاہر ایک انتہائی حقیر مخلوق نظر آتی ہے۔ اپنے عزم حوصلے، طاقت، فہم، ادارک، تجسس دوربینی اور دور اندیشی جیسی خصوصیات کی بنا پر بڑے صناعوں اور کاریگروں کو ورطہ حیرت میں ڈال دیتی ہے۔ جہاں ایک طرف اس کی ذہانت و فطانت قابل تعریف ہے تو دوسری جانب اس کا آپس میں اتحاد و اتفاق ہم انسانوں کو دعوت فکر دیتا ہے کہ ہم ایک چھوٹے سے جانور کی زندگی سے سبق حاصل کریں۔

دنیا کے ہر ملک اور ہر حصے میں چیونٹی پائی جاتی ہے اس کی کئی قسمیں ہیں اب تک دریافت کے اعتبار سے ان کی اقسام کی تعداد چھ ہزار سے بھی زائد ہے۔ یہ بہت چھوٹی اور بعض انگلیوں کے برابر موٹی ہوتی ہیں اور جہاں بھی رہتی ہیں جتھوں کی شکل میں رہتی ہیں۔ اس طرح رہنے پر یہ اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں اتحاد کس حد تک موجود ہوتا ہے چیونٹیاں گرم ممالک میں بہت بڑی تعداد میں اور سرد ممالک میں کم تعداد میں پائی جاتی ہیں گوکہ ہر ممالک میں کم وبیش پائی جاتی ہیں۔ چیونٹیاں مختلف رنگوں کی مثلاً سفید، سیاہ، سرخ، زرد اور بھوری ہوتی ہیں اور ان میں کچھ کاٹنے والی اور کچھ بغیر کاٹنے والی ہوتی ہیں۔ ان کے بہت سے ایسے عضو ہیں جن کا استعمال یہ کئی کئی کاموں میں کرتی ہیں اور کوئی بھی ایسا عضو نہیں جو کام کا نہ ہو۔ غور کریں تو ہم دیکھیں گے کہ وہ اپنے بلوں سے نکل کر غذا کی تلاش و جستجو میں کافی دور تک چلی جاتی ہیں لیکن سورج غروب ہونے سے پہلے اپنے گھروں کو لوٹ آتی ہیں چیونٹیاں ایک قطار میں ایک دوسرے سے ملتے ہوئے اور تیز رفتار سے چلتی ہیں۔ ان کی طاقت کا اندازہ کرنا بہت مشکل نہیں آپ نے اکثر دیکھا ہوگا کہ چیونٹی اپنے سے کافی وزنی چیز کو باسانی کھینچتی ہے ان کے کھینچنے کا طریقہ بھی عجیب وغریب ہے وہ اپنے شکار کو کبھی ایک طرف سے تو کبھی دوسری طرف سے اس طرح اس وزنی چیز کو ہر طرف سے کھینچ کر یہ جاننا چاہتی ہے کہ کدھر سے کھینچنے پر وزن ہلکا پڑتا ہے پھر اسی طرف سے کھینچنا شروع کرتی ہیں اس سے ان کے جبڑے کی مضبوطی کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

سر، سینہ، اور معدہ، چیونٹی کے جسم کے تین حصے ہیں، دوسرے اعضاء جو چیونٹیوں میں پائے جاتے ہیں مثلاً آنکھ، ہونٹ، جبڑے، ناک، کان، سینگ، کمر اور پیر وغیرہ ان تینوں حصوں سے وابستہ ہوتے ہیں چیونٹیوں کی دو چمکیلی چھوٹی چھوٹی آنکھیں دو ہونٹ دو جبڑے دو باریک تیز سنہرے سینگ اور چھ پیر ہوتے ہیں ان تمام اعضا کا کام بھی مختلف ہوتا ہے ظاہر

☆ اسسٹنٹ ایڈیٹر ماہنامہ تہذیب الاخلاق اور فشانت، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

ہے کہ آنکھ ہے تو دیکھنے کا کام ہی کرتی ہے لیکن اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی چھوٹی چھوٹی چمکیلی آنکھوں کی بینائی تیز ہوتی ہے جس کی مدد سے یہ دور تک اپنے شکار کو دیکھ لیتی ہے اور مضبوط جبڑے ہونے کی وجہ سے یہ وزنی سے وزنی چیز کو کھینچ لے جانے میں کامیاب ہوجاتی ہے چیونٹیاں اپنی دونوں سینگوں کی مدد سے آپس میں بات چیت کرتی ہیں اور یہی سینگ کان ناک کا بھی کام کرتے ہیں اور انہیں کی مدد سے اپنے جسم کو اور بلوں کو صاف ستھرا رکھتی ہیں ان میں احساس کرنے کی قوت بھی ہوتی ہے جب چیونٹیاں چلتی ہیں تو تمام عضو حرکت کرتے رہتے ہیں۔

چیونٹی بھی کچھ خاص قسم کے کیڑے پال کر رس حاصل کرتی ہیں۔ یہ شہد کا لالچ دلاکر ان کیڑوں کو اپنے بلوں میں لے جاکر قید کر لیتی ہیں اور ضرورت کے مطابق ان کیڑوں سے رس حاصل کرتی ہیں۔ چیونٹیاں اپنے بلوں کے اندر ایک خاص قسم کی چار دیواری بناتی ہیں ان چار دیواریوں کے بیچ ان کیڑوں کو رکھتی ہیں اور دوسرے کیڑے مکوڑے سے ان کی حفاظت کے لئے چیونٹیاں تعینات کر دی جاتی ہیں۔ ان کیڑوں کے کھانے پینے کا انتظام اسی طرح کرتی ہیں جس طرح وہ اپنے اور اپنے بچوں کے لئے کرتی ہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وہ اپنے انڈوں کے ساتھ ساتھ ان کے انڈوں کی بھی دیکھ بھال کرتی ہیں جب کہ چیونٹیاں اپنی فطرت کے تحت دوسروں کے انڈوں کو نہیں چھوڑتیں لیکن یہاں اس کے برعکس ہے کہ وہ ان کی طرف بری نگاہ سے بھی نہیں دیکھتیں چیونٹیاں ان کے بچوں کو دھوپ دکھانے کے لئے بلوں سے باہر لے جاتی ہیں اور دشمنوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ان کو اپنے اوپر بیٹھائے ادھر ادھر پھرتی ہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر حفاظتی انتظام میں کسی دشمن کی طرف سے مداخلت ہوتی ہے یا انہیں اپنا نقصان ہونے کا احساس ہوتا ہے تو وہ حملے کے لئے تیار ہوجاتی ہیں چیونٹیاں رس لینے کے لئے اپنے سینگوں کا استعمال کرتی ہیں اس کی مدد سے کیڑوں کو تھپک تھپک کر رس نکالتی ہیں۔ اس کے علاوہ چیونٹیوں کے بلوں میں اور بھی دوسرے قسم کے کیڑے پائے جاتے ہیں جو ان کے کسی نہ کسی کام میں آتے ہی ہوں گے۔ اس طرح دیکھا گیا ہے کہ جس طرح انسان اپنے لئے دودھ یا دوسری ضرورت کے لئے جانوروں کو پالتا ہے اسی طرح چیونٹیاں بھی اپنی ضرورت کے لئے کیڑے کوڑے پالتی ہیں۔ ان کے بہت سارے کام تقریباً انسانوں سے ملتے جلتے ہیں۔

چیونٹیاں جب کسی دشمن پر حملہ کرتی ہیں تو ایک ساتھ اور بہت بڑی تعداد میں کرتی ہیں جس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ دشمن یا تو شکست تسلیم کر لے یا مرنے مارنے کو تیار ہوجائے ایسی صورت میں بھاگ کھڑا ہونا ہی زیادہ مناسب ہوتا ہے' مثال کے طور پر آپ نے دیکھا ہوگا کہ شریر بچے اپنے ہی دوسرے ساتھی کو کسی بہانے سے اس جگہ پر کچھ دیر کے لئے کھڑا کر دیتے ہیں جہاں چیونٹیوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے چند لمحے بعد چیونٹیاں اس بچے کے پیر کے سہارے اوپر چڑھ کر کاٹنا شروع کر دیتی ہیں۔ یہ حملہ اتنا شدید ہوتا ہے کہ بچہ رونا دھونا شروع کر دیتا ہے اور جلن کی شدت کو برداشت نہیں کر پاتا جس کے سبب وہ اپنے پیروں کو ملنے یا کھجلانے لگتا ہے اس عمل سے پیر سرخ اور سوج جاتا ہے اسی کی وجہ سے بچہ کو بخار بھی آجاتا ہے۔ دوسری مثال سانپ کی ہے۔ بڑے سے بڑا سانپ چیونٹیوں کے حملے سے بہت گھبراتا ہے کیوں کہ ان کا حملہ چاروں طرف سے ایک ساتھ ہوتا ہے چیونٹیاں اپنے مضبوط جبڑوں کی مدد سے ان کے کھال اور گوشت کو نوچ ڈالتی ہیں۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس شدید حملے کی تاب نہ لاکر سانپ چند لمحوں بعد مرجاتا ہے اور اگر بچ بھی گیا ہو تو اس کے زخم میں سڑن پیدا ہوجاتی ہے اور سانپ مرجاتا ہے۔

چیونٹیوں میں طاقت بے پناہ ہوتی ہے یہ اپنی طاقت کا استعمال ضرورت کے مطابق کرتی ہیں۔ ان کی طاقت کا اندازہ بخوبی تجربہ کرکے لگایا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ ایک مکھی کا وزن اور ایک چیونٹی کا وزن نکال لیں۔ اس عمل

سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مکھی کا وزن چیونٹی کے وزن سے کئی گنا زیادہ ہے۔ مزید تجربے کے لئے مری ہوئی مکھی کو اس جگہ پر رکھ دیں۔ جس طرف سے چیونٹیوں کا آنا جانا لگا ہو چند لمحوں بعد آپ دیکھیں گے کہ چیونٹی مکھی کو کھینچنے کے لئے وہاں پہنچتی ہے پہلے وہ مکھی کے چاروں طرف گھومتی ہے پھر وہ اسے پکڑ پکڑ کر کھینچ کھینچ کر یہ جاننے کی کوشش کرتی ہے کہ کس طرف سے کھینچنے پر وزن میں کمی کا احساس ہوتا ہے چیونٹی اس حصے کو پکڑ کر کھینچنا شروع کرتی ہے اس کام کو کرتے وقت ان کی رفتار میں بہت معمولی فرق ہوتا ہے بلکہ وزن کی مناسبت سے دیکھیں تو یہ فرق نہ کے برابر ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ چیونٹی وزن میں کم ہونے کے باوجود اپنے وزن سے کئی گنا وزن کی چیز باسانی کھینچ لے جاتی ہے۔ یہ تجربے ان کی طاقت کو ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں۔

چیونٹی کا دماغ ایک نقطہ کے برابر ہوتا ہے لیکن ان کی ذہانت اس حد تک ہوتی ہے کہ انسانوں کو بھی تعمیر و ہنر میں پیچھے چھوڑ جاتی ہیں وہ بغیر کسی اوزار کی مدد کے اپنے رہنے کے لئے عالی شان مکان زمین کے اندر بناتی ہیں اور غذا کی تلاش میں دور دراز کا سفر بھی کرتی ہیں اور وہ اپنے انڈوں بچوں کو دھوپ دکھانے کے لئے باہر لاتی ہیں وہ اپنے انڈوں بچوں اور اپنی اور اپنے گھروں کی حفاظت خود دشمنوں سے کرتی ہیں اور اپنے ساتھیوں کی مدد کرتی ہیں۔

اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ چیونٹی ایک ایسی دنیا اپنے لئے تعمیر کرتی ہے جس میں اتحاد و اتفاق، نظم و ضبط، امن و امان کی فضا قائم کرتی ہے اور سکون و آرام، پیار محبت، اور خوش حالی کے ساتھ زندگی بسر کرتی ہے۔ دیکھا آپ نے ہم انسان جس جانور کو معمولی اور حقیر چیز میں شمار کرتے ہیں وہ ہم انسانوں کے لئے کس قدر عبرت کی چیز ہے چیونٹیاں اپنے جتھوں میں جس اتحاد و اتفاق سے رہتی ہیں کیا وہ انسانوں کے لئے باعث عبرت نہیں۔ ہم انسان ایک دوسرے کا خون بہانے سے دریغ نہیں کرتے لیکن چیونٹی اپنی ذمہ داری محسوس کرتی ہے کہ اگر کوئی چیونٹی کا لگاتار کام کرتے رہنا، اپنی طاقت سے زیادہ کام کرنا ایک دوسرے کی خبر و خبر دریافت کرتے رہنا قابل عبرت نہیں ہے۔ امید ہے کہ ایک حقیر سمجھی جانے والی چیز بہت سے انسانوں کے لئے عبرت کے قابل چیز بن جائے گی۔

باقی 'اردو میڈیم اسکولوں کا معیار تعلیم'

اب وقت کا حکم ناطق یہی ہے
جو کچھ ہے دنیا میں تعلیم ہی ہے

حالی

مولانا ابوالکلام آزاد کا قول ہے کہ آدمی ساری عمر اس سوچ میں گذار دیتا ہے کہ اس کو کوئی اچھا کام کرنا چاہئے۔ آج کل میں وقت گذر جاتا ہے۔ وہ لوگ قابل احترام ہیں جو منزل پر گامزن ہونے کے لئے پہلا قدم آگے بڑھاتے ہیں۔ لیکن یہ پہلا قدم بھی اٹھانے والے کتنے ہیں۔ اقبال کی نظم "چاند تارے" میں تارے چاند سے پوچھتے ہیں کہ اس سماں کی ہر شئے کیوں بے تاب ہے۔ چاند، تاروں کو اس زمین پر زندگی کے رازہائے سربستہ بتلاتا ہے۔

جنبش سے ہے زندگی جہاں کی
یہ رسم قدیم ہے یہاں کی
اس رہ میں مقام بے محل ہے
پوشیدہ قرار میں اجل ہے
چلنے والے نکل گئے ہیں
جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں

اقبال کا یہ پیام ہم سب کے لئے ہے۔

(کمانڈر) ایس۔ این۔ اے فردوسی ☆

بازگشت

(گذشتہ سے پیوستہ)

یہ ذکر ۴۹-۱۹۴۸ء کا ہے اس وقت امتحانات تحریری ہوا کرتے تھے۔ آبجکٹو (objective) طرز امتحان کو ابھی شروع نہ کیا گیا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ اگر کسی امتحان میں ۲۰-۲۵ ہزار طلبہ شریک ہوتے تو بمشکل ۵۰۰ر طلبہ کی فرسٹ ڈویژن آپاتی۔ سیکنڈ ڈویژن میں بھی پاس کرنا بڑی بات سمجھی جاتی تھی۔ تھرڈ ڈویژن والوں کو بھی کہیں نہ کہیں داخلہ مل ہی جاتا تھا۔

خاکسار کے ماموں زاد بھائی علی حمزہ کاظمی لکھنؤ کرسچین کالج کے طالب علم تھے اور علم معدنیات (geology) پڑھتے تھے۔

بہر حال بھائی کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کرتے ہوئے خاکسار نے بھی یہ طے کیا کہ وہ بھی علم معدنیات میں ہی داخلہ لے گا۔ غیر یقینی حالات کے باعث بعض لمحات ایسے بھی آئے جب کہ سوچنا پڑا کہ کیا تعلیم کا یہ سلسلہ جاری رکھنا ممکن بھی ہوسکے گا کبھی یہ خیال بھی آیا کہ کہیں ایسی جگہ داخلہ لیا جائے جہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ کچھ کمائی کا ذریعہ بھی نکل سکے چنانچہ اسی سلسلہ میں کلکتہ پہنچ کر رپن کالج میں داخلہ کی کوشش کی۔ اتفاق سے ہم ایک دن تاخیر سے پہنچے۔ جیولوجی کے سکشن کی تمام نشستیں پر ہوچکی تھیں۔ لہٰذا دو ایک دن رک کر واپس ہولئے۔ گھر والوں سے پھر مشورے کیے اور بالآخر پھر یہی طے پایا کہ اپنی پرانی مادر درسگاہ میں داخلہ لیا جائے جہاں تقریباً سارے ہی بزرگوں نے زانوئے ادب تہ کیے تھے۔ چنانچہ علی گڑھ کی روانگی کا ارادہ پختہ کر لیا۔ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس سوچ بچار میں کافی وقت نکل چکا تھا۔ ہر جگہ داخلے مکمل ہو چکے تھے۔ ستمبر کا مہینہ آگیا تھا اور اب داخلہ صرف علی گڑھ میں ہی ممکن تھا۔ نانا صاحب مرحوم کے ایک جگری دوست جو ڈپٹی مجسٹریٹ تھے ان کے صاحبزادے سید مرتضیٰ بلگرامی اے۔ ایم۔ یو۔ میں سیکنڈ ایئر میں پڑھتے تھے۔ وہ آرہے تھے۔ مجھے بھی ان کے ہمراہ روانہ کر دیا گیا۔ سامان کی تیاریاں تو پہلے سے ہی تھیں کوئی دقت نہ ہوئی۔ اس زمانے میں جنتا ایکسپریس نئی نئی نکلی تھی۔ اس وقت تک گاڑیوں میں فرسٹ کلاس' سیکنڈ کلاس انٹر کلاس اور تھرڈ کلاس ہوا کرتا تھا۔ جنتا ایکسپریس پہلی گاڑی تھی جو پوری کی پوری تھرڈ کلاس تھی مگر اس کے تھرڈ کلاس کے ڈبوں کی بھی شان نرالی تھی۔ گارڈ سے لے کر انجن تک سارے ڈبے آپس میں اندر سے ملے ہوئے تھے۔ گاڑی کے درمیان ڈائننگ کار ہوتی تھی جہاں پر ہر شخص جاکر کھا پی سکتا تھا اور پھر اپنی سیٹ پر لوٹ آتا۔ کلکتہ سے چلنے کے بعد یا دلی سے روانہ ہونے کے بعد یہ گاڑی جہاں بھی شام کو پہنچتی وہاں اس کے آخر میں ایک اسپیشل ڈبہ سنیما کا لگا دیا جاتا۔ ہر وہ مسافر جو اس ٹرین میں سفر کر رہا ہوتا' چار آنہ کا ٹکٹ لے کر پوری فلم دیکھ سکتا تھا۔ رات بھر میں تین شو ہوتے۔ دلی آنے والی گاڑی میں سنیما کا ڈبہ کانپور سے لگتا۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ یہ ڈبے بالکل نئی طرز کے تھے یعنی ہر ڈبے میں لکھا ہوتا کہ

☆ پبلک ریلشنز آفیسر' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۵۷ مسافروں کے بیٹھنے کے لئے اور ۵۷ مسافروں کے سونے کے لئے۔ یعنی تھری ٹائر کے ڈبے جو پہلی بار لگائے گئے تھے ہر اسٹیشن پر لوگ خاص طور سے اس گاڑی کو دیکھنے آتے۔

ہم اسی گاڑی سے علی گڑھ صبح ۹ بجے پہنچے۔ یہی اس کا اصل وقت تھا۔ آج کے علی گڑھ اسٹیشن میں کچھ بہت زیادہ تبدیلی نہیں ہوئی دلی کی طرف جانے والے پلیٹ فارم پر صرف شیڈ بڑھ گیا ہے اور ایک نیا پل۔مین پلیٹ فارم میں بھی کوئی خاص تبدیلی نہیں۔ ہاں البتہ اس وقت کہیں کہیں مٹی کے تیل والے لیمپ بھی تھے جو اب نظر نہیں آتے درجہ دوئم کا ویٹنگ ہال اور ٹکٹ گھر بعد کی تعمیرات ہیں۔

گاڑی سے اترے۔ ہر طرف۔کالی شیروانی میں ملبوس طلبہ، لال وردیوں میں قلی اور ریلوے کا اسٹاف بھی اپنی باقاعدہ وردیوں میں موجود تھا "سلام والے کم" "سلام والے کم" سے ٹھیک سلیک ہوئی قلی نے ہمارا سامان اٹھایا۔ مرتضیٰ صاحب نے اس کا نمبر نوٹ کیا وہ ان معاملات کے بے حد پابند تھے۔ شاید UOTC کے ممبر ہونے کی باعث۔ یہی UOTC بعد میں NCC بنادی گئی۔

دل میں ایک ہلکی سی گدگدی تھی جو رہ رہ کر ہوتی جاتی تھی جو شاید ہر نو وارد کو محسوس ہوتی ہو۔ ہم باہر نکلے مرتضیٰ صاحب نے سامان ایک تانگہ پر رکھوا دیا۔ وہ وی۔ ایم ہال میں رہتے تھے۔ مجھے دودھ پور مرحوم خان بہادر ایس۔ ایم منصور صاحب کے یہاں جانا تھا۔ خان بہادر صاحب راقم الحروف کے ماموں صاحب کے ہم جماعت تھے۔ اسی لئے خاکسار بھی انہیں ماموں ہی کہتا تھا۔ یہ بھی بہت پرانے علیگ تھے۔ تقسیم ملک کے آس پاس ریٹائر ہوئے تھے۔ ان کی زمینداری والی پرانی بات نہ رہی تھی۔ لہٰذا اپنے بچوں کو لے کر علی گڑھ آگئے اور یہیں کے ہو رہے۔ انتقال کے بعد اسی مٹو ای میں دفن کئے گئے۔ ان کے بیٹے یہیں سے تعلیم پوری کر کے اب کوئی امریکہ میں کوئی جرمنی میں اور ایک اعظم گڑھ میں ملازم ہیں۔

ہمارا تانگہ گھومتا گھماتا دودھ پور پہنچا۔ منصور ماموں کو ہمارے آنے کی اطلاع پہلے سے تھی۔ وہ ہمارے منتظر تھے۔ ہمارا سامان وہاں اتار لیا گیا اور مرتضیٰ صاحب اپنا سامان لے کر وی۔ ایم ہال کی جانب روانہ ہو گئے۔

۲ بجے کے قریب مرتضیٰ صاحب پھر آئے۔ فارم اور پراسپکٹس میرے پاس پہلے سے تھا جو بھرا جاچکا تھا۔ اسی زمانہ میں طلبہ سے یہ بھی پوچھا جاتا تھا کہ آپ کس ہال اور کس ہاسٹل میں داخلہ لینا چاہیں گے۔ اس زمانہ میں آفتاب ہاسٹل کی بڑی دھوم تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ یہ سنگل سیٹڈ (ہر کمرہ ایک ایک طالب علم کے لئے) ہوسٹل تھا۔ مگر اس کے ملنے کی شرط یہ تھی کہ یا تو آپ ریسرچ کر رہے ہوں یا ایم۔ اے۔ ایم۔ ایس۔ سی کے فائنل ایئرمیں ہوں یا آپ فرسٹ ڈویژن میں پاس ہوئے ہوں۔ جونیئر ہونے کے باوجود چونکہ آخری شرط پوری ہورہی تھی اس لئے ہمت کر کے فارم میں آفتاب ہاسٹل ہی بھر دیا۔

اس وقت کے داخلے بھی خوب تھے۔ آج سوچو تو عجیب سا لگتا ہے اور پھر آج کے ماحول سے اس کا موازنہ کیا جائے تو ایسا محسوس ہوگا کہ یا تو وہ خواب تھا یا یہ کوئی خوفناک خواب ہے۔

طلبہ(نووارد) اپنے اپنے فارم لے کر اپنے کسی سینیئر کے ساتھ باقاعدگی سے لائینوں میں اسٹریچی ہال میں داخل ہوتے اور اپنے اپنے مضمون کے اعتبار سے اپنے اپنے ڈینوں کے سامنے جاتے ۔ ہر ڈین ہر طالب علم کو دیکھتا اس سے سوال کرتا اس کے کاغذات دیکھتا اور اگر مطمئن ہو جاتا تو پرووسٹوں سے درخواست کرتا کہ اس کو کسی ہاسٹل میں داخلہ دے دو۔ یہ سارے ڈین سارے پرووسٹ' رجسٹرار' آفس کا عملہ جو اس زمانہ میں داخلوں اور امتحانات کے کام بھی کرتا تھا اور برسر(پیسوں کے لین دین کے لئے) سب کے سب اسی اسٹریچی ہال میں جمع ہو جاتے اور نیم دائرہ کی شکل میں بیٹھ جاتے۔ طالب علم ایک طرف سے داخل ہوتا اور باری باری

سے سارے کام پورے کرواتا ہوا جب وہ دوسری طرف سے نکلتا تو اس کے سارے کام پورے ہو چکے ہوتے اور اس کے ہاتھ میں ایک سلیپ کھانا جاری کروانے کی اور دوسری کلاسوں میں نام چڑھوانے کی ہوتی۔ ہال اور ہاسٹل بھی وہیں طے ہو جاتا البتہ کمرہ اس وقت الاٹ نہ ہوتا بلکہ نوواردان کو شروع شروع میں ایک جگہ رکھا جاتا اور داخلے پورے ہوجانے کے بعد فائینل الاٹمنٹ کیا جاتا۔

خاکسار کو چونکہ سائنس میں داخلہ لینا تھا لہٰذا ڈین فیکلٹی آف سائنس کے سامنے پیشی ہوئی۔ اس وقت سائنس کے ڈین کرنل حیدر مرحوم تھے۔ انہوں نے کاغذات کو دیکھا مارک شیٹ دیکھی دیگر اسناد (کھیل کود' ڈرامہ' اسکاوٹنگ وغیرہ) بھی دیکھیں اور خوش ہوئے۔ بات چیت انگریزی میں ہی شروع کی۔ سوالوں کے جواب یہ خاکسار بھی اپنی استطاعت کے مطابق دیتا رہا۔ مرحوم کا سوال تھا کہ تم آفتاب ہوسٹل میں داخلہ کیوں چاہتے ہو۔ جس کا جواب خاکسار نے یہ دیا کہ چونکہ وہاں کے کمرے سنگل سیٹڈ ہیں لہٰذا وہاں زیادہ سکون ملے گا اور پڑھائی اچھی ہوسکے گی۔ آپ نے فرمایا کہ میرے عزیز اگر یہی بات تھی تو آپ نے یہاں آنے کی زحمت کیوں گوارا کی۔ گھر پر ہی زیادہ سکون تھا۔ میں خاموش ہوگیا تو آپ نے فرمایا کہ اگر تم میرا مشورہ مانو تو میں کچھ کہوں۔ جس کے جواب میں خاکسار نے یہ کہا کہ اب مجھے کچھ نہیں کہنا آپ جو بہتر سمجھیں فیصلہ فرما دیں۔ اس پر کرنل صاحب نے بڑی ہمدردی لیکن جوش سے فرمایا کہ دیکھو یہاں کبھی اپنے بھائی کے ساتھ نہ ٹھیرو۔ ہوسکے تو محلے والے کے ساتھ نہیں یہاں تک کہ اپنے شہر اپنے صوبہ اور اگر ممکن ہو تو اپنے ملک والے سے بھی الگ رہو اور اپنا پارٹنر کسی غیر ملکی کو بناؤ جس سے تم کچھ سیکھو اور اسے بھی اپنے کلچر سے آشنا کراؤ تاکہ وہ جب یہاں سے جائے تو ایک دوسرا انسان بن کر جائے اور تم بھی جب گھر لوٹو تو بہت کچھ تجربے لے کر لوٹو۔ یہی ایک علیگ کی شان ہے۔ (باقی آئندہ)

گوشۂ قارئین

مکرمی۔ بارِ خاطر نہ ہو تو چند معروضے گوش گذار کرنا چاہتا ہوں۔

(۱) رسالے میں کتابت کی غلطیاں نہیں ہونی چاہئیں۔ انگریزی الفاظ اردو نثر کے درمیان لکھے جاتے ہیں تو ان کا املا ضرور دیکھ لیا جائے۔ مثلاً شمارہ زیرِ نظر (بابت مئی، جون ۱۹۹۴ء) کے صفحہ ۳ پر Preamble کے بجائے Preamable چھپا ہے۔

(۲) کتابت کروانے وقت یا کمپیوٹر کی کمپوزنگ میں بھی الفاظ کی صرفی حالت کا خیال رکھنا از حد ضروری ہے۔ لفظ کے بعد حروفِ صغیرہ آئیں تو لفظ کی صرفی حالت بدل جاتی ہے۔ کلکتہ اس کے ساتھ کا، کے، میں، سے، وغیرہ وغیرہ کوئی بھی لفظ آتا ہے تو کلکتہ 'کلکتے' لکھا جائے گا۔

(۳) لیے، کیے، دیے، پیے، لیجیے وغیرہ کو ہمزہ کے بجائے ے (یا) سے لکھا جائے تو مناسب ہے۔ لیے (بجائے لئے)، کیے، دِیے، پیے، لیجیے وغیرہ۔ یہ املا "رشید حسنی" ہے اور اتباع کے قابل ہے۔

ہم اگر رسالے میں کوئی غلطی کرتے ہیں تو عام پڑھنے والا اسی کو صحیح سمجھتا ہے۔ علم اور سائنس کے ساتھ صحتِ زبان کو عام کرنا بھی از حد ضروری ہے۔

صفحہ ۶۱: مرحوم پروفیسر نور الحسن بتّے بھائی (سجاد ظہیر) کے بھانجے تھے تو وہ سرو زیر حسن کے نواسے ہوئے، پوتے کیسے ہوئے؟

نجم الثاقب شحنہ۔ آثار، یادگیر۔ ۵۸۵۲۰۱

مکرمی! ماہِ رواں کے "تہذیب الاخلاق" کا تازہ شمارہ آپ کی عنایتِ بے نہایت سے ہمدست ہوا، جریدۂ ہٰذا کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔ "گذارشِ احوال واقعی" اور "اعتذار" نے بطورِ خاص متاثر کر کے اظہارِ رائے پر فی الفور مجبور کیا۔

"تہذیب الاخلاق" کے مضامین کی انفرادیت، مباحث کی افادیت، مشمولات کی جامعیت، فکر و فن کی مقصدیت، ترتیب و تہذیب کی جدت کا خوب آئینہ دار پایا! مختصر حجم کے اس رسالے میں ادب و تنقید، شخصیت و فن، تہذیب و اخلاق، معاشرت و معیشت، مذہب و مسلک، طریقت و شریعت غرض کہ ایک ذوق آشنا قلب اور حسن پرست نظر کے لیے اس ارمغانِ سرسید میں کس شئے کی کمی ہے؟

"تہذیب الاخلاق" کو زیادہ ہر دلعزیز، مقبول بنانے کے لیے اس میں قارئین کے گرامی نامے، ایک آدھ خالص ادبی مقالہ، احوال جامعہ علی گڑھ نیز اردو سے متعلق عالمی احوال و کوائف کو بھی شرفِ باریابی دیں تا کہ سرسیدؒ کے خوابوں، تمناؤں اور آرزوؤں کا یہ قدیم و عظیم "تہذیب الاخلاق" صحیح معنوں میں اسم بامسمیٰ بن سکے! راقم فنِ کتابت کے اسرار و رموز کا عرصہ سے رمز شناس ہے اس لیے "تہذیب الاخلاق" میں کتابت و طباعت کی خامیوں کو دیکھ کر افسوس ہوا۔ "فقط" جلی عنوان اور ذیلی عنوانات اپنے حقیقی حسن سے محروم ہیں۔ مسطر کے مطابق کتابت ہونی چاہیے! کاتب کے کرتبوں پر روک لگائیے!

خالد حسین خاں شعبۂ اردو۔ میرٹھ یونیورسٹی۔ میرٹھ

"نئے مدیر کے ہاتھوں میں آتے ہی حسبِ سابق رسالہ میں بعض تبدیلیاں بھی آئی ہیں۔ ٹائٹل کور بالکل سادہ ہوگیا ہے جس پر رسالہ کا نام، ادارہ کا نام ماہ وسال اور یونیورسٹی کا مونوگرام ہے۔ طباعت کتابت کے روایتی طریق کار کے بجائے کمپیوٹر سے ہونے لگی ہے۔ اداریہ سے ایک بیدار مغزی اور کشادہ ذہنی کا احساس ہوتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نئے ایڈیٹر آے دن ہمارے معاشرہ کو پیش آنے والے مسائل و معاملات کو سنجیدگی اور ایمانداری کے ساتھ تہذیب الاخلاق کے پلیٹ فارم سے موضوع بحث بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہے کہ قاری کا حصہ "دور کا جلوہ" پر عمل کرنے کے بجائے قارئین کو بھی اس سوچ بچار کے عمل میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔ اب یہ قارئین کی ذمہ داری ہے کہ اپنے حق کا کتنی سنجیدگی اور ایمانداری سے استعمال کرتے ہیں اور کتنا اپنی انا کی تسکین کا۔ زیرِ نظر شمارہ میں جن مسائل پر اور جس طرح روشنی ڈالی گئی ہے اس سے زیادہ گہرائی کے ساتھ روشنی ڈالنے کی ضرورت تھی۔ یہ بات اس لیے عرض کرنی پڑ رہی ہے کہ (۱) موجودہ ایڈیٹر، اِن مسائل پر زیادہ گہرائی کے ساتھ سوچنے کے اہل ہیں۔ (۲) ان ادارتی تحریروں سے ہی رسالہ کے معیار اور رخ کا تعین ہوگا۔

مضامین میں عقیدۂ معاد کی افادیت اور ہیومن جی نوم میپ (Human Genome Map) خاص طور سے اہمیت رکھتے ہیں۔ امانت سے متعلق علی طنطاوی کی تحریر بھی اچھی ہے لیکن جو بات مجھے خاص طور سے عرض کرنی ہے وہ ساٹھ ستر صفحات کے رسالہ میں شخصیات سے متعلق تین مضامین کی شمولیت ہے۔ ادارت کے نقطۂ نظر سے تو یہ مناسب ہے ہی نہیں۔ لیکن اس سے بھی اہم بات تہذیب الاخلاق کے مقصد کی ہے۔ اگر عورتوں سے متعلق چشتی صوفیا کا نقطۂ نظر چھاپنا تہذیب الاخلاق کا مقصد ہے، سوانحی خاکوں، وفیاتی تحریروں، بازگشت اور عرب ملکوں میں حصولِ روزگار کے لیے اس کے صفحات حاضر ہیں تو اس بات پر نئے سرے سے غور کرنا پڑے گا کہ اسے سرسید کے تہذیب الاخلاق کا تسلسل قرار دیا جائے یا نہیں؟ اس کا نام تہذیب الاخلاق ہونا بھی چاہیے یا نہیں؟ تہذیب الاخلاق اور دوسرے رسائل میں کوئی فرق ہونا چاہیے یا نہیں؟ دو صورتیں ہی ممکن ہیں (۱) اسے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے موجودہ ذہنی اور فکری دیوالیہ پن کا ایک حصہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے (۲) اس پر تجارتی نقطۂ نظر سے غور کیا جائے۔

بہرحال! اتنی بات تو ہمارے استاد پروفیسر مسعود عالم صاحب بھی مانیں گے کہ تہذیب الاخلاق ایک تحریک کا حصہ ہے، اس کا ایک مقصد اور نقطۂ نظر ہے اور اس کا یہ مقصد سرورق پر یونیورسٹی کے مونوگرام چھاپ کر یقیناً حاصل نہیں ہو سکتا۔

امتیاز احمد۔ تبصرہ قومی آواز

اعلان ملکیت

بنک	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
قومیت	ہندوستانی
ایڈیٹر	مسعود عالم
پرنٹر و پبلشر	مسعود عالم
پریس	علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پریس، علی گڑھ
اشاعت کی مدت	ماہانہ
مقام اشاعت	ماہنامہ تہذیب الاخلاق اور نشانت، اے ایم یو علی گڑھ

میں اعلان کرتا ہوں
کہ
مندرجہ بالا اطلاعات میرے
یقین کی حد تک
درست ہیں

۔ مسعود عالم

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۳ — اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء — شمارہ ۱۰، ۱۱

بانی : سر سید احمد خاں

سرپرست

پروفیسر محمد نسیم فاروقی

مدیر

پروفیسر مسعود عالم

نائب مدیر : احمد مجتبیٰ قریشی

اس شمارے کی قیمت	
فی شمارہ	25.00 روپے
زر سالانہ	6.50 روپے
	65.00 روپے
بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک)	30.00 امریکی ڈالر
بیرونی ممالک (عام ڈاک)	15.00 امریکی ڈالر

سرکولیشن انچارج : شفیق احمد

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اور نشانت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۰۲۰۰۲ (یو پی) انڈیا فون : 401027

بیادِ سیّدِ والا گُہر

پیش گفتار

سر سید میموریل لکچر ۱۹۹۴ء
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ڈاکٹر سید عابد حسین *

بہتر سماج کا تصور

سر سید میموریل لکچر کے لئے مدعو کیا جانا میں اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہوں۔ سر سید احمد خاں جنوبی ایشیا کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے تمام عمر اسلامی روایات اور عصر جدید کے مابین ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی وہ جن مسائل سے نبرد آزما ہوئے وہ آج بھی مسلم معاشرے میں برقرار ہیں۔ اور ان مسائل کو حل کرنے کے لئے جو راستے انھوں نے اختیار کیے تھے آج بھی ان کی افادیت بدستور ہے۔

بعض لوگوں کا نقطہ نظر ہے کہ سر سید احمد خاں نے ہندوستانی مسلمانوں کو علیحدگی پسندی کا راستہ دکھایا اور وہ لوگ ہمیں یہ باور کرانا چاہتے ہیں کہ علیحدگی پسندی آج بھی مسلمانان ہند کے نزدیک واحد قابل قبول حکمت عملی ہے۔ میری ناچیز رائے میں یہ خیال حقیقت سے بالکل بعید ہے۔ سر سید اچھی طرح جانتے تھے کہ تبدیلیوں کی جو لہر تمام ہندوستان میں پھیلی ہوئی ہے، مسلمان اس سے زیادہ دنوں تک بے تعلق نہیں رہ سکتے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج جو بعد ازاں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا پیش خیمہ ثابت ہوا، کا قیام بذات خود اس امر کا بیّن ثبوت ہے۔ اگر سر سید نے تمام عمر کسی چیز کی وکالت کی تو وہ تبدیلی معاشرہ ہے۔ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ عصر جدید کے تقاضوں کے سامنے بزدلی کے ساتھ گھٹنے ٹیک دینا مناسب نہیں ہوگا۔ بلکہ ضرورت اس بات کی ہے کہ آنے والے زمانے کے لئے ایک ایسا معاشرہ تعمیر کیا جائے جو جدید تقاضوں سے پوری قوت کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے۔

آج دنیا حیرت انگیز اور بے مثل تبدیلیوں سے گذر رہی ہے۔ یہ تبدیلیاں اقتصادیات، ٹکنالوجی اور بین الاقوامی معاملات وغیرہ ہر میدان میں واقع ہو رہی ہیں۔ تبدیلی کا یہ تیز عمل ذرائع ابلاغ اور مواصلات کے اس تیز رفتار بہاؤ کا مرہون منت ہے جو ساری دنیا میں جاری و ساری ہے۔ کسی بھی ملک یا قوم کے لئے یہ ممکن نہیں کہ نئے خیالات کی اس تبدیلی سے اپنے کو الگ تھلگ رکھ سکے۔ ہمیں یہ اعتراف ہے کہ پہلے کے علی الرغم آج افکار و نظریات کا بہاؤ مغربی یورپ، جاپان اور شمالی امریکہ کے صنعتی معاشرے سے سیدھے ہمارے معاشرے کی طرف ہے لیکن ان تغیرات کا حل یہ نہیں ہے کہ ہم بالکل لاتعلق ہو کر رہ جائیں۔ اگر ہمارے پاس صرف یہی ایک چارہ کار ہوتا، جو شبہ سے بالاتر نہیں، تو اسے بدلتی ہوئی دنیا کے خلاف ایک شکست

---

* وائس چیرمین، راجیو گاندھی انسٹی ٹیوٹ فار کن ٹیمپریری اسٹڈیز، نئی دہلی

نوٹ : سر سید میموریل لکچر ۱۹۹۴ کا اردو ترجمہ پروفیسر شان محمد، ڈائریکٹر، سر سید اکیڈمی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ایما پر کیا گیا۔ انھیں کی اجازت سے تہذیب الاخلاق میں اس کو شائع کیا جا رہا ہے۔ (ادارہ)

مترجم : ڈاکٹر محمد علی جوہر، ریسرچ ایسوسیئیٹ، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

خوردہ ذہن کے ردعمل سے زیادہ وقعت حاصل نہیں ہوتی۔ تہہ خانوں میں پناہ لینے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ آج کی باہم مربوط اور ہر آن بدلتی دنیا میں لاتعلقی سے کسی تعمیری مقصد کا حصول تقریباً ناممکن ہے۔ جہاں تک منصوبہ بقا کا تعلق ہے یہ ایک غیر دانش مندانہ اقدام کہلائے گا، اور اس رجحان سے جتنے مسائل حل ہونگے اس سے کہیں زیادہ مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ اجتماعی ترقی پر مبنی منصوبے کے نقطہ نظر سے بھی اسے خسران عظیم کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ البتہ انفرادی سطح پر آج بھی کسی شخص کے لئے ممکن ہے کہ وہ جوگی یا سادھو بن جائے، اور اسی طرز حیات میں زندگی کی مسرتوں کا عرفان حاصل کرے۔ لیکن وہ منصوبے جو چھوٹی سطح پر کامیاب ہوتے ہیں عموماً بڑی سطح پر بری طرح ناکام ہو جاتے ہیں۔ جو معاشرہ اپنے آپ کو خود ساختہ پناہ گاہوں میں محصور کر لیتا ہے وہ جمود اور کنارہ کشی پر عمل کرتا ہے، اور یہ راستہ لازماً نکبت و افلاس کی طرف لے جاتا ہے۔ میں پوری شدت کے ساتھ اس خیال کی تائید کرتا ہوں کہ بیرونی دنیا سے قطع تعلق کرنے کے پس پشت خواہ کیسے ہی نیک اغراض کارفرما کیوں نہ ہوں اس کا نتیجہ یہی برآمد ہوگا۔ آج کے زمانے میں ہر سماجی گروہ کو نئے راستے اختیار کرنے کے لئے تیار رہنا ہوگا۔ اب جامد ذہنیت سے کام نہیں چلنے والا۔ آج کے دور میں بیرونی دنیا سے ربط رکھنا پہلے کے مقابلے میں زیادہ ضروری ہو گیا ہے۔ مگر جب ہم باہری دنیا سے تعلق پیدا کریں تو پہلے اپنے پڑوسی سے رابطہ پیدا کریں مستقبل کے لیے ہمارا یہ نعرہ ہونا چاہیئے کہ "عالمی سطح پر سوچو اور مقامی طور پر عمل کرو۔"

قوموں میں ماضی سے متعلق ایک افسانوی تصور پایا جاتا ہے خاص طور پر اپنے ماضی سے متعلق۔ اس کے باوصف کہ ماضی کے متعلق لوگوں کے تصورات کا زیادہ تر حصہ ان کے لیے ایک بڑا وسیلۂ ترغیب ثابت ہو سکتا ہے لیکن اگر یہ تصورات ان کی سماجی، اقتصادی ترقی کی راہ میں حائل ہوئے تو یہ ان کی سماجی صحت کے لئے خطرہ بن سکتا ہے۔ ہمارے ملک کی سماجی اور تمدنی ترقی میں دیگر اقوام کے ساتھ ساتھ مسلم حکمرانوں اور عوام دونوں نے ہی نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ ہم ان یادوں سے محظوظ ہونے اور ان کو محفوظ رکھنے میں ہر طرح حق بجانب ہیں۔ لیکن اپنی تاریخ کے اس نازک موڑ پر بجائے اس کے کہ ملک کی ترقی میں دوسروں کے اشتراک کے ساتھ مزید کام کریں، اپنے ماضی ہی کو ہم علیحدگی کا جواز بنا لیں تو یہ ہمارے لئے بڑی بدنصیبی کی بات ہوگی۔ ہندوستانی معاشرے نے جو سماجی اتحاد صدیوں میں حاصل کیا تھا اسے سب سے پہلا صدمہ اس استعماری پالیسی کے ہاتھوں پہنچا جس نے ہندوستانیوں میں علیحدہ سماجی اور سیاسی شناخت پیدا کرنے کی تحریک کو ہوا دی تھی۔ اس پالیسی نے مختلف فرقوں کے درمیان خلیج اور علیحدگی پیدا کرنے، انھیں سماجی اور جذباتی پستیوں میں پناہ لینے پر مجبور کرنے اور خاص طور پر اقلیتی فرقے کو یہ یقین دلانے کے سوا اور کچھ نہ کیا کہ یہ لوگ زندگی کے تمام شعبوں میں پچھڑتے جا رہے ہیں۔ ہم لوگوں کو اب ایک ایسے روشن مستقبل کو تلاش کرنا ہے جس میں ماضی کے مختلف فرقوں کے درمیان مربوط اور تعمیری کردار ادا کیا جا سکے۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ تاریخ کی پیش رفت اپنے تمام نشیب و فراز اور اعادے کے فردوس گمشدہ کے حصول میں کوئی کردار ادا نہیں کر سکتی۔ جنت ماضی میں نہیں مستقبل میں ہے۔

آخر وہ کیا رہنما اصول ہیں جن کی مدد سے کوئی معاشرہ ہر آن تیزی سے بدلتے ہوئے حقائق سے کسی دشواری میں پڑے بغیر زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھا سکے؟ دنیا میں پائے جانے والے معاشروں میں زبردست تہذیبی اور تمدنی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان معاشروں کے عام نصب العین میں سے ان چند کی نشاندہی کرنا ہو، جن سے انسانیت کی بنیادی اور

مشترک قدریں تشکیل پاتی ہیں تو ان میں امن، فلاح و بہبود، انصاف اور مساوات، جماعتی زندگی اور آخر میں سب سے اہم عقلیت پر مبنی قدروں کو شامل فہرست کرنا پڑے گا۔ بلاشبہ مختلف معاشروں میں ان مقاصد کے بارے میں مختلف ترجیحات پائی جاتی ہیں۔ لیکن شاید ہی کوئی ایسا شخص ہو گا جو لوگوں کی کوئی ایسی جماعت پیش کر سکے جو اپنی انفرادی یا سماجی زندگی میں ان مقاصد کو یکسر نظر انداز یا خارج کر دے۔

امن

ہر انسان خواہ وہ کہیں کا رہنے والا ہو امن کا خواہش مند ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں کہ لوگ ہمیشہ ہر قیمت پر امن برقرار رکھیں گے۔ بعض اوقات امن ایک قسم کی پریشان کن انفعالی صورتحال کا مظہر بن جاتا ہے۔ ظلم اور ناانصافی کی صورت میں امن کو ایک خاص حد کے آگے کوئی بھی شخص برداشت نہیں کرے گا۔ درحقیقت تمام روایات ہمیں ان قوانین کو توڑنے کی تلقین کرتی ہیں جن کی بنیاد ظلم اور ناانصافی پر استوار ہوتی ہیں۔ بہر کیف تمام لوگ امن چاہتے ہیں۔ اس کے بغیر صالح زندگی کی اقدار سے استفادہ نہیں کیا جاسکتا۔

آخر وہ کیا عوامل ہیں جو قومی یا بین الاقوامی سطح پر ہمارے درمیان پائیدار امن قائم کرتے ہیں؟ اگر ہم اس موضوع پر گہرائی سے غور کریں تو ہم اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ ایک دوسرے کو برداشت کرنے اور دوسروں کے نقطہ نظر پر ہمدردانہ طریقے سے غور کرنے کی عادت ہی دراصل امن کی ضامن ہوتی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ بعض لوگوں کے نزدیک تحمل ایک ناپسندیدہ لفظ ہے۔ تحمل سے مراد ہے کہ بعض باتوں کے ناگوار ہونے کے باوجود انسان انہیں برداشت کرے۔ ان معنوں میں تحمل ایک مریضانہ اور نامکمل شے ہے بلکہ میری رائے میں یہ ایک قسم کی اخلاقی بیگانگی ہے کیونکہ یہ دوسروں کے ساتھ اشتراک عمل سے کنارہ کشی کے رجحان کو راہ دیتی ہے۔

لیکن تحمل کا مطلب محض یہ نہیں ہے کہ ناگوار باتوں کو برداشت کر لیا جائے۔ یہ محض دوسروں سے بے تعلقی اختیار کرنے کا نام بھی نہیں ہے۔ یہ دنیا کو اس کی تمام تر رنگارنگی کے ساتھ مثبت انداز میں اپنانے اور اس رنگارنگی سے دور رہنے یا اسے ختم کرنے کے بجائے اسے پروان چڑھانے اور زندہ رکھنے کا نام ہے۔ اپنے وسیع ترین معنوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے آپ کا بھلا ضرور چاہو مگر دوسروں کا بھی خیال رکھو۔ صحیح معنوں میں وہی شخص متحمل مزاج کہلانے کا مستحق ہے جو کسی بات کے ناگوار ہونے کی صورت میں یہ دیکھے کہ اس بات کے ناگوار ہونے کی وجہ کیا ہے؟ حقیقی تحمل کی پہلی منزل خود احتسابی ہے مثلاً یہ غور کرنا کہ ایک شخص کو دوسرے کا کوئی عمل، نقطہ نظر یا طور طریقہ ناگوار کیوں لگتا ہے۔ یہ احساس ناگواری خود اپنی قدروں اور اپنی ترجیحات کے بارے میں کیا رائے قائم کرتی ہے۔ لہٰذا تحمل خود اپنی پسند و ناپسند کی اصلاح سے متعلق عقلیت پسندانہ اور ناقدانہ رویہ اختیار کرنے کا نام ہے۔ محض یہ کہنا کافی نہیں ہے کہ اگرچہ میں ان عادات و عقائد کو ناپسند کرتا ہوں پھر بھی میں اسے قبول کر لیتا ہوں۔

تحمل کی دوسری لازمی خصوصیت اس سوال کے جواب میں مضمر ہے کہ دوسرے لوگ یا جماعت یا فرقہ یا قوم جن طور طریقوں کو اپنائے ہوئے ہوں اس کی وجہ کیا ہے؟ وہ قدریں اور تصورات کیا ہیں جو انہیں ایسی باتیں کہنے یا کرنے پر

آمادہ کرتے ہیں جو ہمیں اپنے عقائد و خیالات پر حملہ محسوس ہوتے ہیں؟ بالفاظ دیگر حقیقی تحمل کا انحصار دوسروں سے افہام و تفہیم پر اور دوسروں کے مسلمات، عزائم اور ارادوں کو سمجھنے پر ہے۔ جیسے ہی میں انہیں سمجھنے کی ابتدا کرتا ہوں تو ان کے خیالات اور اعمال کو کم قابل اعتراض پاتا ہوں، مجھے کم از کم یہ احساس ہونا چاہیے کہ جو باتیں لوگ کہہ رہے ہیں وہ من مانی اور احمقانہ نہیں ہیں بلکہ ان کا تعلق براہ راست ان کی اپنی روایات اور رواج سے ہے۔ اس کے باوجود یہ ممکن ہے کہ زیر بحث افکار و اعمال مجھے ناگوار لگیں لیکن میں اب اس مقام پر ہوتا ہوں کہ حقیقی تحمل پر مبنی عمل سے متعلق تیسرے مرحلے کا آغاز کر سکوں۔ اب میں اختلافات کو دور کرنے کی کوشش کے ضمن میں ایک حقیقی، بامعنی تبادلہ خیال کا آغاز کر سکتا ہوں۔ پہلے میں نے بظاہر اپنی قدروں اور عقاید کا احتساب کیا، پھر دوسروں کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی کوشش کی اور اب میں اس مقام پر ہوں کہ دوسروں کو بھی ایسا ہی کرنے پر آمادہ کروں۔

تمام روایتیں بشمول عظیم مذہبی نظام، اور غیر مذہبی فلسفے، مقبول مذہبی عقاید اور مقبول فلسفیانہ تصورات، تحمل کے بارے میں اپنے اپنے نظریات اور اصول رکھتے ہیں۔ میرے خیال میں اگر کوئی شخص اس امر کا مطالعہ اور تفتیش کرے تو اسے میری مذکورہ بالا دلیل سے اتفاق کیے بغیر چارہ نہیں کہ خود احتسابی، حتی کہ خود پر تنقید، دوسروں کو سمجھنے کی کوشش جسے Empathy کہنا موزوں ہوگا اور تبادلہ خیال ــــ یہ تحمل کا ایک قابل قدر نقطہ نظر ہے اور یہی وہ طرز عمل ہے جس پر ہندوستان میں ہم لوگ مذہب، نسل، ذات پات اور اجتماعی رنگارنگی کے باوجود ایک زمانے سے عمل پیرا رہے ہیں۔ ہماری تاریخ اس حقیقت کی گواہ ہے کہ صدیوں پہلے ہمارے صوفیوں اور بھکتی تحریک نے اس وسیع المشرب عمرانی مذہبی فلسفے کی ترویج و اشاعت کی ہے اور جس نے فرقوں کے باہمی تعلقات طے کیے ہیں اور ان کی روزمرہ کی زندگی میں اشتراک اور یگانگت فراہم کی ہے۔ ہم یہ بھی جانتے ہیں کہ بہت سے ایسے لائق ہندو تھے جنھوں نے مذہبی مزاج والے مسلم بادشاہوں کے دربار میں بڑے بڑے انتظامی عہدے حاصل کیے ہیں۔ اسی کے ساتھ بہت سے مسلم علماء ایسے تھے، جنھوں نے ہندو فلسفے کا مطالعہ کیا اور بہت سے متبحر ہندو عالموں نے مذہب اسلام اور اسلامی تمدن کا گہرا مطالعہ کیا۔ یہ آپسی ربط و ضبط اور لطف و محبت کا نتیجہ تھا جو تحمل محض سے کہیں زیادہ وسیع تر اور برتر صفت ہے اور اس نے نہ صرف ہندوؤں اور مسلمانوں کو بلکہ تمام ہندوستانی فرقوں کو ایک رشتے کی زنجیر میں باندھ رکھا تھا۔

آج ایک ایسے ملک میں جو ابھی تک کثرت میں وحدت سے آشنا ہے اور جو اقتصادی، سماجی، سیاسی اور بین الاقوامی شورشوں کے باوجود اس قابل ہے کہ ہم اس کی تاریخ کو فخر کے ساتھ پیش کر سکتے ہیں۔ یہاں یہ اعتراض وارد ہو سکتا ہے کہ عام افراد کے پاس روزمرہ کی زندگی میں اتنا وقت نہیں ہے اور تحمل سے متعلق مذکورہ سہ نکاتی پروگرام کی خاطر خواہ معلومات ان کی رسائی سے باہر ہیں۔ یہ اعتراض بجا ہے۔ ہندوستان میں ہماری روزمرہ کی زندگی کے بے شمار تقاضے ہیں، بہرحال اگرچہ ہم عوام الناس سے حقیقی تحمل کے لئے درکار کسی مشکل تجزیے کی زحمت اٹھانے کی توقع نہیں کر سکتے۔ لیکن ہمارے قائد، دانشور، فنکار ہمارے تعلیم یافتہ اور پیشہ ور طبقے کے ساتھ ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ ہم لوگ سماج کے ان زبردست طبقے کے ہاتھوں دبا دیے گئے ہیں۔ اور میری خواہش ہے کہ ہماری آنے والی نسل جو ابھی یونیورسٹیوں میں جیسی کہ یہ یونیورسٹی ہے تعلیم پا رہی ہے، تحمل سے متعلق اس للکار کو قبول کرے اور اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرے۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

یہ سوچنا ان طبقوں اور آپ جیسے نئے تعلیم یافتہ کی ذمہ داری ہے کہ ہمارے بعض حالیہ اختلافات جن میں سے بیش تر کی وجہ عدم تحمل ہے، کس طرح دور ہوں۔ افلاطون کا قول ہے کہ مذہب خیر کے تصوّر پر مبنی ہوتا ہے اور اس کا مقصد عقائد یا مذہبی رسوم کی تکرار نہیں بلکہ انسانی کی فطرت کی تبدیلی ہوتا ہے۔ ہمیں حق کا علمبردار ہونا چاہیئے اور ہم جس شئے کے علمبردار ہوں اس پر عمل پیرا بھی ہوں۔ حسن کا حصول، بنی نوع انسان کے لئے عزت واحترام، کائنات میں کسی ایسی ذات کی تعظیم کرنا جو ہماری ذات سے عظیم تر ہو وغیرہ وغیرہ انسای فطرت کا جزو ہیں۔ یہ محرکات، زندگی کے تانے بانے کو رنگ و حرارت بخشتے ہیں اور ان سے زندگی میں بالیدگی، کاملیت اور رنگارنگی پیدا ہوتی ہے۔ ہمیں ضرورت ہے کہ اسے اپنی صحیح تر فطرت کے عین مطابق رکھیں اور اپنے ادنیٰ جذبات پر قابو رکھنے میں اس سے کام لیں۔ مصلحین عظام نے ہمیں یہ سب کچھ کر کے دکھا دیا ہے۔ یہ ہمارے دانشوروں، فنکاروں تعلیم یافتہ اور پیشہ ور طبقے کے لوگوں کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس پاکیزہ تصور کو نہ صرف روز مرّہ کی زندگی بلکہ اجتماعی زندگی میں نافذ کریں۔

فلاح و بہبود

تجدد کے مخالفین تجدد پر اکثر یہ اعتراض کیا کرتے ہیں اور ان کے اعتراضات کی بنیاد یہ ہوتی ہے کہ اس میں مادّی فلاح و بہبود پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جاتا ہے اور جتنا زور مادّی فلاح پر دیا جاتا ہے اسی قدر اجتماعی قدروں سے غفلت برتی جاتی ہے۔ ایک حد تک یہ دلیل موجودہ صورتحال کی تائید و دفاع کی کوشش بھی قرار دی جاسکتی ہے۔ لیکن یہ ایک قابل تردید حقیقت ہے کہ ہر مذہب اور فلسفیانہ نظام مادّی فلاح و بہبود کو قابل قدر انسانی سرگرمیوں کی بنیاد قرار دیتا ہے خواہ وہ عملی ہو یا فلسفیانہ۔ ہم میں سے کچھ لوگ سادھو اور ولیوں کی طرح زندگی گزار سکتے ہیں لیکن اس کا سلیقہ سب کو نہیں آتا۔ عام لوگوں کو دن میں تین بار کھانا، اچھی رہائش جہاں بجلی، تازہ پانی، صفائی اچھی تعلیم اور کتابیں، ریڈیو اور ٹیلی ویژن جو ہمیں دنیا جہان سے با خبر رکھتا ہے، درکار ہوتا ہے۔ ان سے ہمارے جسم، ہمارے ذہن اور ہماری روح کو غذا ملتی ہے۔ ان کے حصول کے لئے ہمیں غربت و افلاس کے خلاف جنگ کرنی پڑتی ہے۔ بیماریوں اور جہالت کو دور کرنا اور ہر شخص کو موقع فراہم کرنا کہ وہ بہتر طور پر پروان چڑھے، بہتر انداز سے محسوس کرے اور واضح طور سے سوچے اور صحیح طریقے سے کام کرے۔ بنی نوع انسان کو چاہیے کہ اپنے کو احتیاج کے آہنی پنجے سے آزاد رکھے۔

اس مقام پر مجھے تجدّد کے طریقہ کار سے متعلق ایک عام غلط فہمی کی طرف آپ کی توجہ دلانا چاہیے۔ سب ہی لوگ اس انداز فکر کے قائل نہیں البتہ بعض طبقے تجدد کو تہذیبی اعتبار سے مغربیت کے مترادف قرار دیتے ہیں، یہ ایک زبردست غلطی ہے۔ یہ ان لوگوں کو، جو مذہبی مزاج رکھتے ہیں یا اپنے کلچر کے متعلق بہت زیادہ حساس ہوتے ہیں اس طریقہ کار کے فائدوں سے دور رکھتا ہے۔ سادہ حقیقت کے طور پر بھی تطابق صحیح نہیں ہے۔ یقیناً یہ عین ممکن ہے اور بلاشبہ یہی ہونا بھی چاہیئے کہ تجدّد کے ثمرات سے کسی قوم کا تشخص ضائع ہوئے بغیر ہر ایک کو فائدہ پہنچے۔ بعض ایشیائی معاشروں مثلاً جاپان اور ترکی کی معاشرت کا تجزیہ اس حقیقت کی روشن مثالیں ہیں کہ لوگ اپنے اپنے تمدن پر قائم رہتے ہوئے بھی عصر جدید کے تقاضوں سے کس طرح عہدہ برآ ہو سکے ہیں۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۳ء

زندگی کے مادی پہلو کی اصلاح و ترقی کے نام پر ہم اپنے سماج کے ان افراد کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو روح فرسا مصائب میں مبتلا ہیں۔ اور اپنی قومی معیشت کو ادھورا نہیں چھوڑ سکتے۔ ہر انسان کی خواہش ہوتی ہے کہ اپنے آپ میں کچھ نیا پن پیدا کرے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آج کے زمانے میں مادی فلاح و بہبود کا کون سا راستہ اختیار کیا جائے؟ کیا ہم اس بین الاقوامی معیشت کی دور میں بھی اقتصادی لاتعلقی کی سمت میں الٹا سفر کریں؟ کیا اب ہم اقتصادی طور پر "سودیشی" بننے کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ اور "خود کفالت" جیسی قدروں پر اصرار جاری رکھ سکتے ہیں؟ یا ہمیں مناسب احتیاط کے ساتھ اس شاہراہ پر چلنا چاہیے جو ہمیں بالآخر عالمی معیشت سے ہم آہنگ کر دے۔

ہم سب ہی کم و بیش اس اقتصادی اصلاح کے پروگرام کی حقیقت سے آشنا ہیں جو ہندوستان نے گذشتہ تین سال سے شروع کر رکھا ہے۔ میں ان تفصیلات کو دہرانا نہیں چاہتا۔ واضح طور پر یہ وہ پروگرام ہے جو اقتصادی سودیشیت، خود کفالت اور خود انحصاریت جیسے دقیانوسی خیالات کی نفی کرتا ہے۔ آزادی کی جدوجہد کے دوران سیاسی اور اقتصادی سودیشیت کا رجحان حق بجانب تھا۔ ہم استعماری حکومت کے خلاف اپنی بے اطمینانی کا اظہار کرنے پر مجبور تھے۔ ہمیں سامراجیت کو کمزور کرنا تھا۔ اور ہمیں اپنے آپ میں اپنا اعتماد بحال کرنا تھا کہ ہم حکومت کا کاروبار اپنے ہاتھ میں لے سکتے ہیں۔ اور اپنی ضروریات کی چیزیں خود پیدا کر سکتے ہیں۔ آزادی کے بعد اقتصادی سودیشیت نے خود کفالت اور خود انحصاریت پر مبنی ایک پروگرام کی شکل اختیار کر لی جس کا مقصد درآمدات کو کم کرنا اور ممکنہ حد تک اپنی ضروریات کی چیزیں خود پیدا کرنا تھا۔ یہ ہماری سیاسی آزادی کو مستحکم کرنے اور اخوت پر مبنی اور معیاری معیشت کی بنیاد رکھنے کے لئے بہت ضروری تھا۔

آج بدقسمتی سے خود کفالت اور خود انحصاریت کا مفہوم بدل کر خود محدودیت ہو گیا ہے۔ دنیا کی کوئی بھی معیشت خود منحصر اور خود کفیل نہیں ہے، اور جو معیشتیں پیداواری اعتبار سے بہت ترقی یافتہ ہیں وہ ایسا کرنا بھی نہیں چاہتیں۔ دراصل خود محدودیت کا اظہار محض اقتصادی میدان میں نہیں ہوتا۔ یہ رجحان ہمارے ہم وطنوں کے عمرانی تمدنی مزاج میں سرایت کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے اور یہ تکلیف درحقیقت فرقہ وارانہ حد بندیوں سے ماورا ہے۔ یہ رجحان دوسرے تمدن سے متعلق لوگوں کو جاننے، سمجھنے ان کی قدر کرنے اور ان سے اشتراک کرنے کی راہ میں حارج ہوتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہم نے اپنی سیاسی آزادی حاصل کی اور اسے مستحکم بھی کر لیا ہے۔ ہمارا اقتصادی نظام اتنا معیاری ہے کہ اس کے ذریعے ہم بلند تر شرح ترقی مثلاً ۸ فی صد تک حاصل کرنے میں کامیاب ہیں۔ اور پھر بھی جو چیز غالباً زیادہ اہم ہے کہ کلچر یا نفسیات کے میدان میں بھی ہمیں اس بات کی ضرورت ہے کہ ہم ان خود ساختہ ذہنی پابندیوں کی زنجیر توڑ کر باہر نکلیں تا کہ اپنے چاروں طرف پھیلی ہوئی وسیع و عریض دنیا کے معاشروں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے ساتھ خود اعتمادی کے ساتھ مل بیٹھ سکیں۔

لہذا ہمیں جس چیز کی ضرورت ہے وہ صرف تکنیکی اعتبار سے اقتصادی ترقی نہیں ہے بلکہ ایک ایسے عمرانی۔ اقتصادی تمدن کے ارتقاء کی ضرورت ہے جو مذکورہ بالا ترقی کو برقرار رکھنے کے ساتھ اسے آگے کی طرف بڑھاتا ہے۔ بلاشبہ ہندوستان میں آج ہمیں اصلاحات کی دوسری لہر کی ضرورت ہے تا کہ ہم اس بلند تر ترقیاتی شاہراہ پر گامزن ہو سکیں۔ میں ان اصلاحات کی نوعیت بیان کرنا نہیں چاہتا، لیکن اتنا ضرور کہنا چاہوں گا کہ ان کے طفیل ہم عالمی معیشت میں مزید آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اب میں جس نکتے کی جانب اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ موضوع سے متعلق ہونے کے علاوہ ایک اہم مسئلے کی بھی نشاندہی کرتا ہے۔

حکومت نے کھلی معیشت اور تیز رفتار ترقی کی بنیاد رکھ دی ہے۔ میرے خیال میں ہم لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ ہندوستان میں جو بھی برسر اقتدار ہوگا اسے لازمی طور پر اس طریقہ کار کو اختیار کرنا ہوگا، کوئی بھی حکومت آسانی سے اس اقتصادی تمدن کو تبدیل نہیں کر سکتی۔ یعنی ہمارے بنیادی رجحانات، توقعات، طریقے اور تجارت، معیشت اور پیداوار سے متعلق ترجیحات میں تبدیلی۔ باوجود اس کے ہمارے اقتصادی تمدن میں مزید تبدیلی ضروری ہے کہ اس کے بغیر معاشی اصلاحات جڑ نہیں پکڑ سکتیں اور ہماری توقعات پوری نہیں ہو سکتیں۔

جس طرح ہم اپنے آپ کو دیکھتے ہیں اور دنیا سے ہمارے معاملات کی جو نوعیت ہے اس میں ایک مکمل انقلاب کی ضرورت ہے۔ ہمیں بڑی تیزی کے ساتھ اپنے آپ کو سنبھالنا ہوگا اور اپنے کو عالمی نظام کے ساتھ ہم آہنگ کرنا ہوگا۔ کیونکہ اب ہمارے پاس مزید وقت نہیں ہے۔ ہماری شناخت کے بیش تر عنوانات فرسودہ خیالات پر مبنی ہیں۔ ہماری سال خوردہ و خود ساختہ تصویر آج بھی استعماری عہد کی یاد دلاتی ہے جو کب کا ختم ہو چکا ہے۔ ہمیں اس عہد کو اور اس سے متعلقہ یادگاروں کو خودشکستگی کے احساس سے دو چار ہوئے بغیر بھلا دینا چاہیئے۔ ایسا کوئی قانون نہیں ہے جس کی رو سے ذہنیت کی تبدیلی کو خارج از امکان سمجھا جا سکے۔ ہمیں نئے عالمی چیلنج قبول کرنا ہے اور مقابلے کے لئے تیار رہنا ہے۔ جو زیادہ باہمت اور طاقت ور ہوگا وہی کامیاب ہوگا۔

ہندوستانی مسلمان یہاں کی اقتصادی اصلاحات سے متعلق پروگرام اور اس ملک کے اقتصادی تمدن کا جزو ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کی تعداد کل آبادی کا تقریباً ۱۲ فی صد ہے۔ مسلمانوں کی لیاقت ان کی ضرورتیں اور قوت خرید ہر میدان میں قابل لحاظ ہیں۔ مسلمانوں میں اعلیٰ درجے کے کاریگر، تاجر، مینیجر، سرمایہ کار، ٹکنالوجسٹ اور کاروباری ماہرین موجود ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ان کی یہ تعداد کافی نہیں ہے۔ حکومت نے جو اصلاحات جاری کی ہیں وہ سود مند ہیں۔ ان اصلاحات سے نہ صرف غیر ملکیوں کی ہماری معیشت میں سرمایہ کاری کی حوصلہ افزائی ہوگی بلکہ خود ہندوستانیوں کو بھی سرمایہ کاری اور تجارت کو ذریعہ معاش بنانے کی ترغیب ملے گی۔ ہندوستانی مسلمانوں کو اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ مسلمان کئی اعتبار سے اس معاملے میں فوقیت رکھتے ہیں۔ غالباً سب سے اہم بات یہ ہے کہ دیگر کمزور پہلوؤں کے باوصف، دیگر فرقوں کے مقابلے میں شہری آبادی میں مسلمانوں کا تناسب زیادہ ہے۔ موجودہ اصلاحات نے بلاشبہ صنعت اور سرمایہ سے زیادہ متاثر کیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ان اصلاحات نے شہری آبادیوں پر گہرا اثر مرتب کیا ہے۔ لہذا تعلیم کے بڑے مراکز جیسا کہ یہ یونیورسٹی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) ان علوم اور مہارتوں کو ترقی دے سکتے ہیں جسے حاصل کر کے طلبہ خاص طور پر سائنس اور جدید ٹکنالوجی کے میدان میں ہونے والی تازہ ترین ترقیات سے ہم کنار ہو سکتے ہیں۔

دیگر فرقوں کے افراد کی طرح ہندوستان کے مسلمانوں نے خلیج اور مغربی ایشیاء کے علاقوں سے تعلق قائم کر رکھا ہے۔ وہ اس کے ذریعے اپنی اقتصادی ترقی اور ہندوستان کے مفاد کو فائدہ پہنچا سکتے ہیں۔ جیسے جیسے اقتصادی سرگرمیوں کا میدان وسیع ہوتا ہے اسی رفتار سے سماج میں اس کے مادی فوائد زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچتے ہیں۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیئے کہ عمرانی و اقتصادی مصائب اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے تنازعے اور تشدد اسی جمود زدہ اقتصادی تمدن میں جنم لیتے ہیں کیونکہ وہاں لوگوں کی مسلسل بڑھتی ہوئی تعداد اقتصادی فوائد کے مسلسل گھٹتے ہوئے حصے کے لئے برسرپیکار رہتی ہے۔ البتہ

کسی کو اقتصادی ترقی کے عمل سے .بہت زیادہ توقعات بھی نہیں رکھنی چاہئیں اور اسے صحیح تناظر میں دیکھنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اگر چہ یہ بات بہت اہمی ہے لیکن ہمارے سماج میں پیدا ہونے والی تمام معاشرتی برائیوں کا سدباب معاشی اصلاحات کے ذریعے ہو جائے یہ ممکن نہیں ہے۔

انصاف اور مساوات

انصاف اور مساوات سے عاری سماج میں عمرانی و اقتصادی ترقی سے حاصل ہونے والے فائدے بڑی آسانی سے برباد ہو سکتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جس سماج میں بعض طبقات کو کسی خاص گروہ مثلاً مذہبی فرقہ یا ذات سے وابستہ ہونے کی وجہ سے دائمی طور پر نقصان پہنچایا جاتا ہے، اس سماج میں ترقی کے ساتھ ساتھ فرقہ وارانہ سماجی اور اقتصادی ناانصافیوں کے زور پکڑنے کا امکان رہتا ہے۔ اس قسم کی بعض باتیں بدقسمتی سے ہمارے ملک میں واقع ہو رہی ہیں۔ اگر ہم بلا تاخیر ان ناانصافیوں کے خلاف کوئی سنگین اقدام نہیں کرتے ہیں تو تصادم اور تشدد کا رجحان زور پکڑے گا اور اگر ایسا ہوا تو ہمارے سماج کا تانا بانا بکھر جائیگا۔

بڑے پیمانے پر یہ بے انصافی ایک تاریخی ورثہ ہے۔ ہمارے سماج کی غالب اکثریت ذات پات پر مبنی نظام کے اندر محبوس و محدود چلی آرہی ہے۔ اس نظام نے مذہبی طور پر پیدا کردہ احساس کمتری، سماجی استحصال اور اقتصادی محرومی کو جائز قرار دے رکھا ہے۔ سماج کے انہیں محروم طبقوں کے ادراک پر توجہ کرنے اور اس کی اصلاح کرنے کی ضرورت ہے۔ بلاشبہ یہ محرومی آج ان کی روزمرہ کی زندگی کے تمام شعبوں میں ظاہر ہے۔ لیکن اگر کوئی ان عوامل کی نشاندہی کرنا چاہے جو اس ملک کی نمایاں ترین علامت ہے تو یہ بات یقینی ہے کہ حکومت ہند کے بعض جابر و متشدد شعبوں سے متعلق خصوصاً نظم و ضبط اور جرائم سے متعلق، انصاف کے میدان میں ان کا تجربہ ہے، جس نے انھیں بغاوت کے کنارے تک ڈھکیل دیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے نظم و نسق اور جرائم سے متعلق انصاف کے نظام میں فوری طور پر اصلاح کی جائے، اور ملازمتوں میں ان لوگوں کے نسبتاً زیادہ تقررات اور نمائندگی کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ اس صورت میں سر دست ہم ایک برابر کے ہندوستانی شہری کی حیثیت سے ان کا اعتماد حاصل کرنے کی جہت میں دور تک جا سکتے ہیں۔

اس معاملے میں بلاشبہ اولین ذمہ داری ہندوستان کی ریاست کی ہے قومی اتحاد اور یکجہتی پیدا کرنے کی کوئی بھی کوشش اس وقت تک بار آور نہیں ہوگی جب تک لوگ اپنے آپ کو منظم اور روایتی بے انصافی اور جبر کا شکار محسوس کرتے رہیں گے۔ اور ردعمل کے طور پر یہ انہیں اپنی سماجی و مذہبی شناخت کے دائرے میں محدود رہ کر تسلی حاصل کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ یہ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کے تمام انسانی اور اہم بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کے واقعات پر جو آجکل بڑے پیمانے پر رونما ہو رہے ہیں، کڑی نظر رکھے۔ اس ضمن میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھنا چاہیئے اور نہ کسی طریقہ کار کو آزمائے بغیر چھوڑنا چاہیے۔ آنے والے دنوں میں ایک عام ہندوستانی میں احساس تحفظ عام کرنے اور انہیں قومی دھارے میں شریک کرنے کے سلسلے میں یہ ایک فیصلہ کن اقدام ہوگا۔

اس ضمن میں سماج کے ان طبقات کے لئے جو اقتصادی طور پر معذور ہیں اور مساویانہ سطح پر سماجی اور اقتصادی

سرگرمیوں میں حصہ لینے کے قابل نہیں ہیں انہیں امداد فراہم کرنے کا معاملہ ہے۔ یہاں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اہل ہند کے لئے مثبت تفریق پر مبنی ایک ایسا نظام قائم کرنے کی ضرورت ہے جو مذہبی یا ذات پات کی شناخت سے مشروط نہ ہو بلکہ اقتصادی ضرورت پر مبنی ہو۔ اس کے علاوہ کچھ اور بھی اقدام ہیں جو اس پالیسی کے ساتھ ساتھ کرنے چاہیئے۔ یہ اقدام کیا ہیں۔ سب سے پہلا میدان تعلیم کا ہے۔ اس سے مراد اقتصادی ترقی سے متعلق نئے افکار سے ہے جس میں ابتدائی تعلیم پر خصوصیت کے ساتھ زور دیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی اصلاح شدہ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کی اہمیت کو بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ دوسرا قدم مقامی سطح پر اختیارات کی فراہمی ہے۔ اس کا حل پنچائتی راج بل کے ذریعے پیش کیا جارہا ہے۔ اس بل کا مقصد شہریوں کے شرکت کے دائرہ کار کو وسیع تر کرنا ہے۔ تیسرے کی بنیاد یہ ہے کہ اقتصادی ترقی کے سوتے موجودہ اقتصادی اصلاحات سے پھوٹیں گے اور اس سے اقتصادی فائدے بڑھیں گے۔ وہ لوگ جو سرمایہ لگاتے ہیں اور پیداوار کرتے ہیں اس بات کا لحاظ نہیں کرتے کہ ان کی آمدنی کہاں سے آتی ہے۔ قوت خرید رکھنے والے کون لوگ ہیں اور ان کے کارخانوں میں کون کام کرتے ہیں۔ یہ لوگ اس حرکت پذیر مزدور طبقے سے فائدہ اٹھاتے ہیں جو ذات، مذہب، زبان یا علاقے کی بنیاد پر محدود نہیں ہوتا۔ اور اگر ترقی کی رفتار برقرار رہتی ہے تو ہر شخص نسبتاً زیادہ مساویانہ طور پر اقتصادی ترقی میں حصہ پاسکتا ہے۔

البتہ مجھے اس نکتے پر زور دینا چاہیئے کہ سماجی طور پر محروم اور پس ماندہ طبقوں کی امداد کی حکمت عملی کو، خواہ اس امداد کا تعلق ناگزیر اور بنیادی ضروریات سے کیوں نہ ہو محض ایک قلیل مدتی قدم ہی سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ طویل مدتی اقدام کے طور پر جو چیز واقعی ہمارے لئے ضروری ہے، وہ خود ہمارے سماج کی تبدیلی ہے۔ یعنی اتنا کہ لوگوں کے خود کو ایک سماجی وجود سمجھنے کے انداز میں اور مختلف مذاہب، ذاتوں، جنسوں اور سماجی گروہ سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا ایک دوسرے کے ساتھ رشتہ و تعلق پیدا کرنے کے طریقے میں تبدیلی ہو۔ ہندوستان کے اکثریتی فرقے پر اس سلسلے میں خاص طور پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور سچ تو یہ ہے کہ ہندو سماج میں اصلاح کے معاملے کو پوری شدت کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ نچلے اور پس ماندہ ذاتوں کی سماجی۔ اقتصادی فلاح اس سمت میں محض ایک قدم ہے۔ جو چیز زیادہ اہمیت کی حامل ہے وہ اونچی ذات والوں کے رویے میں تبدیلی ہے۔ اونچی ذات کے ان تمام لوگوں کو جو سلجھا ہوا ذہن رکھتے ہیں، کچھ چبھتے ہوئے سوالات اپنے آپ سے بھی کرنے چاہئیں۔ اگر کوئی واقعی خدا کی ذات میں یقین رکھتا ہے اور یہ یقین رکھتا ہے کہ تمام افراد ایک ہی مقدس آگ کی چنگاری یا حصہ ہیں تو پھر ہم سے ذات پات کی نسلی تفریق کیوں روا رکھی جاتی ہے اور ان لوگوں پر جن کا تعلق نچلے درجے سے ہے بہت ساری پابندیاں کیوں عائد کی جاتی ہیں؟ سوامی وویکانند نے کہا ہے "آپ نے اپنے بے زبان عوام کو مدتوں سے دبا کر رکھا ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اس کا کفارہ ادا کریں "لاکھوں کروڑوں لوگ ایسے ہیں جو تعصب کے تیر و تفنگ کا شکار رہ چکے ہیں جنہیں ان کے مصائب کا معاوضہ سماجی وقار اور بمطابق توقعات، محبت کے طور پر ملنا چاہیے۔ درحقیقت ذات پات کا مسئلہ اونچی اور نیچی ذاتوں کی کشاکش تک محدود نہیں ہے۔ خود اونچی ذات کے اپنے اندر بھی ایک تقسیم پائی جاتی ہے۔ لہذا جس چیز کی ہمیں ضرورت ہے وہ صرف یہی نہیں ہے کہ اونچی اور نیچی ذاتوں کے درمیان تعلقات بہتر ہوں بلکہ پورے ذات پات کے نظام میں مکمل اصلاح کی ضرورت ہے۔ لہذا میں افراد کی تفریق کی غرض سے ایک طویل مدتی معاہدہ پر زور دوں گا تاکہ ایک متحدہ سماج کی تعمیر ہوسکے اور اس سماج میں لوگوں کو برابر کے مواقع حاصل ہوں۔ جو بات ہندو برادری پر صادق آتی ہے وہی

دوسری برادری پر بھی صادق آتی ہے ۔ہمیں دوسرے مذہبی فرقوں کے اصلاح کی بھی اتنی ہی کوشش کرنی چاہیئے جتنی ہن سماج کے لئے ضروری سمجھتے ہیں ۔ تاکہ صرف ہندو ہی نہیں بلکہ تمام ہندوستانی سماج ترقی کی راہ پر آگے بڑھ سکے ۔اس معا میں مسلم فرقہ بہت گہرے اور شدید تذبذب میں مبتلا رہا ہے ۔انہیں ان کے اپنے حال پر چھوڑ دینا مستقبل میں ان کی مخل کو دعوت دینا ہے ۔

جماعتی زندگی

آپسی میل جول کے بغیر قابل قدر اور حقیقی انسانی زندگی کا تصور محال ہے ۔ انسانی زندگی برادری اور متعلقا برادری مثلاً زبان، رواج، غذا، لباس، فن، ادب وغیرہ سے عبارت ہے ۔البتہ "برادری" یعنی تمدنی علیحدگی پسندی ایک نعرہ بن چ ہے ۔اس سے مراد وہ وجود یا وہ حوالے ہیں جنہیں ہم اختیار نہیں کر سکتے بلکہ یہ ہمارے لئے ہماری پیدائش سے ہی متعین ہو جا ہیں اور جس کا ہم دفاع کرتے رہتے ہیں برادری کو ایک مسرت آگیں، ہمہ گیر اور حرکت پذیر سماجی گروہ ہونا چاہیئے ۔ال موجودہ برادری ان اوصاف سے تقریباً عاری نظر آتی ہے ۔برادری میں ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اس کو محدود، محبوس ا ناقابل تبدیل دیکھنا پسند کرتے ہیں ۔ برادری ویسی ہی بنتی ہے جیسی ہم اپنے تصورات، اپنے اعمال اور اپنے خیالات ـ اسے بناتے ہیں ۔ دوسری طرف ہندوستان میں بعض ایسی طاقتیں ہیں جو برادری کو ہم سے بالاتر ایک غیر متعلق شے کی طر ہم پر اور دوسروں پر ایک بندش اور ایک خوفناک نظام بنا کر پیش کرتے ہیں ۔

صالح زندگی کے نقطہ نظر سے، میرے خیال میں، ہمیں برادری میں جینے کی بات نہیں بلکہ برادریوں میں ہی جینے بات کرنی چاہیئے ۔ زمانہ جدید میں زندگی بہت پیچیدہ ہوگئی ہے ۔ہم لوگ مختلف پیشوں سے وابستہ ہیں ۔ہم نسبتاً زیادہ حرکہ پذیر ہیں ۔ہم گاؤں میں، چھوٹے قصبوں میں، بڑے شہروں میں، صوبوں اور ملکوں میں آمد و رفت رکھتے ہیں ۔ہم ایسے لوگوں ـ قریب اور زیر اثر آتے ہیں جن کا تعلق زندگی کے مختلف شعبوں اور مختلف برادریوں سے ہوتا ہے ۔شہری زندگی، خاص طور ہمیں ایک تمدنی گرداب میں پھنسا دیتی ہے ۔ہم میں سے کچھ ہی اس گرداب سے نکل پاتے ہیں ۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی اپنی برادریوں کے گرد حصار کھینچ لیتے ہیں، خود کو دوسروں سے علیحدہ کر لیتے ہیں اور اپنی "خالصیت" پر اصرار کرتے ہیں، شا ہی کبھی گاؤں کی طرف رخ کرنا یا دوسروں سے قطع تعلق کر کے دیہاتیوں سے مماثل معاشرتی زندگی بسر کرنا پسند کریں ـ نکتے کی بات یہ ہے کہ ہم مختلف برادریوں کا ایک حصہ ہیں اور زندگی بھر ان کے اندر اور باہر نقل و حرکت کرتے ہیں اور ا نقل و حرکت سے ہماری زندگی میں بالیدگی آتی ہے ۔اہل ہند نے اس حقیقت کا عرفان بہت پہلے حاصل کر لیا تھا ۔اگرچہ برادری کے استعاری تصور سے آگاہ نہیں تھے لیکن ان کا طرز عمل برادری کے قدرتی اصولوں کے عین مطابق تھا ۔یہی وجہ ـ کہ ان کی برادری ہمہ گیر تھی اور محبت اور وفاداری کے دائروں میں ایک ہی مرکز کے ساتھ ہر سطح پر موجود تھی ۔اس بات ـ باہر کے لوگ خصوصاً مغرب نواز لوگ، جو اب خود اپنے معاشروں میں تمدنی تکثیر کی تحریک چلا رہے ہیں، حیران ہوتے ہیں ہم لوگ شعوری سطح پر نہ سہی مگر ایک عرصہ دراز سے تمدنی تکثیر کے علمبردار رہے ہیں ۔

آج سیٹلائیٹ ٹیلی ویژن کے طفیل اور E -Mail کی قبیل کے ترسیلی ذرائع، عالم گیر کمپیوٹر رابطے اور فیک

مشین پر فوری اطلاع کی وجہ سے برادری سے متعلق تجدیدی نقطہ نظر کی تحدید کی کوئی بھی کوشش بار آور ہوتی نظر نہیں آتی ۔ ایسا کرنے میں اول تو کامیابی کی امید نہیں ۔ اگر کامیابی ہوئی بھی تو ہم سیاحوں اور سماجی علوم کے ماہرین کے لئے عجوبہ بن کر رہ جائیں گے ۔ آج دنیا کے رائج الوقت الفاظ Plasticity, Elasticity شکل پذیری اور لچکداری ہیں ۔ اچھا پلاسٹک اور اچھی قسم کا الاسٹک ایک اندرونی لچک رکھتا ہے ۔ کیونکہ یہ ٹوٹے بغیر جھک اور مڑ سکتا ہے ۔ ہماری برادری کو سالمیت اور اندرونی لچک کی سخت احتیاج ہے ۔ یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ان کی برادری کی بنیادی قدریں اور اعمال کیا ہیں ۔ لیکن انہیں نئی قدروں اور نئے اعمال کو اپنی زندگی میں داخل کرنے کے لئے لچکدار ہونا چاہیئے ۔ بصورت دیگر ان کے ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے ۔

عقلیت

ہر روایت معقولیت پر مبنی ہوتی ہے ۔ معقولیت سے میری مراد لازماً کسی ایسی خشک شے سے نہیں جو سستی دانش وریت کے مترادف ہو بلکہ ایک منظم فکر کو بروئے کار لانے سے اور اس دنیا کے حقائق پر توجہ کرنے سے ہے ۔ کیونکہ ان کا تعلق ہمارے ان اغراض و مقاصد سے ہے ۔ جنہیں ہم قابل قدر اور نیک خیال کرتے ہیں ۔ البتہ معقولیت ایسی کوئی تکنیکی چیز بھی نہیں ہے کہ اس سے ہمارے اغراض و مقاصد دیگر طریقہ کار کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے پورے ہو جاتے ہوں ۔ ہمارے اغراض و مقاصد کے تعین میں معقولیت کار فرما ہوتی ہے ۔ معقولیت ہمیں یہ فیصلہ کرنے میں کہ کون سے اغراض و مقاصد درست اور قابل حصول ہیں اور کون سے نہیں ہیں، ہماری مدد کرتی ہے ۔ ہماری روزمرہ کی زندگی میں معقولیت تعلیم میں مضمر ہے ۔ تعلیم سے ہمارے اندر اغراض و مقاصد کے بارے میں معقولیت کے ساتھ سوچنے اور غور و فکر کرنے کی لیاقت پیدا ہوتی ہے ۔ جن اغراض و مقاصد کو ہم معقولیت پر مبنی سمجھتے ہیں ان کے حصول کی بہترین صورت کے بارے میں منظم اور منضبط انداز سے سوچنے کا شعور بھی تعلیم ہی سے پیدا ہوتا ہے ۔

ان باتوں سے جس امر کی وضاحت ہوتی ہے وہی میرا مقصود ہے ۔ یعنی تعلیم کی قدر و قیمت' میں جانتا ہوں کہ علی گڑھ کے عالمانہ معاشرے کے سامنے یہ بات کہنا گویا مومنین کو دعوت اسلام دینا ہے ۔ لیکن ہمارے ملک کا موجودہ نظام تعلیم بڑی افسوسناک حالت میں ہے ۔ برسوں سے ملک کے دوسرے بہت سے اداروں کی طرح یونیورسٹیاں بھی تعطل کا شکار ہیں ۔ میں نظام تعلیم سے متعلق تازہ ترین معاملات مثلاً سرکاری امداد کے رفتہ رفتہ ختم کیے جانے، معیارات میں تنزل، ابتدائی اور اعلی تعلیم کے مابین تنازعے وغیرہ کی بات کروں گا ۔ ہماری یونیورسٹیوں کو بدلتی ہوئی دنیا کے ساتھ مثبت اور تخلیقی انداز میں قدم سے قدم ملا کر چلنا چاہیئے ۔ انہیں وسائل کی فراہمی کے لئے نعم البدل پیدا کرنا ہوگا اور فراہمی زر کے جدید طریقے ایجاد کرنے پڑیں گے ۔ بالفاظ دیگر معیار بڑھانے کے لئے انہیں ہر ممکن قدم اٹھانا ہوگا ۔ اس زمانے میں قوموں کی باہمی مسابقت کا میدان بین الاقوامی سیاست سے بدل کر بین الاقوامی اقتصادیات ہو گیا ہے ۔ یہ نئی جنگ اب کلاس روم اور تجربہ گاہوں میں جیتی اور ہاری جائے گی ۔ جو قوم اور جو برادری اس کو محسوس نہیں کرتی، اس کا مستقبل حاشیہ نشینی اور محکومیت کے سوا کچھ اور نظر نہیں آتا ۔

اس حقیقت کی اہمیت سے مسلمانان ہند کو بے خبر نہیں رہنا چاہیئے ۔ اسلام بالخصوص اسلامی ہند کا علمی ورثہ ایک

قابل فخر سرمایہ ہے۔ لیکن اگر ہم ماضی ہی میں جیتے رہنے تک محدود رہیں گے تو یقیناً وہ موقع ہاتھ سے نکل جائے گا جو ہمیں روشن مستقبل کی طرف لے جا سکتا ہے۔ اور خطرے کی بات یہ ہے کہ یہ آخری موقع بھی ہو سکتا ہے۔ ایک فرقہ کی حیثیت سے یا فرد کی حیثیت سے ہمیں تعلیم کی انتہائی اہمیت کو محسوس کرنا ہے۔ اور تعلیم کے جس پہلو پر میرا زیادہ زور ہے وہ تعلیم نسواں ہے۔ اگرچہ یہ سب جانتے ہیں کہ تعلیم نسواں شرح اموات اطفال کی طرح عمرانی اقتصادی ترقی کا سب سے بامعنی پیمانہ ہے۔ یہ اور بات ہے کہ ہم ہندوستان میں اسے وہ اہمیت نہیں دیتے جس کا یہ مستحق ہے۔ مسلمانان ہند کو اس معاملے میں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تعلیم نسواں سے متعلق ہمارا ریکارڈ خاص طور پر خراب ہے۔ ہمیں اس افسوسناک صورتحال کی اصلاح کی حتی المقدور کوشش کرنی چاہیئے۔

خلاصہ کلام

میں اپنی بات مستقبل سے متعلق ایک پیشن گوئی کے ساتھ ختم کرنا چاہتا ہوں۔ ہر موقع پر ہم یہ مانتے ہیں اور اس کا اعادہ بھی کرتے ہیں کہ ہمارے بچے ہمارے مستقبل کی ضمانت ہیں۔ تمام والدین چاہتے ہیں کہ ان کے بچے زندگی میں ترقی کریں اور وہ اپنے بچوں کی ترقی کے آئینے میں اپنی کامیابی کا عکس دیکھنا چاہتے ہیں۔ البتہ ایسے والدین کی تعداد کم ہوتی ہے جو اعتماد کے ساتھ اپنی اولاد کو اپنا نصب العین منتخب کرنے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ زیادہ تر والدین اپنے بچوں کے نصب العین کے انتخاب میں دخل دینے کی کوشش کرتے ہیں اور ان کی ذہانت اور فطری توانائی کو اپنی مرضی کے مطابق طے شدہ خطوط پر ڈھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ہمارے فرقے کے قائدین اور والدین برابر کے قصوروار ہیں۔ ہمیں اپنے بچوں کی امنگوں کا گلا نہیں گھونٹنا چاہیئے انہیں محبوس فضا میں جینے پر مجبور کرنے کے بجائے کھلی فضا میں سانس لینے کا موقع فراہم کرنا چاہیئے۔ ہمیں یہ احساس ہونا چاہیئے کہ سماج میں بچوں کو مستقبل کے بارے میں خوش آئند خواب دیکھنے کا موقع نہیں دیا جاتا اور وہ سماج جمود اور مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے۔

آپ کی یونیورسٹی کو علم اور خیر کے حصول کا علمبردار ہونا چاہیئے۔ یہی وہ دو صفات ہیں جن کی بنیاد پر کوئی یونیورسٹی یا معاشرہ اچھا قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہمیں انہیں مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے کام کرنا ہوگا تاکہ زندگی اور انسانوں کے معاملات میں حق اور محبت کو بالادستی حاصل رہے۔

بازیافت

سر سید احمد خاں

طلبہ سے خطاب

(لیکچر جو، دسمبر ۱۸۹۴ء کو سر سید احمد خاں نے مدرسۃ العلوم کے طالب علموں کو دیا)

اے عزیز طالب علمو

مجھ کو اور تم کو اور تمہارے استادوں، تمہارے ماں باپ، تمہاری قوم کو اس بات سے نہایت خوشی ہوگی کہ تم دور دراز فاصلہ اور مختلف شہروں بلکہ مختلف ملکوں سے اس جگہ تحصیل علوم کے لئے جمع ہو۔ مختلف علوم کو پڑھتے ہو اور مختلف مصنفوں کے عمدہ خیالات، عمدہ مسائل علمی، عمدہ معقولات اخلاق سے لطف اٹھاتے ہو۔ تمہارے استاد تمہارے ساتھ پدرانہ محبت اور شفقت رکھتے ہیں اور ہر طرح تمہاری بہتری و ترقی کے خواہاں ہیں۔ وہ تم کو عمدہ عمدہ کتابوں سے جو بڑے بڑے عالموں اور مصنفوں نے تصنیف کی ہیں سبق دیتے ہیں۔ مگر آج میں تم کو ایسی کتاب سے سبق دینا چاہتا ہوں جو نہ کاغذ پر لکھی ہوئی ہے نہ کسی پریس کی چھپی ہوئی ہے، نہ کسی مصنف کی بنائی ہوئی ہے۔ بلکہ قدرت نے اپنے کامل اور فیاض ہاتھوں سے اس کو بنایا ہے۔ اس کے حروف بہت پرکار اور مجسم ہیں مگر ان کا دیکھنا اور پڑھنا کسی قدر مشکل ہے اس کے معانی بھی بہت آشکارا ہیں مگر ان کا سمجھنا کچھ آسان نہیں۔ اس کے پڑھنے کے لئے اس کے کھولنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تمہاری آنکھ کے سامنے ہر وقت کھلی ہوئی ہے۔ اس کتاب کو تم اپنے کالج کی لائبریری یا اپنی میز کی کتابوں میں مت ڈھونڈو۔ وہ ہر وقت تمہارے پاس موجود ہے۔ وہ کتاب کیا ہے؟ خود تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا اس کالج میں ایک جگہ جمع ہونا ہے۔ پس تم کو سمجھنا ہے کہ اس کتاب کو کیونکر پڑھو اور اس کے معنی کیونکر سمجھو۔

اے عزیزو۔ اس کتاب کا نام ہے "کالج لائف یا نئی زندگی"۔ یہی اصلی کتاب ہے اور اسی کا پڑھنا اور اسی کا سمجھنا ــــ اصلی فائدہ اور اصلی مقصود زندگی کا اور اس کالج کا ہے اس کتاب کو اگر تم نے اچھی طرح پڑھا اور اچھی طرح رکھا اور داغدار نہ کیا تو تمہاری آئندہ زندگی وہ زندگی ہوگی جس کے لئے انسان کو زندہ رہنا چاہئے۔ ورنہ اس کی زندگی اور موت دونوں برابر ہیں بلکہ موت زندگی سے بہتر ہے۔ تم اپنی زندگی کے پچھلے زمانوں پر غور کرو اور سمجھو کہ ہر ایک زمانہ تمہاری زندگی میں ایک نئی زندگی کا زمانہ گذرا ہے۔ جب تم بچے تھے اور کچھ نہیں جانتے تھے۔ تمہاری مائیں اپنی مادرانہ محبت سے تمہاری پرورش کرتی تھیں۔ اگر وہ نہ کرتیں تو تمہارا زندہ رہنا محال تھا۔ چند سال بعد تمہاری زندگی میں ایک دوسرا زمانہ آیا جب کہ تم خود چلنے پھرنے اور اپنے آپ کھانے پینے لگے۔ یہ زندگی پہلی زندگی سے نئی زندگی اور حیوانوں کی زندگی میں بہت کم فرق تھا۔ یہ زمانہ بھی تمہاری زندگی کا گذر گیا اور تم ایک نئی زندگی میں آئے جس میں تم کو تعلیم کی اور مذہبی باتیں سکھانے کی اور ان باتوں کی تعلیم کی ضرورت تھی جو تمہاری آئندہ زندگی کے لیے ضروری تھیں۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، ۱۰ اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

یہ زمانہ بھی چند سال میں گذر گیا اور تم ایک اور نئی زندگی میں آئے جو خطرات سے خالی نہ تھی۔ اس زندگی میں تم ایسے آرام سے نہ تھے جیسے کہ پہلی زندگیوں میں تھے کیوں کہ تم ہی میں بہت سے دشمن تمہارے پیدا ہو گئے تھے اور ہر وقت تمہاری گھات میں لگے ہوئے تھے۔ تمہاری آنکھوں پر انہوں نے ایک قسم کا پردہ ڈال دیا تھا کہ تم کو نیک و بد کچھ نہیں دکھائی دیتا تھا۔ تمہارے ماں باپ نے جہاں تک ان سے ہو سکا تم کو ان دشمنوں سے بچایا۔ کوئی بچ گیا۔ کوئی کسی قدر دشمنوں کے منہ میں پھنسا اور کوئی دشمنوں کے جال میں ایسا پھنسا جس کا نکلنا ناممکن ہوا۔ مگر جو بچے یا کسی قدر بچے دشمنوں نے ان کا بھی ساتھ نہیں چھوڑا اور گھات میں لگے رہنے سے غافل نہیں ہوئے تم ان کو نہیں دیکھتے تھے اور وہ تمہارے ساتھ رہتے تھے اور کبھی اپنی صورت اس طرح سے تم کو دکھاتے تھے کہ تم ان کو اپنا دوست سمجھتے تھے حالانکہ وہ تمہارے دشمن تھے۔

یہ زمانہ بھی تمہاری زندگی کا گذر گیا مگر اس درمیان میں تم اپنے دشمنوں سے واقف ہو گئے اور ان سے پناہ میں رہنے کے لئے تم نے ایک نہایت زبردست اور عاقل ماں تلاش کی اور اپنے آپ کو اس کی حفاظت میں سپرد کیا اور ایک نئی زندگی میں داخل ہوئے۔ تم سمجھے کہ تمہاری وہ عاقل ماں ہے۔ کون؟ یہ کالج ہے جس میں تم داخل ہو اور اب تم سب اس کے بچے ہو۔ تم سمجھے کہ وہ تمہاری نئی زندگی کیا ہے۔ وہ کالج لائف ہے۔ اگر تم نے اس کو اچھی طرح گذارا تو تمہارا بیڑا پار ہے ورنہ منجدھار میں ڈوبنا ہے جس کے بعد پھر ابھرنا اور ترنا نہیں۔ اب تم کو اختیار ہے کہ چاہو اپنا بیڑا پار لگاؤ۔ چاہو منجدھار میں ڈبوؤ۔ اب مجھ کو یہ بتانا ہے کہ تم کو کالج لائف سے کیوں کر فائدہ اٹھانا اور اس کو کیوں کر گذارنا چاہئے۔

سب سے اول اور تمام برکتوں کی جڑ جو تمہارا آپس میں سلوک اور محبت سے رہنا ہے تمام طالب علم پورب کے ہوں یا پچھم کے۔ اوتر کے ہوں یا دکھن کے۔ جب وہ سب تمہاری اس عاقل ماں کی گود میں پڑے ہیں تو وہ سب تمہارے بھائی ہیں۔ اگر تم نے ان کے ساتھ مثل بھائی بھائی کے برتاؤ نہ کیا اور برادرانہ محبت ایک دوسرے کے ساتھ نہ برتی تو تم نے اس پہلے اصول کو کہ تم سب ایک عاقل ماں کے بچے ہو توڑ دیا اور جس طرح ایمان کے لئے کلمہ توحید پہلا رکن ایمان کا ہے۔ اسی طرح وحدت پہلا رکن بورڈنگ ہوس کی فائدہ مندی کے لئے ہے اور جس طرح ایمان کا پہلا رکن توڑنے سے آدمی ایمان کے لائق نہیں رہتا۔ اسی طرح بورڈنگ ہوس کا پہلا رکن توڑنے سے آدمی بورڈنگ ہوس کے قابل نہیں رہتا۔ اس لئے تم کو لازم ہے کہ مثل ماں جائے بھائی کے آپس میں محبت اور دوستی برتو۔ بورڈنگ ہوس ایک کل ہے قوم کو قوم بنانے کی اگر اس کے پرزے درستی سے چلتے ہیں تو وہ اپنا کام کرے گی ورنہ کسی کام کی نہیں۔ تم اس کل کے پرزے ہو اور اس لئے اس سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہو۔ تمہارا درست اور کام کے قابل رہنا سب سے مقدم ہے۔ تمہارا کھانا۔ پینا۔ رہنا سہنا۔ آپس میں ہر وقت ملنا۔ سوسائٹی میں شریک رہنا۔ کھیلوں کو آپس میں مل کر کھیلنا۔ لٹریری جلسوں میں شریک رہنا۔ یہ سب باتیں اس لئے ہیں کہ آپس میں محبت اور دوستی ایک دوسرے کی ہمدردی پیدا ہو جو بنیاد قوم کے قوم بننے کی ہے پھر اگر تم نے اس میں قصور کیا تو تمام قوم کا مظلمہ تمہارے سر ہو گا اور تم پر افسوس ہو گا کہ جس عمارت کی تم خود ایک اینٹ ہو اسی عمارت کو تم برباد کرنا چاہتے ہو۔ تمام چیزیں جو دنیا میں عقلی و ذہنی ہیں ان کا کچھ نہ کچھ نشان ظاہر میں بھی پایا جاتا ہے۔ تم جانتے ہو کہ اس برادری اور دلی محبت اور دوستی کا جو تم آپس میں اپنی عاقل ماں کے بچے ہونے میں رکھتے ہو ظاہری نشان کیا ہے۔ یہ نشان کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں ہے۔ خدا کا بنایا ہوا ہے۔ جس کے پورا نہ کرنے سے تم صرف دنیا ہی میں ملامت کے

قابل نہیں ہوتے بلکہ خدا کی ناراضی کے بھی مستحق ہوتے ہو۔ وہ نشان کیا کہ وہ واحد ہے تمہاری آپس کی وحدت کے لئے مقرر کیا ہے۔

جب تم سب نماز کے لئے ایک جگہ جمع ہوگے اور جماعت سے نماز پڑھوگے تو علاوہ اس کے کہ تم خدا کا فرض ادا کروگے اس دلی یگانگت کو جو تم آپس میں رکھتے ہوگے عملی طور پر بھی پورا کروگے۔ مجھے نہایت افسوس ہے کہ شیعہ اور سنیوں نے اپنی اپنی نادانی سے خدا کا فرض ادا کرنے میں بھی تفرقہ ڈالا ہے۔ میں اس کو مٹانا نہیں چاہتا۔ کیوں کہ وہ بجز خدا کے مٹائے مٹ نہیں سکتا۔ مگر میں مسلمان شیعہ طالب علموں کو بھی یہ ضرور کہوں گا کہ نماز کے وقت وہ بھی مسجد میں موجود رہیں جس سے اسلام کی شان اور ایک خدا کے پوجنے والوں کی کثرت ظاہر ہو اور بعد کو وہ بھی اپنے اپنے طریقہ پر اسی زمین پر سجدہ کریں جس پر ان کے بھائیوں نے سجدہ کیا ہے۔ اس وحدت کے قائم کرنے کو شیعہ و سنی دونوں کے لئے ایک مسجد بنائی گئی ہے اور شاید تمام ہندوستان میں آپس میں شیعہ اور سنیوں کے اتحاد کی یہ ایک ہی مثال ہے۔ پس اے میرے عزیز شیعہ طالب علموں اور اے میرے عزیز سنی طالب علموں۔ تم اس وحدت کو قائم رکھو اور جہاں تک ہو تفرقہ کو مٹاؤ کہ اس وحدت کا قائم رکھنا تمہارے دین و دنیا دونوں کی بہبودی کا باعث ہے۔

ایک اور چیز اس وحدت اور آپس میں یگانگت پیدا کرنے کی ہے۔ وہ کیا ہے۔ تم سب بورڈروں کا اور خصوصاً کالج کلاس کے طالب علموں کا ایک سا لباس ہونا۔ شاید کچھ لوگ ایسے بھی ہوں جو اس کو تسلیم نہ کرتے ہوں اور کہتے ہوں کہ ظاہری چیزوں کو اندرونی جذبات کی اصلاح سے کیا تعلق ہے۔ مگر یہ محض غلطی ہے۔ مذہب کی رو سے دنیا کے برتاؤ کی رو سے بہت سی ظاہری چیزیں ایسی ہیں جو اندرونی جذبات پر اثر کرتی ہیں۔ دو شخص جو آپس میں ملتے ہیں اور معین اشاروں سے ایک دوسرے کو مطلع کرتے ہیں کہ وہ فری میسن ہیں۔ شاید تم کو معلوم نہ ہوگا مگر اس امر کے جاننے کے بعد جو جوش محبت و یگانگت ان کے دل میں پیدا ہوتا ہے وہ دوسرے کے ساتھ پیدا نہیں ہوتا۔ تمہارا ایک سا لباس ہونا اس سے زیادہ اندرونی جذبات کی اصلاح کا ہمیشہ محرک ہوگا۔ بڑے بڑے مہذب ملکوں کے کالجوں میں ایک قسم کا متحد لباس طالب علموں کے لئے مقرر ہے۔ ان کالجوں کو جانے دو تم اپنے مذہب کے بعض مشائخوں کے خاندانوں مثل صابری اور آبادانی۔ ناصری وغیرہ کو دیکھو کہ انہوں نے اسی یکجہتی کو قائم رکھنے کے لئے اپنے مریدوں کے لئے ایک قسم کا لباس یا نشان مقرر کیا تھا۔ میں بہت سوں سے واقف ہوں اور یقین کرتا ہوں کہ آپس میں دوستی اور یکجہتی پیدا کرنے کو یہ بھی ایک عمدہ طریقہ ہے۔ تمہاری ڈریس یکساں ہونے کا ایک امپارٹمنٹ معاملہ ہے۔ ٹرسٹیوں کے اجلاس منعقدہ ۲۹ جولائی ۱۸۹۴ء میں یہ معاملہ پیش ہوا تھا اس کی نسبت یہ تجویز ہوئی کہ عام طور پر لوگوں کی رائے دریافت کی جاوے پھر ٹرسٹیوں کی ایک کمیٹی ہو وہ فیصلہ کرے کہ وہ ڈریس لازمی کی جاوے یا نہیں؛ مجھ کو معلوم ہوا ہے کہ جو لباس چند طالب علموں کے لئے بطور نمونہ کے بنا ہے اس کو اکثر ٹرسٹی پسند کرتے ہیں جو بحث باقی ہے وہ لازمی کرنے یا نہ کرنے کی نسبت باقی ہے۔

اے عزیزو۔ اب مجھے تم کو ایک اور بات بتانی باقی ہے اور وہ یہ ہے کہ جس عاقل ماں کی گود میں تم بڑے ہو اس میں جو سب سے اعلیٰ چیز ہے وہ اس کی روح ہے۔ تم جانتے ہو کہ وہ روح کیا ہے۔ وہ روح استاد ہیں جو تم کو تعلیم دیتے ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ ان کا حد سے زیادہ ادب اور ان کی فرماں برداری کرو۔ ہم مسلمانوں میں استاد اور باپ کا درجہ ادب اور فرماں برداری

تہذیب الاخلاق، علی گڈھ، ۱ اکتوبر، نومبر ۱۸۹۴ء

میں برابر ہے۔ یہ شکایت سننے میں آئی ہے کہ انگریزی خواں طالب علم اپنے استادوں اور اپنے ماں باپوں کا ادب نہیں کرتے۔ میں یقین کرتا ہوں کہ تم میں ایسا کوئی نہیں ہے۔ مگر جو انگریزی خواں طالب علم ایسا کرتے ہیں وہ دنیا کی اور خدا کی لعنت کے مستحق ہیں۔ ماں باپ ان کا جسم پیدا کرنے والے ہیں اور استاد ان میں انسانیت ڈالتے ہیں اور اس لئے استادوں کا درجہ حقیقت میں ماں باپ سے بھی زیادہ ہے۔ جب خدا نے ماں باپ کی نسبت فرمایا ہے کہ (انہیں اف تک نہ کہو نہ انہیں جھڑک کر جواب دو بلکہ ان سے احترام کے ساتھ بات کرو)۔ تو اسی پر قیاس کرلو کہ تم کو استادوں کا کس قدر ادب کرنا واجب ہے۔

تمہاری صحت اور تمہاری جسمانی قوت کی ترقی کا تمہارے کالج کے افسروں کو کس قدر خیال ہے۔ ڈسپنسری تمہارے کالج کے احاطے میں موجود ہے۔ عمدہ سے عمدہ دوائیں اس میں موجود ہیں۔ متعدد کمپونڈر اور ڈاکٹر کالج کے احاطہ میں دن رات موجود رہتے ہیں۔ تم کو قواعد اور جمناسٹک سکھانے کو ماسٹر موجود ہے۔ گھوڑے کی سواری سکھانے کو رائڈنگ اسکول اور سواری سکھانے والا استاد موجود ہے۔ کرکٹ اور فٹ بال کے کھیل تمہارے لئے مہیا ہیں۔

ایک انگریزی اخبار کا ایڈیٹر لکھتا ہے کہ مدرستہ العلوم کے طالب علموں نے ابھی تک دوسرے کالج کے طالب علموں سے کچھ فوقیت نہیں دکھائی ہے، مگر اخلاق اور تہذیب میں۔ راستی اور جنٹلمینی میں جو تم نے ترقی کی ہے۔ بیرونی اشخاص نہ اس کو دیکھ سکتے ہیں۔ اور نہ جان سکتے ہیں۔ ان کا مبلغ علم یونی ورسٹی کی ڈگریوں کی فہرست پر منحصر ہے۔ بہرحال ان کا یہ خیال صحیح ہو یا غلط تم کو ایسی کوشش اور محنت کرنی چاہئے کہ علم کی شاخوں میں بھی تمہاری شہرت اور نام آوری ہو۔ تم عمدہ ادیب عمدہ مصنف بنو تا کہ اپنی قوم کو فائدہ پہنچا سکو۔ اس بات کو بھی تم سمجھو کہ جو خوبیاں میں تم میں پیدا ہونی چاہتا ہوں وہ کیوں کر پیدا ہو سکتی ہیں وہ صرف ایک بات سے پیدا ہوتی ہیں یعنی وقت کی پابندی کرنا اور وقت کو ضائع نہ ہونے دینا۔ مجھ کو افسوس ہے کہ ہم ہندوستانیوں کو وقت کی قدر نہیں ہے اور اس لیے اس کے ضائع ہونے کا افسوس بھی نہیں ہے تم وقت کی قدر کرو اور یقین کرلو کہ "گیا وقت پھر ہاتھ آتا نہیں" جب تم وقت کی قدر کرو گے تو اس کا قدر کرنا خود تم کو وقت کی پابندی سکھاوے گا۔ تمہارا بورڈنگ ہوس میں رہنا اسی وقت زیادہ مفید ہو گا جب تم وقت کی پابندی اختیار کرو گے۔

ایک دل چسپ نقل ہے کہ ایک لڑکے کا دوست بہت دور دراز سفر میں گیا جہاں ہزاروں عمدہ سے عمدہ خوب صورت اور دل خوش کرنے والی چیزیں تھیں اس نے خیال کیا کہ اس لڑکے کے لئے میں کیا لے جاؤں۔ آخر کو سوچا کہ اس کے لئے گھڑی سے زیادہ کوئی عمدہ چیز نہیں ہے جو اس کو بتلادے کہ کس وقت کیا کام کرنا ہے اور کس قدر وقت اس نے ضائع کیا ہے اور کس قدر کام میں صرف کیا ہے۔ پس اے عزیز طالب علموں تم کو اپنی مراد پر پہنچنے کے لئے سب سے مقدم وقت کی قدر کرنا اور اس کی پابندی کرنا ہے۔

یہ چند باتیں جو تمہارے کالج لائف کے لئے سب سے مقدم ہیں میں نے تم کو سمجھائی ہیں اور آئندہ کسی لکچر میں اور ضروری باتیں تم کو سمجھاؤں گا مگر اب میں تمہاری دینی اور دنیوی بھلائی اور بہتری و ترقی کے لئے خدا سے دعا کرتا ہوں اور آخر کو تم سے بتاکید کہتا ہوں کہ ہز آنر لفٹنٹ گورنر نے جو تمہاری نسبت یہ فقرہ اپنی اسپیچ میں کہا ہے کہ "اس کالج کے طالب علموں میں یہ صفت ہے کہ راست باز اور دلیر اور گورنمنٹ کے خیر خواہ ہیں" اس کو کبھی مت بھولنا اور اپنی پرائیویٹ اور پبلک لائف میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم رہنا اللہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں کہیں بھی ہو۔

تہذیب الاخلاق، علی گڈھ، ۱ اکتوبر، نومبر ۱۸۹۴ء

پروفیسر رشید احمد صدیقی

عزیزانِ علی گڑھ

(ایک اقتباس)

عزیزو!

سرسید نے اس ادارے کو جن حالات کے ماتحت قائم کیا اور جس طرح اس ادارے نے ان حالات کو سدھارنے میں مدد پہنچائی اور ہم سب کو امید، حوصلہ، وسیع المشربی اور علم و فن کو فروغ دینے کی زندگی اور ذمہ داری سے ہم کنار کیا۔ نیز سرسید کی جیسی عظیم شخصیت تھی اس کے پیش نظر اس کی جرات ہوئی کہ آپ کو وقت کی نزاکتوں کا احساس دلاؤں اور کچھ کر دکھانے کی آپ سے درخواست کروں۔ ملک کی تمام چھوٹی بڑی تعلیم گاہوں میں اور ان کے باہر بھی کچھ نوجوانوں بالخصوص طلبہ نے بدحالی پھیلا رکھی ہے اور اپنے ہی اٹھائے ہوئے طوفان کے جس طور پر تھپیڑے کھا رہے ہیں وہ صرف آپ کے تعاون و طرز عمل سے دور کی جا سکتی ہے۔ سو سال پہلے سرسید نے مسلمانوں کو دکھ اور درماندگی میں پاکر جن خطوط اور عزم و ایمان کے ساتھ اس ادارے کی بنیاد رکھی تھی۔ آج اس سے زیادہ سنگین آزمائش کا سامنا ہے۔ ہمارے سامنے سوچا سمجھا ہوا کوئی ہمہ جہتی پروگرام یا منصوبہ ہے نہ کوئی محکم و معتبر قیادت میسر ہے۔ ایسے میں ہمارا آپ کا ذہن بے اختیار علی گڑھ کی طرف جاتا ہے کہ یہ مہم علی گڑھ کے دیئے ہوئے سایہ اور روشنی میں انجام پا سکتی ہے۔ کام بہت اچھا، بہت بڑا، بہت مشکل اور بہت دنوں تک امید و استقامت سے کرنے کا ہے۔ ایسے کام کل نہیں تھوڑے سے بھی انجام پا جائیں تو اس کو کارنامہ کہیں گے مایوسی و تاریکی دور ہونے لگے گی اور حوصلے بڑھ جائیں گے۔ آپ ہی کے نہیں چھوٹے بڑے ہم سب کے، جب ہر طرف تاریکی چھائی ہو اور فتنے بیدار ہوں اس میں اضافہ کرنا اور ہجوم کے ساتھ ہو لینا علی گڑھ کو زیب نہیں دیتا۔ ایسا کریں گے تو آئندہ نسل کو کیا جواب دیں گے۔ اسی طرح جوابدہی کا ہمارا آپ کا مذہبی تصور یوم الحساب ہے اقبال کا یہ شعر آپ کے ذہن میں ہوگا۔

زلزلے ہیں، بجلیاں ہیں، قحط ہیں آلام ہیں   کیسی کیسی دخترانِ مادرِ ایام ہیں

شعر پرانا ہے جب ہم آپ اور ہماری طرح بہت سی دوسری قومیں اور ممالک آزاد نہیں ہوئے تھے اور فیملی پلاننگ کی کسی کو خبر نہ تھی۔ چنانچہ "دخترانِ مادرِ ایام" نے افزائش نسل کے جیسے جیسے گل کھلائے ان کے باغ و بہار ملاحظہ ہوں۔ لوٹ مار، اغوا، خونریزی، آتش زنی، زبردست، زیردست، زیر دست آزاد حکومتوں کا جدل و جدال اور اقوام و ممالک کا آئے دن زیر و زبر ہوتے رہنا اور

سفاکی کے سانحے، ناقابل برداشت مہنگائی، بے شمار بچوں، بوڑھوں کا بھوک اور بے بسی سے مر جانا۔ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں بے روزگاری، املاک کی تباہی، جارحانہ جلوس، ہڑتال، فسادات عام زندگی کے نظم میں یاس وہراس کا دخل، طلبہ کی شورش، تعلیمی معیار کی پستی، ذخیرہ اندوزی، کھانے پینے کی اشیاء اور دواداروں میں ملاوٹ، تباہ کن منشیات کا عالمی کاروبار، نوعمر لڑکے لڑکیوں کا ان کا عادی ہوتے جانا، رشوت ستانی اقربا پروری، بے غیرتی، خاص و عام کا اس مواخذہ سے بے فکر اور محاسبہ سے آزاد ہونا، مذہب، اخلاق اور تہذیب سے بے گانگی، ہر ممکن جنسی ترغیب و تشنگی کی ہمہ وقت ہر طرح اور ہر قیمت پر آسودگی، شعر و ادب، فنون لطیفہ اور اقدار عالیہ کی بے حرمتی، نامرادی، نحوست و نجاست کے مارے ہوئے نوجوان لڑکے لڑکیوں کی گلی کوچوں میں پھرتی بھٹکتی ہوئی ٹولیاں اور ان سب پر فوق برطانوی پارلیمنٹ اور دوسرے ایسے اداروں کے وہ قوانین جو قبیح جنسی بدکاریوں اور شناعتوں کو سند جواز دیتے رہتے ہیں۔

جہاں جائیے جدھر دیکھئے کم و بیش یہی عالم ہے۔ ہر کلفت سے بچنے اور ہر عیش سے لذت یاب ہونے کی جو سہولتیں فراہم ہیں ان پر ہر حال میں قابض ہو جانے کی ہوس اور اس مقصد کے حصول میں دوسروں کے حقوق کو پامال کرنے میں تمام ممنوعات کو نظر انداز کر دینا جیسے زندگی کا مقصد اولین قرار پا چکا ہے۔ زندگی کو یکسر فراغت، عشرت اور بے غیرتی کا گہوارہ بنانا اور ہر دکھ درد سے منہ موڑ لینا شقاوت ہے۔ اس سے شدید ردعمل کا سامنا ہوتا ہے جس کی تفصیل اوپر گذر چکی ہے۔ اس طریق زندگی سے اس حیرت انگیز اور عظیم توازن میں خلل پڑتا ہے جس کو نظام حیات و کائنات کہتے ہیں۔ اس اختلال کو ہر شریعت میں گناہ قرار دیا گیا ہے۔ موجودہ رستاخیز میں اس کے المناک شواہد ہر جگہ ملیں گے۔

آج کل امریکہ کے چھپے اور کھلے جبر و جبروت کا جو عالم ہے اس سے کون نہیں واقف ہے۔ محتاج، ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ممالک اس کے ہاتھوں میں صید زبوں سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے۔ اس کی سیاسی تنظیم اور بالادستی حرب و ضرب کی قوت، سامان خورد و نوش، عیش و نشاط کی فراوانی، صنعت و حرفت، علم و فن کو فروغ، سائنس اور ٹیکنالوجی کے بے مثل کارنامے، نشر و اشاعت، مواصلات کی حیرت انگیز سہولتیں اور کیا کچھ اور نہیں، ان سے کون انکار کر سکتا ہے۔ لیکن دیکھنے میں یہی آرہا ہے کہ امریکہ کے باشندے (اور یورپ کے بھی) زندگی کی طرف سے ہم نیاز مندوں سے کچھ زیادہ ہی بددل اور بیزار ہیں۔ حکومت، معاشرہ اور فرد میں وہ یک جہتی اور ہم انحصاری نہیں ہے جو زندگی کو گوارا، بامقصد اور برگزیدہ بناتی ہے۔ اکثر ایسا محسوس ہوا ہے جیسے کہ دور وحشت ہی کی اپنی بربریت نہ ہوتی ہو بلکہ دور تمدن کی بھی اپنی بربریت ہوتی ہو! جو اول الذکر سے کہیں زیادہ نامبارک ہوتی ہے۔ قطع نظر اس سے کہ دنیا امریکہ سے بدگمان رہتی ہے۔ خود وہاں کیسے کیسے لرزہ خیز اور انسانیت سوز جرائم شب و روز وقوع میں آتے رہتے ہیں۔ زندگی میں اس تہلکہ، تلخی اور نامرادی کے اسباب کا اس وقت تجزیہ مقصد نہیں ہے۔ لیکن یہ کہنا ہی پڑتا ہے کہ جب تک کوئی راستہ کسی اعلیٰ عقیدہ اور عمل کے ماتحت جو افراد، اقوام اور ممالک کے محدود مصالح و مقاصد سے علیحدہ اور بلند ہو کر زندگی کے معتقدات کے قیام، استحکام اور نفاذ کے لئے اختیار نہ کیا جائے گا۔ وہ زندگی کی صحت یا معاشرت میں کامیاب نہ ہو سکے گا۔ حالات کو دیکھتے ہوئے اب آسانی سے کہا یا مانا نہیں جا سکتا کہ مغرب کا طرز عمل بہر گونہ قابل اعتبار ہے۔ یہ اندیشہ کسی تعصب کی بنا پر نہیں تجربہ کی بنا پر ہے۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

میں اتنا مایوس یا مراقی نہیں ہوں جتنا شاید آپ میری گفتگو یا حلیہ سے اندازہ کرتے ہوں۔ میں امید اور حوصلہ اور صلح و سچائی پر ایمان رکھتا ہوں اس لئے کہ مسلمان ہوں اور علی گڑھ کی فیض بخشیوں سے سرفراز ہوں۔ کہنا یہ ہے کہ جو ذہن زہر آب تیار کرتا ہے وہی ذہن آب حیات بھی بناتا ہے، اس تضاد کو معتدل و متوازن رکھنے کا عمل انسان کے ذہن اخلاق و معاشرہ کی صحت اور توانائی کی ضمانت ہے۔ اس وقت دنیا کے ہر خطہ میں بکیر و بکش اور مسابقت و منفعت اور نفی و انکار کی ہلچل ہے جسے ایک اصطلاح میں نفی و انکار "یا" لا" کا مرحلہ یا جملہ کہتے ہیں۔ جن قوتوں کے شدائد سے یہ بلائیں بے زنجیر ہوئی ہیں ان کو زیر کرنے اور تعمیری و تہذیبی سمت و رفتار دینے کے لئے بالکل دوسرے عوامل کو بر سر کار لانا پڑے گا جن سے آپ نا واقف نہیں ہیں۔ اندیشہ اس کا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تخریبی قوتوں کی مسلسل سر کشی سے وہ صالح عوامل مضمحل ہو جائیں جن سے انسانیت کی حفاظت اور آبیاری ہوتی رہتی ہے۔ اس طرح آپ نوجوان نفی و انکار کے فشار کی تاب نہ لا کر "لا" کے کسی ویرانے میں سرگرداں یا واماندہ راہ نہ رہ جائیں۔ "لا" و "الا" کے مرحلوں سے نوجوان نسلوں کو لازماً گذرنا پڑتا ہے۔ مبارک ہیں وہ نسلیں جو اس مرحلہ و منزل سے بطریق احسن گذر جاتے ہیں۔ اس کے بعد شرف و سعادت کی منزلت و معراج ہے۔ معراج نبوی ہر فرد کے لئے اس کی آرزو مندی اور سعی پیہم کے اعتبار سے معراج کی بشارت ہے اتنا موقع محل نہیں جتنا بھول جانے کے اندیشہ سے مجبور ہو کر یہاں اتنا اور عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میں مراقبہ، وظائف یا چلہ کشی سے نجات اخروی حاصل کرنے کا قائل نہیں ہوں جب تک ان مشاغل کو بامقصد اور بابرکت بنانے کے لئے خلق کی خدمت اور خیر خواہی کے لیے ہم اپنے آپ کو وقف نہ رکھیں۔

ہر جگہ طلبہ کے موجودہ عام طرز عمل کے بارے میں جو کچھ دیکھتا اور سنتا ہوں اس سے بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ جیسے اپنے ہی خاندان اور گوشت پوست کا نوجوان اپنی اور قبیلہ کی ناموس لٹا رہا ہو۔ اس قیمت پر تو کوئی سودا نہیں کیا جاسکتا خواہ وہ کتنا ہی ضروری بتایا جائے۔ ہر جگہ بیشتر طالب علموں نے غیر ذمہ داری کا جو رویہ اختیار کیا ہے وہ اکثر ویسا ہی ہوتا ہے جو سوسائٹی میں نامبارک و خطرناک عوامل و عناصر کا ہوتا ہے۔ طلبہ نے اپنی تعلیم و تربیت، تہذیب اور روزگار کے مسائل کو "لا اینڈ آرڈر" (نظم و نسق) کا مسئلہ بنا دیا ہے۔ یہ رول کسی طرح ان کے شایان شان نہیں۔ کبھی کبھی اتفاق سے ایسا ہو جائے تو حرج نہیں لیکن اس کو پیشہ یا پروگرام بنالینا ثقات کا کیا سوال عجب نہیں عوام بھی اس کو پسندیدہ نہ سمجھتے ہوں۔ یہ اس لیے کہتا ہوں کہ طالب علموں کے ماں باپ ثقات ہی نہیں عوام بھی ہوتے ہیں اور شمار میں کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ میری نظر سے اب تک ایسے والدین نہیں گذرے ہیں خواہ وہ کسی طبقہ یا پیشہ سے تعلق رکھتے ہوں، جو اپنی اولاد کی بھلائی اور بڑائی کے لئے یکساں طور پر خلوص و خشیت سے دعا نہ مانگتے ہوں۔ ذمہ داریوں سے منہ موڑنا بڑی بے غیرتی ہے۔ یہ کہنے سے کام نہیں چلے گا کہ پرانی باتوں کا اب چلن نہیں رہا۔ اس لیے کہ وہ موجودہ تقاضوں سے ہم آہنگ نہیں رہیں۔ لیکن اس سے یہ کیونکر ثابت ہوا کہ نئے اوضاع و اطوار بہر گونہ پسندیدہ اور "واجب الاذعان" ہیں۔ آپ کی پسند یا ناپسند سے کام نہیں بنتا۔ دیکھنا یہ ہوگا کہ کس طریق عمل سے زندگی میں بہتری اور برتری آئی اور کس سے ادبار و انتشار۔ اول الذکر ہی کو اختیار کرنا پڑے گا خواہ اس کا کہنے والا یا اس پر عمل کرنے والا دنیا میں اکیلا ہی کیوں نہ ہو!

لیکن کیا کیجئے جب دیکھنے میں یہ آرہا ہو کہ آپ نوجوانوں کے ہم بزرگ اور قوم اور ملک کے سربراہ اپنے نارواغراض و

مقاصد کے پیش نظر آپ سے ہر سوداہر قیمت پر ہمہ وقت کرنے کے لئے قطعاً یک طرفہ منتظر اور مشتاق رہتے ہوں۔ مہا بھارت کے رزمیہ میں آیا ہے کہ پانچوں پانڈووں نے اپنی بیوی دروپدی کو جوئے کی بازی پر لگا دیا تھا اور ہار گئے تھے۔ آج کی مہابھارت میں بوڑھے اپنی نوجوان اولاد کو ہر داؤں پر لگاتے رہتے ہیں۔ اس فرق کے ساتھ کہ وہ خود جیتتے رہتے ہیں اور اولاد ہارتی رہتی ہے۔ دروپدی کے ناموس کو کرشن جی نے بچایا تھا۔ دیکھنا یہ ہے کہ آپ نوجوانوں کی عفت بچانے کے لئے کون سے کرشن کہاں اور کب نمودار ہوتے ہیں لیکن زندگی کا ایک نام اور تعبیر جوانی بھی ہے جو نہ کبھی ہارتی ہے نہ مرتی ہے اور جو نہیں مرتا اس کے مبارک مقدس اور معظم ہونے میں کلام نہیں۔ آپ کی مثال پہاڑی ندی کی ہے جو کوہستانی نشیب و فراز میں شور مچاتی، ہر شے کو جو اس کے راستے میں آتی ہے اس کو توڑتی پھوڑتی میدان میں اترتی ہے تو عقل مند اس کی بے پایاں توانائی کو کثیر المقاصد اور کثیر المنفعت منصوبوں میں منتقل کر دیتے ہیں۔ پھر وہ اتنی مقدس اور اتنی فیض بخش اور فیض رساں ہو جاتی ہے کہ لوگ اس کو دیوی دیوتاؤں کا درجہ دے دیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ مذہب تہذیب اور انسانیت کا یہ دریائی گہوارہ قرار پائیں۔ آپ نوجوانوں کی یہی روش اور روانی اور روایت ہونی چاہیئے۔

نظر و خبر

ڈاکٹر محمد مسعود عالم قاسمی *

سرسیّد اور عشقِ رسول ؐ

رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور ان کی اطاعت ایمان کے دو بنیادی عناصر ہیں، جس شخص کے دل میں اللہ کے رسول کی محبت نہ ہو اور ان کی اطاعت کا جذبہ نہ ہو وہ صاحب ایمان نہیں ہو سکتا، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ "تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے لیے اس کے باپ، بیٹے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں "(۱) اور اطاعت کے متعلق نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

"جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔"(۲)

سرسید احمد خاں ان دونوں معنوں میں عاشق رسول تھے یعنی ان کے اندر محبت رسول کا ابلتا ہوا چشمہ بھی موجود تھا اور وہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرماں بردار بھی تھے۔ سرسید کے بعض مذہبی خیالات اور دینی اجتہادات پر بلاشبہ نہ صرف علماء اہل سنت نے تنقید کی بلکہ خود ان کے قریبی احباب نے بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ اور سرسید نے خود بھی اپنی تمام باتوں کو عین حق بنا کر پیش نہیں کیا بلکہ اتفاق و اختلاف کا عالی ظرفی کے ساتھ ہمیشہ ہی دروازہ کھلا رکھا۔ یہاں تک کہ اپنے ہی قائم کردہ ایم او کالج (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) کے شعبہ دینیات کے نصاب سے اپنی کتابوں کو الگ رکھا۔ مگر کیا سرسید کے بعض مذہبی اجتہادات یا تجدد پسندانہ خیالات کی بنا پر ان کے عشق و اتباع کو مشکوک ٹھہرایا جا سکتا ہے؟ نہیں یہ خلاف انصاف ہے اگر یہ درست ہوتا تو مسلمانوں کے قدیم اساطین علم فن مثلاً امام غزالی، امام ابن تیمیہ اور امام شاہ ولی اللہ کو ان کے عہد میں ان کی بعض تحریروں کی وجہ سے نشانہ تنقید بنایا گیا لیکن آج کوئی بھی نہیں جو ان کے عشق و اتباع رسول پر انگلی اٹھائے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مذہبی امور میں تجدیدی خیالات کے دو محرک ہو سکتے ہیں ایک محرک مسلمانوں کو ان کے اساسی عقائد، تہذیبی ورثہ اور دینی نظام سے منحرف کرنے کا، دوسرا مسلمانوں کی عزت و آبرو، اعزاز و وقار کو نئے ماحول اور بدلتے ہوئے حالات میں محفوظ رکھنے کا پہلے محرک کی اساس نفاق اور الحاد ہے۔ جبکہ دوسرے محرک کی بنیاد، عشق و اتباع رسول پر ہے۔

سرسید کی تقریروں، تحریروں تعلیمی کارناموں اور سماجی و سیاسی سرگرمیوں سے جو شخص ادنیٰ سی بھی واقفیت رکھتا ہے اس کا دل گواہی دے گا کہ سرسید کا مقصد انگریزوں کے ظالمانہ عہد اور متعصبانہ ماحول میں اسلام اور مسلمان کی عظمت کو

---

* ناظم دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

بچانا تھا۔ گویا مقصد سے اختلاف نہیں کیا جاسکتا، اسے حاصل کرنے کے طریقے اور حکمت سے بھلے ہی اختلاف کیا جائے، سچ تو یہ ہے کہ عشق کی سرمستی روایات کی پابندی بھلا دیتی ہے شاید یہی بھول سرسید سے ہوئی۔ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی جنھوں نے سرسید کے جملہ مقالات خطبات اور کتابوں کو پڑھا ہے بلکہ ان کے مقالات کی ترتیب و تہذیب کا کارنامہ بھی انجام دیا ہے شہادت دیتے ہیں "سرسید کے ذاتی عقائد خواہ کچھ ہوں بعض اسلامی مسائل کے متعلق ان کے خیالات خواہ کتنے ہی غلط ہوں، مگر اس حقیقت اور واقعیت میں کچھ شبہ اور شک نہیں کہ مسلمانوں کی ہمدردی، اسلام کی محبت، اور اس سے بڑھ کر حضور رسول مقبول محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکت سے والہانہ عشق ان کی گھٹی میں پڑا ہوا تھا"(۳)

سرسید اور عشق رسول میں ان کی نسبت ایک موثر عامل کی حقیقت رکھتی ہے بلکہ ان کی رگوں میں بہنے والا خون ان کے عشق کو کیفیت اور حرارت عطا کرتا ہے۔ سرسید احمد خاں جیسا کہ نام سے ظاہر ہے سادات میں تھے گو کہ اسلام میں فضلیت اور قبولیت کا معیار خاندان و نسل نہیں بلکہ ایمان و عمل صالح ہے مگر جہاں یہ دونوں باتیں جمع ہوں وہاں یہی محبت خود بخود نظر آنے لگتی ہے سرسید کا شجرہ نسب سینتیس (۳۷) واسطوں سے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک پہونچتا ہے، جامع مسجد ایس ایس ہال، مسلم یونیورسٹی علی گڈھ کے احاطہ میں شمال کی جانب سرسید کا مزار ہے اس کی بیرونی لوح تربت پر ان کا نسب نامہ رقم ہے۔ سرسید محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو "دادا" کہ کر یاد کرتے ہیں اور اس نسبت پر ان کو فخر بھی ہے، چنانچہ انجمن اسلامیہ بریلی میں خطبہ دیتے ہوئے انہوں نے کہا تھا

"میرے دادا فخر موجودات عالم محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخیر وقت پر جو کلمہ زبان مبارک پر جاری تھا وہ امتی امتی تھا، گو میں آنحضرت کے ذریات میں ہوں جس کا بلاشبہ مجھ کو بڑا فخر ہے مگر انہی کی امت میں بھی ہوں۔۔۔۔۔"(۴)

یعنی نسلی نسبت کے ساتھ دینی وابستگی بھی سرسید کی تشکیل ذات کا عنصر ہے اور دونوں پر سرسید کا یکساں زور ہے چنانچہ وہ خود لکھتے ہیں کہ "نہایت ناچیز ہوں مگر اس رسول کی ذریت میں ہوں جو رحمۃ للعالمین ہے میں اپنے دادا کی راہ پر چلوں گا۔"(۵)

یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ سرسید بسیار نویس اور کثیر التصانیف تھے مگر انہوں نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا ہے علامہ حالی نے حیات جاوید میں سرسید کی ابتدائی تصانیف میں جن تین کتابوں کا تذکرہ کیا ہے ان میں پہلی کتاب "جلاء القلوب بذکر المحبوب" ہے۔(۶) یہ کتاب ۱۲۰۸ھ /۱۸۴۲ء میں لکھی گئی۔ اس کتاب کا آغاز کرتے ہوئے سرسید نے جو الفاظ لکھے ہیں ان کو دیکھیے

"دنیا میں سب سے اچھی بات یہ ہے کہ اپنے پیارے کا ذکر کیجیے اور ہر دم اس کے نام پر دم دیجیے۔"(۷)

اس کتاب کا ماخذ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی کتاب "سرور المحزون" ہے اور جا بجا "مدارج النبوت" سے بھی استفادہ کیا گیا ہے، جس زمانہ میں سرسید نے یہ کتاب تصنیف کی اس وقت ان پر عقلیت اور تجدد کا غلبہ نہ تھا بلکہ وہ ابھی مذہبی و سماجی روایت کے متبع تھے بلکہ سچ پوچھیے تو سرسید کو رسول اور محبت رسول کا پورا شعور بھی حاصل نہیں تھا چنانچہ اس کتاب پر انہوں نے ۱۸۷۸ء میں خود ہی تبصرہ کیا ہے وہ لکھتے ہیں :-

"یہ کتاب اس زمانہ میں لکھی گئی تھی، جبکہ لوگوں کی دیکھا دیکھی مولود کی مجلس کا دل میں بڑا شوق تھا، ہر مہینہ کی دواندہم کو لوگ جمع ہوتے تھے، مولانا کہ دلہ مجوارے کی کھلیوں پر درود پڑھا جاتا تھا اور ختم کے بعد شیرینی بٹتی تھی اور ہم کو لوگ بہت

نیک اور محب رسول سمجھتے تھے۔ حالانکہ اس زمانہ میں نہ ہم نے رسول کو سمجھا تھا اور نہ رسول کی محبت کو۔"(۸)

بعد میں جب سر سید نے مذہبی مسائل کو عقل و فلسفہ اور تحقیق و تفتیش کی نگاہ سے دیکھنا شروع کیا تو ان کو اس کتاب پر بھی نظر ثانی کی ضرورت محسوس ہوئی چنانچہ انہوں نے تہذیب الاخلاق میں اس پر تبصرہ کیا جس کا اقتباس اوپر گذرا۔ اس تبصرہ میں سر سید نے کتاب کے بہت سے مندرجات کو اصلاح طلب قرار دیا انہوں نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق تصور شفاعت کو عیسائیت کے اس عقیدہ کے مماثل ٹھہرایا کہ حضرت عیسیٰ اُمت کے گناہوں کا کفارہ بن گئے، اسی طرح شق القمر کا معجزہ، کسریٰ کے محل کے کنگروں کا گرنا، آتش کدہ فارس کی آگ کا بجھنا، ساوہ کے چشمہ کا خشک ہونا، بحیرہ راہب کا آنحضرت کو نبی ہونے کی خوش خبری دینا، درختوں، پھلوں اور پتھروں کا سجدہ کرنا، آپ سے دھوپ روکنے کے لیے فرشتوں کا سایہ کرنا، جبریل کا آپ کو تین دفعہ بھینچنا، جنوں کا آپ پر ایمان لانا یعنی ان جیسی ساری باتوں کو سر سید نے غلط ٹھہرایا بلکہ معراج کو بھی رویا سے تعبیر کیا۔(۹)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ سر سید نے مذہبی تاریخی اور دینی مسائل پر ناقدانہ اور فلسفیانہ نظر ڈالی اور ان کے مذہبی معتقدات میں تغیر و تبدل بھی رونما بھی ہوا جیسا کہ مذکورہ تبصرہ اور بعد کی دوسری تصانیف مثلاً تفسیر القرآن وغیرہ سے ظاہر ہی ہوا۔ یوں سمجھا جائے کہ سر سید کی عقلیت نے ان کے دینی افکار میں تو تبدیلی کی مگر ان کی محبت رسول میں مطلق کمی نہیں آئی بلکہ اضافہ ہی ہوا، یوں سمجھا جائے کہ سر سید کی عقلیت نے ان کے دینی افکار میں تو تبدیلی کی مگر عشق محمدی پر پانی کی جگہ تیل بن کر ٹپکی، سر سید نے اس محبت کو فلسفیانہ تحقیق کے عرفان سے گذارا، فکر و نظر کی میزان پر تولا اور عقل و شعور کی زبان سے ادا کیا۔ اس میں ایک موثر حال محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت بھی ہے جس کو عقلی ثبوت اور نقلی دلائل دونوں طریقہ سے سر سید نے دیکھا اور پرکھا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ نبوت حقیقت کاملہ اور سرچشمہ علم و عرفان یعنی اللہ کی معرفت کا واحد معتبر ذریعہ ہے ذرا ملاحظہ کیجئے کس انداز شکر گذاری و احسان مندی سے سر سید اس بات کا اظہار کرتے ہیں۔

"یہ سچا مذہب اور وہ شخص جس کی معرفت ہم کو اس کی تعلیم ہوئی ہمارے بے انتہا ادب اور نا محدود ثنا و صفت کا مستحق ہے بلاشبہ اسی خطاب کے لائق ہے کہ "انت احب الی یارسول اللہ من نفسی التی بین جنبی" چنانچہ ہم کو بہت بڑی خوشی اور مبارک اسی بات کی ہے کہ ہم نے اس کو نہ خدا سمجھا اور نہ خدا کا بیٹا نہ کوئی فرشتہ بلکہ ایک وحی بھیجا ہوا انسان جانا، مگر اپنی جانوں سے زیادہ عزیز جانا، بابی انت وامی یارسول اللہ۔"(۱۰)

دل و جانم فدایت یا محمد   سر من خاک پایت یا محمد

عظمت محمد کو عقل و فلسفہ کے میزان پر تولنے کے بعد سر سید نے نتیجہ کے بطور لکھا ہے :

"اے میرے دوستو! کوئی سخت سے سخت دہریہ اور لامذہب بھی اگر ایسے شخص کو معاذاللہ نبی نہ مانے گا تو اس کو یہ ماننا تو ضرور پڑے گا کہ بعد خدا کے کوئی دوسرا شخص بزرگ ہے تو یہی ہے، روحی فداک یارسول اللہ۔ پس جو کوئی شخص نبوت کی حقیقت کو سمجھے گا تو امکان سے خارج ہے کہ محمد رسول اللہ کی تصدیق نہ کرے۔"(۱۱)

سر سید کی محبت رسول کا عالم یہ تھا کہ ایک طرف تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر ان پر گریہ طاری ہو جاتا تھا اور دوسری طرف امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا حال زار دیکھ کر وہ آنسو بہاتا تھا۔(۱۲) جہاں تک نبی پاک کا نام لیکر رونے کا تعلق

ہے تو اس سلسلہ میں امام الدین گجراتی مرحوم کا یہ بیان محفوظ ہے :

"بانی اسلام صلی اللہ علیہ وسلم پر۔یہاں تک شیفتگی کہ ایک دفعہ ان کا اسم مبارک زبان پر آجاتا تو بے اختیار اشکوں کا سیل چہرہ پر جاری ہو جاتا ہے یہ سب کچھ ایک جہان کے مشاہدہ میں آچکا ہے۔"(۱۳)

انگریز جب ہندوستان آئے تو ان کے پادریوں نے ملک کے گوشہ گوشہ میں گھوم کر قرآن اور مذہب اسلام کے ابطال اور پیغبر اسلام کو مطعون کرنے کی کوشش کی جس کا مقابلہ بلاشبہ علماء کرام نے مناظرہ اور مباحثہ کی شکل میں کیا۔ آگرہ اور اودھ کے گورنر سر ولیم میور نے بھی اس معاندانہ جذبہ سے سرشار ہو کر Life of Mohammad کے نام سے چار جلدوں میں ایک کتاب تصنیف کی جو ۱۸۶۱ء میں چھپ کر منظر عام پر آئی اس کتاب سے ولیم میور کا کیا مقصد تھا وہ علامہ حالی کی زبانی سنئیے۔

"درحقیقت یہ کتاب صرف عیسائیوں ہی کو اسلام اور بانی اسلام کی طرف سے گمراہ کرنے والی نہ تھی بلکہ تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو بھی اسلام کی طرف سے شک میں ڈالنے والی تھی۔"(۱۴)

اس زمانہ میں مسلمانوں میں صاحبان علم و فضل کی کمی نہ تھی، مگر اس کتاب کا جو شدید رد عمل سرسید پر ہوا وہ شاید کسی اور پر نہ ہوا سرسید نے اپنا تاثر خود بیان کیا ہے؟

"ان دنوں میں ذرا قدرے دل کو شورش ہے۔ولیم میور صاحب نے جو کتاب آنحضرت کے حال میں لکھی ہے اس کو میں دیکھ رہا ہوں اس نے دل کو جلادیا اس کی ناانصافیاں اور تعصبات دیکھ کر دل کباب ہو گیا۔"(۱۵)

مگر سرسید کا ردعمل مثبت تھا منفی نہ تھا، انہوں نے اس کتاب پر ہنگامہ اور واویلا مچانے کے بجائے اس کا علمی جواب دینے کا سنجیدہ فیصلہ کیا، چنانچہ وہ کہتے ہیں۔

"میرے دل پر جو اس کتاب سے اثر پیدا ہوا وہ یہ تھا کہ اسی زمانہ میں میں نے ارادہ کیا کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کے متعلق حالات میں ایک کتاب اس طرح پر لکھی جاوے کہ جو باتیں صحیح اور اصلی اور واقعی اور منقح ہیں اور معتبر روایتوں اور صحیح سندوں سے بخوبی ثابت ہیں ان کو بخوبی چھان بین کر اور امتحان کر کر ترتیب سے لکھا جائے اور جو حالات مشتبہ اور مشکوک ہیں اور ان کا ثبوت معتبر یا کافی نہیں ہے ان کو جدا گانہ اسی ترتیب سے لکھا جائے"(۱۶)

غرضیکہ سرسید نے اس کتاب کا جواب دینے کا فیصلہ تو کر لیا مگر فکر معاش کا ابتلا اور معاون کار کے فقدان کے باعث اسے پورا نہ کر سکے البتہ مختلف اوقات میں مختصر طور سے مختلف مضامین اور مسائل مذہب اسلام اور آنحضرت کے حالات پر کچھ کچھ لکھتے رہے حسن اتفاق یہ ہے کہ سرسید کو اپریل ۱۸۶۹ء میں لندن جانے کا موقع ملا، گو کہ اس سفر کا مقصد جیسا کہ انہوں نے اپنی رخصت کی درخواست میں واضح طور پر لکھا ہے تعلیمی اور سیاسی تھا مگر در پردہ وہ ولیم میور کی کتاب کا جواب بھی لکھنا چاہتے تھے جس کا مواد انڈیا آفس لندن اور برٹش میوزیم لندن سے جمع کرنا تھا۔ چنانچہ حالی لکھتے ہیں

"سر ولیم میور کی کتاب لائف آف محمد" کا جواب لکھنے کے لئے جس کا ان کو حد سے زیادہ خیال تھا بہت سی ایسی کتابوں اور نوشتوں کی ضرورت تھی جو ہندوستان میں نایاب تھیں اور صرف برٹش میوزیم یا انڈیا آفس کے کتب خانوں میں تھیں۔"(۱۷)

یہ سوال کہ سرسید کے مقاصد سفر میں اگر ولیم میور کی کتاب کا جواب لکھنا بھی شامل تھا تو سرسید نے اس کا اظہار کیوں نہیں کیا اس کا جواب صرف یہ ہے کہ سرسید عیسائی حکمرانوں بالخصوص ولیم میور، گورنر آگرہ، اودھ سے اس کتاب کی تصنیف کو چھپاتا

چاہتے تھے تا آنکہ وہ مکمل نہ ہو جائے چنانچہ سرسید نے محسن الملک کے نام ایک مکتوب میں اس کتاب کے متعلق لکھا ہے

"اختیار سے اس کو مخفی رکھنا چاہیے کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ قبل اتمام کتاب جناب سر ولیم میور صاحب کو اس کا حال معلوم ہو، بعد اتمام انشاءاللہ تعالیٰ میں خود اپنے ہاتھ سے نذر دوں گا۔"(۱۸)

بہر صورت سرسید نے لندن میں علمی، ثقافتی سیاسی اور دیگر قسم کی مشغولیات کے ساتھ اور پاکیزہ جذبہ کے ساتھ "لائف آف محمد" کا جواب لکھنا شروع کر دیا، اس جواب کے لکھتے وقت ان کے جذبہ کی صداقت اور محبت رسول کی معنویت کا اندازہ نواب محسن الملک کے نام سرسید کے ایک مکتوب سے کیجئے۔

"مصمم ارادہ کر لیا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت میں، جیسا کہ پہلے سے ارادہ تھا، کتاب لکھ دی جائے اگر تمام روپیہ خرچ ہو جائے اور میں فقیر، بھیک مانگنے کے لائق ہو جاؤں تو بلا سے، قیامت میں یہ تو کہہ کر پکارا جاؤں کہ اس فقیر مسکین احمد کو جو اپنے دادا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نام پر فقیر ہو کر مر گیا حاضر کرو۔"(۱۹)

مگر اس کتاب کی تالیف میں سرسید کو دو بنیادی رکاوٹیں پیش آئیں ایک تو کسی انگریزی خواں کی رفاقت کی کمی اور دوسرے وسائل کا فقدان جب لائف آف محمد کا جواب مکمل ہونے کی شکل نظر آئی تو سرسید نے انہی بارہ خطبات پر اکتفا کیا جو اصلا لائف آف محمد کے پہلے حصہ کا جواب ہے اور اس کی بھی اشاعت لندن میں مہنگی پڑی تو سرسید نے اس کا انگریزی میں خلاصہ "Essay on life of Mohammed" کے نام سے شائع کرا دیا بعد میں ہندوستان لوٹ کر اردو کتاب نظر ثانی کے بعد شائع ہوئی اس کتاب مین سرسید کا انداز الزامی اور مناظرانہ نہیں بلکہ دوستانہ اور ہمدردانہ ہے، دسویں باب میں خاص طور پر سرسید نے توریت و انجیل میں مذکور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارتوں پر روشنی ڈالی ہے۔(۲۰)

سرسید نے لندن میں صرف یہی نہیں کیا کہ ولیم میور کی کتاب کا جواب دینے کے لیے محنت کی بلکہ بعض انصاف پسند انگریز مصنفین کی کتابوں کی طباعت کا بھی اہتمام کیا، جن میں خاص طور پر جان ڈیون پورٹ کی کتاب Apology for Muhammed and Quran قابل ذکر ہے۔ چنانچہ سرسید نے اس کتاب کی طباعت کے سلسلہ میں محسن الملک کو لکھا۔

"ایک انگریز نے جس کا نام مسٹر ڈیون پورٹ ہے حمایت اسلام میں ایک عجیب و غریب کتاب لکھی ہے، جناب پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا حال لکھا ہے اور جس قدر اتہام اور الزام انگریزوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر اور قرآن پر اور مذہب اسلام پر لگائے ہیں اس کا جواب دیا ہے، چونکہ یہ کتاب بالکل انگریزوں کے مخالف تھی، اس کا چھاپا ہونا اور فروخت ہونا مشکل تھا میں نے کل لاگت چھاپہ کی دینی قبول کی۔"(۲۱)

سرسید کو جو محبت رسول کریم ان کی امت اور ان کے دین و مذہب سے تھی اس کے بارے میں اندازہ کرنے کے لئے مذکورہ مثالیں کافی ہیں مگر یہاں ہم سرسید کے بعض نعتیہ اشعار کی طرف اشارہ کرنا چاہیں گے۔ جن میں رسول سے سرسید کی سچی عقیدت اور پاکیزہ محبت کا انعکاس ہوا ہے۔ بعض منظومات تو جلاء القلوب بذکر المحبوب میں درج ہیں مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ سرسید کے ابتدائی عہد کا حصہ ہے، یہاں ایک اور نعت کا ذکر مناسب ہے جو بعد کے دور کی یاد گار ہے اس نعت میں ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے سرسید کی زندگی کا سرمایہ ان کا عشق رسول ہے اور وہ اس چیز کو خصوصی اہمیت کا حامل قرار دیتے ہیں اس نعت کا ایک شعر یہ بھی ہے ؎ خدا دارم دل بریاں ز عشق مصطفیٰ دارم ندارد ہیچ کافر ساز و سامانے کہ من دارم

یعنی خدا پر ایمان رکھتا ہوں اور عشق مصطفیٰ میں جلا ہوا دل رکھتا ہوں یہ میں ایسا ساز و سامان رکھتا ہوں جو کسی کافر کے پاس

نہیں ہے۔

سرسید نے اپنی عمر کے آخری لمحات جن کاموں میں گذارے اور جس طرح گذارے وہ سرسید کی محبت رسول پر مہر تصدیق ثبت کرتے ہیں، سرسید کے رفیق اور ممتاز سوانح نگار مولانا الطاف حالی نے تفصیل سے لکھا ہے۔

"ایک عیسائی نے رسالہ امہات المومنین اسلام کے برخلاف شائع کیا تھا جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج اور آپ کی اخلاق پر نہایت دریدہ دہنی سے اعتراض لکھے تھے سرسید نے اولاً تمہید کے طور پر ایک جزاً ازتکمیل اصول تنقید روایات پر اسی رسالہ کو دیکھکر لکھا تھا اس کے بعد اس کا جواب لکھنا شروع کیا یہ جواب ابھی ختم نہ ہونے پایا تھا کہ ۲۴ مارچ ۱۸۹۸ء کو احتباس بول کا عارضہ ہوا اور اسی عارضہ میں ۲۸ مارچ کو صبح مالک حقیقی سے جا ملے انا للہ وانا الیہ راجعون" (۲۲)

مرتے وقت سرسید کی زبان پر جو کلمات جاری ہوئے وہ بھی ان کی محبت رسول کی علامت ہیں بقول مولانا حالی وہ قرآن کی تین آیتیں تھیں۔

(۱) حسبنا اللہ ونعم الوکیل ---اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین وکیل ہے۔

(۲) نعم المولیٰ ونعم النصیر --اللہ بہترین آقا ہے اور بہترین مددگار ہے

(۳) ان اللہ و الملائکتہ، یصلون علی النبی یاایھاالذین آمنو صلو علیہ وسلمو تسلیما--اللہ اور اس کے فرشتے نبی پر درود بھیجتے ہیں اے لوگوں جو ایمان لائے ہو تم بھی ان پر درود و سلام بھیجو۔

یعنی سرسید نے اپنی تصنیفی زندگی کا آغاز سیرت رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر کتاب لکھ کر کیا تھا اور سرسید کی کتاب زندگی کا اختتام رسول اللہ کے لئے درود و سلام پر ہوا، قابل تقلید ہے یہ زندگی اور لائق رشک ہے یہ موت

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد زعشق　　　　ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

حوالے

(۱) بخاری و مسلم کتاب الایمان (۲) بخاری کتاب الاحکام (۳) الخطبات الاحمدیہ فی العرب والسیرت المحمدیہ، مقدمہ، نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۹۴ (۴) مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچیز ص ۱۸۳، مصطفائی پریس لاہور ۱۹۰۰ء (۵) ایضاً (۶) مولانا الطاف حسین حالی، حیات جاوید ص ۶۲، ترقی اردو بیورو نئی دہلی ۱۹۹۰ء (۷) مولانا محمد اسمٰعیل پانی پتی مقالات سرسید ہشتم (جلا القلوب) مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۶۲ء (۸) ایضاً (۹) ایضاً (۱۰) الخطبات الاحمدیہ۔ دیباچہ ۳۲ (۱۱) مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچیز ص ۲۹۲ (۱۲) نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بانی اسلام کہنا ہر لحاظ سے غلط ہے، آپ پیغمبر اسلام ہیں نہ کہ بانی اسلام، آپ سے پہلے بھی پیغمبر گذر چکے ہیں ان سب کا دین اسلام ہی تھا گرچہ شریعت جدا جدا تھی۔ (۱۳) مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچیز دیباچہ (۱۴) حیات جاوید (۱۵) مکتوبات، سرسید ص ۹۲ مرتبہ شیخ محمد اسماعیل پانی پتی۔ مجلس ترقی ادب لاہور ۱۹۰۹ء (۱۶) سرسید احمد خاں، الخطبات الاحمدیہ ص ۳۱، نفیس اکیڈمی کراچی ۱۹۹۴ء (۱۷) حیات جاوید ص ۱۴۸ (۱۸) مکتوبات سرسید ص ۴۷، بنام محسن الملک مولوی مہدی علی خاں (۱۹) ایضاً ص ۹۲ (۲۰) حیات جاوید ص ۱۶۰ (۲۱) مکتوبات سرسید ص ۵۷ (۲۲) حیات جاوید ص ۸۵-۲۸۴ ص ۳۳ ایضاً

پروفیسر محمد عمر *

سر سیّد کی تحریک کا تاریخی پس منظر

ہندوستان کی تاریخ کے عبوری دور یعنی ازمنۂ وسطیٰ[1] سے مسلمانوں میں جدید خیالات پیدا کرنے میں سرسید کو ایک نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی قدامت پرستی، توہم پرستی، ذہنی و فکری جمود اور ان کی جہالت کے خلاف جدوجہد کی۔ انھوں نے جدید ہندوستان کی ترقی میں بہت سے عناصر بہم پہنچائے اور مفید سائنسی رجحان کے ارتقاء میں جو مادی اور ذہنی ترقی کے لیے ضروری ہے، ایک اہم رول ادا کیا سرسید کی ولادت ۱۸۱۷ء میں اور انتقال ۱۸۹۸ء میں ہوا تھا۔ یہ ۸۱ سال کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ میں بہت اہم تھا۔ یہ وہ بحرانی دور تھا جس میں ہندوستانیوں کی زندگی کے ہر شعبے میں۔ سیاسی، اقتصادی، مذہبی اور سماجی تبدیلیاں وقوع پذیر ہو رہی تھیں۔ مغلیہ سلطنت کا مکمل زوال ہو چکا تھا اور اس خالی جگہ کو برطانوی شہنشاہیت نے پر کر دیا تھا، پرانا جاگیردارانہ نظام اور صدیوں پرانا مغلیہ دور کا ترکہ نئے سماجی تنظیم کی طاقتوں کے ہاتھوں مغلوب ہو چکا تھا۔ مغربی سائنس اور تکنیکیت پر مبنی صنعتی کارخانوں کے زیر اثر ازمنۂ وسطی کا اقتصادی اور دست کاری کا نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ ایک ایسے شخص کے لیے جس کی نشو نما قدیم جاگیردارانہ نظام میں ہوئی تھی اس کے لیے یہ عبوری اور تیز تر تبدیلی بڑی مشکل سے خوشگوار ثابت ہو سکتی تھی۔ بڑی بے دردی سے قدیم روایات اسے ایک سمت کھینچ رہی تھیں اور جدید ترقی دوسری سمت۔ ہندوستانی مسلمان اسی کشمکش مین مبتلا تھے لیکن سرسید کی سریع التاثر ذہن نے اسی تبدیلی کی علامت کو دیکھا اور اس کی اہمیت کو سمجھا۔ لہذا زمانے کے تقاضوں کو مدنظر رکھتے ہوئے، مسلمانوں کو فلاح و بہبود کے لیے اس چیلنج کو قبول کیا۔ وہ دفعتاً اس جدوجہد میں کود پڑے اور اس تبدیلی کی رفتار کو تیز سے تیز تر کر دیا۔

جب سرسید کی ولادت ہوئی تھی تو ہندوستان کے سیاسی افق پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ان کی ولادت سے ۱۴ سال قبل ۱۸۰۳ء لارڈ لیک کی افواج فاتحانہ دہلی میں داخل ہو چکی تھیں (۱) اور ہندوستان کی تاریخ کا ایک دور ختم ہو چکا تھا۔ مغلیہ سلطنت اپنے پر وقار اقتدار ماضی کی ایک خیالی تصویر بن کر رہ گئی تھی۔ دربار کی شان و شوکت، درباری رسوم، درباری جشن، دربار کے روزانہ کے معمولات، القاب، خلعتیں عطا کرنے اور فرمان جاری کرنے کا قدیم طریقہ بدستور برقرار تھا۔ (۲) حالانکہ ظل الٰہی کا اقتدار اور اختیار ختم ہو چکا تھا ظلِّ الٰہی نہ صرف پینشن خوار تھا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی کا ایک قیدی تھا۔ اپنی گزر بسر کے لیے پینشن میں اضافے کے لیے اسے برطانوی ریذیڈنٹ سے گداگرانہ انداز میں التجا کرنی پڑی تھی۔ (۳) تاہم رسی جل گئی تھی لیکن بل نہیں گیا تھا۔ روایات ماضی کا بھرم رکھنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ عبد لطیف نے لکھا ہے کہ ۱۸۴۲ء میں گورنر جنرل بہادر وزیر ہند مسٹر ایلن برا نے بہادر شاہ ظفر کے دربار میں حاضری کا ارادہ کیا اور انہیں یہ خواہش ہوئی کہ اگر دربار میں بیٹھنے کی اجازت مل جائے تو آداب بندگی بجالائیں۔ "بادشاہ نے اپنے بزرگوں کی آبرو (روایت) کا خیال کرتے ہوئے اس کی اجازت نہ دی، اور در

* سابق پروفیسر، شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

میں بیٹھنے کے متعلق ان کی گزارش مرغوب خاطر نہ ہوئی۔ فرمان نافذ کیا کہ بارگاہ والا میں ایسی توقع نہ رکھی جائے۔ (۴)

لال قلعہ جو کسی زمانے میں ہندوستان کا دل تھا۔ اب زوال اور انحطاط کے تاریک ڈھانچے کے مثل رہ گیا تھا۔ (۵) اتفاقیہ لال قلعے میں جانے والا ہر ایک شخص یہ دیکھ سکتا تھا کہ اب سیاسی طاقت کا مرکز کہیں دوسری جگہ منتقل ہو چکا تھا۔ دربار اور محلوں میں بڑی تعداد میں طفیلی طبقے کی موجودگی نے دربار اور بادشاہ کی اقتصادی زبوں حالی میں اضافہ کر دیا تھا۔ بادشاہ کے لیے یہ بات تقریباً ناممکن ہوگئی تھی کہ ہم جد افراد کی کفالت کر سکتا۔ ان کی تعداد ۱۸۱۸ء میں دو ہزار افراد سے زائد تھی۔ کننگھم نے ان کی حالت ان الفاظ میں بیان کی ہے۔

"سلاطین کی رہائش گاہوں کے چاروں طرف ایک اونچی چہار دیواری بنی ہوئی تھی تاکہ اندر کی طرف کوئی جھانک نہ سکے اس کے اندر بہت سی جھونپڑیاں بنی ہوئی تھیں، جن میں یہ مصیبت زدہ لوگ رہتے تھے جب وہاں کے دروازے کھولے جاتے تھے تو نیم برہنہ، مفلس اور فاقوں کے مارے ہوئے ہمیں گھیر لیتے تھے۔" (۶)

سیرت فرید میں سرسید نے لکھا ہے :

"اکبر شاہ اگرچہ تخت نشین ہوئے، مگر اخراجات کی تنگی کا وہی حال تھا، جو شاہ عالم کے وقت میں تھا، شاہ عالم ہی کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی، تمام کارخانے ابتر ہو گئے تھے، شاہزادوں کو جو قلعہ کے نو محلے میں رہتے تھے، ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا، اور وہ چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ بھوکے مرتے ہیں، بھوکے مرتے ہیں۔" (۷)

لیکن اب فرضی احساس وقار کی وجہ سے وہ لوگ قلعہ معلیٰ سے باہر نہیں نکل سکتے تھے، اور نہ اپنی گذر بسر کے لیے باہر آکر روزی کما سکتے تھے۔

مغلیہ سلطنت کے زوال کا جو آغاز اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ء) کے بعد ہوا تھا اب وہ اپنی انتہا کو پہونچ چکا تھا۔ ملک کی اندرونی سیاسی طاقتیں۔ مرہٹہ، جاٹ، اور سکھ۔ جنہوں نے مغلیہ سلطنت کو کمزور کر دیا تھا، برطانوی سامراجیت کے سامنے دم توڑ چکی تھیں۔ ان تمام سیاسی طاقتوں نے برطانوی اقتدار کو تسلیم کر لیا تھا۔ بعد ازیں برطانوی حکومت نے اپنی سیاسی اور انتظامی طاقت کو اور زیادہ مضبوط کر لیا اور رفتہ رفتہ سارا ہندوستان حکومت برطانیہ کے زیر اقتدار آگیا۔

مغلوں نے نہ صرف ایک مملکت قائم کی تھی بلکہ انہوں نے ایک مشترکہ تہذیب کو پروان چڑھایا تھا، جو اپنی لازمی خصوصیات، اشتراکیت اور وسیع المشربی پر مبنی تھی۔ سرسید نہ صرف اس تہذیب کی ایک پیداوار تھے بلکہ ایک مثالی نمائندہ بھی تھے۔ سرسید کی ولادت اور نشو نما دہلی میں ہوئی تھی۔ بقول میر "دلی جو ایک شہر تھا عالم میں انتخاب" یہ شہر صدیوں سے اس ملک کا دل تھا اور قدیم تہذیب کا گہوارہ۔ سرسید نے اس شہر کی امید افزا فضا اور اس کی بربادی و تباہی دونوں صورتیں دیکھی تھیں۔ وہ اپنے والد کے ساتھ دربار میں جاتے تھے، لہذا انہیں مغلیہ دربار کی زندگی کا چشم دید علم تھا۔ (۸)

سرسید نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ سلطان محمد عادل بن تغلق شاہ کے اخلاف تغلق آباد کے قرب و جوار کے گاؤں میں کھیتی باڑی کرتے تھے، سرسید نے لکھا ہے کہ "تغلق آباد کے گاؤں میں جس قدر مسلمان گھسیرے رہتے ہیں جو سارے دن گھاس کھود کر شام کو بیچتے ہیں، میں نے خوب تحقیق کیا ہے کہ سلطان محمد عادل تغلق شاہ کی اولاد ہیں۔" (۹)

سرسید کی ملاقات شاہ جہاں اور اورنگ زیب بادشاہوں کے ایک بڑے منصبدار خلیل اللہ خاں کے پوتے سے ہوئی تھی جو "لوگوں کے پاؤں دابنے آتا تھا اور دو چار پیسے لیجاتا تھا۔" (۱۰)

سرسید نے لکھا ہے کہ جس تیزی سے زوال کی ابتداء ہوئی تھی اس سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ بات بہت جلد ظہور پذیر ہونے والی ہے کہ مسلمان چند برسوں میں اصطبل میں کام کرنے یا باورچی خانے میں، یا گھاس کاٹنے کے علاوہ کہیں نہیں پائے جائیں گے۔(۱۱) یہ بات مبالغہ پر مبنی نہیں تھی کیونکہ سرسید نے خود اپنی آنکھوں سے شریف خاندان کے افراد کو افلاس میں گرفتار دیکھا تھا۔

غدر (۱۸۵۷ء) پر قابو پانے کے بعد برطانوی حکام نے بالخصوص مسلمانوں کے ساتھ بڑی بے دردی اور سفاکی کا سلوک کیا کیوں کہ انھیں زیادہ جنگجو اور محارب سمجھا گیا ان کے خیال میں ان لوگوں کو ابھی تک یہ بات یاد تھی کہ کل تک وہ لوگ ہندوستان پر حکمرانی کرتے تھے۔ لہذا ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کو زیادہ خطرناک سمجھا گیا۔ انگریزوں نے دہلی کے عام باشندوں اور شاہی خاندان کے افراد کو بڑی بے رحمی اور بے دردی سے چن چن کر تہ تیغ کر دیا۔ صرف کوچہ چیلان کے تقریبا چودہ سو آدمی مارے گئے جن میں مولانا صہبائی اور ان کے دو بیٹے مولوی عبد الکریم اور مولوی عبد العزیز بھی شامل تھے۔(۱۲) ہندوستان کے مشہور خوش نویس محمد امیر پنجہ کش بھی بے گناہ قتل ہوئے۔ شہر میں مارے گئے مقتولوں کی لاشوں پر چیل کوے منڈلاتے تھے، لاشوں سے کنویں بھر گئے تھے۔ برطانوی حکومت کی ذرا سی مخالفت کے شبہ کی بنا پر آباد محلوں کو نیست و نابود کر دیا جاتا تھا۔ غالب نے ایک خط میں منشی ہرگوپال تفتہ کو لکھا تھا۔ "گھر کے گھر بے چراغ پڑے ہیں۔ لال قلعہ کے سامنے خانم بازار تھا جہاں شاہی عمارتیں اپنا سر اونچا اٹھائے کھڑی تھیں، اسے ملبہ کا ڈھیر کر دیا گیا تھا۔"(۱۳)

ان مظالم کو دیکھ کر لوگوں کے دل خوف و ہراس سے دہل گئے تھے اور وہ لوگ پوری طرح سے بزدل اور پست ہمت ہو گئے تھے۔

مسلمانوں کی تباہی و بربادی، دہلی کی ویرانی سرسید نے اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔ غالب نے لکھا ہے "دلی کی ہستی منحصر کئی ہنگاموں پر ہے، قلعہ، چاندنی چوک، ہر روز مجمع مسجد جامع کا، ہر ہفتے سیر جمنا کے پل کی، ہر سال میلہ پھولوں والوں کا، یہ پانچوں باتیں اب نہیں۔ پھر کہو دلی کہاں، ہاں کوئی شہر قلمرو ہند میں اس نام کا تھا۔"(۱۴)

غالب نے اپنے ایک خط میں دلی کی بربادی کا حال ان سطور میں لکھا ہے۔ "مسجد جامع سے راج گھاٹ دروازہ تک بے مبالغہ ایک صحرا لق و دق ہے۔ اینٹوں کے ڈھیر جو پڑے ہیں وہ اگر اٹھ جائیں تو مکان ہو جائے گا۔ یاد کرو مرزا گوہر کے باغیچہ کے اس جانب کو کئی بانس نشیب تھا، اب وہ باغیچہ کے صحن کے برابر ہو گیا، یہاں تک کہ راج گھاٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ فصیل کے کنگورے کھلے رہے ہیں، باقی سب اٹھ گیا۔ کشمیری دروازے کا حال تم دیکھ گئے ہو۔ اب آہنی سڑک کے واسطے کلکتہ دروازے سے کابلی دروازہ تک میدان ہو گیا۔ پنجابی کٹرہ، دھوبی واڑہ، رامجی گنج، سعادت خاں کا کٹرہ، جرنیل کی بی بی کی حویلی، رام جی داس گودام والے کے مکانات، صاحب رام کا باغ حویلی، ان میں سے کسی کا پتہ نہیں چلتا۔ قصہ مختصر شہر صحرا ہو گیا تھا۔ دلی شہر خموشاں ہے۔"(۱۵)

بہر حال محولا بالا حالات اور واقعات کو دیکھ کر سرسید کا دل بہت متاثر ہوا تھا۔ ان کے بال سفید ہو گئے تھے۔ بعض اوقات مایوسی کی حالت میں ترک وطن کر کے کسی دوسرے ملک میں جا کر آباد ہونے کی بات سوچنے لگے تھے۔ بہر حال دور بیں سرسید کو اس بات کا قوی یقین ہو چکا تھا کہ اب دوبارہ مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں ہو سکتی تھی اور انہوں نے مسلمانوں کے انحطاط کے وجوہ کے بارے میں غور کرنا شروع کیا اور یہ سوچا کہ اب اگلا قدم کیا ہونا چاہیئے۔ بڑے غور و فکر کے بعد وہ اس ٹھوس نتیجے پر پہونچے کہ اس انحطاط کی بنیادی وجہ مسلمانون کی ناخواندگی اور قدامت پرستی تھی اور اس کا علاج

صرف جدید تعلیم کے ذریعہ ہی ہو سکتا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنی بقیہ زندگی اور وسائل ہندوستانیوں میں بالعموم اور مسلمانوں میں بالخصوص جدید طرز تعلیم کو مقبول عام بنانے کے لیے وقف کر دی۔

چنانچہ سرسید نے جب تعلیمی تحریک شروع کی تو انہوں نے اس بات کو شدت سے محسوس کیا کہ مسلمانوں کا روایتی نظام تعلیم مسلمانوں کی ترقی کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے کیوں کہ اس نظام تعلیم میں مغربی سائنس اور ٹیکنولوجی کو قبول نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ازمنہ وسطیٰ کے نظام تعلیم اور تحقیق کرنے کے طریقوں کے بالکل بیکار ہونے کی وضاحت کرتے ہوئے سرسید نے کہا تھا کہ پہلے زمانے کے دانشور ایک کمرے میں بیٹھ کر نظریے بیان اور ان کی تردید کر سکتے تھے لیکن انیسویں صدی میں تجربی اور استقرائی طریقوں نے پہلے کے طریقوں کو بالکل بیکار کر دیا ہے۔ لیکن جدید سائنسوں کے پڑھنے کے ساتھ ساتھ وہ ازمنہ وسطیٰ کے تعلیمی ورثہ کو بھی محفوظ رکھنا چاہتے تھے۔ سرسید کا یہ پختہ عقیدہ تھا کہ ہندوستان کے لوگ مہذب دنیا میں اس وقت تک اپنے لیے جگہ حاصل نہیں کر سکیں گے جب تک وہ مغربی علوم حاصل نہ کرلیں گے۔ اور اس ملک کو یوروپی طریقوں پر ترقی نہ دیں گے۔ ان کی نظر میں تعلیم محض نصاب میں مشمولہ کتابوں کا پڑھانا نہیں تھا، بلکہ اس بات کی کوشش بھی کرنی تھی کہ لوگوں کو بالخصوص مسلمانوں کو قرون وسطیٰ کی قدامت پرستی، توہم پرستی اور اندھی تقلید کے دلدل سے باہر نکالا جائے۔ مزید برآں انہوں نے بار بار اس بات کو دہرایا تھا کہ محض مغربی تعلیم کے ذریعہ ہی ہندوستانی اپنے حقوق حاصل کر سکتے تھے برطانوی حکومت ہندوستانیوں کو مغربی تعلیم دینے کے حق میں نہیں تھی۔ لارڈ ایلنبرا نے کہا تھا کہ "ہندوستان میں مغربی تعلیم کو عام اور مقبول کرنے کا یہ نتیجہ بر آمد ہو گا کہ اس ملک میں برطانوی تسلط کا برقرار رہنا ناممکن ہو جائے گا۔" (۱۶) لارڈ ایلنبرا کے ان خیالات سے بلاشبہ یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ تعلیم کے بارے میں سرسید کے خیالات حقیقت پسندی اور دور اندیشی پر مبنی تھے۔

ہندوؤں کے مقابلے میں وقت کے ساتھ ساتھ تعلیمی میدان میں آگے بڑھنے میں مسلمان زیادہ تامل سے کام لے رہے تھے۔ رام موہن رائے، ڈی۔ این۔ ٹیگور، کیشب چندر سین اور دوسرے ہندو مصلحین نے مغربی طرز تعلیم کے خلاف ہندوؤں کے طرز عمل کو بڑی جدوجہد کرنے کے بعد ہموار کر لیا تھا۔ بنگال کے علاوہ مہاراشٹر اور مدراس میں ہندوؤں میں مغربی تعلیم کو مقبول بنانے کے لیے کئی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں۔ لیکن مسلمان جمود کی حالت میں تھے اور اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئے اور یہ لوگ اپنی غیر معقول ضد پر اڑے رہے کہ وہ مغربی نظام تعلیم کو نہیں تسلیم کریں گے۔ حقیقت تو یہ تھی تھی کہ قرون وسطیٰ میں ابھی تک مسلمانوں میں کوئی ایسا اثر آفریں مصلح منظر عام پر نہیں آیا تھا جو قرون وسطیٰ کے اقدار اور تصورات کو قلع قمع کرنے کے بارے میں جدوجہد کرتا۔ سرسید پہلے شخص تھے جو اس میدان میں آگے آئے۔ سرسید کے انتقال کے بعد تعزیتی جلسے کو خطاب کرتے ہوئے ٹی۔ ایچ۔ آرنلڈ نے کہا تھا۔ "سرسید احمد خاں نے اپنے لوگوں سے سستی، کاہلی، خواری اور جہالت سے اوپر اٹھنے کی درخواست کی تھی۔ دیکھو ان کی دعوت کے جواب میں نئی نسل وجود میں آگئی۔ (۱۷)

سرسید نے مسلمانوں کو مغربی تعلیم دینے کے لیے ایک ٹھوس منصوبہ بنایا۔ ۱۰۔ اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ انگلستان گئے۔ وہاں جانے کا ان کا بنیادی مقصد تھا کہ وہ وہاں کی یونیورسٹیوں یعنی کیمبرج اور آکسفورڈ کے طرز تعلیم اور طلباء کی اقامتی زندگی کا بذات خود مطالعہ کریں۔ وہاں کی ترقی کو دیکھ کر سرسید نے اس باب پر غور کیا اور اس نتیجے پر پہونچے کہ جب تک عوام میں مغربی تعلیم کو آگے نہ بڑھایا جائے گا اس وقت تک ممکن نہیں کہ کوئی باشندہ تہذیب یافتہ اور قابل احترام ہو سکے۔ انگلستان کی تہذیبی، تمدنی، صنعتی اور علمی ترقیوں کی وجہ یہ تھی کہ ان کے تمام فنون اور سائنس کی کتابیں ان کی ملکی زبان میں

تھیں ۔ لہذا جو لوگ ہندوستان کے لوگوں کی حالت کو بہتر بنانا چاہتے تھے انھیں مغربی فنون اور سائنس کی کتابوں کو اپنی مادری زبان میں ترجمہ کرنا چاہئے ۔ لندن کے جلسہ میں سرسید نے اپنے ہم وطنوں کو اس بات کی نصیحت کی کہ وہ لوگ جہالت، لاعلمی، اور ناخواندگی کو دور کرنے کے لیے مصمم ارادے کے ساتھ جدوجہد کریں ۔ ان خیالات کا اظہار انہوں نے ان خطوط میں کیا تھا جو انہوں نے لندن سے اپنے رفقاء کو لکھے تھے ۔ انہوں نے راجا جے کشن داس کو لکھا تھا ۔(۱۷)

"ہندوستان کے بھی خواہان ۔ کسی دوسرے کا سہارا نہ لو بلکہ اپنے میں خود اعتمادی پیدا کرو ۔ اپنے بچے دوسرے ملکوں میں جاؤ اور وہاں کے فنون اور سائنسی کتابوں کا ترجمہ کرو ۔ جب تم ان علوم پر مہارت حاصل کر لوگے اور مہذب ہو جاؤ گے تو سرکاری نوکری کرنے کے بارے میں تم بہت کم سوچو گے ۔ مجھے امید اور قوی یقین ہے کہ وہ دن بہت جلد آنے گا ۔"(۱۸)

انگلستان سے واپسی کے بعد ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو سرسید نے علی گڈھ میں ایم ۔ او ۔ کالج قائم کیا اور یکم جون ۱۸۷۵ء سے اس میں باقاعدہ تدریس کا کام شروع ہوا ۔ پروفیسر گب نے اس ادارے کے بارے میں لکھا ہے کہ "اسلام میں جدید خیالات کی پہلی تنظیم تھی ۔"

سرسید کی خواہش تھی کہ اس کالج کی حیثیت قدیم اور جدید، مشرق اور مغرب کے مابین ایک پل کی ہو، حالانکہ وہ مغربی علوم کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے تھے لیکن وہ مشرقی علوم کی قدر و قیمت سے بےخبر نہیں تھے اور وہ قدیم بیش بہا علمی ورثے کو محفوظ کرنا اور اسے آنے والی نسلوں کو منتقل کرنا چاہتے تھے ۔ وہ عربی فارسی، سنسکرت کی تعلیم کو دوبارہ زندہ کرنا چاہتے تھے ۔ ان کی یہ دلی خواہش تھی کہ طلبہ کو دینی تعلیم بھی ساتھ ساتھ دی جائے ۔ انگریزی زبان اور ادب کی تعلیم کے بارے میں ان کے خیالات اعلیٰ تھے لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہندوستان کی قدیم زبانوں اور ادب کو بھی نظر انداز نہیں کرنا چاہتے تھے ۔

حوالے

(۱) Shah Alam II and East India company , Calcutta 1965 K . K Datta p. p.115 -116

(۲)۔ سیرت فریدیہ، سرسید احمد صفحہ ۱۰۷ (۳) سیرت فریدیہ سید احمد ۱۱۴-۱۱۵ (۴) عبداللطیف ۱۸۵۷ء کا روزنامچہ مرتبہ خلیق احمد نظامی، ندوۃ المصنفین دہلی ۱۹۵۸ء ص ۱۱۵ - ۱۱۶ Percival Spear Twilight of the Mughals Cambridge - 1951, p . -62 (۶) سرسید احمد خاں، سیرت فریدیہ، مرتبہ محمود احمد برکاتی پاک اکیڈمی کراچی، ص ۱۰۶ (۷) A. K Nizami,Sayyid Ahmad Khan , Publication Division . Ministry of Information & Broad-Casting Patiala House New Delhi,1966 (۸) عبدالقادر بدایونی، منتخب التواریخ، مرتبہ احمد علی اور کبیر الدین، کلکتہ ۱۸۶۸ء جلد اول، ص ۲۲۵-۲۲۱ (۹) سید افتخار عالم مار ہروی، تاریخ مدرستہ العلوم، مفید عالم، آگرہ ۱۹۰۱ء ص ۹۰ (۱۰) شاہ نواز خاں، مآثر الامرا، مرتبہ مولوی عبدالرحیم۔ کلکتہ ۱۸۸۸ء جلد اول ص ۷۷۵ - ۷۸۲ (۱۱) تاریخ مدرستہ العلوم ص ۸۹ (۱۲) K.A.Nizami Sayyid Ahmad Khan , p13 (۱۳) مفتی انتظام اللہ شہابی، ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما ۔ دینی بک ڈپو اردو بازار ۔ دہلی ص ۸۱ - ۸۴ (۱۴) ایضاً (۱۵) آثار الصنادید، سید الاخبار دہلی، ۱۸۴۷ء ص ۲۲-۲۳، نیز مفتی انتظام اللہ شہابی ایسٹ انڈیا کمپنی اور باغی علما ۔ دینی بک ڈپو، اردو بازار دہلی، ص ۸۱ - ۸۴ (۱۶) اردوئے معلی، مطبع مجتبائی دہلی ۱۸۹۹ء ص ۶۰ (۱۷) ایضاً ص ۱۰۵ (۱۸) The Economic History of India in the Victorian Age(19) 15 , R D . Dutt P 1521º - K . A Nizami . Sayyi d Ahmad Khan Page Page 16(20) Grahm , Sayyid AhmadKhan Page 64(21) K . A Nizami Sayyi d Ahmad p 97 - 64

ڈاکٹر اصغر عباس *

سر سید کے ابتدائی دس سال

پرانی دلی جسے شاہ جہان آباد بھی کہتے تھے صدیوں سے دانش و تہذیب کا مرکز رہی ہے۔ یہاں انیسویں صدی میں ایک
ور محلہ فیض بازار تھا وہاں اور اس کے آس پاس مشرقی علوم کے مستند علماء رہتے تھے۔ یہیں فارسی اور اردو کے مشہور شاعر
ۃ اور صدر الدین آزردہ کے مکانات تھے اور انھیں مکانات کے قریب حکیم مومن خاں کی گلی تھی اور یہیں سر سید کے دوست
بخش صہبائی رہتے تھے۔ درویشوں کے درویش شاہ غلام علی مجددی کی خانقاہ اور مدرسہ بھی یہاں تھا۔ اس خانقاہ میں
وستان ہی کے نہیں افغانستان اور ترکستان سے آئی ہوئی خلقت کا ہجوم رہتا تھا۔ فیض بازار کے بیچوں بیچ سے چاندنی چوک
طرح ایک مصفا نہر بہتی تھی جسے فیض نہر کہتے تھے۔ اکتوبر کے مہینے میں اس نہر پر ان موسمی پرندوں کا ہجوم ہوتا تھا جو دور
ر کے ملکوں سے موسم سرما گذارنے دلی کے آبی علاقوں میں آجاتے تھے اسی فیض نہر کے داہنی طرف سے ایک راستہ نواب
م خاں کے تراہے کی طرف مڑتا تھا وہاں ایک حویلی تھی۔ حویلی کیا تھی اچھا خاصا قلعہ تھا، اس میں باغ کے ساتھ فوارے،
ں اور چھوٹی چھوٹی نہریں تھیں۔ خوشنما محرابوں کے دوہرے تہرے چوڑے دالان تھے۔ بہت سارے یکدرے اور کمرے
، راہداریاں کشادہ تھیں منقش چھتیں، روشن کتب خانہ، جگمگاتے دیوان خانے اور حرم سرائیں تھیں۔ رنگین شیشوں کی بڑی
ی کھڑکیاں تھیں صدر دروازے کی رفعت و شان تو دیدنی تھی۔ یہ حویلی مغل بادشاہ کے وزیر اعظم دبیر الدولہ، امین الملک خواجہ
ید الدین احمد مصلح جنگ کی حویلی کہلاتی تھی۔ اسی حویلی کے شبستان اقبال میں آج سے تقریباً پونے دو سو سال پہلے ۱۷
توبر ۱۸۱۷ء کو ایک تنومند بچہ پیدا ہوا جس کی پیشانی اونچی اور چمکتی تھی، سینہ کشادہ اور شانے چوڑے تھے، سر بڑا تھا، خوب
ٹے موٹے ہاتھ تھے موہنے والی آنکھیں تھیں۔ ریشم جیسے بال تھے اور صبح صادق جیسی رنگت تھی اس بچہ کے انگ انگ سے
ت اور توانائی ٹپکتی تھی یہ بچہ سید محمد متقی اور عزیز النساء بیگم کی تیسری اولاد اور خواجہ فرید الدین احمد کا نواسہ احمد تھا۔ بعد
ں جب اس کے کارناموں کی شہرت گاؤں گاؤں اور شہر شہر پہنچ گئی تو یہی بچہ سر سید کے نام سے ساری دنیا میں مشہور ہوا۔
مد اپنے بڑے بھائی سید محمد اور بہن صفیۃ النساء بیگم کی پیدائش کے کافی دنوں بعد پیدا ہوئے تھے اس لئے ان کی پیدائش پر
ںلی میں خوب خوب خوشیاں منائی گئی تھیں گیت گائے گئے تھے اور ہفتوں رتجگا رہا تھا۔
دلی کے دو روحانی مرکزوں کے سربراہوں سے احمد کے گھرانے کے خصوصی روابط تھے ان میں احمد کے والد تو شاہ

* ریڈر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ گلشن دوست، سر سید نگر علی گڑھ

غلام علی مجددی کے حلقۂ خاص میں شامل تھے اور مرید نے اپنے پیر کے دل میں اتنا گھر کرلیا تھا کہ شاہ صاحب جو اپنی خانقاہ سے کہیں شہر میں آتے جاتے نہ تھے وہ سید متقی کے گھر کبھی کبھار آجاتے تھے اور یہ رشتۂ الفت اتنا مضبوط تھا کہ شاہ صاحب ان کے بچوں کی دکھ بیماری سے بھی بے چین ہوجاتے تھے۔ سید متقی نے اپنے پیر طریقت سے نومولود کے نام کے لئے درخواست کی، شاہ صاحب نے بچے کا نام احمد رکھا، اس سے پہلے وہ احمد کے بڑے بھائی کا نام محمد رکھ چکے تھے۔

احمد ساڑھے چار سال کے ہوئے تو فروری کی ایک خوشگوار سہ پہر کو مسلمان شرفا اور امرا کے دستور کے مطابق ان کی بسم اللہ کی تقریب ہوئی۔ اس روز حویلی میں شہر کے سارے معززین اپنی شاندار سواریوں پر آئے تھے دہلی کے اہل اللہ بھی موجود تھے اور احمد کے سارے اعزہ جمع تھے خوب مزے مزے کے کھانے پکے تھے تقریب کے لئے سات قسم کی مٹھائیاں تیار کرائی گئی تھیں حویلی قندیلوں کی روشنی سے بقعۂ نور بنی ہوئی تھی اس روز احمد کو نہایت قیمتی پوشاک میں محفل میں لایا گیا تھا وہ مجمع کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے تھے جب ان کے سامنے چاندی کی تختی رکھی گئی جس پر اقراء کی اول کی آیتیں لکھی ہوئی تھیں اور شاہ غلام علی مجددی نے ان سے کہا تھا کہ پڑھو بسم اللہ الرحمن الرحیم تو احمد سے کچھ بولا نہ گیا تھا وہ مبہوت ہو کر شرکائے محفل کو دیکھتے رہے لیکن جب شاہ صاحب نے انھیں اپنی گود میں بٹھالیا اور جیسے جیسے شاہ صاحب اقراء کی اول کی آیتیں پڑھتے گئے احمد بھی ان کے ساتھ ساتھ پڑھتے گئے اور حاضرین محفل نے مبارک سلامت کی صدائیں بلند کیں۔

مٹھائیوں کے سات خوان آئے شیرینی تقسیم ہوئی احمد کو رنگ برنگ کے تحفے اور اشرفیاں ملیں ان سب باتوں میں ان کو بہت مزہ آیا اتنا مزہ کہ یہ تقریب انھیں عمر کے آخری حصے میں بھی یاد رہی اور خدا جانے یہ شاہ غلام علی صاحب کے قرآن پڑھانے کی برکت تھی یا احمد کی والدہ کا فیض تھا کہ انھیں خدا کی وحدت پر ایمان کامل میسر ہوا اور رسول اللہ کی ذات پاک سے مجذوبانہ حد تک عشق پیدا ہوتا گیا اور پھر جیتے جی سر سید کے جی سے رسول اللہ اور قرآن کی محبت نہ گئی اور جیسے جیسے وہ بڑے ہوتے گئے ان کے دل کے راستے قرآن پاک اور رسول اکرم کی محبت ان کے شعور کا حصہ بنتی گئی بعد میں انھوں نے سیرت پاک پر کتابیں لکھیں اور قرآن مجید کی تفسیر بھی۔

احمد کو اپنی ماں سے بے حد محبت تھی زندگی بھر جس شخصیت کا ان پر سب سے زیادہ اثر رہا وہ ان کی ماں تھیں یہی ان کی محبت تھی جس میں حب وطن بھی پوشیدہ ہے اور حب قوم بھی اور اسی سے ان میں وہ تمام تمدنی نیکیاں اور خوبیاں پیدا ہوئیں جس کا ہم ذکر کرتے ہیں۔ احمد کی والدہ کئی اعتبار سے اپنے زمانے کی خواتین سے آگے تھیں، انھیں بچوں کی تربیت میں ملکہ حاصل تھا وہ دلی کی اشرافیہ کی رکن رکین تھیں۔ اس کے باوجود ان کا دل زر و زیور سے اتنا خوش نہ ہوتا تھا جتنا ضرورت مندوں کی حاجت روائی سے ہوتا تھا وہ بیواؤں کی مونس و غمخوار تھیں اور سماج کی ٹھکرائی ہوئی عورتوں کے لئے امید کا پیغام تھیں وہ گھر کی آمدنی کا پانچ فیصد حصہ غریب عورتوں کی بیٹیوں کی شادی بیاہ اور دوسرے رفاہی کاموں پر خرچ کرتی تھیں اس کے علاوہ اپنی وسیع و عریض حویلی کے بہت سارے یکدرے اور کمروں میں انھوں نے دلی کی لاوارث اور بوڑھی اور بیکس عورتوں کو پناہ دے رکھی تھیں وہ ان کی ہر طرح خبر گیری کرتی تھیں انھیں لاوارث عورتوں میں ایک عورت زینن بھی تھی وہ بیمار پڑی۔ اتفاق سے احمد کی والدہ کو بھی وہی بیماری لاحق ہوئی۔ احمد بڑے ہو چکے تھے کماتے تھے اپنی والدہ کے لئے قیمتی معجون لے کر آئے جسے خاموشی سے ان کی والدہ نے زینن کو کھلادیا۔ انیسویں صدی میں دلوں اور تاریخوں کی سعادت اور

نحوست کا بہت خیال رکھا جاتا تھا لیکن احمد کی والدہ کو ان باتوں پر مطلق اعتقاد نہ تھا وہ روایت شکن خاتون تھیں اور اسلامی اخلاق کا نمونہ تھیں خدا ترسی کے کاموں کے لئے برادری بھر میں مشہور تھیں انھوں نے قرآن پاک کے علاوہ فارسی کی ابتدائی کتابیں بھی پڑھی تھیں ۔ جب ننھے احمد رات کو اپنی ماں کے سامنے دن کا پڑھا ہوا سبق سنانے جاتے تو سوت کی گوندھی ہوئی تین لڑیں ایک لکڑی میں بندھی ہوئی بچہ کی تنبیہ کے لئے وہ اپنے پاس رکھ لیتیں اگرچہ وہ ان پر خفا تو کئی بار ہوئیں لیکن ان سوت کی لڑوں سے ان پر کبھی مار نہیں پڑی ۔ دراصل یہی ذات احمد کے لئے علم و ہدایت اور تالیف قلب کا مصدر تھی ۔ عزیز النسا بیگم ان عورتوں میں ہیں جن پر ہندوستان ہی نہیں انسانیت سدا فخر کرتی رہے گی ۔

بچپن میں احمد درسی کتابیں پڑھنے میں ذرا کم دل لگاتے تھے اس کے باوجود انھیں پڑھائی پر اچھا خاصا وقت دینا پڑتا تھا انھیں استاد سے پڑھا ہوا سبق والدہ کے علاوہ نانا کو بھی سنانا پڑتا تھا نانا اچھا سبق سنانے پر مزیدار مٹھائی دیتے تھے ورنہ ڈانٹ پڑتی تھی احمد ایک رات غم زدہ دل سے سبق سنا رہے تھے ایک شعر کا انھوں نے ترجمہ کیا کہ طمع کے تین حرف تینوں خالی نانا نے نظر اٹھا کر دیکھا دوسری اور تیسری بار بھی جب احمد نے یہی معنی کہے تو نانا نے برہمی کا اظہار کیا اور کہا کہ بے پیر سبق یاد نہیں کرتا ۔ اتنا کہنا تھا کہ نانا کے چہیتے کی آنکھوں سے آنسوؤں کے تار جاری ہوگئے اس دن احمد کو بہت رنج ہوا تھا بہت دیر کے بعد سمجھے تھے کہ است کے معنی کہنا بھول گئے ہیں ۔ احمد کا بچپن ننھیال میں گذرا تھا نانا کی مجلس میں شائستگی ، سلیقے اور نفاست کی فراوانی تھی ان کے نانا کا معمول تھا کہ وہ دن کا کھانا محل سرا میں اور رات کا کھانا دیوان خانے میں کھاتے تھے ایک وسیع ڈائننگ روم میں جسے اس زمانے میں نعمت خانہ کہتے تھے ایک بہت وسیع صاف و شفاف دستر خوان بچھتا تھا اور خواجہ فرید الدین احمد کے سارے بیٹے اور بیٹیاں ، بیٹوں کی بیویاں پوتے اور پوتیاں نواسے اور نواسیاں سب ان کے ساتھ کھانا کھاتے تھے اس بات کا لحاظ رکھا جاتا تھا کہ کوئی چیز دستر خوان پر گرنے نہ پائے ۔ نہ انگلیوں کو کوئی چاٹے ، نہ روٹی کے ٹکڑے سے تھڑا ہوا ہاتھ پونچھے ، نہ ہاتھ کھانے میں بھرنے پاویں نہ دستر خوان پر اپنی پلیٹوں کے سامنے چچوڑی ہوئی ہڈیاں رکھی جائیں نہ نوالہ چبانے کی آواز منہ سے نکلے سب بچے اپنے کپڑے صاف رکھتے تھے کہ کہیں نانا کی ڈانٹ نہ پڑ جائے ۔ یہاں تک کہ سب بچے اپنے پیر بھی صاف رکھتے تھے کہ کہیں سفید فرش پر دھبہ نہ پڑ جائے ۔

احمد کے نانا خواجہ فرید الدین احمد دو بار مغل حکومت کے وزیر اعظم رہ چکے تھے دو ملکوں ، ایران اور برما میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے سفارتی خدمات انجام دے چکے تھے دو بار کلکتہ مدرسہ کی نظامت کر چکے تھے ۔ یہ مدرسہ ۱۷۸۰ء میں وارن ہیسٹنگز نے قائم کیا تھا ۔ خواجہ فرید الدین کو ریاضیات سے طبعی مناسبت تھی انھوں نے آصف الدولہ کے وزیر اعظم علامہ تفضل حسین سے لکھنؤ میں علم ریاضی کی تحصیل کی تھی کہا جاتا ہے کہ خواجہ فرید الدین مسلمانوں میں دوسرے اقلیدس تھے ان کے شاگردوں میں مولوی کرامت علی ، خواجہ محمد ناصر جان اور حکیم رستم علی جیسے جید عالم اور فنکار تھے جس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ خواجہ فرید کا علم و خبر میں کیا پایہ رہا ہوگا ۔ ان کا علم کتابی نہ تھا اور نہ زمانے سے بے خبر ، وہ جس زمانے میں کلکتہ میں تھے اس وقت یورپ سے تازہ تازہ چھاپہ خانہ آیا تھا سیرام پور میں کتابیں چھپ رہی تھیں ۔ راجہ رام موہن رائے اپنا اخبار مراۃ الاخبار نکالنے لگے تھے کلکتہ مختلف زبانوں اور تہذیبوں کا مرکز بنا ہوا تھا وہاں جو ذہنی بیداری رونما ہو رہی تھی اس کے اخذ و اکتساب میں سرسید کے نانا خواجہ فرید الدین احمد بھی شریک تھے وہ غالب کے کلکتہ پہنچنے سے پہلے دس بارہ سال کلکتہ میں گذار

کر دہلی آچکے تھے ۔ خواجہ فرید الدین احمد کے پاس دہلی میں ایک بہت اچھا کتب خانہ تھا جس میں مشرقی علوم کی کتابوں کے علاوہ جدید انگریزی کتابیں بھی تھیں جن پر خواجہ فرید الدین کے ہاتھ کے لکھے ہوئے معنی و مطلب بھی تھے ۔ وہ انگریزی بول بھی لیتے تھے اور پڑھتے بھی تھے ۔

ان دنوں دلی میں بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو یہ سمجھتے تھے کہ ہمارے تمام پرانے طریقے دودھ کے دھلے ہیں اور اتنے درست ہیں کہ ان کی پیروی ہمیں آنکھ بند کر کے کرنی چاہئے کچھ لوگ دلی میں ایسے بھی پیدا ہو گئے تھے جو دلی میں تعینات ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز افسروں کی بغیر سوچے سمجھے نقل کرنا ہی اپنی شان سمجھتے تھے لیکن وہاں چند لوگ ایسے بھی تھے جو ہندوستان اور یورپ دونوں جگہ کی خوبیوں اور خامیوں سے واقف تھے خواجہ فرید الدین انھیں لوگوں میں سے تھے ۔ وہ صاحب علم و فکر تو تھے ہی ساتھ ہی تصوف کا رجحان بھی رکھتے تھے، لیکن انکا دل جہاں بانی کو رقم کرنے میں زیادہ لگتا تھا وہ جہاں دیدہ، مدبر تھے انھیں مغل حکومت اور ایسٹ انڈیا کمپنی دونوں کا اعتبار حاصل تھا دلی کے دکمیارے بادشاہ کو تو ان پر اتنا بھروسہ تھا کہ قلعہ معلی کے مالی حالات کو تباہ کن ناکامی سے بچانے کے لئے انھیں دوبار کلکتہ سے بلایا گیا انھیں کے مشورہ پر اکبر شاہ ثانی نے اپنے پنشن کے معاملات کو درست کرنے کے لئے رام موہن رائے کو لندن بھیجا تھا اور راجہ کا خطاب دیا تھا ۔ احمد نے بچپن میں کئی بار راجہ رام موہن رائے کو لال قلعہ میں دیکھا تھا ایسٹ انڈیا کمپنی کو بھی خواجہ فرید پر اتنا اطمینان تھا کہ انھیں اس نے ایران اور برما صلح صفائی کے لئے بھیجا تھا دلی کا ریذیڈنٹ جنرل آکٹرلونی جسے دہلی والے اختر لونی کہتے تھے اور مغل بادشاہ نے اسے نصیر الدولہ معز الملک وفادار خاں بہادر ظفر جنگ کا خطاب دیا تھا وہ خواجہ فرید کے یہاں اکثر آیا کرتا تھا ان کے دیوان خانے میں جہاں فرش کی نشست تھی اور رومی مخمل اور زربفت کا مسند رکھا رہتا تھا وہاں ایک کرسی شیر کے سے پایوں کی بھی رکھی رہتی تھی اور جب جنرل آکٹرلونی آتا تھا تو اس پر بیٹھتا تھا ایک دن وہ دیوان خانے میں اپنی پوری وردی کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا کہ کھیلتے ہوئے ادھر احمد آنکلے اور جنرل کو دیکھ کر الٹے پاؤں واپس جانے لگے لیکن آکٹرلونی نے انھیں اپنے پاس بلالیا باتیں ہونے لگیں ۔ احمد نے پوچھا آپ نے ٹوپی میں پر کیوں لگا رکھے ہیں اور کوٹ میں دوہرے بٹن کیوں لگے ہوئے ہیں ۔ دراصل بچپن ہی سے احمد کی افتاد طبع کچھ ایسی تھی کہ ہر نئی چیز ان کے تجسس میں اضافہ کرتی، معلوم کرنے کی یہی خواہش تھی جس نے آگے چل کر علمی جستجو کو سرسید کے لئے ایک دائمی سفر بنادیا ۔

احمد ابھی دلی سے باہر نہیں گئے تھے ایک دن ان کے والد نے مغل پورہ اپنے گاؤں چلنے کے لئے کہا احمد کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں جب وہ مغل پورہ پہنچے تو نیلے شفاف آسمان اور حد نظر تک سرسبز کھیتوں کی وسعتیں ان کا استقبال کر رہی تھیں گو تیار ہونے کی خوشبو سارے میں پھیلی ہوئی تھی یہ گاؤں جفاکش اور کھرے جاٹوں سے آباد تھا یہاں کے قدرتی مناظر، کھیت کھلیان شام کو چراگاہوں سے پلٹتے ریوڑ، مصفا تالاب اور شاداب باغات احمد کو اچھے لگے تھے وہ فصل کے موقع پر ایک ایک ہفتہ اپنے گاؤں میں رہتے تھے ۔ یہاں کی خوشگوار یادیں، جنگل میں پھرنا عمدہ دودھ دہی اور تازہ تازہ گھی باجرے اور مکئی کی گرم گرم روٹیوں کی یاد سرسید کو عمر کے آخری حصے میں بھی رہی ۔ گاؤں میں رہنے کی وجہ سے وہ وہاں کی مشکلوں اور پریشانیوں کو بھی سمجھ گئے تھے اسی لئے بڑے ہو کر انھوں نے کاشت کاری کے پرانے طریقوں کو بدل کر رائج کرنے کا کام علی گڑھ سائنٹفک سوسائٹی کے ذریعہ شروع کرایا زراعت پر کتاب کا ترجمہ کرایا اور بھی چھوٹے بڑے ایسے

کام کئے جس سے دیہات کے لوگوں کو بھی پیٹ بھر روٹی ملے۔

احمد جیسے جیسے بڑے ہو رہے تھے انھیں حویلی کے اندر چین نہیں آتا تھا انھیں مردانہ دلچسپیاں ہی نہیں خطرے کی زندگی پسند تھی۔ انھیں گھوڑے کی سواری اچھی لگتی تھی' اس زمانے میں ان کے والد سید متقی کو تیر اندازی اور تیراکی میں کمال حاصل تھا شرفائے دہلی کی بڑی تعداد ان فنون میں ان کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرتی تھی احمد نے بھی اپنے باپ کے ساتھ تیرنے کی مشق کافی بہم پہنچائی تھی وہ دلی میں تیراکی کے مقابلوں میں شریک ہوتے وہ پانی میں جس طرح جدوجہد کرکے آگے بڑھتے تھے اسی طرح بعد میں وہ ہر اس دریا کو پیر جاتے تھے جو ان کا راستہ روکتا تھا۔ بے خطا نشانہ لگانے میں بھی احمد کا جواب نہ تھا ایک دفعہ جب احمد کا نشانہ تودے میں نہایت صفائی اور خوبی سے جاکر بیٹھا تو باپ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ مچھلی کے جائے کن تیرائے۔

بچپن میں احمد کو کبھی کبھار بہت طیش آجاتا تھا ایک بار وہ اپنے ساتھی کے ساتھ شطرنج کھیل رہے تھے اس نے بے ایمانی کی ان کو بہت تاؤ آیا وہ نہایت تیزی سے اٹھے اور اس کے ہاتھ پر اتنے زور سے مکا مارا کہ اس کا انگوٹھا اتر گیا وہ بھونچکا ہو کر احمد کو دیکھنے لگا اسے اپنے درد کا احساس ہوا اتنے میں سارے دوست جمع ہوگئے آخر کسی طرح معاملہ رفع دفع ہوا اسی طرح ایک بار وہ اپنے ایک بوڑھے نوکر پر غضبناک ہوگئے اور اسے ایک تھپڑ رسید کر دیا ان کی والدہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے ان کو گھر سے نکال دیا اور جب تک احمد نے نوکر سے معافی نہ مانگ لی انھیں گھر میں قدم رکھنے کی اجازت نہ ملی لیکن احمد جیسے جیسے بڑے ہوتے گئے وہ اپنے غصہ پر قابو پاتے گئے یہاں تک کہ جب چاروں طرف سے ان کی تذلیل و تکفیر کی گوا گہار مچی تب بھی سر سید کے دل میں انتقام کا خیال نہ آیا اس وقت تک عفو پروری اور درگذران کا شعار ہوچکا تھا۔

احمد خانوادہ رسالت کے چشم و چراغ تھے ان کا سلسلہ نسب آنحضرت سے ملتا ہے۔ یہی نہیں ان کے خاندان کو مغل دربار میں پشتینی رسوخ حاصل تھا مغل اعظم شہنشاہ اکبر سے اکبر شاہ ثانی تک تقریباً تین سو برس کے عرصے میں مغل حکومت کو احمد کے خاندان سے لگاتار سپہ سالار' مدبر، شاعر اور عالم ملتے رہے انھیں اسباب سے ان کا خاندان دلی کے چند ممتاز خاندانوں میں تھا احمد کے والد مغل دربار کے راستباز اور کھرے امیروں میں تھے انھیں بادشاہ بھائی کے لفظ سے مخاطب کرتا تھا اور وہ اس کی خواب گاہ تک بلا روک ٹوک جاسکتے تھے لیکن جیسے جیسے وہ اپنے پیر طریقت شاہ غلام علی مجددی کی مقناطیسی نظروں کے تار میں بندھتے گئے ان کا دل دربار کے جھمیلوں سے بیزار ہوتا گیا اور دنیا کی دوستی سے ان کا دل پاک ہوتا گیا انھوں نے مغل دربار کا جانا کم کر دیا اور ان کی جگہ احمد دربار میں جانے لگے وہ ابھی آٹھ نو برس کے تھے کہ شاہی جلوس کے موقع پر اس وقت پہنچے جب دربار برخاست ہوچکا تھا' بادشاہ محل میں جانے کے لئے ہوادار پر سوار ہوچکے تھے' بادشاہ نے ان کو گھوڑے پر آتے ہوئے دیکھا' بادشاہ جب تسبیح خانے کے پاس پہنچے تو ٹھہر گئے اور جواہر خانے کے داروغہ کو کشتی جواہر لانے کا حکم دیا اور احمد کو اپنے پاس بلایا ان کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پوچھا کہ دیر میں کیوں آئے مگر وہ چپ کھڑے رہے درباریوں نے کہا عرض کرو تقصیر ہوئی جب بادشاہ نے ان سے دوبارہ پوچھا تو احمد نے کہا کہ سو گیا تھا بادشاہ مسکرائے اور فرمایا کہ بہت سویرے اٹھا کرو' احمد کے اس طرح سچ بولنے پر سارے درباری حیران ہوگئے تھے۔ یہی سچ بعد میں سر سید کی تقریر میں، تحریر میں، بات میں اور برتاؤ میں ان کی پہچان بن گیا۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

سید فرخ جلالی *

سرسیّد کے چند ساتھی

(۱۸۶۴ء سے ۱۸۷۴ء تک)

سرسید کی شخصیت تحریک اور تشکیل کی ترجمان تھی وہ فکر کو عمل میں اور بصر کو نظر میں تبدیل کرنے کے لیے بے چین رہتے تھے ۱۸۵۷ء کے واقعہ کے بعد ان کی تحقیق اور جستجو کی عادت اجتماعیت اور نئے خیالات کی اشاعت کے لیے وقف اور وضع ہو گئی۔

۱۸۵۷ء کے بعد ان کی ماں عزیز النسا بیگم اور محبوب بیوی پارسا بیگم کی وفات نے غور و فکر اور قوم کے لئے کچھ کرنے کے' نئے بند بنانے کے' منصوبوں اور تحریکوں نے جنم لینا شروع کر دیا۔ وہ اب رنج و غم کے پیکر نہیں تھے فکر اور عمل کا مرقع تھے' وہ یاس کی تصویر نہ بنے' امید اور آس کا دریا بن گئے' وہ اب روایت کے وضع دار محافظ نہ تھے بلکہ اب نئی فکر اور تبدیلی کے پیامبر اور پاسدار تھے۔ یہیں سے سید احمد خاں سرسید کے روپ اور رنگ کی طرف سفر کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے بعد نئے متوسط طبقے میں کچھ کچھ غور و فکر اور مغربی خیالات پر سوچنے کے اجتماعی اداروں نے فروغ پایا۔ اب شہروں میں زوال اور ادبار کے اسباب پر نظر پڑنے لگی اور دہلی لٹریری سوسائٹی۔ روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی بریلی۔ ڈبیٹنگ سوسائٹی میرٹھ۔ جلسہ تہذیب لکھنؤ اور انجمن پنجاب لاہور جیسی انجمنوں اور اداروں نے جنم لینا شروع کیا۔ ان انجمنوں میں سماجی اصلاح اور نئے خیالات کے نعرے ذہن میں آنے لگے تھے۔

۱۸۶۳ء میں سرسید ہندوستان کے پیرس و لندن یعنی کلکتہ گئے اور انجمن مذاکرہ اسلامیہ میں ایک لکچر تعلیم اور قومی ہمدردی اور حب وطنی پر دیا وہاں ایشیاٹک سوسائٹی اور کلکتہ یونیورسٹی تھی یہ ادارے مغرب کی نئی تحریکوں کے نقیب تھے۔ سرسید نے سماجی اصلاح کو اپنا مقصود نہیں بنایا۔ بلکہ وہ تو نئی تجزیاتی نظر کے ترجمان اور "سائیٹنفک سوسائٹی کے بانی بن گئے۔ اب یہ لکھنؤ کا جلسہ تہذیب نہ تھا نہ دہلی کی لٹریری سوسائٹی تھی بلکہ علی گڑھ اور غازی پور کے نئے مین فین تھے یہ رونے کی آواز نہ تھی بلکہ نئے دور کے طفل کی غوں غاں تھی۔

۹ جنوری ۱۸۶۴ء کو انھوں نے سائیٹنفک سوسائٹی کی بنا ڈالی۔ پرانے رفیق اور نئے شناسا دریافت کیے۔ اگر آپ آج تلاش کریں گے تو ان افراد کے خاندانوں نے آگے چل کر نئی تعلیم کا خیر مقدم کیا۔ اور ہندوستان اور پاکستان کے نئے متوسط

* شعبۂ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

طبقے New Middle Class کے جنم کی تیاری ہونے لگی۔سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد اس طرح سے تھے ۔
۱۔ان علوم اور فنون کی کتابوں کا جن کا انگریزی زبان یا یورپ کی اور کسی زبان میں ہونے کے سبب ہندوستانی نہیں سمجھ سکتے ایسی زبانوں میں ترجمہ کرنا جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوں۔
۲۔سوسائٹی کو کسی مذہبی کتاب سے سروکار نہ ہوگا۔
۳۔سب قوموں کے لوگ سوسائٹی کے ممبر ہو سکیں گے۔

یہ وہ عظیم مقاصد ہیں جہاں نیا ہندوستان ایک سو تیس برس کے بعد بھی پورے طور سے نہیں پہنچ پایا ہے سائینٹیفک سوسائٹی کے مقاصد اور منصوبوں پر سرسید کے پہلے سوانح نگار لفٹننٹ گراہم نے تقریر کی گراہم ۱۸۶۲ء تک بدایوں میں سپر نٹنڈنٹ پولس تھے پہلے صدر بی۔اسپیٹ تھے اور سیکریٹری سید احمد تھے۔

میں یہاں ان چند ہندوستانیوں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے ابتدائی دور میں سائینٹیفک سوسائٹی کی رکنیت قبول کی یا اختیار کی۔

ٹیپو سلطان کے پوتے شہزادہ سلطان محمد جلال الدین اس کے رکن بنے جو کلکتہ میں بھی رہے تھے۔

نواب احمد بخش کے بیٹے نواب ضیاء الدین احمد خاں رئیس لوہارو جن کے کتاب خانے کا ۱۸۵۷ء میں لٹ جانے کا غم غالب نے کیا تھا اس کے ممبر تھے سرسید نے جب ۱۸۷۵ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کی بنا ڈالی تو یہ پہلے ممبروں میں سے تھے یہ غالب کے خسر نواب الہی بخش معروف کے بھتیجے تھے ان کے بیٹے شہاب الدین ثاقب اور نواب احمد سعید خاں طالب تھے ۱۸۵۷ء کے بعد بھی انھوں نے ایک بڑا کتاب خانہ جمع کیا۔

مولوی عبداللطیف جو لیجس لیٹو کونسل بنگال کے ممبر تھے اور مذاکرہ اسلامیہ کلکتہ کے سیکریٹری تھے عبدالغفور نساخ کے بھائی تھے اس سوسائٹی کے ممبر تھے۔شیخ نجم الدین حیدر جو شیخوپور بدایوں کے رہنے والے تھے غالب سے ان کے تعلقات تھے آگرہ میں تحصیلدار تھے اور نواب اسحاق خاں جو ایم۔اے۔او کالج کے (۱۹۱۳-۱۸) سیکریٹری تھے اس سوسائٹی کے ممبر تھے۔

مولوی محمد بخش بدایونی جو آگرہ میں صدر الصدور تھے ان کے بھائی مولوی علی بخش تھے ان کے دوسرے بھائی سعید بخش تھے جن کے بیٹوں میں شکور بخش ڈپٹی کلکٹر اور رزاق بخش قادری تھے دونوں نے ایم اے او کالج میں پڑھا شکور بخش کو سرسید بہت عزیز رکھتے تھے۔محمد بخش کے ایک بیٹے تھے۔جن کا نام حامد بخش تھا مولوی محمد بخش کی تنخواہ آٹھ سو روپیہ ماہوار تھی اور یہ ہی تنخواہ سرسید کی تھی محمد بخش کو مولانا فیض احمد بدایونی نے نوکر کرایا تھا وہ گورنر کے استاد تھے آل احمد سرور ان کے پرنواسے اور عبداللہ ولی بخش قادری ان کے پرپوتے ہیں۔حیات جاوید میں محمد بخش کا ذکر ہے سائینٹفک سوسائٹی کے ابتدائی رکن تھے۔

عنایت اللہ خاں شروانی ابن داود خاں شروانی رئیس بھیکم پور کو علی گڑھ تحریک میں بڑی اہمیت حاصل ہے۔سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی کا مستقل صدر مقام الہ آباد تجویز کیا تھا۔مگر عنایت اللہ خاں کی تحریک اور ان کے بھائی غلام احمد خاں کی مدد سے سائنٹفک سوسائٹی کا صدر مقام علی گڑھ قرار دیا گیا۔عنایت اللہ خاں کے بھتیجے احمد سعید خاں اور نواب مزمل اللہ خاں تھے دونوں سرسید کے جاں نثار رفیق تھے نواب مزمل اللہ خاں مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر رہے نواب مزمل اللہ خاں کے بیٹے

نواب رحمت اللہ خاں علم و ادب کے سرپرست ہیں، سائنٹفک سوسائٹی کے عنایت اللہ خاں خاص رکن تھے یونین کے سامنے کا فوارہ ان کی یادگار ہے۔

سرسید کے عزیز سمیع اللہ خاں کے خاندان کے خاص فرد مولوی امین اللہ خاں جن کا تعلق ریاست الور سے تھا اس سوسائٹی کے رکن ہوئے ۔ غازی پور کے شاہ اسد علی جن کے خاندان کا علی گڑھ تحریک سے خاص تعلق رہا ہے اس سوسائٹی کے رکن بنے ۔مولوی امجد علی زبیری رئیس امروہہ جن کے بیٹے حامد علی خاں تھے، حامد علی خاں نے ایم ۔اے کالج میں پڑھا لندن اعلیٰ تعلیم کے لیے گئے اور ابتدائی دور میں انڈین نیشنل کانگریس میں شامل ہوئے ۔امجد علی کا خاندان حکیموں کا تھا۔امجد علی خاں اس کے رکن بنے ۔سلطان حسن عثمانی منصف، علی گڑھ اور منصف داتا گنج بدایوں تھے ۔ غالب کے شاگرد تھے ۔ کالج کی کمیٹی مذہب اہل سنت کے ممبر تجویز ہوئے بریلی کے ساکن تھے ۔قدیم وطن بدایوں تھا۔سوسائٹی کے ممبر تھے ۔شیخ شرف الدین رئیس شیخوپور تھے ۔ابتدائی دور میں CIE کا خطاب ملا ۔سرسید نے رسالہ خیرخواہان ہند میں ان کا احوال لکھا ۔اس سوسائٹی کے رکن تھے ۔مولوی وحید احمد مودود ان کے پوتے تھے ۔ کنور وزیر علی خاں جو بدایوں دہلی، میرٹھ میں ڈپٹی کلکٹر رہ چکے تھے اور نواب محمود علی خاں رئیس چھتاری کے بھائی تھے ۔ کنور وزیر علی خاں نے غالب کو قمار بازی کے سلسلہ میں قید کی سزا بھی کی تھی ان کے والد کا نام کنور مردان علی خاں تھا، اس سوسائٹی کے ممبر تھے۔

سرسید کے مشہور مخالف اور انگریزی اقتدار کے حامی سید امداد علی رئیس آگرہ اس سوسائٹی کے رکن تھے ۔محمد مردان علی خاں رعنا جو غالب کے شاگرد تھے اس سوسائٹی کے رکن بنائے گئے ۔راجستھان کی کئی ریاستوں میں وزیر رہے ۔مراد آباد کے رہنے والے تھے، نواب کنور لطف علی خاں رئیس ابن نواب محمود علی خاں رئیس چھتاری اس سوسائٹی کے رکن تھے ۔ان کے بھائی عبدالعلی خاں کے بیٹے نواب احمد سعید آف چھتاری مسلم یونیورسٹی کے چانسلر رہے ۔ان کے بیٹے نواب زادہ ابن سعید خاں کورٹ کے ممبر ہیں۔

سرسید کے بے تکلف دوست زین العابدین مچھلی شہری، محمد آباد، غازی پور میں منصف تھے ۔ابتدائی دور میں انگریزی کی ایک کتاب کا اردو میں ترجمہ کیا سرسید کے قریب ہی دفن ہوئے ۔اس سوسائٹی کے فعال ممبر تھے۔

جناں ناز دلسوئے خلد کہ زین العابدین دارد

(ان کے بیٹے زین الدین ڈپٹی کلکٹر تھے ۔ دوسرے بیٹے عین الدین بھی ڈپٹی کلکٹر تھے)۔ سوسائٹی کے ممبر تھے ۔سرسید کے دوست مولوی مظہر اللہ بکھر الونی بجنور میں کلکٹری میں سررشتہ دار تھے ۔ان کے پوتے اسد الرحمن علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں شعبہ انگریزی میں تھے ۔سرسید کے خطوط مولوی مظہر کے نام چھپ چکے ہیں ۔بنگال کے سہروردی خاندان کے خاص فرد عبداللہ خاں عبیدی اس کے ممبر تھے ۔چودھری اصغر علی ضابط کھیڑہ بدایوں کے رئیس تھے ان کے خاندان نے تحریک کا ساتھ دیا ۔اس سوسائٹی کے رکن رہے۔

سائنٹفک سوسائٹی کے ممبران کے چند نام اور لکھتا ہوں ۔

۱۔امجد علی وکیل آگرہ ۲۔محمد امر اللہ وکیل آگرہ ۳۔حفیظ الدین حیدر وکیل ۔مرزا پور ۴ ۔ مولوی حیدر حسن وکیل آگرہ ۔ سمیع اللہ خاں وکیل آگرہ ۶ ۔ قاضی علی اکبر چریا کوٹی وکیل غازی پوری ۔ ۷ ۔مولوی عبد الستار وکیل آگرہ ۔سید فضل حق وکیل علی گڑھ

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۳ء

۹۔ قاضی لطافت حسین وکیل علی گڑھ۔ ۱۰۔ قاضی محمد مددحسین وکیل علی گڑھ۔ ۱۱۔ احمدحسین تحصیلدار باندہ ۱۲۔امام الدین تحصیلدار مراد آباد ۱۳۔میر سید محمد تحصیلدار سکندرہ راؤ۔ ۱۴۔علی حسین تحصیلدار بنارس ۱۵۔ فضل احمد تحصیلدار قائم گنج ۱۶۔ قاضی فضل احمد تحصیلدار میرٹھ ۱۷۔سید نادر علی تحصیلدار نگینہ۔ ۱۸۔ مہدی علی خاں تحصیلدار اٹاوہ ۱۹۔سید نصیر علی تحصیلدار باغپت ۲۰۔سید تراب علی ڈپٹی کلکٹر بدایوں

سائیٹنفک سوسائٹی کے ہندو ممبران کے نام

۱۔منشی نولکشور لکھنو۔ ۲۔ راجہ جے کشن داس مراد آباد۔ ۳۔ لالہ ہربنس لال۔ ۴۔ کاشی نریش مہاراجہ ایشری پرشاد۔ ۵۔لالہ اجودھیا پرشاد ۶۔ رائے بختاور سنگھ۔ ۷۔بابو لعل کانپور۔ ۸۔لالہ بہاری لال۔ ۹۔ لالہ بدری پرشاد وکیل علی گڑھ۔ ۱۰۔ ونایک پرشاد لکھنو ۱۱۔ پنڈت ٹھاکر دت غازی پور ۱۲۔راجہ ٹیکم سنگھ مرساں۔ ۱۳۔لالہ جگت نرائن غازی پور۔ ۱۴۔ راجہ دیو نرائن بنارس۔ ۱۵۔ چندر شیکھر مترجم بدایوں ۱۶۔ چنی لال بنارس۔ ۱۷۔ چوبے دمن پت رائے آگرہ۔ ۱۸۔ بابو دکھنا رنجن لکھنو۔ ۱۹۔ مہاراجہ دگ وجے سنگھ بلرام پور۔ ۲۰۔رادھا کشن رئیس علی گڑھ (تیج بہادر سپرو کے دادا)۔

عربی ادب کے عالم مولانا فیض الحسن سہارنپوری کو سر سید نے سائیٹنفک سوسائٹی میں ملازم رکھا جب دیوبند کے دار العلوم کے صدر مدرس مولانا یعقوب ابن مملوک علی کی تنخواہ ۲۵ روپے تھی۔ مولانا فیض الحسن کا پچاس روپیہ مشاہرہ مقرر ہوا۔ یہاں سے مولانا فیض الحسن لاہور گئے ان کے پوتے ماسٹر اخلاق احمد صاحب کا بیان ہے کہ سانپ کے کاٹنے سے وفات ہوئی۔ مولوی رشید حسن اور ماسٹر سعید حسن دو بیٹے چھوڑے۔

دریافت

پروفیسر عرفان حبیب *

سرسیّد احمد خاں اور تاریخ نویسی

ہندوستان کی روایتی تاریخ نویسی میں جو بڑی تبدیلی انیسویں صدی میں شروع ہوئی، اس میں سید احمد خاں کی اپنی جگہ ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ سید احمد خاں کے طرز تخیل پر اس جدید تہذیب کی تحریک کا جسے ہم آج کل "بنگال کے نئے جنم" (Bengal Renaissance) کے نام سے جانتے ہیں، بڑا گہرا اثر پڑا۔

سید احمد خاں کے خاندان کا قریبی تعلق دہلی کے بادشاہی دربار سے تھا، جس کے مختلف عہدوں پر ان کے خاندان کے اراکین کئی پشتوں سے فائز رہے تھے۔ مغل دربار کے وفادار دوستوں میں جدید تہذیب کی تحریک کے سربراہ راجہ رام موہن رائے سب سے اگلی صف میں تھے۔ کلکتہ اور لندن میں ۱۸۲۹ء سے اپنی وفات (۱۸۳۳ء) تک انھوں نے مغل بادشاہ اکبر شاہ ثانی کے حقوق، اختیارات اور پنشن کے سلسلے میں بغیر کسی انعام کی خواہش کے انتھک کوششیں کیں اور انگریزی سرکار کی مخالفت کے باوجود شاہی دربار سے "راجہ" کا خطاب لینے سے انکار نہیں کیا۔ (۱) سید احمد خاں ۱۶ سال کے تھے جب ہندوستان کی اس عظیم ہستی کا انتقال ہو گیا لیکن یہ امر یقینی ہے کہ راجہ رام موہن رائے کے نام سے وہ اچھی طرح واقف ہوں گے اور اغلب یہ ہے کہ ان کے نظریات کے اثرات بھی ان تک پہنچے ہوں۔ جب سید احمد خاں نے انگریزی سرکار میں ملازمت شروع کی تو ان کے تعلقات انگریز افسروں سے قائم ہوئے۔ حالانکہ سید احمد خاں نے انگریزی پر کبھی عبور حاصل نہ کیا لیکن پھر بھی چند انگریز افسروں کی سرپرستی میں انھوں نے تاریخ اور دوسرے علوم کو جدید نقطہ نظر سے دیکھنا شروع کیا۔ اپنی عربی اور فارسی تعلیم کا پورا فائدہ اٹھا کر انھوں نے ہندوستان کے عہد وسطیٰ کی تاریخ میں تحقیقات شروع کیں، جو اب بھی تاریخ دانی کے لئے نہایت اہم ہیں۔

سید احمد خاں تقریباً ۲۲ سال ہی کے تھے کہ فارسی میں ان کی تصنیف "جام جم" کے نام سے منظر عام پر آئی۔ ان کی اس پہلی تاریخی تصنیف ہی میں مغربی تاریخ نویسی کا اثر جھلکتا ہے۔ کیونکہ "جام جم" ایک روایتی تاریخی کتاب نہیں ہے، بلکہ ایک حوالہ کی کتاب (Work of Reference) ہے۔ جس میں تیمور کے وقت سے لے کر ہندوستان کے بادشاہوں کے شجرے، پیدائش تخت نشینی اور وفات کی تاریخیں اور القاب وغیرہ دیئے گئے ہیں۔ سید احمد خاں ۱۸۳۹ء میں آگرہ کمشنری میں

* ایڈوانس سینٹر، شعبہ تاریخ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

نائب منشی کے عہدہ پر مقرر کئے گئے تھے، اور تعجب کی بات نہیں کہ "جام جم" انہوں نے آگرہ کے کمشنر رابرٹ ہیملٹن کی فرمائش پر لکھی۔ اور یہ ۱۸۴۰ میں آگرہ ہی سے شائع ہوئی۔ "جام جم" ہندوستان کے عہد وسطی کے مشہور انگریز مورخ سر ہنری ایلیٹ کی نظر سے گذری اور جو تنقیدی رائے اس نے ۱۸۴۹ء میں اس نوجوان عالم کی پیش کش پر دی ہے، وہ دلچسپی سے خالی نہیں ہے۔

> "یہ مفید جدولات ۱۸۴۰ء میں آگرہ سے شائع ہوئے۔ ان کے خاتمہ پر کئی مستند کتابوں کی فہرست دی گئی ہے جن سے مصنف نے اپنی اطلاعات فراہم کیں۔ حالانکہ تھوڑا سا شک ضرور ہوتا ہے کہ مصنف نے ان سب کتابوں کو واقعی استعمال کیا ہو۔ کیونکہ جب میں نے مصنف سے ذاتی طور پر خط و کتابت کی تو ان سے یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ ان میں سے کئی کتابوں میں کیا لکھا ہے اور اب وہ کہاں دستیاب ہو سکتی ہیں۔ بلکہ کچھ کتابوں میں، جن کا انہوں نے حوالہ دیا ہے، متعلقہ زمانہ کے بارے میں کوئی اطلاع ہے ہی نہیں۔" (۲)

کمزوریاں ہر کتاب میں ہوتی ہیں اور "جام جم" سید احمد خاں کا پہلا ہی علمی تجربہ تھا۔ خود ایلیٹ نے ان کی دوسری اہم کتاب "آثار الصنادید" کی تعریف کی ہے۔ "دارالخلافہ دہلی کی شاندار عمارات کا بڑا اچھا بیان ہے۔" (۳) سید احمد خاں منصف کے عہدہ پر مقرر ہو کر ۱۸۴۶ء میں اپنے وطن دہلی واپس پہنچے۔ یہاں ان کی ملاقات ایڈورڈ ٹامس (Edward Thomas) سے ہوئی۔ ایڈورڈ ٹامس کو سلاطین اور مغلیہ زمانہ کے بادشاہوں کے سکوں سے بہت دلچسپی تھی اور اس نے دہلی سلاطین کے سکوں پر اپنی پہلی کتاب ۱۸۴۷ء میں شائع کی۔ سید احمد خاں نے خود اس کی "مدد اور اعانت اور اعلیٰ ہمتی اور قدر دانی" کا ذکر کیا ہے جس کی وجہ سے "آثار الصنادید" ۱۲۶۳ھ مطابق ۱۸۴۷ء میں تیار ہو سکی اور دہلی سے شائع ہوئی۔ (۴)

"آثار الصنادید" میں مغربی انداز کی آثار قدیمہ سے دلچسپی کار فرما ہے۔ موجودہ عہد سے پہلے فارسی کی تاریخ نویسی میں عمارات اور کتبات پر رسالے لکھنے کی کوئی روایت نہیں تھی۔ اگر اس بات میں شک ہو تو سٹوری اور دوسرے مستند مصنفوں کی فہرستیں دیکھی جا سکتی ہیں۔ "آثار الصنادید" کا چوتھا باب (تذکرہ اہل دہلی) تو یقیناً تذکروں کی روایت پر لکھا گیا ہے، اور پہلے باب کے جدول یا نقشہ (دہلی کے حکمرانوں کی فہرست) میں "جام جم" کی جھلک ہے، لیکن دوسرے اور تیسرے ابواب جدید ترین علوم آثار قدیمہ و کتبات (Archaeology and Epigraphy) کے اثرات سے لبریز معلوم ہوتے ہیں۔ عمارتوں کی تصویریں اسی انداز میں بنائی اور چھاپی گئی ہیں جیسے انگریز مصنف کیمرا کے استعمال سے پہلے لکڑی (Wood cuts) یا پتھر (Lithography) کے چھاپوں سے شائع کرتے تھے۔ اسی طرح سید احمد خاں نے دہلی کے جن کتبوں کی نقلیں دی ہیں ان میں ہندوستان کے قدیم ترین کتبات یعنی اشوک کے ستونی فرامین کو اصل براہمی رسم الخط میں دیا گیا ہے، مہرولی کے آہنی مینار کے کتبہ کو بھی اصل خط میں شائع کیا گیا ہے اور بلبن کے عہد کے پالم باؤلی کے سنسکرت کتبہ کا اصل متن ترجمہ کے ساتھ درج ہے۔ قطب مینار کے کتبوں کو ان کی اصلی شکل اور پھر خط نستعلیق دونوں میں دیا گیا ہے۔ اپنی نوعیت کی یہ اتنی اہم تصنیف تھی کہ نہ صرف سید احمد خاں کی زندگی میں اس کے تین ایڈیشن نکلے (دوسرا ایڈیشن، دہلی ۵۴-۱۸۵۳ اور تیسرا لکھنو ۱۸۷۶ء) بلکہ اسی کا ترجمہ فرانس کے مشہور مستشرق گارسن دے تاسی نے ۶۱-۱۸۶۰ میں فرانسیسی میں شائع کیا۔ (۵) یہ ضرور ہے کہ مرزا سنگین بیگ نے برطانوی ریزیڈنٹ چارلس میٹکاف کی سرپرستی میں دہلی کی عمارات اور کتبات پر ایک کتاب فارسی

میں ۱۸۲۱ء میں (اضافات ۱۸۲۹ء) "سیر المنازل" کے نام سے لکھ چکے تھے۔ جس کے کئی مخطوطات ملتے ہیں۔ (سب سے پہلے مخطوطہ میں جو برلن میں ہے، تصاویر بھی ہیں)۔(۶) یہ کتاب سید احمد خاں کی نظر سے نہیں گزری اور ان کی تحقیقات اپنی ہیں۔ نیز ان کی کتاب میں عمارات پر کہیں زیادہ تفصیلات ہیں۔ تعجب ہوتا ہے کہ انہوں نے بقول حالی یہ کتاب ڈیڑھ سال ہی میں مرتب کر دی جبکہ انہوں نے اکثر کتبات خود نقل کیے اور عمارات کی تصاویر اور نقشے بنانے میں بھی ان کو کافی وقت لگا ہو گا۔ قطب مینار کے باہر کے کتبوں کو وہ صرف "چھینکے" میں بیٹھ کر پڑھ سکے، جو کھوں کا کام تھا۔(۷)

چھپائی کے آنے کی وجہ سے فن تاریخ میں ایک اور اضافہ یہ ہوا کہ پرانی کتابوں کو شائع کیا جانے لگا اور شائع کرنے کے لئے مستند متن تیار کرنے کی ضرورت ہوئی۔ یہ نہایت دلچسپ بات ہے کہ جس کتاب پر مصحح کی حیثیت سے سید احمد خاں کی پہلی نظر پڑی وہ کوئی تصوف یا دینیات کا پرانا رسالہ نہ تھا، بلکہ شیخ ابوالفضل کی کتاب "آئین اکبری" تھی۔ اس کتاب کا مصنف وہ تھا جس کو اسلامی علماء "ملحد" کہتے آئے تھے اور کتاب اس بادشاہ کے نظام مملکت کے متعلق تھی جس نے سلطنت مغلیہ کو مذہبی تفریق سے بالاتر رکھنے کی پالیسی اپنائی تھی۔ علاوہ ازیں نہ صرف ابوالفضل کا طرز تحریر مشکل تھا بلکہ اس کی کتاب میں بے انتہا اعداد و شمار (Statistics) کے جدول یا نقشے ہیں، جو معاشی تاریخ میں نہایت اہمیت رکھتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ہندوستان کے پرانے تہذیب و تمدن کا بھی اس میں ایک مفصل بیان ہے، جو معمولی فارسی داں کے لئے آسان فہم نہیں۔ سید احمد خاں نے کئی مخطوطات کو سامنے رکھ کر "آئین اکبری" کی تین جلدوں میں سے دو جلدوں (اول اور سوم) کو ۱۸۵۵ء میں مع تصاویر کے (جن میں سے اکثر انہوں نے خود بنوائیں) شائع کیا۔ اگرچہ یہ ایڈیشن اس لئے اتنا مستند نہیں ہو سکا جتنا بلوکمین (Blochmann) کا (۷۷۔۱۸۶۶ء) یا نولکشور، لکھنو کا (۱۸۸۲ء) تو اس کی وجہ یہ ہے کہ سید احمد خاں کو اتنے اچھے نسخے نہ مل سکے جو بعد کے ایڈیشنوں کے محققوں کو مل سکے۔ وہ اس بات پر مجبور ہوئے کہ کچھ اعداد و شمار گلیڈون کے ترجمے سے نقل کرلیں اور دوسری جلد جس میں ہندوستان کے صوبوں کا بیان تھا اور مالگذاری کے اہم اعداد و شمار تھے وہ تیار ہی نہ کر سکے۔ حالی کا کہنا ہے کہ انہوں نے دوسری جلد بھی تیار کر لی تھی لیکن اس کا نسخہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت میں ضائع ہو گیا۔ (۸)

۵۸۔۱۸۵۷ء کی بغاوت کے خاتمہ کے فوراً بعد سید احمد خاں نے اپنی علمی کارروائیاں پھر شروع کر دیں۔ سید احمد خاں کے "آئین اکبری" کے ایڈیشن سے ان کی تاریخی اور علمی قابلیت کی شہرت کلکتہ کی ایشیاٹک سوسائٹی تک پہنچ گئی اور سوسائٹی کی دعوت پر انہوں نے چودھویں صدی کے ہندوستان کے مشہور مورخ ضیاء برنی کی "تاریخ فیروز شاہی" کا ایڈیشن تیار کیا۔ جس کے پہلے صفحہ (مطبوعہ ۱۸۶۲ء) پر درج ہے کہ یہ ایڈیشن "بتصحیح مولوی سید احمد خاں صاحب با اہتمام کپتان ولیم ناسولیس و مولوی کبیر الدین احمد" شائع ہوا۔ یہ کہنا مبالغہ سے کام لینا ہو گا کہ سید احمد خاں نے ضیاء برنی کی تصنیف کا صحیح معنوں میں ایک تنقیدی (critical) ایڈیشن تیار کیا۔ ان کے پاس صرف چار مخطوطے تھے اس لئے وہ پتہ نہ لگا سکے کہ برنی کی تاریخ کا ایک پہلے کا متن بھی موجود ہے۔ جس کے کچھ حصوں کو برنی نے سہواً یا جان کر اپنے دوسرے متن میں شامل نہیں کیا کئی غلطیاں، بھی ناقص مخطوطات کی وجہ سے ان کے اپنے متن میں آگئیں پھر سید احمد خاں نے اکثر مخطوطوں کے اختلافات کو بھی نوٹ نہیں کیا ان سب کمزوریوں کے باوجود سید احمد خاں کا ایڈیشن اب بھی برنی کی تاریخ کا واحد کامل

ایڈیشن ہے اور دہلی سلطنت کی تاریخ کے لئے سب سے اہم ماخذ کی حیثیت رکھتا ہے۔

ابھی ضیاء برنی کی تاریخ کے ایڈیشن کا کام ختم نہیں ہوا تھا کہ سید احمد خاں نے ایک نئی تاریخی کتاب کو شائع کرنے کا کام اپنے ذمہ لے لیا۔ ایلیٹ نے ۱۸۴۹ء میں اپنے پڑھنے والوں کو اطلاع دی تھی کہ سید احمد خاں کے بڑے بھائی سید محمد خاں نے "تزک جہانگیری" کا ایک "بہت اچھا متن" تیار کیا ہے جو یقیناً شائع کرنے کی غرض سے ہوگا۔ کیونکہ مصحح نے اس کے لئے ایک مقدمہ بھی تیار کیا تھا جس میں اپنے آباو اجداد کے بارے میں اطلاعات درج کی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ نسخہ اصل میں سید احمد خاں ہی کا تیار کیا ہوا ہو۔ کیونکہ آکسفرڈ کی باڈلیئن لائبریری میں (نمبر ۲۲۱) تزک جہانگیری کا ایک مخلوطہ ہے جو ۱۸۴۶ء میں سید احمد خاں نے دس نسخوں کی مدد سے تیار کیا۔ ہو سکتا ہے کہ اب جو متن تزک جہانگیری کا ۶۴-۱۸۶۳ء میں انہوں نے غازی پور (آخری حصہ علی گڑھ) میں چھپوا کر شائع کیا وہ اسی تیار شدہ نسخہ یا اس کی نقل سے لکھوایا گیا ہو۔ باڈلیئن کے نسخہ کی طرح مطبوعہ تزک میں بھی محمد ہادی کا مقدمہ اور خاتمہ شامل ہیں۔ سید احمد خاں کا یہ ایڈیشن ان کی عالمانہ غیر جانبداری اور تاریخ سے وفاداری کا شاہد ہے۔ جہانگیر مذہبی تعصب کے اظہار سے خوش نہ ہوتا تھا اور اس لئے اس نے شیخ احمد سرہندی کے بارے میں تنقید و تنبیہ کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن سید احمد خاں نے یہ مناسب نہ سمجھا کہ ان الفاظ پر تبصرہ کریں یا یہ کہ حذف کر دیں۔

ایک مصحح کی حیثیت سے سید احمد خاں کا انتخاب، یعنی ضیاء برنی، ابو الفضل اور جہانگیر کی تصنیفات معنی خیز ہیں۔ ان کی گہری دلچسپی ہندوستان کی تاریخ سے تھی اور انہوں نے ان تین کتابوں کا انتخاب کیا جو ہندوستان کی تاریخ کے اہم ماخذوں کی کسی فہرست میں بھی لازمی طور سے شامل ہوں گی۔ ۶۴-۱۸۶۳ء میں "تزک جہانگیری" کی طباعت سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ سید احمد خاں نے مغل بادشاہوں کے لئے جو سخت الفاظ "اسباب بغاوت ہند" میں ۵۸-۱۸۵۷ء کے غدر کے فوراً بعد استعمال کئے وہ سرکار انگلشیہ کی خوشنودی کے لئے زیادہ تھے اور ان کے دل کی آواز کم۔ آخر کچھ ہی سال پہلے تو وہ اپنے آباو اجداد کی سلطنت مغلیہ کے لئے خدمات کو بڑے فخر سے بیان کرتے تھے۔

لیکن یہ امر واقع ہے کہ ایک مورخ کی حیثیت سے سید احمد خاں پچھلی حکومتوں، ان کی شاندار عمارتوں اور انتظامی کارناموں کے محض مداح ہی نہ تھے۔ ان میں تنقید کا جذبہ تھا اور ۱۰ مئی ۱۸۶۶ء کو علی گڑھ میں سائنٹفک سوسائٹی کے سامنے انہوں نے جن احساسات کا اظہار کیا ان سے کون سنجیدہ مورخ اختلاف کر سکتا ہے؟ انہوں نے کہا:

> "اگر ہمارے ہم وطن اطمینان سے غور کریں اور اگر وہ سابق حکمرانوں کے اعمال کو انصاف اور اخلاق کی کسوٹی پر پرکھیں تو وہ اس نتیجہ پر یقیناً پہنچیں گے کہ ان حکومتوں نے ہمارے ملک کو بے حد نقصانات صرف اس لئے پہنچائے کہ ایک تھوڑی سی تعداد کے افراد کو فائدہ ہو۔ پچھلے بادشاہوں اور راجاؤں کی حکومت نہ تو ہندو مذہب کے مطابق تھی نہ اسلامی مذہب کے، وہ صرف ظلم و تشدد پر مبنی تھی۔ اس کے لئے طاقت حق کی دلیل تھی۔ اس کے نزدیک عوام کی آواز کی کوئی سنوائی نہ تھی۔ طاقتور اور زور آور لوگ کمزور اور غریب لوگوں پر ظلم کرتے تھے اور اپنے ذاتی اغراض کو حاصل کرنے کے لئے کل اختیارات پر قابض ہو بیٹھے تھے۔ صرف غاصب اور مفسد لوگ ہی یہ خواب دیکھ سکتے ہیں کہ ایسا حکمرانہ نظام جس کے تحت ہندوستان اتنی لمبی صدیاں گذار چکا ہے، پھر سے واپس آجائے۔" (۹)

باقی صفحہ ۶۱ پر

ڈاکٹر سید مشرف علی *

سرسید کی قانونی صلاحیت

انسان کا امتیازی مقام اس کی صلاحیتوں اور شعور پر منحصر ہوتا ہے۔ عام طور سے دیکھا گیا ہے کہ انسان چند یا ایک ہی صلاحیت کی بنیاد پر سماج یا قوم میں نمایاں مقام حاصل کر لینے میں کامیابی حاصل کرلیتا ہے۔ مثال کے طور پر ایک ادیب، شاعر، ایک مقرر، نقاد، طبیب، مذہبی پیشوا، ایک سیاست داں، مصنف وغیرہ منفرد صلاحیتوں کے حامل انسان کا امتیازی مقام کچھ عرصے تک سماج یا قوم میں قائم رہتا ہے، اس کے بعد کوئی دوسرا اس سے بہتر باصلاحیت انسان اس کا مقام لے لیتا ہے اور اس کا مقام یاد داشت کے خانوں میں وقت گزرنے کے ساتھ معدوم ہوجاتا ہے۔ مگر جب مذکورہ صلاحیتیں یک جا ہوکر ایک ہی انسان میں جمع ہوجاتی ہیں تو ایسا شخص زندہ و جاوید ہوجاتا ہے اور وقت اس کے امتیازی مقام کو معدوم کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا۔ سرسید ایسے امتیازی مقام کے حامل ہیں جو اپنی بے شمار صلاحیتوں کی وجہ سے زندہ و پائندہ و تابندہ ہیں۔ قدرت نے سرسید کو متعدد صلاحیتیں عطا کیں اور سرسید ایک مفکر، مورخ، مدبر، مفسر، صحافی، مصنف، مقرر، محب وطن، مصلح کی صلاحیتوں سے آراستہ ہونے کے ساتھ ایک انتہائی باشعور منصف اور قانون کی لیاقت کے حامل تھے اور جو ابتدا ہی سے ان کی گفتگو اور عمل سے ظاہر ہوتی تھی۔

سرسید کی ملازمت کا سلسلہ ان کے والد کے انتقال کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔ اس وقت سرسید عدالت کی کارروائیوں اور انگریزی قوانین سے نابلد تھے۔ سرسید نے اس بات کو بہتر سمجھا کہ پہلے وہ عدالتی کارروائیوں سے واقفیت حاصل کریں اس کے بعد ملازمت کے لئے کوشش کرنا سود مند ہوگا۔ لہٰذا وہ اپنے خالو مولوی خلیل اللہ خاں جو اس وقت دلی میں صدر امین تھے کے پاس گئے اور ان کی اجازت سے ان کی عدالت میں کام سیکھنا شروع کردیا۔ چند ماہ ہی میں سرسید نے پورے کام اور عدالتی کارروائی پر ایسی دسترس حاصل کرلی کہ ان کے خالو مولوی خلیل اللہ خاں نے متاثر ہوکر ان کو فوجداری کے خفیف مقدمات کا جو کہ فیصلے کے لئے صدر امینی میں آتے تھے اپنی کچہری میں سررشتہ دار مقرر کردیا۔ کچھ عرصے کے بعد مسٹر رابرٹ

* سابق ریڈر، شعبۂ قانون، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

ہملٹن جو بعد میں سر رابرٹ ہملٹن (Sir Robert Hamilton) کہلائے جج ہو کر دلی آئے۔ سرسید ان سے پہلے ہی سے واقف تھے لہذا ہملٹن صاحب سے ملنے گئے اور ملازمت کی درخواست کی۔ ہملٹن نے سرسید کو سیشن عدالت کا سر رشتہ دار مقرر کرنا چاہا، مگر سرسید نے اس منصب کو قبول کرنے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ وہ اس ذمہ داری کو انجام دینے کے لیے اپنے کو پوری طرح اہل نہیں سمجھتے تھے۔ چونکہ ہملٹن سرسید کی صلاحیتوں سے واقف تھے لہذا انھوں نے سرسید کو اس کام کے لئے آمادہ کرنے کی کوشش کی مگر سرسید راضی نہ ہوئے اور کہا "جس کام کی میں اپنے میں لیاقت نہیں پاتا اس کو کیوں کر قبول کرسکتا ہوں" اور صدر امینی میں بعینہ کام کرتے رہے۔ سرسید کی اس صاف گوئی کا ہملٹن پر ایسا اثر ہوا کہ جب ہملٹن کمشنر ہو کر آگرہ تبادلہ ہو کر آئے تو دہلی کی عدالت میں اپنے جانشین مسٹر لینڈزی کے سپرد کر گئے۔ قبل اس کے مسٹر لینڈزی سرسید کو کوئی عہدہ دیتے مسٹر رابرٹ ہملٹن نے ان کو آگرہ بلالیا اور وہاں کی کمشنری کے دفتر میں نائب منشی کے عہدے پر مقرر کر دیا۔ آگرہ کی کمشنری میں بحیثیت نائب منشی سرسید نے نہ صرف قوانین مال پر عبور حاصل کیا بلکہ کمشنری سے متعلق تمام اضلاع کے بندوبست کا کام منظم کر کے دفتر کے لیے ایک مستحکم دستور عمل کو قائم کیا۔ اسی زمانہ میں سرسید نے قوانین دیوانی متعلقہ منصفی پر بہت تفصیلی اور جامع نوٹس تیار کیے۔ جب یہ نوٹس ہملٹن کی نظر سے گذرے تو وہ سرسید کی صلاحیت اور قانونی گرفت کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ انھوں نے وہ نوٹس گورنمنٹ میں پیش کیے اور ساتھ ہی سرسید کے لیے منصفی کے عہدے پر تقرر کرنے کی سفارش کی۔ گورنمنٹ نے ہملٹن صاحب کی سفارش منظور کر کے حکم جاری کیا کہ جہاں بھی منصفی کا عہدہ خالی ہو سرسید کو اس پر مقرر کر دیا جائے۔ سرسید کا تقرر ابھی ہونے نہیں پایا تھا کہ منصفی کے عہدے کے لیے امتحان لازم کر دیا گیا۔ لہذا سرسید کمشنر ہملٹن کی ہدایت پر امتحان میں بیٹھے اور اول درجہ میں کامیاب ہوئے۔ منصفی میں امتیازی کامیابی کے بعد سرسید نے یہ نوٹس چھپوائے اور اس کا نام "انتخاب الاخوین" رکھا۔ یہ انتخاب منصفی کے امیدواروں کے لیے ایسا مفید ثابت ہوا کہ پورے صوبے میں شائع ہو گیا اور امیدواروں نے ایسا استفادہ کیا کہ محض یہ نوٹس ہی کامیابی کے لیے کافی ہوتے تھے۔ سرسید کے ان نوٹس کی اس درجہ مقبولیت اور کامیابی پر انجمن اسلامیہ لاہور نے جب سرسید کو ۱۸۸۴ء میں سپاس نامہ پیش کیا تو اس میں بھی سرسید کے تیار کردہ منصفی کے نوٹس کی خوبی اور قانون سے متعلق سرسید کی لیاقت کا تذکرہ کیا ہے۔

۱۸۵۴ء میں جب سرسید کی عمر ۳۷ سال کی تھی صدر امین کے منصب پر مستقل ہو گئے مستقل ہونے تک سرسید نے قانون کی بیشتر دفعات اور عدالتی کارروائی میں پیچیدگی اور پریشانیوں کو محسوس کر کے نظیریں اور شرحیں مرتب کیں اور عدالتی کارروائی کو بہتر اور آسان بنایا جس کا انگریز ججوں پر گہرا اثر پڑا۔

سرسید دہلی سے بجنور ۱۲ جنوری ۱۸۵۵ء میں مستقل صدر امین مقرر ہو کر آئے۔ یہیں ضلع بجنور کی تاریخ سرسید نے انتہائی تحقیق اور محنت سے لکھی۔ اس تاریخ میں ضلع کے حالات کے ساتھ ایک طویل بحث سنہ فصلی کے متعلق انتہائی وضاحت کے ساتھ لکھی۔ سنہ فصلی اور سنہ عملی کے سلسلے میں ایک عرصے سے سرکاری دفاتر میں غلطی چلی آرہی تھی۔ اس غلطی کو سرسید نے گورنمنٹ پر ظاہر کر کے اس کی اصلاح کی۔ یہ اصلاح گورنمنٹ نے منظور کر کے صدر بورڈ کے پہلے سرکلر ۱۸۶۰ء اور دوسرا ۱۸۶۱ء کے رو سے ایک ہی سنہ سنہ مالی کا نام مقرر ہو گیا۔ یہ نیا نام سنہ عملی کے مطابق ہوا جس سے دفتری مشکلات ختم ہو گئیں۔ سرسید

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

کا یہ ایسا کارنامہ تھا جس کے متعلق بجنور کے ضلع کلکٹر مسٹر شیکسپیر ایک جگہ سر سید کے متعلق لکھتے ہیں۔

"سر سید احمد خاں ان باتوں کی طرف بھی متوجہ ہوتے ہیں جو ان کے خاص کام سے علاقہ نہیں رکھتی۔ چنانچہ انھوں نے اس ضلع کی تاریخ بھی بہت محنت کے ساتھ تیار کی اور وہ قانونی ذمہ داریوں کو بھی بڑی خوبی سے انجام دیتے ہیں۔"

سر سید نے اسی سنہ فصلی کے مضمون پر ۱۸۶۶ء میں ایک نہایت مفید اور مفصل لکچر سائنٹفک سوسائٹی علی گڑھ میں دیا۔ اس لکچر میں انھوں نے تقریباً وہ تمام خیالات ظاہر کیے جو سنہ فصلی کے متعلق تاریخ بجنور میں تحریر کیے تھے۔

دوسرا کام جو سر سید نے صدر امینی کے فرائض کے ساتھ کیا وہ آئین اکبری کی تصحیح اور درستگی تھی۔ چونکہ آئین اکبری کے نسخے کافی مسخ ہو گئے تھے اس لیے ان کا درست کرنا انتہائی دشوار کام تھا مگر سر سید کا ایسے دشوار کاموں میں جی لگتا تھا اور کافی دلچسپی سے کرتے تھے، لہٰذا یہ کام بھی انھوں نے بخوبی انجام دیا۔

غدر کے بعد بجنور سے سر سید اپنے صدر امینی کے عہدے سے ترقی پا کر بحیثیت صدر الصدور مراد آباد تبادلہ ہو کر آئے۔ یہاں اپنے اس عہدے کے ساتھ ایک کمیشن کے ممبر بھی مقرر ہوئے، جو دو انگریز اور ایک ہندوستانی ممبر پر مشتمل تھا۔ ہندوستانی ممبر میں سر سید کا انتخاب کیا گیا۔ اس کمیشن کے مقرر ہونے کا خاص مقصد یہ تھا کہ غدر کے زمانے کی بدعنوانیوں، غارت گری، غیر قانونی طور پر مقبوضہ جائدادوں کے سلسلے میں عذرداریوں کی سماعت اور تحقیقاتی کام انجام دے۔ سر سید نے اس کام کو بھی اپنے فرائض منصبی کے ساتھ انتہائی دلچسپی اور محنت سے کیا۔ اس کے علاوہ بہت سے کام فلاح عامہ کے کیے جس میں "تاریخ سر کشی بجنور" مدرسہ مراد آباد کا قیام اور انتظامی قحط مراد آباد قابل ذکر ہیں۔

سرکاری منصبوں کی ذمہ داریاں بحیثیت صدر امین، صدر الصدور اور آخیر میں جج عدالت خفیفہ کے خاطر خواہ انجام دینے سے سر سید کی قانونی لیاقت اور انتظامی صلاحیتوں کے انگریز افسران و حاکم ایسے معترف و متاثر رہتے تھے کہ سر سید کو ان کے کارہائے منصبی کے ساتھ بیشتر قانون سے متعلق کمیٹیوں اور مجلسوں میں مقرر کرتے۔ لہٰذا سب سے پہلے ۱۸۷۸ء میں سر سید کو لارڈ لیٹن (Lord Lytton) نے وائسرائے کی مجلس وضع قانون (Vice - Regal Legislative Council) کا ممبر مقرر کیا۔ اس مجلس کی ممبری کے عرصہ میں سر سید نے مختلف قوانین کے بلوں (Bills) کا مسودہ تیار کیا جس میں خاص بل چیچک کا قانون جس کا مسودہ ۱۸۷۹ء میں کونسل میں پیش ہوا۔ کچھ ممبران کی مخالفت کے باوجود اکثریت نے سر سید کے مسودے کو منظور کر کے حمایت کی اور جلدی جاری کرنے اور قانون کو لازم قرار دے کر احکام جاری کیے۔

دوسرا بل "قانون تقرر قاضیان" سے متعلق تھا جس کا مسودہ سر سید نے انتہائی محنت سے پرانے قانون جو ۱۷۹۳ سے ۱۸۲۸ء تک وقتاً فوقتاً نافذ ہوتے رہے ان کی عبارت کے بیشتر سقم اور کمزوریوں کے پیش نظر نیا مسودہ تیار کیا۔ اس مسودے کو بھی کونسل کی حمایت حاصل ہوئی اور جزوی اختلاف کے بعد یہ بل اکثریت سے ۱۸۸۰ء میں منظور ہو گیا۔

تیسرا بل قانون وقف خاندانی کا تھا۔ اس بل کے مسودہ کا تیار کرنا انتہائی مشکل کام تھا کیونکہ اس کے تیار کرنے میں بہت سے قانونی اور شرعی پہلو وابستہ تھے۔ ان نازک پہلوؤں کے باوجود سر سید نے حالات کے جائزے کے بعد اس بل کے تیار کرنے اور کونسل سے پاس ہو جانے کو انتہائی ضروری سمجھا۔ سر سید نے محسوس کیا کہ جائدادوں کی تقسیم اور ان کے دن بدن فروخت ہونے سے مسلمانوں کے اعزاز و افتخار میں تیزی سے تنزلی واقع ہو رہی تھی۔ مسلمانوں کی معاشی حالت کو قائم

رکھنے کے لیے ان کی جائدادوں کو قایم رکھنا وقت کا تقاضہ تھا۔ سرسید نے اس صورت حال پر یقین کرکے اس بل کے تیار کرنے میں پوری جانفشانی سے محنت کی تاکہ جائدادوں کا تحفظ ہو سکے۔ مسودے کو تیار کرنے میں سرسید نے قانونی پہلوؤں کے ساتھ فقہی شرح کو شامل کر کے ایک توازن قایم کیا۔ شیعہ سنی فقہی کتابوں سے مواد یکجا کر کے مسودے میں انتہائی لیاقت سے شامل کیا جس کی رو سے جائداد کو اپنے بعد اپنی اولاد اور اپنی نسل کے لیے ہمیشہ وقف کر دینے کا اختیار فراہم کیا۔ ان دفعات کے تحت جائداد نہ کبھی بیع ہو سکے اور نہ وراثت میں تقسیم ہو سکے اور ہمیشہ قایم و برقرار رہے۔ اس مسودے کو تقویت دینے کے لیے سرسید نے مختلف صوبوں کی مثالیں نقل کیں جہاں مسلمانوں نے اپنی جائدادیں وقف کی تھیں۔ اگرچہ اس بل کا مسودہ بیشتر ممبروں کو پسند آیا اور مفید بھی سمجھا گیا مگر باوجود سرسید کی انتھک کوشش کے یہ بل پاس نہ ہو سکا۔ قیاس یہ ہے کہ انگریز ممبران نے اپنی پالیسی کے تحت اس بل کو پاس کرنے کی حمایت نہیں کی۔ اگر یہ بل پاس ہو جاتا تو مسلمانوں کو اپنی جائدادیں محفوظ رکھنے کا ایک مستحکم قانون حاصل ہو جاتا۔

سرسید کی قانون کی لیاقت، اس کے باریک سے باریک پہلوؤں کا شعور، انتہائی جامع اور آسان عبارت لکھنے کی اہلیت سے ممبران کونسل وضع قانون، وائسرائے اور دیگر حکام ہمیشہ قائل رہے جو اپنی تقریروں اور تحریروں میں اس کا شدت سے اعتراف کرتے۔ سرسید کی کونسل میں تقریروں کے جواب میں انگریز ممبران یا وائسرائے کی تقریریں سرسید کی تعریف اور اعلیٰ صلاحیت کی ستائش کے بغیر نہ ہوتیں۔ سرسید اگرچہ انگریزی سے ناواقف تھے مگر اس کے باوجود وہ کونسل کی بحث میں شریک رہے۔ کونسل میں تقریر کرنے کے لیے اپنی اردو کی تقریروں کو انگریزی میں ترجمہ کراتے اور پھر انگریزی ترجمہ کو فارسی حرفوں میں لکھ کر کونسل میں تقریر کرتے۔ تقریر قانونی اور حالات کے تجزیہ کے اعتبار سے اتنی جامع اور عام فہم ہوتی کہ کونسل کے ممبران سرسید کی قانونی صلاحیت اور شعور کے قائل ہوتے۔ ان کی ایک تقریر پر جو فارسی حرفوں میں لکھ کر دی گئی تھی لارڈ لیٹن (Lord Lytton) نے انتہائی تعجب کا اظہار کرتے ہوئے تعریف میں کہا "میں نے ایسی قابلانہ اسپیچ کبھی نہیں سنی۔"

ایک دوسرے موقعہ پر سرسید کی تقریر جو موصوف نے مسودہ قانون انتقال جائداد (Law of Transfer of Property) کی رپورٹ پیش ہونے پر ۲۶ / جنوری ۱۸۷۷ کو بل کی تائید میں کی تھی' کے متعلق انگلشمین (Englishman) میں ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا جس نے سرسید کی تقریر کے سلسلے میں لکھا۔

> "کسی ہندوستانی جینٹلمین (Gentleman) نے اب تک اس مسئلہ کی تائید میں کہ ملک قانون کو ڈیفیکشن codification یعنی مجموعہ احکام کا محتاج ہے اور اس میں کوڈیفیکشن کی گنجائش ہے اور ملک کے دونوں فرقوں کی تاریخ اور لٹریچر ایک قومی ضرورت کی طرف بڑے استحکام کے ساتھ اشارہ کرتی ہے۔ ایسی صراحت کے ساتھ نہیں کی جیسی آنریبل سید احمد خاں نے کی۔"

سرسید نے اور دیگر قوانین کے کونسل میں پیش ہونے کے موقعوں پر یادگار تقریریں کیں جس سے ان کی علمیت، عظمت اور قانون پر مکمل عبور و دسترس مستحکم ہوتی گئی۔ مثال کے طور پر قانون حقوق استفادہ اور قانون ترمیم مجموعہ ضابطہ فوجداری (Criminal procedure Amendment Act) کے موقعوں پر انتہائی مفصل اور استدلال کے ساتھ تقریر کی'

اس سے اور بھی زیادہ دلائل کے ساتھ سرسید نے قانون لوکل سلف گورنمنٹ متعلقہ اضلاع متوسط پر ۱۲ جنوری ۱۸۸۳ء کو لارڈ رپن (Lord Ripon) کے عہد وائسرائے میں کونسل میں اسپیچ دی۔ سرسید کی یہ تقریر ایسی آراستہ و پیراستہ واضح اور مدلل تھی کہ کونسل نے سرسید کے خیالات کی حمایت کی اور اس تقریر کو کونسل کی تاریخ میں ایک نمایاں مقام کا مستحق قرار دیا۔ یہ سرسید کی عظمت اور امتیاز تھا کہ ان کو قانون سے متعلق اعلیٰ منصب پر مقرر کیا جاتا رہا۔ منصفی کے امتحان میں درجہ اول سے کامیاب ہونا اور جو نوٹس انھوں نے منصفی کے امتحان کے لیے تیار کیے جن کے شایع ہونے کے بعد کافی امیدواروں نے استفادہ کیا اور کامیابی حاصل کی' اس بات کی دلیل ہے کہ سرسید کو ابتدا سے قانونی شعور حاصل تھا۔ سرسید کو انتہائی معمولی عہدے نائب منشی سے منصف، صدر امین، صدالصدور اور آخیر میں جج عدالت خفیفہ کی سلسلہ وار ترقی ہوئی' یہ منصب سرسید کو ان کی قانونی لیاقت کے ساتھ محنت و دلچسپی سے اپنے فرائض منصبی کو انجام دینے کے مظہر ہیں۔ یہ انگریزوں کا وہ دور حکومت تھا جب عام طور سے عدالتوں کے جج انگریز ہی ہوا کرتے تھے۔ ان اعلیٰ عہدوں پر کسی ہندوستانی کا تقرر سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ مگر سرسید نے اپنی اعلیٰ قانونی صلاحیتوں اور انتظامی لیاقت کا انگریز حکام، وائسرائے وقت کو قائل کر لیا۔ ان کو وائسرائے کی مجلس قانون سازی کی ممبری کا عطا ہونا اور ممبری کے بعد کئی اہم قوانین کے مسودے تیار کرنا' ان پر قانونی بحث اور تقریریں اس بات کی دلیل ہیں کہ سرسید کو قانون کو سمجھنے اس کو عملی شکل دینے' اس کی تشریح کرنے، قانون کو وضع کرنے اور اس پر قانونی، سماجی، شرعی پہلو سے بحث مباحثہ کرنے کی مکمل لیاقت اور عبور حاصل تھا۔ سرسید کی قانونی صلاحیتیں ہماری قوم و ملک کے لیے انفرادی اور اجتماعی اعتبار سے انتہائی مفید ہیں۔

صفحہ ۵٦ کا باقی

حوالے

(۱) راجہ رام موہن رائے اور مغل دربار کے مابین تعلقات کے لیے دیکھئے پرسول سپئیر (Percival Spear) "مغلوں کا آخری لمحہ" (Twilight of the Mughals) کیمبرج ۱۹۵۱ صفحات ۴۰، ۴۶، ۴۹، ۵۲، ۴۵، ۱۱۲، ۲۲۶ (۲) ایلیٹ اور ڈاؤسن (Elliot and Dowson) "ہندوستان کی تاریخ اس کی مورخوں کی زبانی" (History of India as told by its own Historians) جلد ہشتم، صفحات ۴۲۰-۴۳۱ (۳) ایضاً ۴۳۱ (۴) "آثار الصنادید" مکمل ایڈیشن، دہلی، ۱۹۶۵ء صفحہ ۲۰ (۵) "آثار الصنادید" کا انگریزی ترجمہ آر۔ ناتھ۔ نئی دہلی سے ۱۹۷۹ء میں شایع ہوا۔ (٦) فارسی ایڈیشن مع اردو ترجمہ، مصحح و مترجم شریف حسین قاسمی نئی دہلی ۱۹۸۲ اردو ترجمہ از ڈاکٹر نعیم احمد، علی گڑھ ۱۹۸۰ء (۷) الطاف حسین حالی "حیات جاوید" لاہور ۱۹۵۷ء صفحہ ۱۱۵ (۸) آئین اکبری کی تصحیح پر دیکھیے حالی۔ "حیات جاوید" صفحات ۱۲۲-۱۲۷، ۵۸، ۱۸۵۷ میں سید احمد خاں کی "تاریخ ضلع بجنور" بھی بالکل تلف ہو گئی۔ (۹) شان محمد مصحح، سرسید احمد خاں کی تحریرات اور تقاریر "Writings and speeches of Sir Syed Ahmad Khan"۔ بمبئی ۱۹۷۲ء صفحات ۱۱۶-۱۱۷۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

اردو اکادمی دہلی

کی

شائع کردہ تحقیقی۔ تنقیدی کتابیں

☆ اردو صحافت	مرتب	انور علی دہلوی	32روپے
☆ اردو غزل	مرتب	ڈاکٹر کامل قریشی	40روپے
☆ اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب	مرتب	ڈاکٹر کامل قریشی	39روپے
☆ حواشی ابوالکلام آزاد	مرتب	سید مسیح الحسن	60روپے
☆ اردو میں بارہ ماسہ کی روایت	مصنف	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	49روپے
☆ اشاریہ آجکل	مرتب	جمیل اختر	77روپے
☆ دلی میں اردو شاعری کا تہذیبی اور فکری پس منظر	مصنف	پروفیسر محمد حسن	26روپے
☆ کلیات مکاتیب اقبال (جلد اول)	مرتب	سید مظفر حسین برنی	125روپے
☆ کلیات مکاتیب اقبال (جلد دوم)	مرتب	سید مظفر حسین برنی	125روپے
☆ کلیات مکاتیب اقبال (جلد سوم)	مرتب	سید مظفر حسین برنی	200روپے
☆ نئی تعلیمی پالیسی اور اردو تدریس		اکادمی کی پیش کش	30روپے
☆ آزادی کے بعد دلی میں اردو تحقیق	مرتب	ڈاکٹر تنویر احمد علوی	30روپے
☆ آزادی کے بعد دلی میں اردو تنقید	مرتب	ڈاکٹر شارب ردولوی	40روپے
☆ اردو مرثیہ	مرتب	ڈاکٹر شارب ردولوی	50روپے
☆ معاصر اردو تنقید	مرتب	ڈاکٹر شارب ردولوی	45روپے
☆ معاصر اردو غزل	مرتب	پروفیسر قمر رئیس	70روپے

اردو اکادمی دہلی۔ گھٹا مسجد روڈ۔ دریا گنج۔ نئی دہلی۔110002

فون نمبر 3276211

افکار و اقدار

پروفیسر وحید اختر *

سرسیّد کی مذہبی فکر و فکرِ اقبال

انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں برطانوی سلطنت کے ہند میں استحکام کے بعد مسلمانوں کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اپنے مذہب کے تحفظ اور تہذیب کی بقا کا تھا۔ مغربی علوم کا سیل بیکراں امڈتا چلا آرہا تھا اور سیاسی زوال کے ساتھ قدیم اسلامی علوم کے پاؤں بھی اکھڑتے جا رہے تھے۔ اس صورت حال کا سامنا کرنے کی دو ہی صورتیں ممکن تھیں ایک تو یہ کہ مسلمان مغربی علوم سے قطع نظر کر کے اپنے حصار میں بند ہو جائیں۔ یہ راستہ اکثریت نے علماء و محدثین کی قیادت میں اختیار کیا۔ دوسری صورت یہ تھی کہ مغربی علوم سے فیض اٹھا کر اپنے مذہب اور اس سے متعلق علوم کو نئے تقاضوں سے ہم آہنگ کیا جائے۔ سرسید نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔ بنگال میں اس راہ کو اختیار کر کے تہذیبی نشاۃ ثانیہ کی داغ بیل ڈالی جا چکی تھی اگر سرسید اس سمت میں رہنمائی نہ کرتے تو مسلمان جو اپنے ہم قوموں سے اس میدان میں پیچھے رہ چکے تھے، تہذیبی نشاۃ ثانیہ کے عمل میں شاید اور ایک صدی پیچھے رہ جاتے۔ سرسید کو ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی کا تو احساس تھا مگر ہندو مذہب کی صلاحیت اخذ و قبول کا صحیح اندازہ نہ تھا۔ اس لیے جب انہیں خبر ملی کہ ایک تقریب میں ہندو راجاؤں نے انگریزوں کی طرح میز کرسی پر کھانا کھایا تو انہیں حیرت آمیز مسرت ہوئی۔(۱) اس اعتراض کے جواب میں کہ انگریزی تعلیم یافتہ مذہب سے بیگانہ ہو جاتے ہیں، سرسید نے کہا تھا کہ بنگالیوں نے مذہب کو اس لیے چھوڑا کہ ان کا مذہب علم کی روشنی کے سامنے، سچ نہ ہونے کی وجہ سے قائم نہیں رہ سکتا تھا۔(۲) سرسید کا یہ ریمارک اس خطرے کی، جو مذہب کو جدید تعلیم سے تھا، تصدیق کرتا ہے لیکن وہ اسلام کو ایسا مذہب نہیں سمجھتے تھے کیونکہ مسلمان کے مذہب اور دنیاوی امور علیحدہ نہیں۔ وہ اسلام کو مذہب فطرت سمجھتے تھے جو علم سے کمزور نہیں مضبوط ہوتا ہے ان کے خیال میں اگر علم سے اسلام کو کوئی نقصان پہنچے گا تو وہ روح مذہب کو نہیں بلکہ غیر اسلامی عقائد و رسوم کے خس و خاشاک کو نقصان پہنچے گا۔

سرسید راسخ العقیدہ مسلمان تھے اس لیے انہوں نے مذہب کے مسلّمات پر نہ کبھی شک کیا نہ سوال کیا۔ سرسید کے اس اعتراض پر کہ محسن الملک بھی باوجود شیعہ سے سنی ہونے کے، جو کوئی بنیادی تبدیلی عقیدہ نہیں، اپنے آبائی عقائد کی تقلید کی دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ محسن الملک نے جواباً بڑا فکر انگیز مسئلہ چھیڑا تھا۔ سرسید کو لکھتے ہیں:

* صدر، شعبہ فلسفہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

"یہ تو فرمائیے کہ اس زمانے کے فلاسفر اور سائنس (علم) کے جاننے والے جو تمام درجے نیچر (فطرت) کے طے کر کے نئی روشنی دنیا میں پھیلا رہے ہیں ؟ گر حضرت کی نسبت کہیں کہ گو آپ نے تقلید چھوڑی: کتابوں کو ردی بھاؤں اور مفسروں کی تضحیک کی اور اپنے نزدیک تحقیق کے بڑے بڑے درجے پر قدم رکھا اور قرآن کو نیچر اور قوانین نیچر کے مطابق کرنے میں بڑی زحمت اٹھائی، مگر باوجود اس عالی دماغ اور روشن ضمیری اور محققانہ خیالات اور حکیمانہ دماغ کے بچپن کی سنی سنائی باتوں کے اثر سے اپنے آپ کو بچا نہ سکے اور اب تک خدا کے مع رسول کے قائل اور اصول دین کے معتقد بنے رہے۔ قصور معاف آپ کو اس کے جواب دینے میں اتنی آسانی نہ ہو گی۔"(۳)

سرسید اس سوال کا جواب ٹال گئے مگر ایک جگہ انھوں نے دعوی کیا ہے کہ: "اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات پر متوجہ نہ ہوتا تو یقیناً مذہب کو چھوڑ دیتا۔"(۴)۔ سرسید کا یہ دعوی مشتبہ ہے کیونکہ وہ مذہب کے معاملے میں چند مسلّمات پر پختہ یقین رکھ کر چلتے تھے۔ جب مولانا محمد قاسم نانوتوی سے سرسید کے کفر کا فتوی طلب کیا گیا تو انھوں نے سرسید سے خدا، نبی کریم اور قیامت کے متعلق تین سوالات لکھ کر ان کے جوابات منگوائے۔ سرسید نے لکھا۔ ہے کہ "خدا تعالی ازلی ابدی مالک اور صانع تمام کائنات کا ہے۔" "نبی کریم کے متعلق اپنا یہ اعتقاد ظاہر کیا۔ "بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر" "قیامت کو برحق مانا۔"(۵) مولانا نے علماء کرام سے فرمایا "کیا تم ایسے شخص کے کفر پر مجھ سے دستخط کرانا چاہتے ہو جو پکا مسلمان ہے؟ جاؤ میں قیامت تک اس فتوے پر دستخط نہیں کروں گا"(۶) سرسید نے اپنے مضمون "اعتقاد باللہ" میں مذہب اسلام کے تمام عقائد کو تسلیم کیا ہے۔ (۷)۔ اس کی تفصیل دوسرے مضمون "قرآن مجید کی تفسیر کے اصول" میں ملتی ہے یہ مضمون دراصل ان کی تفسیر پر محسن الملک کے اعتراضات کے جواب میں ہے۔ محسن الملک نے جو بنیادی فلسفیانہ سوال اٹھایا تھا اس سے قطع نظر کرتے ہوئے، ایک طرح سرسید نے اپنی راسخ العقیدگی کا ثبوت دیا ہے۔ ان اصولوں کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ خدا سچا ہے اور قرآن مجید اس کا کلام اور بالکل سچ اور صحیح ہے۔ کوئی علم اسے جھٹلا نہیں سکتا۔
۲۔ خدا کے کام اور خدا کے کلام میں اختلاف ہو ہی نہیں سکتا اگر ہو تو خدا کا نعوذ باللہ جھوٹا ہونا لازم آتا ہے۔
۳۔ قانون قدرت کی پابندی سے خدا کی قدرت مطلق میں نقصان نہیں آتا۔
۴۔ انسان مذہب کے لیے ہے یا مذہب انسان کے لیے، دونوں صورتوں میں وہ عقل انسانی کے مافوق نہیں، مطابق ہے۔ یہ چاروں اصول ایک طرح سے معتزلہ کے عقائد کے مطابق ہیں۔

ان اصول اربع کی تفسیر سرسید نے مزید پندرہ اصولوں سے کی ہے جو انہی کے فروع ہیں ان میں سرسید نے صفات باری کے بارے میں اپنا عقیدہ بیان کیا ہے جو معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ معجزات سے بحث کی ہے قرآن کے بتمام موجود ہونے کی تصدیق کی ہے۔ ترتیب آیات کو منصوص مانا ہے۔ قرآن مجید میں ناسخ و منسوخ سے انکار کیا ہے۔(۸)

سرسید کو شبلی نے فلسفہ الہیات میں اونچا درجہ دیا ہے۔ اس کا سبب صرف یہ ہے کہ وہ سرسید کے مذہبی خیالات سے متفق نہ تھے۔ اس لیے انہیں فلسفی مان لینے میں ہی عافیت دیکھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید بنیادی طور پر متکلم تھے۔ اسلام میں علم کلام کی بنیاد ہی مذہب کے عقائد کو یونانی فلسفے کی یورش سے بچانے کے لیے پڑی۔ معتزلہ نے یونانی علوم اور اسلامی

معتقدات میں تطبیق کی کوشش کی اس لحاظ سے بڑے سے بڑا مسلمان متکلم فلسفے کے بنیادی مسائل کو غور و فکر کے دائرے سے خارج کر دیتا ہے۔ سر سید نے بھی دعوائے تحقیق کے باوجود یہی کیا۔ انہوں نے جگہ جگہ نئے علم کلام کی تدوین پر زور دیا ہے ان کے نزدیک قدما کا علم کلام جو یونانی سائنس اور فلسفے کے مقابلے اور ان سے مطابقت پیدا کرنے کا نتیجہ تھا، ان علوم کے فرسودہ و غلط ہونے کی وجہ سے بیکار ہو چکا تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ایسا علم کلام مدون کیا جائے جو مغربی سائنس، فلسفے اور اسلام میں تطبیق کا کام سر انجام دے۔ سر سید کی بہت سی تاویلات سے سخت اختلاف رکھنے کے باوجود شبلی کے سامنے بھی یہی مقصد تھا۔ سر سید اور شبلی دونوں متکلم ہیں دونوں عقلیت پسند ہیں دونوں کا میلان معتزلہ کی طرف ہے، دونوں کا مقصد ایک ہے اختلاف صرف فروعات میں ہے شبلی کا رخ مشرق کی طرف ہے، سر سید کا رخ مغرب کی جانب، شبلی قدیم علم کلام کو مکمل طور پر از کار رفتہ نہیں جانتے وہ اپنے ماضی سے اخذ قوت کرنا چاہتے ہیں۔ سر سید کے نزدیک تمام قدیم علم کلام موجودہ عہد کے تقاضوں کو پورا کرنے سے قاصر ہے اس لیے وہ اسلام کی قوت اس میں جانتے ہیں کہ وہ مغرب سے علم اخذ کر کے اپنی حقانیت کے لیے استعمال کرے۔ شبلی کی رومانیت انہیں ماضی کی عظمت کے جلوے دکھانے پر مامور کرتی ہے۔ سر سید کی حقیقت پسندانہ عصریت انہیں حال سے مفاہمت کا مبلغ بناتی ہے۔ شبلی نے علم الکلام کے آغاز میں سر سید سے درپردہ اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے :

> "جدید تعلیم یافتہ گروہ کہتا ہے کہ نیا علم کلام بالکل نئے اصول پر قائم کرنا ہوگا۔ کیونکہ پہلے زمانے میں جس قسم کے اعتراضات اسلام پر کیے جاتے تھے آج ان کی نوعیت بالکل بدل گئی ہے۔ پہلے زمانے میں یونان کے فلسفے کا مقابلہ تھا جو محض قیاسات پر قائم تھا۔ آج بدیہیات اور تجربہ کا سامنا ہے۔ اس لیے اس کے مقابلے میں محض قیاسات عقلی اور احتمال آفرینیوں سے کام نہیں چل سکتا۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ خیال صحیح نہیں قدیم علم کلام کا جو حصہ آج بیکار ہے پہلے بھی ناکافی تھا اور جو حصہ اس وقت بکارآمد تھا، آج بھی ہے اور ہمیشہ رہے گا۔"(۹)۔

اس لیے شبلی علم کلام کو قدیم اصول اور موجودہ مذاق کے موافق ترتیب دینے کے حق میں تھے۔ یہ کام اس وقت مصر اور شام اور ہندوستان میں ہو رہا تھا۔ ہندوستان میں سر سید ہی اس وقت وہ شخص تھے جو یورپ کے معتقدات و خیالات کو معیار مان کر قرآن و حدیث کی تاویل کر رہے تھے۔ حالانکہ سر سید نے ہمیشہ تاویل سے انکار کیا۔ مگر ان کے اکثر معترضین حتیٰ کہ معتقدین مثلاً حالی اور محسن الملک بھی ان کی تفسیر کے بیشتر حصوں کو تاویل ہی کے زمرے میں رکھتے رہے۔ شبلی نے بغیر نام لیے سر سید کی اس کوشش ہی کو "تقلیدی اجتہاد" کا نام دیا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود شبلی بھی "تقلیدی اجتہاد" سے آگے نہ بڑھ سکے۔ شبلی کی مذہبیت کی بنیاد قدیم علوم پر تھی۔ ان کا بنیادی مقصد مذہب کا دفاع اور تحفظ تھا۔ سر سید کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی تھی۔ مگر وہ شبلی سے بہت زیادہ مغرب سے واقف تھے۔ اگرچہ ان کی یہ واقفیت سطحی اور سرسری تھی۔ مگر اسے انہوں نے اپنی ذہانت اور محنت سے براہ راست واقفیت کے درجے تک پہنچایا سر سید کا بنیادی مقصد مغربی علوم کی ترویج تھا نہ کہ مذہب کا دفاع۔ اگر اس بنیادی فرق کو سامنے رکھا جائے تو سر سید اور شبلی کے اختلاف کی نوعیت واضح ہو جاتی ہے۔

سر سید مذہبی مباحث کو ثانوی مانتے ہیں جو ان کے اصلی مقصد، یعنی مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف مائل کرنے کے لیے ناگزیر ہیں اس لیے سر سید نے اپنے مضامین میں جا بجا علوم جدیدہ کو اسلام کے خلاف نہ جاننے، بلکہ انہیں

اسلام کے اصول فطرت کے مطابق ماننے پر اصرار کیا ہے یہی ان کی تجدید علم کلام کی کوشش کا بنیادی سبب ہے۔
" دافع البہتان" میں لکھتے ہیں:

"میرے نزدیک یہ بات بالکل مسلّم ہے کہ علم کلام جو حکمت یونان کے مقابل میں بنایا گیا تھا اس زمانے میں بے کار ہے اور علما پر فرض ہے کہ علم کلام کو از سرنو اس طرح پر تدوین کریں کہ وہ بہ مقابلہ حکمت اور علوم جدیدہ کے جو اس زمانے میں رائج ہیں کار آمد ہو۔"(۱۰)۔

سر سید کا خیال تھا کہ ہندوؤں کے لیے یہ مسئلہ تھا ہی نہیں اس لیے کہ ان کا مذہب چند رسوم سے عبارت ہے' ان محدود رسموں کے محفوظ رکھنے کے ساتھ وہ نئی چیز سیکھنے میں کبھی تامل نہیں کرتے۔ مسلمانوں کا معاملہ مختلف ہے۔ اس لیے مذہب کی نئی تفسیر و تعبیر لازمی ہے ۔(۱۱) اس لیے وہ مسلمانوں کو میدان میں آکر فلسفۂ مغربیہ اور علوم محققہ جدیدہ کے ساتھ وہی عمل کرنے کی دعوت دیتے ہیں جو ان کے بزرگوں نے فلسفۂ یونانیہ کے ساتھ کیا تھا۔(۱۲) وہ ایک طرف تو علم کے حصول کو کار ثواب مانتے ہیں اور امور دنیا کو عبادت ۔(۱۳) دوسری طرف وہ علوم میں مسلمانوں کی ترقی کو اسلام کی ترقی کا وسیلہ جانتے ہیں۔ وہ علماء کی 'جدید علم دشمنی' کی مخالفت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اسلام میں اور دنیوی عزت حاصل کرنے میں کوئی تناقض نہیں۔(۱۴) ان کے نزدیک ماضی میں علوم دینیہ اور علوم عربیہ و فلسفۂ یونانیہ کی ترقی مقتضائے زمانہ سے تھی اور اب ان کا تنزل اس لیے ہے کہ علوم عربیہ' جو مدرسوں میں پڑھائے جاتے رہے ہیں' بے کار ہو چکے ہیں۔(۱۵) ان کا خیال ہے کہ قدیم علم کلام بت پرست یونانیوں کی مسلمانوں سے آویزش و آمیزش سے پیدا ہوا تھا۔ حالات بدلنے اور یونانی علوم کے زوال کے بعد وہ علم کلام بھی بے کار ہو گیا۔(۱۶) اب علوم عربیہ و مذہبیہ کی وہ قدر اور ضرورت نہیں رہی جو پہلے تھی۔ پہلے ان کی مدد سے عہدے اور مناصب ملتے تھے' اب نہیں ملتے ۔ سر سید کا یہ خیال بھی ہے کہ فکر و اظہار کی جو آزادی علم کی ترقی کے لیے ضروری تھی اگلے زمانے میں حاصل نہیں تھی۔ اس لیے غزالی پر کفر کا فتوی لگا اور شاہ ولی اللہ کی تحقیقات جدیدہ کے میلان کی مخالفت ہوئی۔ اس فقدان آزادی کو وہ مسلمانوں میں علم کے زوال کا باعث مانتے ہیں ۔(۱۷) تقلید کے رجحان نے اجتہاد و تحقیق کو ختم کر دیا۔ دور جدید میں اجتہاد اور تحقیق کو از سر نو زندہ کرنے کی ضرورت ہے کیونکہ اس کے بغیر مسلمان ترقی نہیں کر سکتے۔ سر سید ہر زمانے کے لیے مجتہد کا ہونا ضروری سمجھتے ہیں۔

"اگر ہمارے پاس زندہ مجتہد موجود نہ ہوں گے تو ہم مردہ مجتہدوں سے نئی بات کا مسئلہ جو ان کے زمانے میں حادث بھی نہیں ہوئی تھی کیوں کر پوچھیں گے۔ پس ہمارے لیے مجتہد العصر والزمان کا ہونا ضروری ہے۔"(۱۸)۔

اس تحریر پر یہ شور اٹھا کہ اب سر سید اپنے کو مجتہد بھی کہلوانا چاہتے ہیں۔ ممکن ہے سر سید کا یہ منشا نہ ہو' مگر ان کے مریدوں نے انہیں مجتہد و مجدّد مانا اور لکھا۔ سر سید کی تحریریں ان کے اجتہاد کا ثبوت ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس وقت کے علما نے انہیں نیچری اور کافر قرار دیا اور آج کے علما انہیں اجتہاد کے لائق نہیں مانتے۔ سر سید نے مذہب کی تجدید کی ہو یا نہیں لیکن انہوں نے مسلمانوں کو من حیث القوم حیات نو دینے کی کوشش میں ضرور کامیابی حاصل کی۔ مذہب' جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا ان کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک کا ضمیمہ ہے' بنیاد نہیں ۔ یہ مسئلہ اپنی جگہ غور طلب ہے کہ اگر سر سید مذہبی مباحث میں نہ پڑتے تو اپنے مقصد میں انہیں زیادہ کامیابی حاصل ہو سکتی تھی یا نہیں۔ لیکن وہ سچے دل سے یہ سمجھتے تھے کہ

مسلمانوں کی ترقی کے لیے مغربی تعلیم لازمی ہے اور مغربی تعلیم کی طرف انہیں راغب کرنے کے لیے علوم جدیدہ و اسلام میں تطبیق ناگزیر ہے۔ یہی ان کے متکلمانہ مباحث و تصورات کی بنیاد ہے۔ اس لحاظ سے میں سرسید اور شبلی کے مقاصد کی نوعیت کو مختلف سمجھتا ہوں۔ شبلی نے مذہب کے لیے علم کلام کی تدوین نو کی اور سرسید نے مسلمانوں کی دنیوی ترقی کے لیے ایک نئے علم کلام کی تعمیر کی۔

سرسید کے یہاں مذہب کا تصور فطرت کے عین مطابق ہے۔ انہوں نے اسلام کو مذہب فطرت ثابت کرنے اور علوم فطرت سے اس کی مطابقت ظاہر کرنے میں بڑا زور قلم و ذہن صرف کیا ہے۔ ان کی اس کوشش کو ان کے نئے متکلمانہ تصورات کی روح ماننا چاہیے۔ اس کے علاوہ انہوں نے فروعات سے جو بحث کی ہے اور سابق متکلمین کی طرح ذات و صفات، تشبیہ و تنزیہ، جبر و قدر، عقل و نقل، معراج جسمانی و روحانی، قیامت، معاد، حشر اجساد، ملائکہ، جنت و دوزخ، شیطان، جن، مکاشفہ اور وحی کی ماہیت کے متعلق جو موشگافیاں کی ہیں وہ اس لحاظ سے کم تر درجے کی حامل ہیں کہ ان کی اہمیت بنیادی عقائد کی سی نہیں ہے۔ تیسری نوع کی بحثیں مناظرانہ ہیں، جو ایک طرف تو علماء کی تنگ نظری کے جواب میں ہیں یا عیسائیوں کے اسلام پر اعتراضات کا رد ہیں۔ سرسید کے یہاں مناظرانہ رنگ پوری مذہبی تحریروں میں غالب ہے، یہ ان کے متکلمانہ طرز فکر کا نتیجہ تھا، اس لئے میں سمجھتا ہوں کہ وہ باوجود قدیم علم کلام کو رد کرنے کے دعووں کے اس کے اثر سے آزاد نہ ہو سکے، اور متکلمانہ فکر میں معتزلی طرز استدلال کی ہی توسیع کرتے نظر آتے ہیں۔ سرسید کا عقیدہ یہ ہے کہ مذہب خدا کا قول ہے اور فطرت خدا کا فعل ہے اس لیے دونوں ایک ہیں۔ ظاہر ہے کہ مذہب سے ان کی مراد صرف اسلام ہے، وہ ثبوت کو بھی ایک فطری تقاضہ اور امر مانتے ہیں۔ نبی کا انتخاب قدرت بلا وجہ نہیں کرتی کہ جسے چاہے اس منصب سے نواز دے بلکہ انبیا تمام صفات کے جامع ہوتے ہیں اور ان کی فطرت اس بار کو اٹھانے کی اہلیت رکھتی ہے۔ (۱۹) اس لیے وہ وحی کو ایک ملکہ سمجھتے ہیں۔

> "خدا اور پیغمبر میں بجز اس ملکہ نبوت کے جس کو ناموس اکبر اور زبان شرع میں جبرئیل کہتے ہیں اور کوئی ایلچی یا پیغام پہونچانے والا نہیں ہوتا اس کا دل ہی وہ آئینہ ہوتا ہے جس میں تجلیات ربّانی کا جلوہ دکھائی دیتا ہے۔ اس کا دل ہی وہ ایلچی ہے جو خدا کے پاس پیغام لے جاتا اور خدا کا پیغام لے کر آتا ہے" (۲۰)

سرسید نے معتزلہ کے عقیدے کے مطابق خدا کو بھی عقل کا مصداق جانا اور مانا ہے۔ وہ اشاعرہ کی طرح یہ نہیں مانتے کہ اشیاء کا حسن و قبح یا کسی فعل پر ثواب و عذاب صرف خدا کے حکم پر منحصر ہے بلکہ یہ مانتے ہیں کہ خدا کے احکام عقل کے مطابق ہیں۔ اسی لیے سچے ہیں۔ (۲۱)۔ خدا نے قدرت کا جو قانون بنایا ہے وہ عقل کا تابع ہے اور چونکہ اس قانون کو بنانے والا خدا ہی ہے اس لیے اس کی قدرت مطلقہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔ قانون قدرت کبھی نہیں ٹوٹتا کیونکہ جو کچھ خدا کرتا ہے وہی فطرت ہے۔ (۲۲) اس بنیاد پر انہوں نے معجزات و کرامات و خرق عادات کا عام عقیدے کے برخلاف انکار کیا ہے۔ وہ معجزے کو بھی قانون علت و معلول کا مظہر سمجھتے ہیں۔ خرق عادت ان کے نزدیک کوئی چیز نہیں، معجزے کی نوعیت سے مختلف مقامات پر بہت تفصیل سے بحث کی ہے۔ (۲۳) اور اس معاملے میں شاہ ولی اللہ سے بھی اختلاف کیا ہے۔ (۲۴)

بعض مقامات پر تو سرسید مذہب و سائنس کی تطبیق میں اتنے آگے نکل گئے ہیں کہ انہوں نے روح کو بھی مادی وجود مانا ہے جو جسم لطیف جوہر مستقل بالذات ہے۔ (۲۵) اسی کے ساتھ وہ روح کو امر رب مانتے ہیں، مگر شاید انہیں علم نہ تھا کہ

ان کی روح کی تعریف انہیں مادیّت کے فلسفے سے قریب ہے جا رہی ہے۔سورہ یوسف کی تفسیر میں خواب سے بحث کرتے ہوئے سر سید نے خواب کی نفسیاتی تعبیریں کی ہیں وہ نفسیات کے جدید تر نظریوں سے قریب ہیں۔وہ خواب کو انسان کی اپنی ذہنی کیفیات اور خواہشات کا مظہر مانتے ہیں۔(۲۶) اسی طرح انہوں نے استوٰی علی العرش اور سماوات کی جو تفسیریں کی ہیں وہ ان کے دین فطرت کے مطابق مگر عام عقیدے سے مختلف ہیں۔(۲۷) ان کی تاویل بعث اور مسائل میں یہ ہے کہ قیامت برحق ہے۔مگر ہر شخص کے لیے اس کی موت ہی قیامت ہے۔ وہ قیامت کی تفصیلات و علامات کی سائنسی طریقے سے توجیہ کرتے ہیں۔(۲۸) اس عقیدے میں اقبال بھی سر سید کے ہم نوا نظر آتے ہیں۔ سر سید مہدی موعود کے بھی منکر ہیں۔(۲۹) سر سید کے ان تمام عقائد کو ان کی فطریت یا فطرت پرستی ہی کا نتیجہ سمجھا جاسکتا ہے۔سر سید کا خیال تھا کہ مسلک فطرت (Naturalism) نیچر کو قانون الٰہی کے مطابق ماننے کا نام ہے یہ دہریت یا لامذہبیت کا فلسفہ نہیں۔اس معاملے میں سر سید کو مغالطہ ہوا لیکن انہوں نے اپنے مسلک فطرت کی توجیہ و تفسیر خالص اسلامی عقیدوں اور اصولوں کی بنیاد پر کی۔ان کے بعض عقیدے مروجہ عقیدوں سے مختلف ضرور ہیں مگر انہیں سر سید اصلی اسلام سے انحراف نہیں مانتے تھے بلکہ اس کے عین مطابق جانتے تھے۔

حیرت اس پر ہوتی ہے کہ سر سید ایسا تعقل پسند صفات و ذات کے بارے میں معتزلہ و اشاعرہ کے انداز میں بال کی کھال نکالنے کو کیوں کر علوم جدیدہ کے طرز فکر سے مطابق کرسکا۔سر سید معتزلہ کے ہم خیال ہیں۔ وہ خدا کی صفات کو ذات کا عین مانتے ہیں۔انہوں نے کئی مقامات پر اپنے عقیدہ کی توضیح کی اور قرآن مجید کی تفسیر میں ذات و صفات کے مسئلے سے متکلمانہ انداز میں بحث کی ہے۔(۳۰) وہ معتزلی فکر کو تصوّف کی وحدت الوجودی فکر سے ملا دیتے ہیں اور فطرت کو مذہب ماننے کے لیے خدا کو عین فطرت مان کر خالق و کائنات کی عینیت کا بھی اقرار کرتے ہیں۔(۳۱) تصوّف اور معتزلہ کی عقلیت کا یہ امتزاج بھی توجہ طلب امر ہے۔سر سید کو ان کے مخالفین وہابیت کے زیر اثر سمجھتے رہے۔اس لیے کہ وہ تقلید کے خلاف تھے اور تقلید کو شرکت فی النبوۃ کے برابر مانتے تھے۔(۳۲) وہ ائمہ فقہا اور ائمہ اہل بیت کسی کی تقلید کے قائل نہیں۔سر سید نے حدیث کی صحت و اعتبار کے مسئلے سے مختلف مضامین میں تفصیلی بحث کی ہے۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ صرف وہ احادیث قابل قبول ہیں جو قرآن کے مطابق ہیں۔یا رسول کے عمل کی توثیق کرتی ہیں اور عقل کے معیار پر پوری اترتی ہیں۔(۳۳) سر سید کا محدثین سے مناظرہ اور ان کی مخالفت ہمیں یاد دلاتی ہے کہ قدیم متکلمین کی بھی محدثین نے شدید مخالفت کی تھی۔اسطرح سر سید حال کے محدثین و علمائے ظاہر کے مقابل معتزلہ کے جانشین کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔

سر سید نے دو اکابر کا جا بجا حوالہ دیا اور ان کی تحریروں سے تائید حاصل کی ہے۔ایک امام غزالی ہیں اور دوسرے شاہ ولی اللہ۔غزالی غیر تقلید کو کفر نہیں سمجھتے۔انھوں نے خود اجتہاد کیا ہے اور تاویل کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔(۳۴) سر سید نے غزالی کے کئی مضامین اور کتابوں کا ترجمہ خلاصہ اور شرح کی ہے، اس لیے کہ وہ سمجھتے تھے کہ غزالی کی تصنیفات سے ان کی مذہبی طرز فکر کو تقویت پہنچتی ہے۔لیکن بعض مقامات پر ان کو غزالی کے یہاں بھی تقلید کا اثر نظر آتا ہے۔(۳۵) مجموعی طور پر وہ مانتے ہیں کہ غزالی نے عموماً ترک تقلید کی راہ اختیار کی ہے۔(۳۶) سر سید نے غزالی کے "المنقذ من الضلال" کا بھی خلاصہ کیا ہے۔غزالی نے اپنے سفر فکر میں پہلے علم محسوسات پر شک کیا پھر عقلیات پر شک کیا اور آخر میں تصوّف کی راہ اختیار

کی۔ سرسید کی مذہبی فکر محسوسات و معقولات ہی کے دائرے میں گردش کرتی رہی۔ وہ تصوف سے کچھ شغف ضرور رکھتے تھے مگر ان کی عقلیت پسندی نے انہیں اس راہ پر چلنے سے باز رکھا۔ اس اختلاف کے باوجود سرسید پر غزالی کا گہرا اثر ہے حالانکہ غزالی نے فلسفے کا رد لکھ کر اور اسے نصاب سے خارج کر کے اسلامی مدارس میں کٹر پن کو مضبوط کرنے میں بڑا کام کیا ہے عام طور سے آج اس غزالی کے نام لیوا تنگ نظر علما میں بہت مل جائیں گے جو ان کو فلسفے کا مخالف کہے گا لیکن اس غزالی کا کوئی نام نہ لے گا جو متشکک بھی تھا۔ سرسید، غزالی کے مرید نظر آتے ہیں انہیں صرف چند مقامات پر غزالی سے اختلاف ہے۔ سرسید پر اثر انداز ہونے والی دوسری شخصیت شاہ ولی اللہ کی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شاہ ولی اللہ نے اپنے زمانے میں اجتہاد پر زور د[یا] اس کی ضرورت کو محسوس کیا اور تقلیدی رویے سے بغاوت کی لیکن مجموعی طور پر ان کی فکر شیخ احمد سرہندی کے سلسلہ فکر سے مل جاتی ہے۔ سرسید، غزالی کی احیاء العلوم اور شاہ ولی اللہ کی حجۃ اللہ البالغہ کو عظیم فکری اور اجتہادی کارنامہ جانتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ علمائے سابق میں غزالی اور علمائے متاخرین میں شاہ ولی اللہ نے جدید تحقیقات کی روشنی میں اسلام کی تفسیر و تاویل کی ہے۔ سرسید ان بزرگوں سے بیشتر اتفاق کرتے ہیں۔ سرسید، جنہیں معتزلہ کے توسط سے فلاسفہ میں ابن سینا اور ابن رشد کے قریب ہونا چاہیے تھا، غزالی کے حلقے بگوش کیوں ہو گئے، حیرت کی بات نہیں۔ سرسید نے ابن سینا کا اثر تو قبول کیا مگر ابن رشد کا ان کے یہاں بہت کم حوالہ ملتا ہے۔ غزالی سرسید کے نئے تصور مذہب کے ارتقا میں معاون ہو سکتے تھے اور سرسید نے ان سے یہی کام لیا۔ اس طرح شاہ ولی اللہ جو ہندوستان کی غیر مذہبی یا روادارانہ فکر کے حریف ہیں اجتہاد اور ترک تقلید کے سلسلے میں غیر مذہبی مفکرین سے زیادہ مدد دے سکتے تھے۔ سرسید کا ایک مضمون بھی خالص فلسفیانہ نہیں ان کا مقصد مذہب اور علوم جدیدہ میں تطبیق تھا۔ اس حد تک انہوں نے غزالی اور شاہ ولی اللہ سے مدد لی اور اس کے باوجود معتزلہ کی عقلیت پسندی کا نہ صرف سہارا لیا بلکہ اس کی توسیع بھی کی۔ ان دو متضاد عوامل کی سرسید کے تصور مذہب میں آمیزش اسلام اور علوم مغرب کی تطبیق کے لیے ضروری تھی کیونکہ ان کا مقصد دوہرا تھا۔ ایک تو وہ اسلام کو علوم جدیدہ کے مطابق ثابت کرنا چاہتے تھے دوسرے علوم جدیدہ کے خلاف مسلمانوں کے عام تعصب کو مٹانا چاہتے تھے۔ معتزلہ نے انہیں منہاج فکر (Method) دیا اور غزالی اور شاہ ولی اللہ نے مواد کے ساتھ اجتہاد کی مثالیں بھی فراہم کیں۔

سرسید کی تربیت خانوادہ مجددیہ میں ہوئی تھی۔ برہان احمد فاروقی کا خیال ہے کہ ان کا تنزیہی تصور، توحید اور تصوف کو صرف تزکیہ اخلاق کا ذریعہ سمجھنا شیخ مجدد کا اثر ہے۔ (۳۷) شاہ ولی اللہ کا سلسلہ بھی فکری لحاظ سے شیخ مجدد سے ملتا ہے۔ شیخ مجدد نے تصوف میں اتباع سنت پر زور دے کر حدیث کی طرف توجہ دلائی تھی اور فقہ کی اہمیت کو کم کیا تھا۔ شاہ ولی اللہ نے حدیث کا ایک اسکول قائم کر دیا جو سید احمد بریلوی تک پہنچتے پہنچتے اہل حدیث کا اسکول بن گیا، جس نے تقلید کا انکار کیا۔ سرسید تقلید کے انکار میں اور آگے بڑھے اور انہوں نے حدیث کی تحقیق و تنقید پر اتنا زور دیا کہ مذہب کی بنیاد صرف قرآن رہ گیا۔ (۳۸) اس لحاظ سے سرسید کو اس سلسلہ فکر سے جوڑا جا سکتا ہے جو غزالی سے شروع ہو کر شیخ مجدد کے توسط سے شاہ ولی اللہ اور پھر اہل حدیث تک پہنچتا ہے۔ مگر اس ظاہری مشابہت کے باوجود سرسید میں اور ان بزرگوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ سرسید کا اصل مقصد مذہب اسلام کی غیر اسلامی عناصر سے تطہیر نہ تھی۔ انہوں نے غیر اسلامی رسوم کی مخالفت اس لیے کی کہ ان کی بنا پر [تو]ہمات و تعصبات کا شکار ہو کر مسلمان علوم اور مغربیت سے بھاگ رہے تھے۔ شیخ مجدد اور شاہ ولی اللہ کے لیے اصلاح و اجتہا[د]

مت دین کے لیے ضروری تھے جب کہ سرسید نے یہ ضرورت اسلام اور مسلمانوں کی دنیوی بقا کے لیے محسوس کی۔

سرسید نے جو نیا تصوّر مذہب عام کرنے کی کوشش کی اس میں انہیں جزوی کامیابی ہوئی۔ غیر اسلامی توہمات و عقبات اور رسوم و رواج کے ترک کرنے کے ساتھ اسلام پر عقلی نقطۂ نظر سے غور و فکر کا آغاز ہوا۔ سرسید مذہب کی فطرت رسائنس سے تطبیق پیدا کرنے کی کوشش میں بہت آگے نکل گئے تھے لیکن بعد والوں نے اس تطبیق کو زیادہ قابل قبول ر پابند شریعت بنانے کی کوشش کی۔ مذہب کا جو نیا تصور سرسید عام کرنا چاہتے تھے اس کی جزوی ناکامی کے میرے دیک دو اسباب ہیں۔ ایک تو یہ کہ سرسید کو یہ احساس نہیں تھا کہ مذہب، فلسفہ اور سائنس سب کے دائرہ ہائے کار جدا جدا ہیں ان ں تطبیق کی کوشش سعی رائیگاں ہے، فلسفہ اور سائنس، سیکولر علوم ہیں۔ سرسید علوم کے اس جدید مغربی تصوّر کو قبول نہ لرسکے اور یہ سمجھ کر کہ اسلام ہی واحد مذہب ہے جو علوم جدیدہ سے کمزور ہونے کے بجائے مستحکم ہوسکتا ہے ان کی تطبیق ں لگے رہے۔ یہ کار لاحاصل تھا۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ سرسید نے چند بنیادی مسائل ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ فروعات میں الجھ گئے اگر وہ جن، ملائکہ، معجزات، قیامت، حشر اجساد، ذات و صفات، جبر و قدر ایسے مسائل کی بے فیض متکلمانہ بحثوں میں نہ پڑتے تو نابد انہیں زیادہ کامیابی ہوتی۔ اس طرح انہوں نے اپنے معتقدین کو بھی مذہبی فکر کے معاملے میں اپنے سے دور کر دیا، محسن ملک کو تو ان کی تفسیر قرآن و مذہب سے اختلاف تھا ہی، حالی کو بھی لکھنا پڑا کہ۔ "آخر عمر میں سرسید کی خود رائی یا جو وثوق کہ ن کو اپنی رایوں پر تھا وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو گیا تھا۔"

حالی مذہبی لحاظ سے پرانے خیال کے راسخ العقیدہ مسلمان تھے، حیات جاوید، میں بھی سرسید کی مذہبی فکر کے متعلق ن کا انداز اعتذار کا ہے، تائید یا دفاع کا نہیں۔ اس لیے بعض محققین کو حالی پر سرسید کے مذہبی خیالات کی مخالفت کا بھی بجا ور بدگمان ہوتا ہے، میں اسے سرسید کی ناکامی ہی سمجھتا ہوں کہ وہ محسن الملک کو جو ان کے جانشین ہونے والے تھے اور حالی کو جو ان کے معتقد بھی تھے اور سوانح نگار بھی، اپنے تصور مذہب کا قائل نہ کر سکے۔ سرسید کی ناکامی کا سلسلہ آج تک یوں باری ہے کہ وہ دینیات کی تعلیم کو جس فلسفیانہ اور عقلی طریقہ پر رائج کرنا چاہتے تھے خود ان کے قایم کیے ہوئے دارالعلوم نے کبھی اپنانے کی کوشش نہ کی۔

سرسید اپنی اس ناکامی میں اس لیے اور بھی عظیم ہوجاتے ہیں کہ ان کا اصلی مقصد، مذہبی اصلاح و اجتہاد تھا، جو ایک سیلہ تھا اور وہ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کے عام و مقبول ہونے کی صورت میں پورا ہو گیا۔ انہیں اپنے اس مشن کے لیے رفقا ر ہم نوا، مخالفین کے گروہ میں ملتے گئے اور آج سرسید کے نام لیوا افراد کی اکثریت ان پر مشتمل ہے جو سرسید کی زندگی میں ن کو نیچری کہتے تھے اور آج بھی ان کی عقلیت پسندانہ مذہبی فطرتیت کو کسی طرح قبول نہیں کرسکتے۔ خدا جانے اسے ان کی کامیابی مانا جائے یا ناکامی کہ ان کے صنم خانۂ فکر کو پاسبان بھی کعبے ہی سے ملے، جو اصنام فکر و دانش کو کچھوڑ کر معبدِعلم میں بھی پاسبانی حرم ہی کی کرتے رہے۔ سرسید کا تصوّر مذہب مقبول نہ ہوسکا، مسلمانوں کی ادعائیت اور جمود پسندی کی وجہ سے ہو بھی نہ سکتا تھا۔ لیکن انہوں نے مذہبی فکر کو عقلیت کے جس راستے پر ڈالنا چاہا تھا اس کی تائید، اختلاف کے باوجود شبلی کی مذہبی فکر سے بھی ہوئی اور اقبال، ابوالکلام کے اجتہادی کارناموں نے بھی اسی کی توسیع کی۔ مولانا حمید الدین فراہی کی محققانہ تفسیر کو بھی ایک معنی میں سید ہی کا بالواسطہ فیضان کہا جا سکتا ہے آج اسلام کے متعلق جدید طرز فکر کو اپنانے کے

دعوے دار تمام مکاتب خیال اپنے باہمی اختلافات کے باوجود، وہ کٹر مذہبیت اور ادعائیت کے حلیف ہوں یا ترقی پسندی وجدیدیت کے، اسی عقلیت کے منہاج کو برتنے کی کوشش کرتے ہیں جس کی طرح سر سید نے ڈالی تھی۔

سر سید کی نئے علم کلام کی تدوین و تشکیل عملی لحاظ سے ہی نہیں نظریاتی حیثیت سے بھی کم ہی کامیاب ہوئی اس کے اسباب کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ انہوں نے بہت سے مسائل اور ان کے حل پرانے علم کلام ہی سے مستعار لیے۔ یونانی علوم اور اس کے زیر اثر نمو پانے والے کلام کی تغلیط کرنے کے باوجود وہ یونانی فلسفے کے مبہم تصورات میں بار بار الجھ جاتے ہیں اور انیسویں صدی کے دوسرے نصف میں بھی ان کی صداقت کے معتر نظر آتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ ان خیال آرائیوں کی بنیاد سائنسی سمجھتے ہیں۔ سائنس سے سر سید کی شناسائی بہت سرسری تھی۔ یہی سبب ہے کہ وہ شاہ ولی اللہ کے نظریہ ارتقا کا تو حوالے دیتے ہیں مگر ڈارون کے نظریہ کو تسلیم کرتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ شاہ صاحب نے مولانا روم اور بعض قدیم فلاسفہ کی طرح یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ پہلے معادن خلق ہوئے ان سے معدنیات، ان سے نباتات۔ نباتات سے حیوانات، حیوانات سے انسان پیدا ہوا۔ سر سید نے شاہ صاحب کا یہ بیان "تفہیمات الہیہ" سے نقل کیا ہے۔(۳۹) اور لکھا ہے

"جو لوگ ڈارون کی تھیوری کے قائل ہیں وہ تو شاہ ولی اللہ صاحب کے اس بیان سے انقلاب کی تھیوری پر استدلال کرتے ہیں اور جو لوگ انقلاب کے قائل نہیں ہیں بلکہ مماثلت کے قائل ہیں جیسا کہ ہمارا خیال ہے، وہ ان کے بیان سے مماثلت کی تھیوری پر استدلال کرتے ہیں"۔(۴۰)

انقلاب اور مماثلت کی اصطلاحات مبہم ہیں لیکن اتنا ضرور ظاہر ہوتا ہے کہ سر سید کی کوشش یہ ہوتی تھی کہ وہ نئے سائنسی نظریات کی قرآن یا علمائے اسلام کی تحریروں سے تائید و تطبیق کر سکیں یہ تو ایک پہلو ہے۔ دوسری طرف سر سید نے بہت سے معتقدات کی عقلی توجیہات کر کے انہیں عقل کے لیے قابل قبول بنانے کی بھی کوشش کی ہے۔ یعنی ایک طرف تو انہوں نے جدید سائنسی نظریات کا جواز اسلام میں تلاش کیا دوسری طرف انہوں نے اسلامی معتقدات کا جواز سائنس یا فلسفہ سے پیش کرنے کی کوشش کی۔ دوسرے کام میں کہیں کہیں ان کی یہ کوشش کامیاب بھی ہے۔ وحی، مکاشفہ، بہشت، تخلیق و ارتقا، معراج، معجزہ و خرق عادت، خواب کی تعبیر کی تاویلات اس لحاظ سے اہم ہیں کہ انہوں نے کامیابی سے اسلام کے معتقدات اور قانون فطرت میں مطابقت دکھائی ہے۔ سر سید کی یہ تاویلات ادعائیت پسند اور لفظ پرست علما کو آج بھی دعوت فکر دیتی اور انہیں رسمی معتقدات کے حصار سے نکالنے میں معاون ہو سکتی ہیں۔ فقہ کے معاملے میں سر سید اجتہاد کی ضرورت کو محسوس کرتے ہیں انہوں نے خلافت کو دنیوی امور سے وابستہ کر کے مسلمانوں کے ایک فرقے کی تو تائید کی مگر خلافت کے متعلق ان کا نقطۂ نظر سواد اعظم کے لیے قابل قبول نہیں ہو سکتا۔(۴۱) خلافت پر سر سید کی رائے کو سلطان ترکی سے ان کے کے مسلمانوں کی غلط مذہبی عقیدت کی روشنی میں دیکھنا چاہیے۔ سر سید خود ترکی سے متاثر تھے ان کا لباس اور علی گڑھ کالج کے طلبہ کے لیے ان کا مجوزہ یونیفارم اس کے گواہ ہیں۔ لیکن وہ ہندوستان میں خلافت اسلامی کے تصور کے مخالف تھے۔ سر سید کی اس رائے سے شاید ہی کوئی معروضیت پسند مفکر و محقق اختلاف کر سکتا ہے کہ ابتدائی چند برسوں کے بعد واقعی خلافت اسلام میں ملوکیت و شہنشاہیت کے مترادف ہو گئی تھی اور اس کی کوئی مذہبی حیثیت باقی نہیں رہی تھی۔ سر سید کو ترکی میں ہونے والی قانون کی تبدیلیوں سے بھی خوشی تھی اور ترکوں کی مغربیت و جدیدیت پسندی بھی مرغوب تھی۔ خلافت کو مذہب سے

الگ کرکے انہوں نے بعد کے سیاسی قائدین تحریک خلافت سے زیادہ سیاسی بصیرت کا اظہار کیا جب ترکی، خلافت کی نقاب اوڑھنے والی ملوکیت و مطلقیت سے نجات حاصل کر رہا تھا۔ ہمارے ملک کے روشن خیال قائدین خلافت کے کھوکھلے تصور کو سینے سے لگائے اس کے تحفظ کی عمر ناشناس سعی کر رہے تھے۔

سر سید نے اسلامی قانون میں بعض تبدیلیوں کی ضرورت کو محسوس کیا تھا۔ اسی لیے سر سید نے فقہ میں اجتہاد پر اصرار کیا اور اسلامی قانون کی نئے حالات اور تقاضوں کے تحت تبدیلی کو ناگزیر محسوس کیا۔ انہوں نے تعدّدِ ازدواج کو فطری قرار دیتے ہوئے ایسے نکات پیش کیے کہ ایک شادی سے زیادہ کا جواز ہی نہ رہے۔(۴۲) انہوں نے صغرسنی کی شادی کے خلاف قانون کی تائید کی۔ مگر وراثت کے اسلامی قانون کو عین مطابق فطرت مانا اور یہ ثابت کیا کہ قرآنی احکام فطرت کے تقاضوں کی تکمیل کرنے کی وجہ سے ناقابل تغیر ہیں۔(۴۳) ان تحفظات کے ساتھ سر سید فقہ کے مروجہ اسکولوں سے چمٹے رہنے کو جمود سمجھتے تھے اور اجتہاد کی ضرورت کو محسوس کرتے تھے۔(۴۴) میرا خیال ہے کہ اگر سر سید اسلام کے ان معاشرتی پہلوؤں پر متکلمانہ بحثوں کے مقابلے میں زیادہ توجہ صرف کرتے تو اس کے بہتر نتائج نکل سکتے تھے کیوں کہ ذات و صفات، جبر و قدر، مادے کی قدامت اور بعض غیر عقلی عقیدوں کی عقلی تاویلات کی بحث سے یہ کام زیادہ دور رس نتائج کا حامل ہوتا۔ انہوں نے ضروری اور بے فیض مباحث میں الجھ کر اجتہاد کے اس تقاضے کی تکمیل نہیں کی جسے وہ محسوس کر رہے تھے۔ محسن الملک نے یہ لکھا تھا کہ فلسفہ و سائنس کے نظریات بدلتے رہتے ہیں، جس طرح پرانے نظریات بدل گئے موجودہ نظریات بھی بدل جائیں گے تو کیا آپ ان کی از سرِ نو توجیہ و تطبیق کریں گے؟ یہ سلسلہ لامتناہی ہوگا اور لاحاصل۔ اس لیے انہوں نے سر سید کو مشورہ دیا تھا کہ سائنسی نظریات کو بلاشک و شبہ قطعی اور آخری ماننا بھی صحیح نہیں۔ سر سید نے اس کا جواب اثبات میں دیا ہے ان کا عقیدہ تھا کہ قرآن ہر زمانے کے جدید سے جدید تر انکشافات و نظریات کی تائید کر سکتا ہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے کائنات کے اس قدیم نظریے کا حوالہ دیا ہے کہ سورج زمین کے اطراف حرکت کرتا ہے۔ یاد رہے کہ سر سید نے حرکت زمین میں ایک رسالہ "قول متین در ابطال حرکت زمین" لکھا تھا۔ مگر بعد میں انہوں نے اسی یقین سے زمین کی سورج کے گرد گردش کی بھی قرآنی توجیہ کی۔ ان کا خیال تھا کہ اس میں غلطی ہماری تھی قرآن کی نہیں جو ہمارے علم سابق کا نقصان اور قرآن مجید کے کامل ہونے کا ثبوت ہے۔(۴۵) ان کا دعوا تھا کہ قرآن ہر تحقیق کی تائید کر سکتا ہے۔ یہ ان کی ادعائیت ہی تھی جس کی بنیاد اس غلط خیال پر ہے کہ قرآن سے سارے علوم اور جدید سے جدید تر نظریات کی توثیق ہوتی ہے یہ سر سید کے تصور مذہب اور تفسیر قرآن کی بنیادی کمزوری تھی ستم ظریفی یہ ہے کہ سر سید کی عقلیت اور فطرتیت کے مخالفین نے سر سید کی تغلیط و تردید کے باوجود ان کی اس کمزوری اور غلط منطق کو اپنا لیا۔ آج بھی ہمارے بیشتر علما قرآن کی حقانیت اسی میں سمجھتے ہیں کہ ہر سائنسی انکشاف کو قرآن ہی سے ماخوذ و مستنبط مانا جائے۔

سر سید کو جو کامیابی اپنے بنیادی مقصد کی تکمیل، یعنی مغربی علوم کی مسلمانوں کی ترویج میں ہوئی، اسی کا ایک لاحقہ یہ بھی ہے کہ وہ اپنے مذہبی تصور کو سائنس و مذہب کی بے ثمر تطبیق کے انتہا پسندانہ جذبے کی وجہ سے اپنے مقلدین و معاونین سے بھی نہ منوا سکے۔ سر سید کا مذہبی مباحث سے مقصود علم کی اشاعت کی طرف مسلمانوں کو راغب کرنا تھا اس میں تو وہ سرخرو ہوئے مگر ان کا مذہب میں اجتہاد اس کامیابی کی نذر ہو گیا۔ میں نے ایک جگہ عرض کیا ہے کہ سر سید کے

صنم خانے کو پاسبان کعبے سے ملے۔ ان کے صنم خانہ ذہن نے کعبے کو بھی پاسبان فراہم کئے اور اس طرح مذہب کے معاملہ میں اپنی ناکامی کو درپردہ کامیابی سے بدل لیا یہ سودا انہیں گراں نہیں پڑا۔ البتہ ہمیں اس سودے میں اپنے نفع و نقصان کا از سر نو حساب کرنا چاہئے۔

سرسید کی تشکیل الہیات اسلامی کا یہ جائزہ اقبال کی اجتہادی فکر کے عوامل کے عناصر کو سمجھنے میں پس منظر کا کام دے سکتا ہے۔ اقبال سے قبل برصغیر میں دو ہی نام اس ذیل میں اہم ہیں۔ شاہ ولی اللہ اور سرسید۔ شیخ احمد سرہندی نے ان دونوں چراغوں کو روشنی دی۔ (۴۶) لیکن ان کا اصل مقصد اسلام کی تقلید تھا نہ کہ تعمیر نو۔ سرسید نے خود اعتراف کیا ہے کہ صرف فرقہ امامیہ نے اجتہاد کے دروازے کو کھلا رکھا لیکن انہوں نے شیعہ مجتہدین کے اجتہادات سے کہیں کوئی بحث نہیں کی۔ بعض امور میں وہ شیعہ موقف سے قریب نظر آتے ہیں، یہی حال اقبال کا بھی ہے کہ بقول خود ع

ہے اس کی طبیعت میں تشیع بھی ذرا سا

اقبال کی بعض نظموں (اسرار و رموز کے منقبتی حصے) میں اہل بیت رسول سے جو گہری عقیدت نظر آتی ہیں وہ اس کا ثبوت ہے۔ اقبال نے بعض متاخر ایرانی مفکرین کے حوالے دیے ہیں جیسے ملاصدرا، میر باقر، داؤد طوسی وغیرہ۔ لیکن یہ محض حوالے ہیں کیونکہ کوئی معمولی سی تفصیل بھی ان علماء فلاسفہ کے کارناموں کی نہیں دی۔ (۴۷) یہ تحقیق اقبالیات کا ایک مستقل اور جداگانہ موضوع ہوسکتا ہے کہ اقبال پر فقہ جعفریہ اور شیعہ فلسفے کا کتنا اثر ہے، اور کہاں کہاں موجود۔ بحث میں یہ مسئلہ دراز کار اہمیت رکھتا ہے اس لیے کہ سرسید ہوں یا اقبال بعض فکری مماثلتوں اور عقیدے سے ہٹ کر ان دونوں کے یہاں شیعہ مجتہدین کے اجتہادات کا سراغ لگانا امر محال ہے۔ خود شیعہ علما اور جدید تعلیم یافتہ طبقے نے اجتہادات کے اس سلسلے پر کوئی وقیع کام نہیں کیا جسے مغربی علوم اور جدید اکتشافات و تحقیقات کی روشنی میں حوالے کے لیے پیش کیا جاسکے۔ اس لیے سرسید ہی کا کارنامہ دور جدید میں فکر اقبال کا مقدمہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ یہ بات بھی نظر انداز نہیں کی جاسکتی کہ سرسید کے رفقاء اور معاونین میں شیعہ فرقے کے کئی سربرآوردہ حضرات رہے ہیں اور اقبال کے شارحین و معتقدین میں بھی اس فرقہ کے کئی مذہبی، ترقی پسند اور جدیدیت پسند دانشور پیش پیش تھے اور ہیں۔ لہذا یہ ماننا پڑے گا کہ ان دونوں مفکرین و مصلحین کے حلقے میں "گرفتاران ابوبکر و علی" ایک صف میں نظر آتے ہیں اور اختلاف سے ماورا ہیں۔ سرسید اور اقبال کی تمام فرقوں میں مقبولیت کی بنا پر یہ ضروری ہے کہ فروعی، فرقہ وارانہ فقہی اختلافات کو نظر انداز کرکے اسلام میں اجتہادی فکر کے امکانات اور اس کی تعبیر و تشکیل نو کو وسیع تر اسلامی تناظر میں دیکھا جائے۔ ایران کے حالیہ اسلامی انقلاب کے اکثر فکری رہنماؤں نے اقبال پر لکھا ہے اور ان سے اکتساب فیض کیا ہے جن میں ڈاکٹر علی شریعتی اور مرتضی مطہر شہید کی کتابیں اہمیت کی حامل ہیں۔ یہ بھی اس حقیقت کا ثبوت ہے کہ اقبال کی فکری کاوش ہمہ گیر اپیل رکھتی ہے۔ سرسید سے باہر کی دنیا اتنی شناسا نہیں جتنا اقبال سے ہے، جمال الدین اسد آبادی نے سرسید کو روشناس کروایا بھی تو وفادار برطانیہ اور نیچری کی حیثیت سے، اقبال نے افغانی اور سرسید دونوں سے روشنی حاصل کی۔ ان کی پان اسلامیت افغانی سے ماخوذ ہے، لیکن ان کی فکر کے لیے زمین سرسید ہی نے تیار کی۔ سرسید کی مذہبی فکر کی بنیاد ہی پر اقبال کی کاوش اجتہاد کا بالائی ڈھانچا تعمیر ہوا۔ میں یہاں جان بوجھ کر "ڈھانچے" کا لفظ استعمال کر رہا ہوں اس لیے کہ اقبال نے ڈھانچہ تو کھڑا کر دیا لیکن اسے تفصیلات سے مزین و

مکمل نہیں کیا۔ اس طرح ان کی فکر خود تو بعد والوں کے لیے ایک خاکے کی حیثیت رکھتی ہے۔ سرسید نے اقبال سے بہت زیادہ لکھا۔ ان کے یہاں تفصیلات و جزئیات بھی اقبال سے زیادہ ہیں لیکن اقبال کا عرفان مذہب و مغرب سرسید سے آگے تھا۔ ان کی بصیرت میں مشرق و مغرب دونوں کی فلسفیانہ کاوشیں شریک رہیں۔ ان کا مطالعہ براہ راست اور تناظر فکر سرسید سے وسیع تر تھا اس لیے انہوں نے تطبیق سائنس و مذہب کی بجائے اسلامی عقاید اور اصول فقہ کو جدید اصطلاحوں میں سمجھنے اور برتنے کی کوشش کی اور تطبیق کو لاحاصل سمجھا۔

سرسید کی طرز تفکر و تاویل بڑی حد تک معتزلانہ ہے۔ ان کے یہاں علم کلام کے مبہم مسائل جیسے ذات و صفات، جبر و قدر، خیر و شر کا مبسوط تجزیہ و تفسیر موجود ہے۔ اقبال کا طرز فکر متکلمانہ نہیں۔ وہ مذہبی عقائد اور مابعد الطبیعیاتی مسائل میں عقلی و منطقی موشگافیوں کی لاحاصلی سے واقف تھے۔ ان کی یہ واقفیت اسلامی فکر کی تاریخ اور مغربی فلسفے کے مباحث کے مطالعے پر مبنی تھی۔ وہ سرسید کی طرح ذات باری کے وجود کے روایتی دلائل کی کمزوری کا احساس رکھتے ہیں۔ یہ کانٹ کا اثر تھا لیکن وہ ایک معنی میں وجودیت پر مبنی روحانی تجزیہ وجود اور عرفان ذات و حق کو اساسی اہمیت دیتے ہیں اس طرح وہ عقل پر عشق کو، منطقی فکر پر وجدان کو، سائنس کے تجزیاتی طریقہ کار پر مذہبی وجدان کے ترکیبی عمل کو ترجیح دیتے ہیں۔ یہ سرسید کی فکر سے بہت آگے جانے کا ثبوت ہے۔ لیکن اقبال کے سارے مباحث و تعبیرات بڑی حد تک مابعد الطبیعاتی مسائل مثلاً ذات باری، زمان و مکان، بقاء و اختیار نفس، خیر و شر، سزا و جزا سے آگے نہیں بڑھتیں۔ وہ بعض مسائل میں شاید زمان و مکان کے ذیل میں اشعری نظریہ کے جوہریت کا انطباق بھی کرتے ہیں اس طرح ان کی فکر کا دائرہ بھی محدود ہے۔ سرسید متکلمانہ مسائل کے اسیر ہیں اقبال مابعد الطبیعات سے آگے نہیں بڑھتے۔ دونوں کے اپنے اپنے حدود ہیں۔

سرسید اور اقبال دونوں مغرب کے اثرات کے مقابل مذہب اسلام کا تحفظ و دفاع کر کے اسے از سر نو گم گشتہ تخلیقی صلاحیت اور فعالیت بخشنا چاہتے تھے۔ اقبال نے شاعری میں تو سماجی معاشی مسائل کو اپنا موضوع بنایا۔ مگر تشکیل کے کام میں ان سے بحث نہیں کی۔ بحث ہے بھی تو سرسری مثلاً مسلمانوں کو مغربی استحصال اور مادیت سے بچانے اور انہیں جدید فکری آلحوں سے لیس کرنے کی خواہش تک محدود ہے۔ سرسید اور اقبال دونوں نے اپنے زمانے کے سیاسی اور معاشرتی نظام کے عوامل، استحصالی قوتوں کی بنیاد کے تجزیہ پر اور اس کے سماجی اثرات پر روشنی نہیں ڈالی۔ محض فکری مسائل ایک محدود طبقے کو متاثر کر سکتے ہیں۔ لیکن عوام گیر اثر و نفوذ کے لیے سماج کے عملی مسائل پر توجہ ضروری تھی۔ اس لیے دونوں کا اجتہاد کوئی دور رس اور دیرپا اثر نہیں چھوڑ سکا۔ ان دونوں کے خلاف ایرانی قائدین انقلاب کی رسائی عوام کے ذہنوں تک اسی لیے ہو سکی کہ انہوں نے زندگی، سیاست معاشیات اور سماج کے عام مسائل پر توجہ کی اور ان کو بدلنے کے لیے اسلامی آئیڈیا لوجی سے موثر کام لیا۔ یہ اجتہاد کی وہ منزل ہے جس تک سرسید اور اقبال دونوں کی رسائی نہ ہو سکی۔

سرسید اور اقبال دونوں اپنے ادوار میں دوسرے اسلامی ممالک کے فکری اجتہادات سے بڑی حد تک بے خبر نظر آتے ہیں۔ دونوں ترکی کی اصلاحی تحریکوں سے متاثر ہیں۔ اقبال کو یہ بھی احساس ہے کہ ترکی کی بہت سی اسلامی یا نام نہاد اجتہادی کوششیں محض سطحی ہیں۔ روح مذہب سے ان کا علاقہ نہیں۔ لیکن وہ کسی مسئلہ پر دو ٹوک رائے نہیں دیتے۔ فیصلہ کن بحث سے دانستہ یا نادانستہ گریز کرتے ہیں۔ (۴۹) اقبال کی یہ لاعلمی ان کے وسیع مطالعہ کی روشنی میں حیرت ناک ہے اگر ان

دونوں مفکرین نے اپنے ہم عصر اجتہادات سے پوری واقفیت حاصل کی ہوتی اور ان سے استفادہ کیا ہوتا تو ان کے اجتہادات کی عصری معنویت بڑھ جاتی۔

سرسید نے مسلمانوں کے تعلیمی مسئلہ کو بنیادی اہمیت دی۔ اقبال نے ان میں سیاسی بیداری اور روحانی احیا کو۔ دونوں کے یہاں اسلامی عقائد و نظریات کی تفسیر نو اصل مقصد کا ضمیمہ بن جاتی ہے' یہ بھی مشتبہ ہے کہ دونوں کو اپنے مقصد میں کس حد تک کامیابی ہوئی۔ کیا سرسید تعلیم جدید سے جس طرح کا کام لینا چاہتے تھے' وہ کام پورا ہوسکا اسی طرح سوال یہ ہے کہ آیا اقبال جس ذہنی' سیاسی احیاء' کا مسلمانوں کے لیے خواب دیکھ رہے تھے وہ شرمندہ تعبیر کس حد تک ہوا' اور ہوا تو کیسے اور کہاں؟

اقبال سرسید کی طرح سائنس اور مذہب کے حدود کو خلط ملط نہیں کرتے۔ لیکن متکلمانہ اور سرسیدی فکر کے نشۂ منطق کا خمار ان کے یہاں مادہ کی توانائی میں تحلیل کے طبیعی انکشاف کو ایک روحانی قوت کے اثبات پر منطبق کرنے کی شکل میں ظاہر ہے اس لیے مجھے اندیشہ ہے کہ اقبال بھی مکمل طور پر متکلمانہ طرز فکر سے آزاد نہیں ہوسکے۔

سرسید کے فکری خاکے کی ترمیم اور خانہ پری اقبال نے کی یا ایک دوسری جہت میں ابوالکلام نے ______ لیکن اقبال کے اجتہادی خاکے میں رنگ بھرنے اور اس کی خلاؤں کو پر کرنے کا کام برصغیر میں صحیح معنی میں اب تک نہیں ہوسکا دونوں مفکرین کی کامیابی اور ناکامی میں بھی بڑی مماثلت ہے۔ اسی مماثلت سے زیادہ توجہ طلب حقیقت یہ ہے کہ اقبال کے لیے سرسید کی مذہبی فکر نے مقدمہ کا کام دیا۔ دونوں جس سلسلہ فکر کی کڑیاں ہیں اس میں غزالی' سرہندی اور شاہ ولی اللہ کو اہمیت حاصل ہے۔ دونوں ان کے معتقدین ہیں مگر سرسید غزالی اور شاہ ولی اللہ کے اجتہادی کارناموں کے ویسے ناقد نہیں جیسے اقبال ہیں۔ اس فرق کو سمجھنے کے لیے بھی اور فکر اقبال کا مطالعہ کرنے کے لیے سرسید سے رجوع کرنا ضروری ہے۔ اسی لیے میں سرسید کی فکر کو اقبال کی فکر کا دیباچہ مانتا ہوں۔

حوالے

(۱) مقالات سرسید۔ مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی جلد ۱۲ ص ۲۶۲۔ (۲) مقالات سرسید۔ مرتبہ محمد اسمٰعیل پانی پتی جلد ۱۲ ص ۲۶۲۔ (۳) ایضاً جلد دوم ص ۲۱۲ (۴) سرسید احمد خاں۔ عبدالحق۔ حوالہ سرسید احمد خاں (ایجو کیشنل بک ہاؤس) ص۔ ۱۲۲۔ (۵) مقالات سرسید۔ جلد دوم ص۔ ۵۲ (۶) ایضاً جلد دوم ص ۵۲ (۷) ایضاً جلد دوم ص ۲ تا ۶۔ (۸) ایضاً جلد دوم ص ۲۰۶ تا ۲۵۷' ۲۰ (۹) علم الکلام۔ حصہ اول۔ شبلی (مطبوعہ معارف اعظم گڑھ) ص ۴۔ (۱۰) مقالات سرسید۔ جلد ۱۳ ص ۲۸ (۱۱) ایضاً ص ۳۶۱ (۱۲) ایضاً جلد اول ص ۹۹ (۱۳) ایضاً جلد اول ص ۱۴۸' ۱۴۶ (۱۴) ایضاً ص ۲۷۴ (۱۵) ایضاً ص ۲۷۴ (۱۶) ایضاً ص ۲۷۱ (۱۷) ایضاً ص ۲۷۲۔ ۲۷۳ (۱۸) ایضاً ص ۲۹۱ (۱۹) ایضاً ۲۷ تا ۷۷ (۲۰) ایضاً ص ۶۸ (۲۱) ایضاً جلد اول' ص۔ ۶ (۲۲) ایضاً ص ۲۷ (۲۳) ایضاً ص ۸۰۔ ۹۱۔ ۹۹۔ ۱۰۳' ۱۰۰ (۲۴) ایضاً ص ۸۶۔ ۸۷ (۲۵) ایضاً صفحہ ۲۰۴' ۲۰۵ (۲۶) ایضاً ص ۲۳۶۔ (۲۷) ایضاً ص ۳۱۱' ۳۱۴ (۲۸) ایضاً ص ۳۲۷ (۲۹) ایضاً ص ۳۵۲ (۳۰) ایضاً جلد ۱۳' ص ۲۴۔ ۲۵' جلد ۲' ص ۲۲۹۔ ۲۳۰ (۳۱) ایضاً جلد ۱۲۔ ص ۲۸ (۳۲) ایضاً جلد ۱۳' ص ۲۹۔ ۳۰ (۳۳) ایضاً جلد ۲۲۔ ۲۸ جلد اول ص ۶۹ (۳۴) ایضاً جلد ۲۲ ص ۱۰۴' ۱۰۷' ۱۰۸ (۳۵) ایضاً ص ۱۱۲ (۳۶) ایضاً ۱۱۳ (۳۷) شیخ مجدد کا نظریہ توحید برہان احمد فاروقی (دین محمدی پریس لاہور) ص ۴۴ (۳۸) ایضاً ص ۳ (۳۹) مقالات سرسید' جلد اول' ص ۲۴۶۔ ۲۴۷ (۴۰) ایضاً ص ۸۴ (۴۱) ایضاً۔ مقدمہ اسمٰعیل پانی پتی' ص ۲۶۔ (۴۲) ایضاً جلد ۱۳' ص ۲۵۹' ۲۶۵' ۵۱۷ (۴۳) ایضاً اول' ص ۱۶۸ (۴۴) ایضاً۔ جلد۔ ۱۳' ص ۳۵ (۴۵) ایضاً جلد ۲' ص ۲۵۷ (۴۶) (۴۷) اقبال و شریعتی (تہران) (۴۸) ایضاً (۴۹)

Iqbal -Reconstruction of Religous Thought in Islam (Delhi) Introduction. 46, 49

پروفیسر نعیم احمد*

انقلاب، تعلیم کے ذریعہ

سرسید ہندوستانی مسلمانوں کے تاریخی مقدر کی تمام پیچیدگیوں اور تضادات کی ایک نمایاں علامت ہیں۔ وہ ماضی کو امان پھٹک کر تعلیم اور مذہب دونوں میں ایسی اصلاحات کے خواہشمند تھے جو سرمایہ دار ترقی کے تقاضے پورے کر سکیں۔ اسی سبب وہ راجہ رام موہن رائے، دیانند سرسوتی اور کیشب چندر سین کی اصلاحی تحریکوں کے مداح تھے۔ ملک، معاشرے اور سیاست سے متعلق محرومیوں اور بدنصیبیوں کا مداوا ان کے خیال میں روشن خیالی کے ذریعے ہی ممکن تھا۔ تعلیم کی بنیاد وہ انسانی ذہن کی نئی فتوحات قرار دیتے تھے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ انسانی زندگی، معاشرے، اخلاقیات، ثقافت اور آرٹ نے اب تک جو ترقی کی ہے اسے گہرے غور و فکر کا موضوع بنایا جائے اور اس منتھن کے بعد جو ہاتھ آئے، صرف اسے ہی امرت سمجھا جائے۔ وہ ثقافت اور ٹیکنولوجی کی ترقی کو ملک کی طاقت اور خوشحالی کی ضمانت سمجھتے تھے۔

آثار الصنادید کے مطالعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید سینکڑوں برس سے مستحکم نظریاتی، علمی اور لسانی تشکیلات میں یقین رکھتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد کی حقیقتوں کی روشنی میں ان تشکیلات سے باہر نئی علمی و تعلیمی تشکیلات وضع کیں۔ اپنی انھی امتیازی خصوصیات کی بنا پر سرسید ۱۸۵۷ء کے بعد شمالی ہند میں نشاۃ الثانیہ کے ایک بڑے مظہر بنے۔ انھوں نے تعلیم کے ذریعہ سوچنے سمجھنے اور رد و قبول کی سطح پر انقلاب لانے کی کوشش کی۔ تعلیم سرسید کے نزدیک انقلاب کا بنیادی منتر ہے۔ وہ کثیر جہتی انقلاب کے علمبردار تھے۔ فکر و عمل کی ہر جہت میں وہ فیصلہ کن تبدیلی کے خواہشمند تھے۔ اس لیے ان کا تعلیمی نظریہ یک طرفہ یا محدود نہیں۔ وہ مختلف مدرسے قائم کرکے اپنے نظریات کی آزمائش کرتے رہے۔ بالآخر ۱۸۷۵ء میں علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم اس نوعیت کے سب سے بڑے تجربے کے روپ میں سامنے آیا۔

یہ تضاد آج بھی موجود ہے کہ کیا تعلیم کے لئے حکومت وقت کی طرف دیکھا جائے یا پھر سرکاری امداد اور سرپرستی کی محتاجی سے نجات حاصل کرتے ہوئے تعلیمی ادارے قائم کئے جائیں؟ سرسید کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ تعلیمی اغراض و مقاصد سرکار پر انحصار کرکے پورے نہیں کئے جاسکتے۔ ان کے بقول :۔

---

* صدر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

"کوئی قوم جس کو اپنے بچوں اور قوم کی تعلیم کی خواہش ہو، جب تک وہ تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لیوے، اس کا پورا ہونا غیر ممکن ہے"۔

سرسید کے اس خیال سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی ہے کہ وہ اس نکتہ سے باخبر تھے کہ حکومت Status Quo کی قائل ہے اور اسی کے لئے تعلیم دیتی ہے۔ وہ سرکاری ذہن بنانے اور چابی کے گڈے تشکیل دینے کی کوشش کرتی ہے۔ اس لئے سرکاری تعلیم سے معاشرتی یا نظریاتی انقلاب کی نہ تو راہ ہموار ہو سکتی ہے اور نہ ہی اس کے تقاضے پورے کئے جا سکتے ہیں۔ سرسید سرکاری تعلیم کی حدود اور اس کی محدود اغراض سے بخوبی واقف تھے۔ انہوں نے یہ حقیقت اچھی طرح سمجھ لی تھی کہ برطانوی سرکار ہندوستانیوں کے دلوں میں یہ بات بٹھانا چاہتی تھی کہ تعلیم صرف معاشی ضرورتیں پوری کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس طرح وہ ہندوستانیوں کی تخلیقی قوتوں کو خفتہ رکھنا چاہتی تھی۔ سرسید برطانوی سرکار کی اس حکمت عملی کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ انہوں نے حکومت وقت کی تعلیمی پالیسی سے واضح لفظوں میں اختلاف کا اظہار کیا :

"گورنمنٹ کا یہ کہنا کہ ہم کو اس قدر تربیت سے کچھ علاقہ نہیں بلکہ ہم اس قدر تعلیم کے خواہاں ہیں جو امور معاشی سے علاقہ رکھتی ہے اور جو صرف جغرافیہ، حساب اور ہندسہ پر زور دیتی ہے، نہایت بے جا ہے۔"

انسان دوستی سرسید کا ایک قوی جذبہ تھا۔ ان کے نقطۂ نظر کے مطابق ہر انسان میں صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں اور ہر قوم میں ہزاروں نیکیاں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ لیکن اچھے برے کی تمیز معاشرتی اقدار سے حاصل ہوتی ہے۔ ذہنی صلاحیتیں خام مواد کی طرح ہوتی ہیں، جب تک اسے جلا نہ بخشی جائے، وہ کارآمد نہیں ہوتا۔ سرسید کے خیال کے مطابق تعلیم ذہن کو جلا اور اعلیٰ اقدار کا شعور بخشتی ہے۔ اس طرح ذہن کی سطح پر انقلاب بپا ہوتا ہے اور انسان نہ صرف فطرت کو اپنی مرضی کے مطابق ڈھالتا ہے بلکہ خود اپنی صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرتا جاتا ہے۔ تعلیم کے ذریعہ ہی دریافت، تخلیق اور ایجاد کی کارفرمائیاں ممکن ہوتی ہیں۔ انسان کی صلاحیتوں اور امکانات میں اضافہ بھی اسی کا صدقہ ہے۔ سرسید کے لفظوں میں :

"ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصد رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اس کی عقل و ذہن میں ایک جدت پیدا ہو تا کہ جو امور پیش آئیں ان کے سمجھنے کی، برائی بھلائی جاننے کی اور عجائب قدرت الٰہی پر فکر کرنے کی اس کو طاقت ہو، اس کے اخلاق درست ہوں، معاملات معاش کو نہایت صلاحیت سے انجام دے اور امور معاد پر غور کرے"

سرسید نے انسان کی فطری خوبی کے قائل ہونے کے باوجود اس بات پر بار بار زور دیا ہے کہ انسانی خوبیوں اور صلاحیتوں کا اظہار صرف تعلیم کے ذریعے ہی ممکن ہے۔ فرد کے سلسلے میں تعلیم کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیتے ہوئے سرسید جب اپنے نظریہ کو اجتماعی حالت کی پرکھ کی کسوٹی بناتے ہیں تو ان کا ذہنی و جذباتی کرب اور بڑھ جاتا ہے۔ لیکن اس کرب کے نتیجے میں وہ بے عملی یا معذوری کے شکار نہیں بنتے۔ اسلئے ان کے دل میں اجتماعی سطح پر تعلیم پھیلانے کی ایک امنگ پیدا ہوتی ہے ــــــ پوری قوم کی حالت بدل ڈالنے کی آرزو انگڑائی لیتی ہے اور غم اور دکھ کی راکھ سے وہ چنگاریاں اٹھتی ہیں جو تعلیم کے فروغ کا شعلہ بننا چاہتی ہیں :

"مجھ کو اس بات کا رنج ہے کہ میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں، پر ناشائستہ، ان میں نہایت دلیری اور جرات پاتا ہوں پر خوفناک، ان میں نہایت قوی استقلال پاتا ہوں، پر بے ڈھنگا ـــــــــــ پس میرا دل

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر، ۱۹۹۳ء

جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاویں تو دین اور دنیا دونوں کے لئے کیسی مفید ہوں۔"

معاصر قومی و بین الاقوامی صورت حال میں سرسید کی اس تمنا کا جواز بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

یہ حقیقت بار بار ثابت ہو رہی ہے کہ انقلاب کوئی انجکشن نہیں۔ ایسا جادو یا دوا نہیں جسے باہر سے انسان کے جسم میں داخل کر دیا جائے اور اس کے من کی دنیا تبدیل کر دی جائے۔ باہر کی چیزوں میں فیصلہ کن تبدیلیاں کر دینے کے باوجود اگر من کی دنیا کو تبدیل کرنے میں سستی یا کوتاہی برتی جائے تو کئی کئی دہائیوں کی کوششیں رائگاں چلی جاتی ہے۔ انقلاب اور اس کی بقا کے لئے اس کے تناظر، تشکیلات اور اغراض و مقاصد کی تعلیم لازمی ہے۔ سرسید کے نقطۂ نظر کے مطابق تعلیم انسانی وجود میں خود کار تبدیلیاں پیدا کر کے انقلاب کی راہ ہموار کرتی ہے۔ وہ انسان سے کوئی بات تسلیم نہیں کراتی، اس کے لئے بذات خود نتائج پر پہنچنے کا وسیلہ بنتی ہے:

"انسان کو تعلیم دینا در حقیقت کسی چیز کا باہر سے اس میں ڈالنا نہیں بلکہ اس کے دل کے سوتوں کو کھولنا اور اس کے اندر سربی چشمہ کے پانی کو باہر نکالنا ہے جو صرف اندرونی قوت کو حرکت میں لانے اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا ہے۔"

سرسید کا کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اجتماعی انقلاب کی کاوشیں کیں۔ فرد کی اہمیت سے واقف ہوتے ہوئے انہوں نے تزکیۂ نفس، عرفان ذات اور فرد کی اصلاح کی نظریاتی تشکیلوں سے خود کو جدا رکھا ـــــ اور تعلیم کو عظیم اجتماعی مقاصد کے حصول کا آلہ قرار دیا۔ یہ بات بڑی اہمیت رکھتی ہے کہ سرسید اجتماعی تبدیلیوں کو فرد کی صلاحیتیں اجاگر کرنے کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ اسی مقصد کے حصول کے لئے انہوں نے علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کیا۔ سرسید نے ذہنی و نظریاتی تبدیلیوں کے ساتھ اس تعلیمی ادارے کو معاشی تقاضے پورے کرنے کا ذریعہ بنانے کا بھی خواب دیکھا۔ وہ تعلیم ہی نہیں روزگار میں بھی بڑے بڑے انسانی گروہوں کے خود کفیل ہو جانے کو بڑی اہمیت دیتے تھے۔ ملازمت کو مطمح نظر بنانے کے بجائے انہوں نے علوم و فنون کی تعلیم اور اس تعلیم کے فروغ پر زور دیا۔ سرسید ایک منطقی ذہن کے مالک تھے۔ وہ کوئی بھی کام بلا جواز نہیں کرتے تھے۔ سرکاری تعلیمی ادارے موجود ہونے کے باوجود، مدرسۃ العلوم کے قیام کا سبب انفرادی صلاحیتوں کی جلا، اجتماعی، ذہنی و فکری انقلاب اور معاشی خود کفالت کا تصور تھا۔ وہ ہر نکتہ چینی کا مدلل جواب دیتے تھے۔ مدرسۃ العلوم کے قیام کی اسکیم پر نکتہ چینی کے جواب میں تقریباً سوا سو سال قبل سرسید نے تعلیم کے اغراض و مقاصد کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، حکومت ہند اور یونیورسٹی گرانٹس کمیشن اس کے ایک جزو کی طرف آزادی کے سینتالیس سال بعد متوجہ ہو رہے ہیں:

"جناب من آپ نے مقصد مدرسۃ العلوم پر غور نہیں فرمایا۔ اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان علوم و فنون میں ایسی تعلیم پاجاویں کہ بلاذریعہ نوکری، خود اپنی قوت بازو سے اپنی معاش پیدا کریں اور چونکہ مدارس سرکاری میں بجز نوکری پیشہ بننے کے یہ بات حاصل نہیں ہوتی اس لئے مستقل مدرسہ قائم کرنے کی ضرورت پیش آئی۔"

انقلاب کے لئے تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ سرسید کے نظام فکر میں تعلیم و تربیت لازم و ملزوم ہیں۔ تعلیم ان کے یہاں ڈگری کے بھی مترادف نہیں۔ وہ ڈگری کے حصول کے بجائے تربیت حاصل کرنے

کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں :

"اے دوستو مجھ کو یہ بات کچھ زیادہ خوش کرنے والی نہیں ہے کہ کسی مسلمان نے بی ۔اے یا ایم ۔اے کی ڈگری حاصل کرلی ہے ۔میری خوشی قوم کو قوم بنانے کی ہے۔"

سر سید نے زور دے کر کہا ہے کہ اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر لینے کے بعد بھی آدمی انسان نہیں بن سکتا، اگر اس کی تربیت میں کمی رہ گئی ہو۔ صرف کتابیں پڑھنا اور تربیت سے بے بہرہ رہ جانا، کتابیں لادنے کے مترادف ہے :

"پڑھنا لکھنا آجانے سے اور منطقی یا فلسفی ہوجانے سے کامل تربیت خیال نہ کرلینی چاہئے۔۔۔۔صرف پڑھ لکھ لینے سے تربیت کامل نہیں ہوجاتی۔"

مدرستہ العلوم اور پھر ایم ۔اے ۔او کالج کو اقامتی درسگاہ بنانے سے سرسید کی غرض یہی تھی۔۔۔۔۔تعلیم کے ساتھ تربیت ۔اس طرح وہ نوجوانوں کو ایک مکمل انسان بننے کی راہ پر چلانا چاہتے تھے۔ صرف کتاب خوانی ان کے نقطۂ نظر کے مطابق کسی کام کی نہیں ہوتی:

"اگر میری رائے غلط نہ ہو تو نری تعلیم کسی کام کی نہیں جب تک اس کے ساتھ تربیت نہ ہو۔"

آخر میں یہ بات کہ اس تعلیم و تربیت میں سرسید کے خیال میں مادری زبان بڑی اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ ذہنی انقلاب صرف اسی کے ذریعے ممکن ہوتا ہے۔ سرسید کے زمانے کی طرح یہ مسئلہ آج بھی لاینحل ہے کہ اپنی تہذیبی خو و بو برقرار رکھتے ہوئے سائنس اور ٹیکنولوجی کی جدید سے جدید تر برکتوں سے کیسے فائدہ اٹھایا جائے ؟ روشن خیالی کو کیسے فروغ بخشا جائے؟ انگریزی اور ہندوستانی زبانوں کے مابین تعلیم سمیت زندگی کے ہر شعبہ میں استعمال کی کشمکش اب ایک ایسے مرحلے میں داخل ہو چکی ہے کہ ہندوستانی زبانوں کی فیصلہ کن فتح صاف نظر آرہی ہے ۔ایسے میں سرسید کے خواب و خیال کی تحسین اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی حقیقتوں کا احتساب کرتے ہوئے، ان کے انقلاب بذریعہ تعلیم کے تصور کو مزید معنویت بخشنے کی خاطر کیوں نہ اردو کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں ذریعہ تعلیم بنانے کے انقلابی امکان پر بھی غور کیا جائے؟

ڈاکٹر حامدہ مسعود *

فکرِ سرسیّد کے دو اہم پہلو

اقبال کے نزدیک آئینِ نو سے ڈرنا اور طرزِ کہن پر اڑنا قوموں کی زندگی میں کٹھن منزل ہوتی ہے۔ مگر سرسید اس دشوار رہگذر سے جس مردانہ وار انداز سے گذرے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ انھوں نے قوم کے درخشاں ماضی کی حکایات سنی تھیں اور اس کی موجودہ زبوں حالی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا جس نے ان کے نکتہ چین ذہن پر تازیانہ کا کام کیا اور ان کی جرأت عمل اور مستقبل شناسی نے پھیلی ہوئی تاریکی اور مایوسی کے عالم میں امید کی قندیل روشن کی اگر ایک طرف فطری جذبہ تجسس و تحقیق نے انھیں قومی سرمایہ اور ماضی کی نشانیاں کھنگالنے پر اکسایا تو دوسری طرف ذوقِ عمل نے روشن مستقبل کی سمت اور شاہراہ متعین کی۔ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ ان کے فکری سفر کا آغاز دردمندانہ تحقیق و اجتہاد سے شروع ہو کر مجدّد کی جرأت اور بصیرت پر تمام ہوا۔

یہ بات محض اتفاق قرار نہیں دی جا سکتی کہ سرسید کی اولین تصنیفات قوانین ضابطہ ہندی کو چھوڑ کر تاریخ ہند سے متعلق تھیں۔ تاریخ فیروز شاہی کا شمار تو تدوین و تالیف میں ہوگا۔ لیکن ان کی معرکۃ الارا تصنیف آثار الصنادید جس کا پہلا ایڈیشن ۱۸۴۷ء میں تیار ہوا وہ ان کی معلومات، مطالعہ اور تحقیقی میلان کا بیّن ثبوت ہے۔ یہ دلی کے حکمرانوں، اس کی مشہور عمارات اور انیسویں صدی کی معروف شخصیات کی ایک قابل قدر دستاویز ہے۔ آج تاریخ نگاری کا فن بڑی ترقی کر چکا ہے۔ اور اس میں نئے زاویے اور مکاتیب فکر شامل ہوئے ہیں۔ تاہم سرسید کا پیش کردہ تحقیق و جستجو کا معیار آج بھی معتبر ہے۔ انھوں نے آثار قدیمہ پر لکھے ہوئے کتبوں کی نقل و تشریح میں جس غیر معمولی ذہنی کاوش کا ثبوت دیا وہ تحقیقی لگن کی حیرت انگیز مثال ہے۔ حالی نے حیات جاوید میں سرسید کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ "قطب صاحب کی لاٹھ کے بعضے کتبے جو زیادہ بلند ہونے کے سبب پڑھے نہ جا سکتے ان کو پڑھنے کو ایک چھینکا دو بلیوں کے بیچ میں ہر ایک کتبے کے محاذی بندھوا لیا جاتا تھا۔ اور میں خود اوپر چڑھ کر اور چھینکے میں بیٹھ کر ہر کتبے کا چربا اتارتا تھا۔ جس وقت میں چھینکے میں بیٹھتا تھا تو مولانا صہبائی

* سابق ریڈر، ویمنس کالج، علیگڑھ مسلم یونیورسٹی، علیگڑھ

فرط محبت کے سبب بہت گھبراتے تھے۔ اور خوف کے مارے ان کا رنگ متغیر ہو جاتا تھا۔" اس طرح وہ گھنٹوں کتبات کے چربے اور برجوں کے نقشے اتارا کرتے تھے۔ اور بعض وقت کئی کئی دن اپنے مستقر سے غیر حاضر رہتے تھے۔ اس محنت شاقہ کا محرک شہرت طلبی کا جذبہ یا تاریخ نویس کی حیثیت سے خود نمائی کی خواہش نہیں تھی۔ بلکہ اپنے قومی ورثہ کے ان روشن میناروں کو تاریخ کے اوراق میں محفوظ کر لینے کا عزم تھا جو وقت کی دست برد اور وارثوں کی بے توفیقی اور بے اعتنائی کے سبب کھنڈر بنتے جا رہے تھے۔ اور ایک طرح سے یہ نہایت پیش بینی کا کام ثابت ہوا۔ کیونکہ آثار الصنادید کی تصنیف کے دس سال بعد ۱۸۵۷ء کی قیامت صغریٰ میں بعض عمارتیں صفحہ ہستی سے ہی معدوم ہو گئیں۔ کون جانے کہ سرسید آنے والے کل کا نوشتہ تقدیر پڑھ رہے تھے۔ چنانچہ وہ ایک مٹتی ہوئی تہذیب کو تحریر اور تصویر میں محفوظ کر گئے۔ آثار الصنادید کی فراہم کردہ معلومات میں آگے چل کر اضافہ ہوا ہے۔ تاہم اس کی مسابقت، تحقیق و جستجو کی روایت اور مصنف کے اپنے تہذیبی اور تاریخی سرمائے سے اٹوٹ محبت سے انکار نہیں کیا جا سکتا چنانچہ سرسید نے اپنے ایک لکچر میں کہا تھا۔

کسی قوم کے لیے اس سے زیادہ بے عزتی نہیں کہ وہ اپنی قوم کی تاریخ کو بھول جائے اور اپنے بزرگوں کی کمائی کھودے

(مجموعہ لکچر ص ۱۴۴)

اس قومی محبت، پیش بینی اور رجائیت کا اظہار ان کی تقریروں اور مضامین میں جا بجا ملتا ہے۔ غدر ۱۸۵۸ء کے صرف چند سال بعد ہی غازی پور میں وکٹوریہ اسکول کے افتتاح کے موقع پر تقریر میں انھوں نے بڑی بے باکی سے کہا تھا "میری اس پیشن گوئی کو بھی یاد رکھو کہ وہ دن دور نہیں کہ ہر ضلع میں سے ایک شخص کا کاونسل میں حاضر ہونا ضروری ہو گا۔ وہ دن آویگا کہ تم خود قانون بناؤ گے اور خود ہی اس پر عمل کرو گے۔ صرف ایک چیز چاہیئے یعنی تربیت اور لیاقت۔"

(مجموعہ لیکچر ص ۲۰)

سرسید کے مخالفین نے انھیں انگریزوں کا حشو، مغرب کا مقلد اور مذہب اسلام کا دشمن کہا ہے۔ وہ سرکار انگریزی کے ملازم تھے۔ غدر ۵۷ء میں انھوں نے بہت سے انگریزوں کو جان پر کھیل بچایا۔ لیکن جب اس کے صلہ میں سادات جہاں آباد کی ضبط شدہ جاگیر داری تجویز ہوئی تو انھوں نے اسے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ انھوں نے جس بے باکانہ انداز سے رسالہ اسباب بغاوت ہند لکھا وہ حکومت کے بے ضمیر سپاس گذار کا نہیں ہو سکتا۔ مغرب کی ترقی اور سر بلندی کے اسباب کو سمجھنے اور ان خوبیوں کو اپنانے کی انھوں نے سفارش ضرور کی۔ تاہم تقلید نہیں تھی۔ اس کی مثال علی گڑھ میں مشرق و مغرب کے امتزاج کی شکل میں نمودار ہوئی۔ انھوں نے مذہب میں اجتہاد عصری تقاضوں کے احساس کا صور ضرور پھونکا جو اس کی بنیادوں کو مضبوط بنانے کے لئے تھا۔ جب ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ ذرا مدھم پڑا۔ تو انگریز حاکموں کی جانب سے اس کی پوری ذمہ داری مسلمانوں کی فتنہ پردازی پر ڈالی گئی اور اس کی پاداش میں انھیں چن چن کر جبر و استعداد کا نشانہ بنا دیا گیا۔ صاحبان علم و فن کی عزت و ناموس خاک میں مل گئی۔ اور معاشی طور پر مسلمان مفلوج ہو کر رہ گئے۔ ہر چند کہ ملکہ وکٹوریہ کے اعلان معافی نے کچھ ہمت بندھائی۔ لیکن مسلمانوں کی حمایت اور غدر کے اسباب کی صحیح وضاحت کی ہمت کسی میں نہیں تھی۔ اس وقت سرسید وکیل بن کر سامنے آئے۔ وہ اسباب بغاوت ہند کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

مگر ان فسادات کے اصل سببوں کا بیان کرنا میں ایک عمدہ خیر خواہی اپنی گورنمنٹ کی سمجھتا ہوں۔ اس لئے مجھ پر واجب ہے

کہ گویا ان کا علاج بخوبی ہو گیا ہو پھر بھی جو سبب میرے دل میں ہیں ان کو بھی ظاہر کردوں۔ سچ ہے کہ بہت بڑے بڑے دانا اور تجربہ کار لوگوں نے اس بغاوت کے سبب لکھے ہیں۔ مگر امید ہے کہ شاید کسی ہندوستانی آدمی نے اس میں کوئی بات نہ لکھی ہو۔ بہتر ہے کہ ایسے شخص کی بھی رائے رہے۔

(رسالہ اسباب بغاوت ہند مرتبہ فوق کریمی ص ۸۳-۸۴)

اس کے بعد سرسید جس مدلل اور محققانہ انداز سے ہندوستانیوں کی بغاوت کے اسباب کی نشاندہی کرتے ہیں وہ اجتہادی تجزیہ کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ پہلے انھوں نے سرکشی اور بغاوت کے معنی اور مثالیں پیش کی ہیں۔ بعد ازاں وہ ان غلط فہمیوں کو دور کرتے ہیں۔ جو علماء (بالخصوص مولوی محمد اسمٰعیل شہید)، بہادر شاہ ظفر اور روس و ایران کی مبینہ سازش سے متعلق تھیں۔ وہ نہایت جرات کے ساتھ سیاسی و اقتصادی اسباب اور حکام کی غلط رویہ پر تنقید کرتے تھے۔ مثلاً حکام مشنری پادریوں کو نہ صرف پیسے اور کتابیں دیتے تھے بلکہ اپنے ماتحتوں کو یہ حکم بھی تھا کہ ان کی کوٹھی پر آ کر پادری صاحب کا وعظ سنیں۔

اور بعض ضلعوں میں یہ رواج نکلا کہ پادری صاحب کے ساتھ تھانہ کا ایک چپراسی جانے لگا۔ اور پادری صاحبان دوسروں کے مقدس لوگوں کو اور مقدس مقاموں کو بہت برائی سے اور ہتک سے یاد کرتے تھے۔

(اسباب بغاوت ہند ۱۰۵)

ستم بالائے ستم یہ کہ پادریوں کی طرف سے کچھ ایسے بھی اشارے ملے کہ پورے ہندوستان میں صرف ایک مذہب یعنی عیسائی مذہب ہوگا۔ اسی طرح حکام اضلاع کی رعایا کے حالات سے مطلق ناواقفیت، حکما مسلمانوں پر روزگار کے دروازے تقریباً بند ہونا اور عمال کا ہندوستانیوں کی بے توقیری کرنا دوسرے بڑے بڑے اسباب ہیں۔ اس ضمن میں سرسید لکھتے ہیں۔

"گو وہ ہمارے بعض حکام کے ناگوار طبع ہوں۔ مگر ہم کو کچھ لکھنا اور دل کھول کر کہنا ضرور ہے۔ یہ وہ بات ہے ہم کہتے ہیں کہ جس سے جنگلی وحشی جانور دام میں آتے ہیں۔ درندے رام ہوتے ہیں۔ انسان کی تو کیا حقیقت ہے۔ کیا لارڈ بیکن/اسپنسر کافی نہیں کہ ہم اس مقام پر دوستی اور محبت اور ربط اور اتحاد کے فائدے بیان کریں۔ ہاں اتنی بات بیان کرنی ضروری ہے کہ آپس کی محبت اور ہمسایہ کی دوستی سے گورنمنٹ اور رعایا کی محبت بہت بڑھ کر ہے۔ دوست کو ایک شخص سے دوستی کرنی پڑتی ہے اور گورنمنٹ کو اپنی تمام رعایا سے"

(اسباب بغاوت ہند ص ۳۷)

یہ انداز استدلال ایک متوازن ذہن کا ہی ہو سکتا ہے۔ گورنمنٹ کے کسی مودب فدوی ملازم کا نہیں۔ نئی تحقیق اور اضافی معلومات کی روشنی میں سرسید کے تجزیے میں ترمیم ممکن ہے۔ ان کی بعض رایوں سے اختلاف بھی کیا جا سکتا ہے۔ (مثلاً عورتوں کی قانونی خود مختاری بہ طور ایک سبب کے) لیکن ان بیشتر نکات اجتہادی شان رکھتے ہیں۔ اور موجودہ جمہوری دور میں بھی اہل اقتدار، عوام اور اقلیتوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

سرسید کو مقلد کہنا ستم ظریفی اور ناانصافی ہے۔ دراصل وہ ہر اچھی چیز کو اپنانے اور اس سے استفادہ کے قائل تھے۔ انھوں نے سائنس اور ٹیکنالوجی کے باعث اہل مغرب کو ترقی یافتہ پایا اور ان کی اصول پسندی، احساس ذمہ داری اور پابندی وقت کا ذاتی مشاہدہ کیا۔ ان خوبیوں کو وہ ترقی کی ضمانت سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے بار بار اس کا تذکرہ کیا۔ غدر کے بعد انگریزوں سے نفرت مسلمانوں میں عام تھی۔ یہاں تک کہ اشراف اور اہل شرع ان سے ہاتھ ملانے میں کراہیت محسوس کرتے۔

اور اگر ناچار مصافحہ کرنا ہی پڑ جائے تو اولین موقعہ پر ہاتھوں کو پاک کرتے ۔ان کے ساتھ بیٹھ کر کھانے اور ان کی طرز کے کھانے کو ناجائز قرار دیتے ۔ سر سید کی تحقیق کے مطابق شرع میں اس کا جواز نہیں تھا۔ حکمت بھی یہ بتاتی تھی کہ ایسا نہیں ہونا چاہیے ۔ چنانچہ انھوں نے چند رسائل اس بارے میں لکھے ۔ مستقبل نے ان کے اس مجتہدانہ شعور اور جرات کی تائید کی۔ تبئین الکلام میں سر سید نے بائیبل کی توضیح و تفسیر میں بھی اپنی اجتہادی صلاحیتوں کا بڑے اعتماد سے اظہار کیا۔ روایتی علمائے اسلام نے اس کو قابل اعتراض گردانا۔ مگر اس مخالفت میں ذہنی جمود اور روایت پرستی کا زیادہ دخل تھا۔ آج ہر طرف INTER FAITH (بین المذاہب) افہام و تفہیم کا چرچہ ہے ۔ ہندوستان کے ماحول میں سر سید کی یہ کوشش شاید وقت سے پہلے تھی ۔ مگر اس سے ان کی اجتہادی فکر کا پتہ ضرور چلتا ہے ۔ اسی طرح ان کی تفسیر قرآن نے تہلکہ مچایا ۔ اس کے دلائل براہین بہتوں کو ملحدانہ اور نیچری نظر آئے ۔ جنہ کے وجود اور معراج نبی کے متعلق ان کی تشریحات آج بھی مستند علماء مسترد کر دینگے ۔ لیکن یہ ماننا پڑے گا کہ تفہیم قرآن کو نئے ذہن کے لیے آسان بنانے اور اس پر جدید علم کی روشنی میں گفتگو کرنے کی راہ انھوں نے دکھائی ۔ سر سید کے اخذ کردہ نتائج سے اختلاف ممکن ہے ۔ مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ان کا انداز فکر اجتہادی اسپرٹ اور تجدد و تفہیم سے ہم کنار ہے ۔ اگر ان کی ذہنی فکر ہمارے لئے ناقابل قبول بھی ہو ۔ تب بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ مذہبی امور پر ان کے مباحث اور رشحات ہمارے سامنے آئیں ۔ تا کہ ان پر کھل کر تنقیدی نظر ڈالی جاسکے ۔ دین کوئی نازک بلور نہیں کہ وہ ذرا سی ٹھیس سے چکنا چور ہو جائے ۔

سر سید کی مجتہدانہ جرات کا اظہار ان کی مذہبی اور غیر مذہبی تصانیف دونوں ہی دائروں میں ہوا ہے ۔ وہ آزادی رائے کی بڑی قدر کرتے تھے ۔ اور اسے انسان کا بنیادی حق تصور کرتے تھے ۔ چنانچہ وہ اپنے مقالے میں رقم طراز ہیں :

> "راؤں کا بند رہنا خواہ بہ سبب کسی مذہبی خوف کے اور خواہ بہ سبب اندیشہ برادری اور قوم کے اور خواہ بدنامی کے ڈر سے اور یا گورنمنٹ کے ظلم سے نہایت بری چیز ہے ۔ راؤں کے بند رہنے سے تمام انسانوں کو نقصان پہنچتا ہے ۔ اور نہ صرف موجودہ انسانوں کو بلکہ ان کو بھی جو آئندہ پیدا ہونگے ۔"

(مقالات سر سید ص ۱۵۱)

سر سید اپنے قول کے عامل تھے ۔ چنانچہ مذہبی کتب کے علاوہ انھوں نے اپنے تقریباً ہر مضمون میں اسی بے باکی سے رائے کا اظہار کیا ہے ۔ جس کے وہ مدعی تھے ۔ اس کا سب سے اہم عملی نمونہ M.A.O کالج کا قیام ہے ۔ ہر طرف سے مخالفتوں کی یلغار کے باوجود وہ اپنے تعلیمی منصوبہ پر اٹل رہے اور بالآخر اسے عملی شکل دی ۔ ان کی یہ جرات عمل آج بھی ہمارے لئے مشعل راہ ہے ۔

عام طور سے صاحب عمل مخالفت و تردید کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ مگر بعض اوقات اس سے اغماز ممکن نہیں ہوتا چنانچہ سر سید نے بھی اکثر ذاتی مخالفتوں کو فراموش کیا ۔ لیکن جب حملہ ملی مفاد پر ہوا تو وہ دنداں شکن جواب دینے سے باز نہ رہے ۔ اس ضمن میں ان کے خطبات احمدیہ کا ذکر بھی ضروری ہے ۔ جب سر ولیم میور کی دل آزار اور بہتان پر مبنی کتاب لائف آف محمد شائع ہوئی تو بہ قول سر سید ان کا دل جل جل کر کباب ہو گیا ۔ یہ ایک ملی تازیانہ تھا ۔ انھوں نے طے کیا کہ وہ اس کتاب کا مدلل اور محققانہ جواب لکھیں گے ۔ وہ قرض لے کر اور ذاتی اثاثہ فروخت کر کے انگلستان پہونچے تا کہ وہاں کے مواخذ سے استفادہ

باقی صفحہ ۸۹ پر

پروفیسر محمد شریف خاں *

سرسیّد کے تعلیمی افکار

بنیادی طور پر سر سید احمد خاں ایک سوشل رفارمر تھے مگر چونکہ سوشل رفارم میں تعلیم کا اہم رول ہوتا ہے اس لئے انھوں نے تعلیم میں اتنا اعلیٰ مقام حاصل کیا کہ ان کو ماہر تعلیم کہنا بے جا نہ ہو گا۔ لیکن صرف ماہر تعلیم کہنا بھی سر سید احمد خاں کے ساتھ ناانصافی ہو گی کیونکہ بہ یک وقت انھوں نے مسلمانوں کی بہبودی کے لئے اتنے کام کئے ہیں کہ کسی گوشہ کو انھوں نے چھوڑا نہیں۔ حقیقت میں جو کام تنظیمیں اور ادارے کرتے ہیں وہ انھوں نے خود کیے۔

جہاں تک ان کے تعلیمی خیالات کا تعلق ہے اس کا اظہار انھوں نے کسی ایک تصنیف میں نہیں کیا ہے بلکہ ان کی مختلف تصانیف، تقریروں اور کارگزاریوں سے ان کے تعلیمی خیالات کا اندازہ ہوتا ہے اگر ہم ذریعہ تعلیم پر غور کریں تو بظاہر ان کے خیالات میں تضاد نظر آتا ہے۔

"ابتدا تو وہ مادری زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے کے حق میں تھے اور بڑی شد و مد سے اس کی وکالت کرتے تھے جب یہ خیال ان کے دل میں راسخ ہو گیا کہ انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنائے بغیر چارہ نہیں تو انھوں نے اتنی ہی شدت سے اس کی موافقت میں اظہار خیال کیا"۔(۱)

"غرض یہ کہ سر سید پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ ہندوستانیوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ وہ جدید علوم انگریزی زبان کے ذریعہ حاصل کریں آخر کار اس رائے میں اتنی شدت پیدا ہو گئی کہ ۱۸۸۱ء میں جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ حکومت برطانیہ مشرقی علوم کی تعلیم کے لئے پنجاب یونیورسٹی کالج قائم کرنا چاہتی ہے تو انھیں یہ شبہ ہوا کہ حکومت ہندوستانیوں کو جدید تعلیم سے محروم رکھنا چاہتی ہے انھوں نے تہذیب الاخلاق میں کئی مضمون پے در پے اس کی مخالفت میں لکھے اور اسے مسلمانوں کے لئے "ایک جال" بتایا۔ اسی سلسلہ کے ایک مضمون میں لکھتے ہیں: "یہ خیال بہت پرانا ہے کہ اگر ہماری تعلیم ہماری زبان میں ہو تو ہمارے لیے اور ملک کی ترقی کے لیے زیادہ تر مفید ہے۔"(۲)

بظاہر ان کے خیالات میں تضاد نظر آتا ہے کہ کبھی وہ مادری زبان کی تائید کرتے ہیں اور کبھی انگریزی ذریعہ تعلیم کی شدت سے موافقت کرتے ہیں لیکن یہ مسئلہ تضاد کا مظہر نہیں ہے کیونکہ جب ابتدا میں انھوں نے تعلیم کے لئے زور دیا تو

* شعبہ تعلیم، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

وہ ابتدائی تعلیم سے متعلق تھا لیکن جب مسلمانوں نے تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی تو ان کو اندازہ ہوا کہ ترقی کرنے کے لئے اسکولی تعلیم کافی نہیں ہے اس کے لئے اعلیٰ تعلیم بھی ضروری ہے اور اس زمانہ میں اعلیٰ تعلیم صرف انگریزی زبان کے ذریعہ ہی ممکن تھی اس لئے انھوں نے انگریزی زبان کو ذریعہ تعلیم بنانے پر زور دینا شروع کر دیا۔ اسی لئے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ سرسید احمد خاں اعلیٰ تعلیم کے لئے انگریزی ذریعہ تعلیم کے حامی تھے مگر اسکولی تعلیم کو مادری زبان کے ذریعہ تعلیم دینے کے موافق تھے۔

اب ہم مواد تعلیم پر غور کریں تو خود انگریزوں میں اس پر اختلاف رائے تھا کہ ہندوستانیوں کو انھیں کے مشرقی علوم کی تعلیم دی جائے یا ان کو مغربی علوم سے روشناس کرایا جائے۔ اس وقت دو تعلیمی دستاویز تیار کئے گئے ایک کا نام میکالے کی منٹس" اور دوسرے کا نام "ووڈ کا ڈیچ" تھا۔ پہلے دستاویز میں مغربی علوم کی افادیت پر زور دیا گیا اور مشرقی علوم خصوصاً ہندوستانی علوم کی تذلیل کی گئی۔ میکالے کا خیال تھا کہ ہندوستان اور عرب ممالک میں جو قومی ادب ہے اسکی حیثیت کسی یوروپین لائبریری کی ایک الماری میں جتنا علم موجود ہے اس کے برابر ہے۔ اس کے مقابل "جیمس مل" جنھوں نے "ووڈ کا ڈیچ" تیار کرنے میں اہم رول ادا کیا تھا، کا خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو تعلیم انھیں کے مشرقی علوم کی دی جائے۔ آخر کار فتح لارڈ میکالے کی ہوئی۔ سرسید احمد خاں نے بھی اس بات کا اندازہ لگایا تھا کہ اگر مسلمانوں نے حکومت کی پالیسی سے اختلاف کیا تو وہ برادران وطن سے بہت پیچھے رہ جائیں گے اس لئے انھوں نے بھی اسی پر زور دیا تھا کہ مسلمانوں کو یورپی علوم میں مہارت حاصل کرنی چاہیے اگر وہ ایسا نہ کرتے تو مسلمانوں کو حکومت میں کوئی حیثیت حاصل نہ ہوتی اور ملک کا سارا نظم و نسق ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہوتا جو مسلمانوں کے مفاد کے خلاف کام کرتے اور اس طرح مسلمان ہندوستان میں ایک پس ماندہ طبقہ بن کر رہ جاتے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ سرسید احمد خاں نے جس خطرے کے تحت مسلمانوں کو یورپی علوم کی تعلیم کے لئے راغب کیا وہ خطرہ ان کی کوششوں کے باوجود بھی باقی رہا اور مسلمان اس وقت پسماندہ طبقہ میں شمار ہوتے ہیں لیکن اگر سرسید احمد خاں نے مسلمانوں کو مغربی علوم کی طرف راغب نہ کیا ہوتا تو خدا جانے مسلمانوں کی کیا حالت ہوتی۔

موجودہ نظام تعلیم میں اس پر بھی زور دیا جاتا ہے کہ تمام طلبہ کو یکساں تعلیم نہیں دی جا سکتی کیونکہ انفرادی اختلافات اس قدر زیادہ ہیں کہ اگر ممکن ہو تو ہر شخص کو علحدہ علحدہ تعلیم دی جائے۔ سرسید احمد خاں نے اس اصول کو بہت پہلے سمجھ لیا تھا اس لئے انھوں نے مدرستہ العلوم کو تین حصوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ بنایا تھا تاکہ تین قسم کے طلبہ کی ضروریات کو پورا کیا جا سکے۔ پہلے حصہ کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ اس میں تمام یوروپین علوم پڑھائے جائیں گے اور ان کا ذریعہ تعلیم انگریزی ہوگا۔ اس حصہ سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ جب عملی زندگی میں داخل ہوں گے تو سرکاری ملازمت حاصل کریں گے انگریزوں سے قریبی تعلقات رکھیں گے اور مسلمانوں میں سائنس اور ٹیکنولوجی کی تعلیم کو فروغ دیں گے۔ دوسرے حصہ میں یوروپین علوم ضرور پڑھائے جائیں گے۔ مگر ان کی تعلیم اردو زبان کے ذریعہ ہوگی۔ اس حصہ سے ان کا مقصد تھا کہ مسلمانوں میں ایسا طبقہ پیدا ہو جو یوروپین علوم سے واقف ہو مگر وہ اس کو اردو زبان میں منتقل کرے تاکہ مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے کے جو فائدے ہوتے ہیں ان سے وہ خود بھی مستفید ہوں اور آئندہ آنے والی نسلوں کو بھی اس سے فائدہ اٹھانے کا موقع ملے۔ تیسرے حصہ میں وہ مشرقی علوم پڑھانا چاہتے تھے تاکہ مشرقی علوم بھی ترقی کر سکیں اور مسلمانوں

کا عربی اور فارسی زبانوں سے جو تعلق تھا وہ برقرار رہ سکے اور آئندہ بھی ایسے مسلمان تیار ہوں جو اس سرمایہ کو انگریزی اور اردو زبان میں ترجمہ کر سکیں۔ سر سید احمد خاں کا یہ تعلیمی نظریہ بہت وسیع تھا کیونکہ یہ مسلمانوں کے مختلف طبقوں اور افراد کی ضرورت کو پورا کرتا تھا۔ اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان تینوں حصوں کو فروغ دیتی تو مسلمانوں کی تعلیمی حالت بہت بہتر ہوتی اور آج ہندوستان میں مسلمان تعلیمی طور سے پس ماندہ تصور نہ کیے جاتے۔

ایک اور تعلیمی مسئلہ تعلیم نسواں کا تھا ایک الزام یہ ہے کہ سر سید احمد خاں نے صرف لڑکوں کی تعلیم کی طرف توجہ دی اور لڑکیوں کی تعلیم کے لئے کوئی خاطر خواہ کام نہیں کیا اگر اس الزام پر ماضی کے حالات کو فراموش کر کے غور کیا جائے تو سر سید احمد خاں ضرور قصوروار تصور کیے جانے چاہئیں۔ کیونکہ لڑکی کی تعلیم لڑکے کی تعلیم سے زیادہ اہم ہے لڑکے کو تعلیم دیں تو صرف فرد کی تعلیم ہوتی ہے مگر لڑکی کو تعلیم دیں تو خاندان کی تعلیم ہوتی ہے ۔لیکن اگر ماضی پر غور کر کے فیصلہ کیا جائے تو سر سید احمد خاں کا فیصلہ دانشمندانہ تھا۔ جس قوم نے ان کو لڑکوں میں انگریزی تعلیم کے فروغ کی اتنا بڑا جرم جانا تھا کہ ان پر کفر کے فتوے لگادیئے وہ اگر لڑکیوں میں انگریزی تعلیم کی کوئی کوشش کرتے تو نہ جانے ان کا کیا حشر ہوتا۔ اور اگر وہ لڑکیوں کو مشرقی علوم کی طرف راغب کرتے تو ان پر تفریق کرنے کا الزام لگتا۔ اس کے علاوہ ان کے وسائل محدود تھے اگر وہ اپنی صلاحیتوں اور وسائل کو لڑکے اور لڑکیوں دونوں کی تعلیم پر صرف کرتے تو دونوں کا بھلا نہ ہوتا۔ ہاں اگر انھوں نے کبھی کوئی ایسا مضمون لکھا ہوتا یا کوئی ایسی تقریر کی ہوتی جس میں تعلیم نسواں کی مخالفت کی ہوتی تو یہ سوچا جاسکتا تھا کہ وہ تعلیم نسواں کے حق میں نہ تھے مگر راقم الحروف کو ایسی کسی تقریر یا تحریر کا علم نہیں ہے۔ ایک اور مسئلہ پس ماندہ طبقہ کی تعلیم سے متعلق ہے کچھ حضرات نے سر سید کے اس رویہ کو ناقص قرار دیا ہے جو انھوں نے پس ماندہ طبقہ کی تعلیم کی طرف اپنایا۔ اور اس کی بنیاد انھوں نے ایجوکیشن کمیشن کے ایک سوال نامہ کے سر سید کے جواب کو بتایا ہے جس میں وہ صرف اس سوال کا جواب نہیں دیتے کہ آیا ہندوستان کے مزدور پیشہ لوگ اس بات کا فیصلہ کر سکتے ہیں کہ جو تعلیم سرکاری مدرسوں میں دی جاتی ہے وہ ان کے بچوں کے لیے مناسب ہے یا نہیں، مگر سید طفیل احمد منگلوری اس سے اتفاق نہیں کرتے ہیں اور وہ لکھتے ہیں :

"جس وقت اولاد کی تربیت کا ذکر آتا ہے تو رئیسوں اور دولت مندوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم اپنی اولاد کی تعلیم خاص اپنے اہتمام سے اور ہر ایک علم کے عالم نوکر رکھ کر بخوبی کر سکتے ہیں بعضوں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہم کو اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کی فکر کافی ہے مگر یہ ایک بڑی غلطی ہے اور خود اولاد کے ساتھ دشمنی کرنی ہے۔ جہالت اور ناتربیتی وبا کی مانند ہوتی ہے جب تک تمام شہر اس وبا سے پاک نہ ہو کوئی ایک گھر اپنے تئیں اس سے بچا نہیں سکتا۔ کسی علم کے پڑھ لینے سے انسان تربیت یافتہ نہیں ہو جاتا جب تک کہ اس کے لئے ایک بہت بڑا گروہ اس کے ہم جنسوں کا جس میں اس کا میل جول ہو تربیت یافتہ نہ ہو" (۲)

ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اس وقت تعلیم اس قدر محدود تھی اور اس میں اس قدر خرچ ہوتا تھا کہ تعلیم عام نہیں تھی مگر سر سید کی دلی خواہش تھی کہ وہ ایسا انتظام کر سکیں جس میں مسلمان غریب اور امیر سب ہی اپنے بچوں کو تعلیم دلا سکیں سر سید احمد خاں مسلمانوں کو اعلیٰ معیار کی تعلیم دینے کے حامی تھے اسی لئے انھوں نے ایم ۔اے ۔او کالج میں آکسفورڈ اور

کیمبرج کو نمونہ مان کر انتظام کیا۔ اور اسی معیار کے اساتذہ جمع کرنے شروع کئے مگر جہاں تک طلبہ کے لباس کا سوال تھا اس میں انھوں نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی نقل نہیں کی بلکہ ایک ترقی یافتہ مسلمان ملک ترکی کو اس کے لئے منتخب کیا اسی لئے مدرستہ العلوم کے طالب علموں کے لئے انھوں نے ترکش کوٹ اور ترکش ٹوپی کو یونیفارم میں شامل کیا۔

سرسید احمد خاں کے تعلیمی کارنامے اس قدر موثر ثابت ہوئے کہ مسلمانوں نے ان کے مذہبی خیالات پر ان کی زیادہ بازپرس نہ کی۔ اگر ان کا تعلیمی پروگرام اتنا مفید ثابت نہ ہوتا تو مسلمان ان کے مذہبی خیالات پر ان کو کبھی معاف نہ کرتے بلکہ ان کی خوب خبر لیتے۔ مگر سید احمد خاں کا تعلیمی کام اس قدر کامیاب ہوا کہ دنیا کے ایک بڑے حصہ میں جو مسلمان اپنا مقام بنا پائے وہ صرف اس لئے ممکن ہو سکا کہ یا تو خود انھوں نے یا ان کے بزرگوں نے اپنی تعلیم ایم۔اے۔او کالج یا علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں حاصل کی۔

حوالے

(۱) نورالحسن نقوی۔ "سرسید اور ہندوستانی مسلمان" صفحہ ۱۱۹،۱۲۰ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ (۲) ایضاً "صفحہ ۱۱۹،۱۲۰،۱۲۲"
(۳) سید طفیل احمد منگلوری۔ "مسلمانوں کا روشن مستقبل" صفحہ ۱۵۔

صفحہ ۸۵ کا باقی

کر سکیں چنانچہ وہاں انھوں نے ایک مبسوط جواب خطابات احمدیہ کی شکل میں لکھا۔ یہ ان کے عشق رسول، تحقیقی کاوش اور قوت استنباط و استدلال کا زندہ جاوید ثبوت ہے۔ اور موجودہ دور میں ہمارے لئے ایک مثال بھی کہ شاتمان رسول کو کس طرح علمی طور سے بے آبرو اور ان کے وار کو بے ضرر کیا جا سکتا ہے۔

سرسید نبی نہیں تھے کہ تنقید سے بالاتر ہوں۔ امام نہیں تھے کہ معصوم کہلائیں۔ ولی اللہ نہیں تھے کہ بیعت روحانی کے مدعی ہوں۔ مگر وہ فکر و عمل کے پیشوا ضرور تھے۔ تعصب، توہمات اور جمود کے ماحول میں انھوں نے روشنی، حرکت، عقل اور ایمان کے حق میں اجتہاد کیا۔ وہ انسانوں کے دست گیر اور چار سو سال سے سوئی ہوئی مسلم ملت کے مسیحا اور مجدد تھے۔ ان کے بعض خیالات سے اختلاف ممکن ہو سکتا ہے۔ لیکن ان کے طرز فکر کی معنویت اور افادیت ہنوز تازہ تر ہے۔

پروفیسر عتیق احمد صدیقی *

سرسیّد اور تعلیم نسواں

اگر یہ پوچھا جائے کہ کیا سرسید عورتوں کی تعلیم کے حامی تھے تو اس کے جواب سے پہلے کئی اور سوالوں کے جواب دینا ضروری ہوں گے۔ مثلاً یہ کہ اس وقت عام تعلیم کی کیا حالت تھی؟ معاشرہ جدید نظام تعلیم کو کس نظر سے دیکھ رہا تھا؟ تعلیم کی طرف خود مردوں کی کتنی توجہ تھی؟ کیا اس نظام میں ہمارے معاشرے کے مطابق لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے رعایت رکھی گئی تھی؟ اور ایسے ہی بہت سے سوال۔

ہم یہ بات نظر انداز نہیں کرسکتے کہ معاشرہ نمو پذیر بھی ہے اور تغیر پذیر بھی۔ وہ کبھی ایک حالت پر قائم نہیں رہتا نہ رہ سکتا ہے۔ ہر دور میں معاشرے کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں انھیں کے مطابق معاشرے کی ضرورتیں ابھرتی ہیں اور انھیں کی روشنی میں ان کی تکمیل کی کوششیں کی جاتی ہیں۔ ہر دور میں اہل بصیرت موجود ہوتے ہیں، ان کی دور رس نگاہیں مستقبل کے پردوں کے پیچھے بھی دیکھ سکتی ہیں، وہ زمانہ کی آہٹ کو دور سے سنتے ہیں، وہ زمانہ کے تقاضوں کو دوسروں سے زیادہ سمجھتے ہیں اور ان تقاضوں سے ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔۔۔ کچھ معاشرے کو بدلتے ہیں اور کچھ زمانہ کو اپنے ڈھب پر لانے کے لیے جدوجہد کرتے ہیں اور یوں ایک توازن پیدا ہوجاتا ہے۔ یہ اصلاح کا عمل ہے۔ زمانہ کی تبدیلیوں سے دیر تک صرف نظر کیا جاتا رہے تو اس کے تقاضوں میں شدت پیدا ہوجاتی ہے اور پھر اس کا سیل بے اماں اپنے ساتھ سب کچھ بہالے جاتا ہے، سابق سرمایہ کو نیست و نابود کر دیتا ہے اور تبدیلیوں کے جھنڈے گڑ جاتے ہیں۔ یہ انقلاب ہے۔ یہ سمندر کی طوفانی لہروں کی مانند ہوتا ہے کہ جب وہ اٹھتی ہیں تو سب کچھ برباد کر ڈالتی ہیں، شاید کبھی نئی زمینیں بھی دے جائیں جو زرخیز ثابت ہوں۔ پہلا عمل ایک دریا کی سبک خرامی ہے جس کا پانی خشک زمینوں کو سیراب کرتا جاتا ہے، ان کی گہرائیوں تک سرایت کرتا ہے اور دیرپا و دوررس اثرات چھوڑ جاتا ہے۔ اس سیراب زمین میں بیج بوئے جاتے ہیں تو ان کے کلّے پھوٹتے ہیں، پودا ابھرتا ہے، آہستہ آہستہ بڑھتا ہے، پتیاں اور شاخیں بڑھنا شروع ہوتی ہیں، پھر وہ ایک روز تناور درخت بن جاتا ہے اور برگ و بار لاتا ہے، جس سے مخلوق خدا فیضیاب ہوتی ہے۔

---

* سابق صدر، شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۳ء

سر سید انقلابی نہیں تھے۔ وہ مصلح تھے۔ ۱۸۵۷ء میں جو انقلاب آیا وہ اس کی تباہ کاری دیکھ چکے تھے، اس کے ہولناک نتائج بھی ان کے سامنے تھے۔ وہ ان میں سے کسی کو بھی دہرانا نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے اس کے اسباب کو سمجھا بھی تھا، (ظاہر ہے کہ اپنے طور پر۔ جس سے اس وقت بھی بہت لوگوں نے اتفاق نہیں کیا اور آج بھی اختلاف کیا جاسکتا ہے) اور ان عوامل کو سمجھنے کی کوشش کی تھی جو ایک قوم کی ترقی اور اس کے غلبہ و تسلط نیز دوسری قوم کے زوال اور مغلوبیت کے ذمہ دار تھے۔ ان کو یقین تھا کہ جب تک ان کا تدارک نہیں کیا جائے گا، کوئی کامیابی حاصل ہونا ممکن نہیں ہوگا۔ محض سر کٹانے اور خون بہانے سے کچھ نہیں ہوسکتا۔ جو حالات پیدا ہوگئے تھے ان کی تلافی مناسب تدبیر کے ذریعہ ہی بالخصوص اس صورت میں کہ اہل وطن کی ایک بڑی تعداد نے نئے نظام کو قبول کرلیا تھا۔ بلکہ وہ اس کا حصہ بن کر اس کو تقویت پہنچا رہے تھے اہل بنگال اس میں پیش پیش تھے۔ راجا رام موہن رائے کی اصلاحی اور تعلیمی تحریک نے انیسویں صدی کے نصف اول میں ہی جدید تصورات کی راہ ہموار کرکے ایک بڑی تعداد کو اس طرف متوجہ کردیا تھا۔ برادران وطن کی ایک بڑی تعداد نے عسکری تصادم اور سیاسی ٹکراؤ کا راستہ ترک کرکے تعلیم کی راہوں سے اقتدار میں شرکت شروع کردی تھی۔ مسلمان بوجوہ تصادم کی راہ پر گامزن تھے اور اقتدار وقت سے نفرت و بیزاری کے تصورات کے ساتھ علیحدگی اختیار کیے ہوئے تھے۔ یہ خلیج بڑھتی ہی جارہی تھی۔ سر سید نے نہ صرف اس خلیج کو پاٹنے کی کوشش کی بلکہ قوم کو تعلیم کی طرف ملتفت کرکے علم کے خزانوں پر قبضہ کرنے کی ترغیب دی۔ انھوں نے تعلیمی ادارے قائم کرکے اپنی ان کوششوں کو عملی شکل دی تو اپنی تقریروں اور تحریروں کے ذریعہ ان کو تقویت بخشی۔ ان کی کوششوں میں جتنی شدت اور تیزی آتی گئی اتنی ہی ان کی مخالفت بھی بڑھی۔ یہ ایک طرح سے جدید اور قدیم کا ٹکراؤ بھی تھا۔ سر سید دیکھ رہے تھے کہ ہمارے قدیم علوم جو ابھی تک ہمارے نظام تعلیم کی بنیاد رہے تھے، اپنی عملی افادیت کھو چکے تھے۔ ان سے کسی حد تک مذہبی رہنمائی ضرور ہوتی تھی، لیکن زمانہ کے نئے تقاضوں کو پورا کرنے کی سکت و صلاحیت ان میں بالکل نہیں رہ گئی تھی۔ جدید علوم سے زندگی میں ایک انقلاب آرہا تھا۔ کلوں کی ایجاد اور ان کے استعمال سے نہ صرف زندگی میں سہولتیں پیدا ہورہی تھیں بلکہ اس کی سمت و رفتار میں بھی تبدیلی پیدا ہورہی تھی۔ طرح طرح کی ایجادات، پھر ان کے ذریعہ نئی کلوں کا بننا، پھر زندگی میں ان کا استعمال اور پھر اس سے زندگی کے رخ میں تبدیلی، یہ سب کچھ ان کے ہاتھ میں تھا، جن کے ہاتھوں میں علم کے خزانوں کی کنجی تھی۔ جدید تعلیم کے حصول کا ایک بہت ہی سطحی مقصد خواہ سرکاری ملازمتیں حاصل کرنا یعنی اقتدار وقت میں شریک ہونا رہا ہو، لیکن سر سید کی نظر اس سے کہیں اعلیٰ وارفع مقاصد پر تھی۔ انھوں نے بار بار یہ بات کہی کہ تعلیمی ادارے کے قیام سے ان کا مقصد محض ملازمت کے متمنی لوگوں کے لیے سندوں کا کارخانہ قائم کرنا نہیں تھا، بلکہ عالموں کی ایک جماعت پیدا کرنا تھا جو حقیقی علم کو فروغ دے اور اس کے ثمر و برکات اور فوائد کو عام کرے۔ مگر ایک ایسے ماحول میں جہاں تعلیم ہی عام نہ ہو، ایسے اعلیٰ مقصد کا پورا ہونا آسمان کو چھونے کی کوشش کرنا تھا۔

یوں تو سارا ملک ہی جہالت کی تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا، لیکن مسلمانوں میں علم و تعلیم سے بیگانگی کچھ زیادہ ہی تھی۔ اگرچہ ان کے مذہب نے انہیں علم حاصل کرنے کا حکم دیا تھا، مگر مذہب کی بھی کون سی پابندی ہو رہی تھی۔ خواص مال مست تھے تو عوام کھال مست، عوامی مدارس کا رواج ذرا کم تھا۔ درس و تدریس ایک انفرادی معاملہ تھا۔ علما و مشائخ اپنے گھروں پر ہی

تدریس کا شغل جاری رکھتے۔ بالعموم یہ ان کے لیے ذریعہ معاش بھی نہیں ہوتا تھا بلکہ اس کا مقصد علم و معرفت کی ترویج اور رضائے الہی کا حصول ہوتا تھا۔ طالبان علم بھی علم کو جزو دین سمجھ کر ہی حاصل کرتے تھے وسیلہ معاش نہیں۔ چند ایک کے لیے ان کے علمی اکتسابات وسیلہ معاش بھی بن جاتے، یہ ایک الگ بات تھی۔ رفتہ رفتہ لوگوں کی توجہ تحصیل علم کی طرف سے ہٹتی گئی اور تعلیم کا فقدان ایک عام بات ہوگئی۔ کہیں کہیں تو پوری بستی میں کسی ایک حرف شناس کا ملنا بھی دشوار تھا۔ پورا معاشرہ اسی رنگ میں ڈوبا ہوا تھا۔ شہروں کے مقابلے میں دیہات کی اور مردوں کے مقابلے میں عورتوں کی حالت اور بھی زیادہ خراب تھی۔ ہم سیاسی طور پر مساوات کی کتنی بھی باتیں کرتے رہیں، لیکن یہ امتیاز ہمیشہ باقی رہا ہے اور بہ ظاہر اس کے ختم ہونے کے آثار آج بھی نظر نہیں آتے۔

شہروں میں عام طور پر تعلیم کا کچھ چلن رہتا تھا، جس سے دیہات عام طور پر محروم تھے۔ علم کے شائق مرد، دور دراز کا سفر کرکے ان مراکز تک پہنچتے اور علم کے چشموں سے سیراب ہوتے۔ یہ مواقع کسی پر بند نہیں تھے، مگر ان تک رسائی اور ان سے استفادہ کرنے میں اتنی دشواریاں حائل ہوتیں کہ معدودے چند ہی اکتساب فیض کرسکتے تھے۔ مرد تو پھر بھی کچھ نہ کچھ تعلیم حاصل کرلیتے، لیکن عورتوں کے لیے مزید دشواریاں تھیں۔ معاشرہ کی شہری تہذیب میں عورت کا مقام گھر تھا۔ اس کی چہار دیواری کے اندر ہی اس کی ساری زندگی محدود تھی۔ پردے کے رواج نے مزید رکاوٹیں پیدا کردی تھیں۔ اس کا اچھا برا یا صحیح و غلط ہونا ایک الگ مسئلہ ہے۔ لیکن عورت کا عام رواج کے مطابق اپنے گھر کی دنیا سے باہر قدم رکھنا معیوب تھا۔ دیہات میں عورت معاشی پیداوار میں مرد کے دوش بدوش تھی، لیکن شہروں میں معاشی عمل میں عورت کو کوئی دخل نہ تھا۔ یہ سراسر مردوں کی ذمہ داری تھی۔ تعلیم کا یوں بھی معاشی تفاعل میں کوئی بڑا دخل نہ تھا۔ اس لیے مردوں کو بھی تعلیم کی طرف خاص رغبت نہ تھی، عورتیں تو اور بھی زیادہ بے نیاز تھیں۔ ان کی ذمہ داری تو یہ تھی کہ وہ گھر کے نظام کو درست رکھیں، خاندان کو مربوط و مستحکم رکھیں، اولاد کی پرورش و تربیت کریں، شادی بیاہ اور گھر کی ایسی دوسری تقاریب کا اہتمام کریں اور خانگی رسوم کی نگہداشت کریں۔ یہ خود ایک پوری دنیا تھی۔ گویا سماج کی دو سطحیں تھیں۔ ایک بیرونی اور ایک اندرونی۔ بیرونی پرت مردوں سے متعلق تھی۔ تغیر پذیر، صلابت و سخت کوشی کی متقاضی، سرد و گرم زمانہ کو جھیلنے کی متحمل، معاشی پیداوار کی ذمہ داری یا دوسری اندرونی پرت تھی عورت پر مبنی۔ امور خانگی کی ذمہ دار، نئی نسلوں کی تربیت کرنے والی، خاندان کی شیرازہ بندی کرنے والی، روایات و رسوم اور زبان و تہذیب کی پاسبان، نرم و نازک مگر اس نازک شاخ کی طرح جو بڑے سے بڑے طوفان کو بھی جھکائی دے جائے، ٹوٹے نہیں اور طوفان گزرنے کے بعد سربلند ہو کر پھر کھڑی ہوجائے۔ مذہب دونوں میں مشترک تھا، اس کے تقاضے دونوں سے ہی یکساں تھے۔ پورے سماج مرد و عورت کی تعلیم سے بے نیازی اور بے تعلقی کے باوجود جب کبھی خواتین کی تعلیم کی طرف توجہ دی گئی یا وہ اس طرف متوجہ ہوئیں تو اس کی ضرورتیں بہت زیادہ نہیں تھیں۔ قرآن پاک کی تلاوت، مذہب کا اتنا علم جو ان کو فرائض و واجبات دین سے واقف کرادے، امور خانہ داری، پرورش اطفال اور صحت و صفائی کے مبادیات ــــ یہ ان کی ضرورتیں تھیں۔ بقول نذیر احمد:

> "اس ملک میں مستورات کو پڑھانے لکھانے کا رواج نہیں۔ پھر بھی بڑے شہروں میں بعض شریف خاندانوں کی اکثر عورتیں قرآن مجید کا ترجمہ مذہبی مسائل اور نصائح کے اردو کے رسالے پڑھ پڑھا لیا کرتی ہیں۔" (مراۃ العروس ص ۱۰)

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۳ء

نہ صرف یہ کہ شریف خاندانوں کی عورتیں پڑھ پڑھالیا کرتی تھیں بلکہ اس کا انتظام بھی شریف خاندانوں کے گھروں میں ہی ہوتا تھا۔ جن کو توفیق ہوتی، ان کے گھروں میں مکتب قائم ہوتا، پاس پڑوس کی بچیاں وہاں جاتیں اور گھر کی بی بی ان کو تعلیم دیتی۔ یہ تعلیم کا رضا کارانہ انتظام تھا۔ آج کی اصطلاح میں اسے سماجی خدمت کہہ لیجئے لیکن وہ خواتین اس کو دین کا، خیر کا اور ثواب کا کام سمجھ کر انجام دیتی تھیں۔ سماجی خدمت بھی تو کار خیر ہی ہے۔ نذیر احمد نے مراۃ العروس اور بنات النعش میں مکتب کے جو نقشے پیش کیے ہیں، وہ اس دور کے تعلیم نسواں کے نظام اور اس کی ضرورتوں کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ اصغری کی تعلیم کہاں اور کیسے ہوئی۔ لیکن وہ اس دور کی تعلیم یافتہ، ذہین اور روشن خیال خواتین کی نمائندہ ہے۔ وہ سلیقہ مند، خوش تدبیر اور نیک سیرت ہے۔ وہ خاندان 'خواہ وہ میکہ تھا یا سسرال کی بھی خواہ ہے اور اس کے مختلف افراد میں ہم آہنگی و یگانگت پیدا کرنے کی خواہاں ہے۔ وہ اس سماج کے تناظر میں ایک مثالی خاتون کا کردار پیش کرتی ہے۔ یہ محض ایک خیالی ہیولیٰ نہیں تھا، بلکہ اس کے جیتے جاگتے نمونے سماج میں موجود تھے۔ خود سرسید کی والدہ کے بارے میں جو اطلاعات فراہم ہوتی ہیں وہ یہ کہ "وہ صرف قرآن مجید پڑھی ہوئی تھیں اور ابتدا میں کچھ فارسی کی کتابیں بھی پڑھی تھیں۔" (۱) لیکن ان کی سوجھ بوجھ اور قابلیت معمولی عورتوں سے بہت زیادہ تھی۔ یہ کوئی معمولی خاتون نہ تھیں۔ یہ دبیر الدولہ، امین الملک، خواجہ فریدالدین احمد خاں بہادر مصلح جنگ کی چہیتی اور ہونہار بیٹی تھیں۔ خواجہ فریدالدین خود "با اقبال، لائق، دانشمند، صاحب علم و فضل اور خاص کر ریاضیات میں وحید عصر تھے۔" (۲) ان کے بیٹے یعنی سرسید کے ماموں نواب زین العابدین "فنون ریاضی میں ید طولیٰ" (۳) رکھتے تھے۔ سرسید کی بہن صفیۃ النسا بیگم "عورتوں میں ممتاز اور قابل تھیں۔ اکثر مذہبی کتابیں اور کچھ حدیث کی عربی کتابیں بھی مع ترجمہ کے پڑھی تھیں اور ان کے گھر میں کنبے کی اکثر لڑکیاں جمع ہوتیں اور ان سے پڑھتی تھیں۔" (۴) سرسید کا خاندان اشرافیہ کے بھی اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتا تھا، لیکن خواتین کی تعلیم ایک مختصر دائرے میں محدود تھی۔ اس سے زیادہ کی اس معاشرے میں ضرورت بھی نہ تھی، نہ اس کا کوئی انتظام و انصرام۔

سرسید جب مختلف تجربات اور کافی غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے کہ قوم کو ذلت و پستی سے نکالنے، زمانہ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے اور جدید دور کی ترقیات سے مستفاد ہونے کے لیے تعلیم اشد ضروری ہے تو انھوں نے اس دور کے تعلیمی نظام کو قریب اور غور سے دیکھا، اپنے ارادوں کی تکمیل کے لیے منصوبہ بنایا اور اس کو عملی شکل دینے میں جی جان سے جٹ گئے۔ انگلستان کے سفر کے دوران انھوں نے جہاں تعلیمی اداروں، وہاں کی مجلسوں، شرفا کی محفلوں، بازاروں، شہری آبادیوں اور زندگی کے دیگر مظاہر کو دیکھا وہیں یورپی خواتین کو بھی دیکھا۔ ان کی شائستگی، ان کے مہذب انداز، ان کے تعلیمی و علمی رجحان اور زندگی کے مختلف امور میں ان کی عملی شرکت کا مشاہدہ کیا۔ وہ اس بات سے بھی بے حد متاثر ہوئے کہ کس طرح یہ خواتین مردوں کے دوش بدوش زندگی کے کاروبار میں ہاتھ بٹا رہی ہیں (یہ الگ بات ہے کہ ابتداً اس عمل کا آغاز سماجی مجبوریوں کے تحت ہوا)۔

ان کے دل میں جہاں یہ ارمان پیدا ہوا کہ ان کا وطن اور ان کے اہل وطن انگلستان اور اہل انگلستان کی طرح ہوتے، وہیں ان کو ملک و اہل ملک کی موجودہ حالت پر سخت تاسف بھی تھا۔ انھوں نے مولوی مہدی حسن (محسن الملک) کے نام ایک خط میں لکھا :-

تیس مختصر حال و نتیجہ سفر یورپ کا یہ ہے، مگر ہماری قسمت میں جلنا ہے۔۔یہاں کا حال دیکھ دیکھ کر اپنے ملک اور اپنی قوم کی حماقت اور بے جا تعصب اور تنزل موجودہ اور ذلت آئندہ کے خیال سے رنج و غم زیادہ بڑھ گیا ہے اور کوئی تدبیر اپنے ہم وطنوں کے ہوشیار کرنے کی نہیں معلوم ہوتی۔مذہب جس کو وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے خوب اختیار کیا ہے، اس میں بھی وہی حماقت اور نالائقی اور گمراہی ہے جو اور تمام کاموں میں ہے۔بس کوئی کیا کرے، بد اقبالی، بدنصیبی کا کچھ علاج نہیں۔"(۵)

موص خواتین کے بارے میں وہ اور بھی زیادہ دل گرفتہ ہوئے کہ یہ مردوں سے بھی زیادہ پس ماندگی اور ابتری کا شکار تھیں۔ پنے سفر نامہ لندن میں انھوں نے یہ بیان کرکے کہ کس طرح ایک لڑکی نے ان سے علمی گفتگو کی اور وہ اس کی فہم و دانش ے متاثر ہوئے۔یہ بھی بیان کیا کہ اپنے ملک کی عورتوں کے بارے میں سوچ کر ان کو کتنا دکھ ہوا۔انھوں نے لکھا :

"اگر ہندوستان میں کوئی عورت بالکل برہنہ بازار میں پھرنے لگے تو ہمارے ہم وطنوں کو کیسا تعجب اور کس قدر حیرت ہوگی۔ بلا مبالغہ یہ مثال ہے کہ جب یہاں کی عورتیں یہ سنتی ہیں کہ ہندوستان کی عورتیں پڑھنا لکھنا نہیں جانتیں اور صد تربیت اور زیور تعلیم سے بالکل برہنہ ہیں تو ان کو بڑا ہی تعجب ہوتا ہے۔"(۶)

وہاں متوسط طبقہ کی عورتوں میں بھی علم و تعلیم کا رواج اور پھر اس کے اثر سے ان کا شائستہ و مہذب ہونا، خانگی ر میں ان کا خوش سلیقہ ہونا اور پھر سوسائٹی میں ان کا ذی مرتبت و ذی عزت ہونا سر سید نے دیکھا تو ہندوستانی عورتوں کی ں حالی کا احساس اور بھی شدید ہوا۔ مگر وہ جانتے تھے کہ جس سوسائٹی میں مردوں کا ذہن ہی جہالت کی تاریکیوں میں ڈوبا ہوا ، وہاں عورتوں کی حالت بہتر ہونے کے بارے میں سوچا بھی نہیں جا سکتا۔چشم زمانہ نے یہ بھی دیکھا کہ خود مردوں کی تعلیم ے بارے میں ان کی کوششوں کی سخت مخالفتیں ہوئیں۔ تعلیم نسواں کا معاملہ اور بھی زیادہ نازک تھا۔وہ اس کو چھیڑ کر لیمی تحریک کے لیے مزید دشواریاں پیدا نہیں کرنا چاہتے تھے۔ان کو یقین تھا کہ سوسائٹی کے مرد تعلیم یافتہ ہو جائیں اور تعلیم سے ان کا ذہن روشن ہو جائے تو تعلیم نسواں کے سوتے خود بخود جاری ہو جائیں گے۔ تعلیم نسواں کے لیے جو سرکاری مدارس ئم تھے ان کی حالت اور ماحول اس قسم کا تھا کہ اشراف خاندانوں کے مسلمان اپنی بیٹیوں کو ان اسکولوں میں بھیجنے پر مائل یں ہو سکتے تھے۔نہ اس دور میں سرکار یا کسی اور کے لیے ایسے اسکول قائم کرنا ممکن تھا جو لڑکیوں کے مربیوں کی طمانیت کے ق ہو۔"معاشرتی ماحول اور اس کی وجہ سے پیدا ہونے والی پابندیاں بھی لڑکیوں کی تعلیم میں حارج تھیں۔نہ ان سے صرف ر کیا جا سکتا تھا، نہ اس ماحول کو ایک دم بدلا جا سکتا تھا۔خود ان مصلحین کا ذہن بھی اسی ماحول کا پروردہ تھا، وہ اس میں ترمیمات کر سکتے تھے۔مگر اس کو توڑ تو نہیں سکتے تھے۔۱۸۸۲ء میں سر سید نے تعلیمی کمیشن کے روبرو شہادت دیتے ہوئے تعلیم نسواں ے متعلق کہا :

بعض شخصوں کی یہ رائے ہے کہ مردوں کی تعلیم سے پہلے عورتوں کی تعلیم ہونی چاہیے وہ غلطی پر ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ مسلمان عورتوں کی پوری تعلیم اس وقت تک نہ ہوگی جب تک کہ اس قوم کے اکثر مرد پورے تعلیم یافتہ نہ ہو جائیں گے۔اگر ہندوستان کے مسلمانوں کی سوشل حالت پر غور کیا جائے تو اس وقت تک جو حالت مسلمان عورتوں کی ہے وہ میری رائے میں خانگی خوشی کے واسطے کافی ہے۔جو کچھ بالفعل گورنمنٹ کو کرنا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمان لڑکوں کی تعلیم

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۳ء

و تربیت کے بندوبست کی جانب کافی توجہ کرے، جب کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل بخوبی تعلیم و تربیت یافتہ ہوجائے گی تو مسلمان عورتوں کی تعلیم پر اس کا ضرور بالضرور ایک زبردست گو مخفیہ اثر پہنچے گا۔ تعلیم یافتہ باپ یا بھائی یا شوہر بالطبع اپنی رشتہ مند عورتوں کی تعلیم کے خواہشمند ہوں گے۔"(۷)

سر سید ہی کی کوششوں سے ۱۸۸۶ء میں "محمڈن ایجو کیشنل کانفرنس" کا قیام عمل میں آیا جس کا مقصد اولین مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے میں کوشش کرنا قرار دیا گیا تھا۔ اس کے اراکین سر سید کے ہمنوا اور ہم خیال لوگ ہی تھے اور تعلیم کی ترویج و اشاعت میں اتنے ہی سر گرم تھے۔ ۱۸۸۸ء میں لاہور میں کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا تو زندہ دلان پنجاب نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ سر سید کی آواز پر پہلے ہی لبیک کہہ رہے تھے۔ اس اجلاس میں تعلیم نسواں کے مقصد کو تقویت پہنچانے کے لیے مدارس قائم کرنے کے لیے قرار داد پیش کی گئی تو سر سید نے اس کی مخالفت کی انھوں نے اس بارے میں تقریر کرتے ہوئے کہا :

"کوئی دنیا کی تاریخ اس وقت نہیں مل سکتی کہ جن خاندانوں کے مردوں نے تعلیم پائی ہو، مردوں کے اخلاق درست ہو گئے ہوں، مردوں نے علم و فضل حاصل کر لیے ہوں اور عورتیں تعلیم سے محروم رہی ہوں۔ ہمارا منشا یہی ہے کہ یہ تعلیم جو ہم دلا رہے ہیں، لڑکوں کی تعلیم نہیں ہے بلکہ لڑکیوں کی ہے، جن کے وہ باپ ہوں گے۔ اس وقت ہم عام یورپ کی اور تعلیم یافتہ ممالک کی ہسٹری دیکھتے ہیں اور پاتے ہیں کہ جب مرد لائق ہوجاتے ہیں عورتیں بھی لائق ہوجاتی ہیں۔ جب تک مرد لائق نہ ہوں عورتیں بھی لائق نہیں ہوسکتیں۔ یہی سبب ہے کہ ہم کچھ عورتوں کی تعلیم کا خیال نہیں کرتے ہیں۔ اس کوشش کو لڑکیوں کی تعلیم کا بھی ذریعہ سمجھتے ہیں۔"(۸)

اپنے سفر پنجاب کے دوران انھوں نے پھر اسی خیال کو دہرایا۔ خواتین کے ایک جلسے کو خطاب کرتے ہوئے کہا :

"اے میری بہنو تم یقین جانو کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جس میں مردوں کی حالت درست ہونے سے پہلے عورتوں کی حالت میں درستی ہو گئی ہو ۔۔۔۔ تم یہ نہ سمجھو کہ میں اپنی پیاری بیٹیوں کو بھول گیا ہوں بلکہ میرا یقین ہے کہ لڑکوں کی تعلیم پر کوشش کرنا لڑکیوں کی تعلیم کی جڑ ہے۔"(۹)

مگر وہ خود اپنی تحریک کے ابتدائی دور میں ہی تعلیم نسواں کی زبردست حمایت کر چکے تھے۔ انھوں نے شریف خاندانوں کو غیرت دلائی تھی کہ ان کی لڑکیاں تعلیم سے بے بہرہ رہ کر زیور انسانیت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ اپنے ایک مضمون (۱۸۶۹) میں انھوں نے لکھا تھا :

ہم تعجب کرتے ہیں ان حضرات شرافت شمار کی شرافت پر کہ وہ کیسے اپنی عورتوں کی ناشائستگی کو پسند کرتے ہیں اور کیوں اس تعلیم کو ناپسندیدہ جانتے ہیں۔ انسان کی آراستگی کے واسطے بالاتفاق زیور علم سے زیادہ اور کوئی شے آرائش و زیبائش کی نہیں ہے۔ پس کیا وجہ ہے کہ عورتوں کی نسبت جہالت پسند کی جائے۔ کیا عورتیں ان کے نزدیک فی نفسہ مرتبہ انسانیت سے خارج ہیں جو ان کو مثل جانوروں کے رکھنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔"(۱۰)

نذیر احمد کے کردار اکبری، نعیمہ، غیرت بیگم وغیرہ اسی ماحول کی پروردہ ہیں جہاں عورتوں کی جہالت ان کو نہ صرف ناشائستگی، بد سلیقگی، ضد اور ہٹ دھرمی کا شکار بنا دیتی ہے بلکہ ان کو مثل جانوروں کے زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

ان بیانات پر نظر ڈالیے تو چند باتوں کا اندازہ ہوتا ہے: (۱) سر سید کو اندازہ، ہوگیا کہ معاشرے میں مغربی تعلیم سے

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

یک گونہ نامناسبت بلکہ نفرت موجود ہے۔ جب تک معاشرے کی عام طبائع اس سے مانوس نہ ہوجائیں، اس کے فوائد پر مطلع ہو کر اس کو بخوشی قبول نہ کرنے لگیں، اس وقت تک ادھر پوری توجہ نہ ہو گی۔ اس تعلیم کے ساتھ اجنبیت اور بیگانگی ہی کا معاملہ نہیں تھا بلکہ معاشرے میں بڑے شبہات یہ بھی تھے کہ یہ عیسائیت کی تبلیغ کا ذریعہ ہے اور جو لڑکے یہ تعلیم پائیں گے وہ اپنا مذہب چھوڑ کر عیسائیت کے حلقہ میں داخل ہوجائیں گے (اس کی مثالیں بھی موجود تھیں) جب تک یہ شکوک و شبہات دور نہ ہوں گے، اس وقت تک خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوسکتی، (۲) جو معاشرہ ان شبہات کی بنا پر لڑکوں کی تعلیم کے لیے آمادہ نہیں تھا۔ لڑکیوں کو اس تعلیم میں ڈالنا کیسے برداشت کرتا۔ یہ تو گویا معاشرے کے قلب پر براہ راست حملہ ہوتا۔ اس کے خلاف جو ردعمل ہوتا اس سے لڑکوں کی تعلیم بھی متاثر ہوتی۔ اس لیے انھوں نے صبر و تحمل کے ساتھ اپنی رائے میں ترمیم کی اور تعلیم نسواں کو موخر کیا کہ جب وہ نسل آجائے گی جس نے جدید تعلیم حاصل کی ہو گی اور جس کا ذہن اس سے مانوس ہوچکا ہو گا، وہ خود ہی خواتین کی تعلیم کا انتظام کرے گی اور تب اس قدر بھڑک اور مغائرت محسوس نہ ہو گی۔ یہ ان کی حکیمانہ بصیرت اور دور اندیشی کا تقاضا تھا جو فوری اور عارضی نتائج پر نظر نہیں رکھتی بلکہ دور رس اور مستقل اثرات کو مدنظر رکھ کر عمل کا خاکہ بناتی ہے۔ (۳) ہوا بھی یہی کہ سرسید کی تعلیمی تحریک شروع ہونے کے بیس پچیس سال کے اندر اندر ہی تعلیم نسواں کے لیے آوازیں اٹھنے لگیں، اس کے مطالبے کیے جانے لگے، نسوانی بیداری اور حقوق نسواں پر بھی زور دیا جانے لگا۔ تاآنکہ سرسید کی قائم کردہ ایجوکیشنل کانفرنس میں ۱۸۹۱ء میں تعلیم نسواں سے متعلق مندرجہ ذیل قرارداد منظور کی گئی :

> "اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ مسلمانوں کی موجودہ حالت میں مردوں کی تعلیم کے ساتھ عورتوں کی تعلیم کی بھی کوشش لازم ہے کیوں کہ قوم کی اصلی ترقی زیادہ تر اسی پر منحصر ہے۔ یہ تعلیم ایسی ہونی چاہیے کہ عورتوں کی مذہبی، علمی اور اخلاقی زندگی میں ترقی ہو۔"

آج ہم اندازہ نہیں کرسکتے کہ اب سے سوا سو سال پہلے جدید تعلیم کی راہ میں کیا دشواریاں حائل تھیں۔ لوگوں کے دلوں میں بجا طور پر شکوک و شبہات تھے۔ صدیوں کی معاشرتی روایات کو توڑنا یا بدلنا آسان نہیں تھا، مذہبی عقائد اپنی حقیقی شکل سے دور ہوجانے کی وجہ سے، اس راہ میں خود بڑی رکاوٹ تھے۔ صنف نازک کا معاملہ اور بھی پیچیدہ تھا۔ شرفا اپنے گھر کی بچیوں کے گھر سے باہر قدم رکھنے کو معیوب جانتے تھے۔ عوامی اسکولوں کا تصور ابھی عام نہیں تھا۔ پردہ وغیرہ کا انتظام بھی ہوتا تو شرفا کو اپنے گھر کی لڑکیوں کا ہما شما کے ساتھ بیٹھنا گوارا نہ تھا۔ اس لیے اس حساس مسئلہ کو چھیڑنا بہت سی دشواریوں کو دعوت دینا تھا۔ سرسید نے اس معاملہ میں مصلحتاً آہستہ روی اختیار کی۔

ذرا آہستہ لے چل کاروان جذب و مستی کو کہ سطح ذہن عالم سخت ناہموار ہے ساقی

وہ اس وقت کا انتظار کر رہے تھے جب جدید تعلیم یافتہ لوگوں کی نسل تیار ہوجائے اور خود ان کے اندر داعیہ پیدا ہو کر وہ تعلیم نسواں کے کام کو آگے بڑھائیں۔ چنانچہ جہاں ۱۸۹۱ء میں صرف ایک قرارداد منظور ہو کر رہ گئی تھی، وہیں ۱۸۹۸ء میں ایجوکیشنل کانفرنس میں باقاعدہ شعبہ نسواں قائم ہو گیا اور تعلیم نسواں کا کام بھی اسی زور و شور سے شروع ہو گیا جس طرح دوسری تعلیمی کوششیں جاری تھیں۔ اب یہ آوازیں اٹھنے لگیں کہ خواتین کی اعلیٰ تعلیم کے بغیر قومی زندگی مہمل رہے گی اور ترقی کا کوئی تصور اس کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

سرسید نے جب جب عورتوں کی تعلیم کو موخر کرنے یا محدود رکھنے کی بات کہی تو یہ ان کی اصلاحی مصلحت کا تقاضا
. وہ خواتین کو معاشرے کا اہم جز سمجھتے تھے اور یہ بھی کہ اتنے اہم جز کو مہمل اور ناکارہ چھوڑ دینا کسی بھی معاشرے کے
. فال نیک نہیں ہوسکتا۔ سو سال گزر جانے کے بعد بھی ابھی تک نہ تو ملک کی خواندگی کا مسئلہ حل ہوا اور نہ ابھی تک
دں اور عورتوں کے درمیان تعلیمی تناسب کا فرق ختم ہوا۔ آزاد ہندوستان میں اس کے لیے برابر کوششیں ہو رہی ہیں۔
ست کے ذرائع ابلاغ، حکومت کی پوری مشنری اس کے لیے کوشاں ہے اور بڑا سرمایہ بھی اس کے لیے فراہم کیا جا رہا ہے۔
لک کے مخصوص حالات کی وجہ سے یہ فرق ابھی تک قائم ہے۔ سو سال پہلے اس راہ کی دشواریوں کو مدنظر رکھیں تو سرسید
جذبات سے عاری حقیقت بینی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ قوموں کی تشکیل و تعمیر میں یہی حقیقت بینی مفید و بار آور ہوسکتی
،۔ سرسید نے اسی کو اپنایا اور قوم کے لیے ٹھوس بنیادیں فراہم کیں۔ معاشرے کے روشن خیال افراد تعلیم نسواں کی کمی
تلافی کا بیڑا اٹھا سکیں تو یہ سرسید کو حقیقی خراج عقیدت ہوگا۔

حوالے

ت جاوید، ص۔ ۴۰ (۲) ایضاً ص۔ ۲۴ (۳) ایضاً ص۔ ۲۵ (۴) ایضاً ص۔ ۴۴ (۵) خطوط سرسید مرتبہ راس مسعود، ص۔ ۴۲ (۶) سفر نامہ
ران لندن، ص ۱۰۹ (۷) حیات جاوید، ص ۲۲۸ (۸) مکمل مجموعہ لکچرز و اسپیچز، ص۔ ۲۱۰ (۹) سرسید احمد خاں پنجاب میں، ص۔ ۱۴۴
بحوالہ منتخب مضامین سرسید، ص ۱۸۶۰

پروفیسر نظام الدین گوریکر *

سر سیّد کا تعلیمی نظریہ اور سرگرمیاں

کسی نے سچ کہا ہے کہ اچھے دوست کی مثال ایک گنجان درخت کی سی ہے جب تک وہ سر سبز ہے اس کے سایہ میں راحت ملتی ہے اور اس کے پھل سے لذت حاصل ہوتی ہے اور جب خشک ہو جاتا ہے تو اپنی لکڑی سے طرح طرح کے فائدے پہنچاتا ہے۔ یہ مثل سر سید (۱۸۱۷ع - ۱۸۹۸ع) پر بھی ہر اعتبار سے صادق آتی ہے جنہوں نے ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کے آخری ایام بھی دیکھے اور برطانوی اقتدار کی تدریجی ترقی کے آثار بھی۔ ایسے تاریک بلکہ الناک دور میں سر سید کی رفاقت اور قیادت خصوصی طور پر مسلمانوں کے لیے ایک نعمت سے کم نہ تھی جب تک حیات رہے وہ اپنے ہاتھ، پانوں اور زبان کے ساتھ جان، مال اور قلم سے مسلمانان ہند کی بالخصوص رہنمائی کرتے رہے اور جب اللہ کو پیارے ہو گئے تو مسلمان ان کے احسانات کو یاد کر کے ان کے اعمال اور افکار کا نہ صرف اعتراف کرنے لگے بلکہ ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے عمل پیرا ہونے کی آج بھی کوشش کر رہے ہیں اگرچہ اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ سر سید کی ہمہ جہت شخصیت متنازع فیہ رہی ہے۔ مذہبی عقائد کے لحاظ سے علمائے وقت نے انہیں کافر اور ملحد کہا تو روشن خیال گروہ نے انہیں مجتہد العصر اور امام زماں کے ناموں سے یاد کیا، تعلیمی افکار کے اعتبار سے دقیانوسی طبقہ نے انہیں اسلام کش اور انگریزوں کا پٹھو قرار دیا تو ماہرین تعلیم نے انہیں زمانہ شناس اور دور اندیش کہا اور سیاسی اعمال کی حیثیت سے ناسمجھ لوگوں نے انہیں ابن الوقت کہا تو دانشوروں نے انہیں مصلح قوم کا خطاب دیا۔ بہر کیف ان کی خدمات مذہبی ہوں یا تعلیمی، قومی ہوں یا سیاسی اگر انہیں مصلحت وقت تصور کریں اور حالات حاضرہ کے پیش نظر ان کا جائزہ لیں تو پتہ چلے گا کہ ان کے احسانات قوم پر اس قدر ہیں کہ وہ کسی صورت میں بھی ان سے عہدہ بر آ نہیں ہو سکتی۔

سن ستاون کی جنگ آزادی میں ہندوستانیوں اور انگریزوں دونوں کا جو خون خرابہ ہوا اور دونوں قومیں جس زبوں حالی کا شکار ہوئیں اس کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ سچ ہے کہ انگریز حاکم بن چکے تھے۔ اور ہندوستانی محکوم لیکن مسلم قوم سب سے زیادہ معتوب سمجھی جاتی تھی اس لئے کہ انگریزوں نے حکومت ان ہی سے چھینی تھی۔ ایسے آڑے وقت میں سر سید احمد خاں

---

* ڈائرکٹر، اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، انجمن اسلام، دادا بھائی نوروجی روڈ، بمبئی۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر، ۱۹۹۲ء

نے مسیحا بن کر سب سے پہلے اسباب بغاوت ہند اور بعد میں لائل محمڈنز آف انڈیا لکھ کر بڑی خوبی کے ساتھ مسلمانان ہند کی صفائی پیش کی اور مسلمانوں کو بری الذمہ قرار دیا اور واضح طور پر افسران حکومت کی غلط کاریوں کی نشاندہی کی اور حکومت برطانیہ کو غدر کا ذمہ دار ٹھہرایا اس طرح انہوں نے ان نازک حالات میں اپنی حق گوئی، بے باکی اور جرات مندی کا ثبوت دیکر مسلمانوں کی زبوں حالی کا علاج تعلیم و تربیت میں بتایا اور بقول ڈاکٹر محمد اقبال ع

اس دور میں تعلیم ہے امراض ملت کی دوا

مسلم معاشرہ کی اصلاح اور ترقی کے لیے سرسید نے جو منصوبے بنائے اور جو تحریک شروع کی اس میں تعلیم و تربیت کو بنیادی اہمیت دی بلکہ اپنے زمانے کے ہندوستان کی سماجی، سیاسی اور معاشی خرابیوں کا واحد علاج تعلیم ہی کو قرار دیا سرسید نے اس بات کی وضاحت کی کہ تعلیم انسان میں زبردست تبدیلی لاتی ہے اور انسان کی پوشیدہ صلاحیتوں کو نکھارتی ہے۔ سرسید نے بغیر تعلیم کے انسان کی روح کو ایک چٹکبرے سنگ مرمر کی چٹان کے مانند بتلایا جب تک سنگتراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا اس کو تراش کر سڈول نہیں بناتا اور پالش سے آراستہ نہیں کرتا اس وقت تک اس کے جوہر اسی میں پوشیدہ رہتے ہیں اور اسکے خوبصورت بیل بوٹے اور خوش نما رنگ روپ ظاہر نہیں ہوتے۔یہی حال انسان کی روح کا ہے وہ کتنا ہی نیک دل ہو جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا اس وقت تک اس کی ہر خوبی اور اس کا ہر کمال جو اس میں چھپے رہتے ہیں اس کی مدد کے بغیر ظاہر نہیں ہوتیں۔مسلمانان ہند کی جہالت اور تعصب کو دور کرنے کے لیے تعلیم کی ضرورت پر زور دیتے ہوئے سرسید نے فرمایا: "میں اپنی قوم میں بھی ہزاروں خوبیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ، ان میں جرات مندی اور بے باکی پاتا ہوں پر خوفناک، ان میں قومی استقلال دیکھتا ہوں پر بے ڈھنگا، ان میں صبر و قناعت بھی ہے پر بے موقع، پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائیں تو دین اور دنیا دونوں کے لیے کیسی کچھ مفید ہوں۔"

سرسید نے زندگی کو کامیاب بنانے اور صحیح تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے اس بات کو بار بار دہرایا کہ "انسان یہ فیصلہ کرے کہ اس کو کیا بننا ہے اور کیا کرنا ہے ۔ اگر وہ بخوبی تصفیہ کرتا ہے اور اپنے تصفیے میں غلطی نہیں کرتا تو اس میں عزم جزم پیدا ہوتا ہے اور اس کو کامیابی ضرور حاصل ہوتی ہے کامیابی کی جڑ اسی فیصلہ مین مضمر ہوتی ہے کہ میں کیا بنونگا اور میں کیا کرونگا۔"

ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے لیے سرسید کے خیال میں یہ بھی ضروری ہے کہ "ان کو جدید علوم و فنون کی فائدہ مند تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم سے بھی آراستہ کریں اور مذہبی تعلیم کے لئے ذی علم اور ذی فہم اصحاب یکجا جمع ہوں اور بحث و مباحثہ کے بعد وہ ایسا نصاب مرتب کریں جو بلحاظ حالات زمانہ اور بنظر علوم و فنون جدیدہ مطابقت رکھتا ہو اور جو پرانی اور دقیانوسی تعلیم سے مختلف یعنی ترمیم شدہ ہو، ضروریات وقت کے موافق ہو اور جو مذہبی مقاصد کو بھی پورا کرتا ہو۔" سرسید مزید فرماتے ہیں کہ "مذہبی تعلیم کا اہتمام حکومت سے کروانا اور خود کچھ نہ کرنا بے حسی اور بے غیرتی کی بات ہے۔ اپنی مذہبی تعلیم کا ہمیں خود انتظام کرنا چاہیے کیونکہ مسلمان مذہبی تعلیم کو اپنی تعلیم کا لازمی حصہ قرار دیتے ہیں۔پس ان کا فرض ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تعلیم اپنے ہاتھ میں لیں تا کہ وہ اپنے بچوں کو دونوں طرح کی تعلیم خاطر خواہ دلا سکیں۔"

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۳ء

سرسید کے خیال میں نہ صرف تعلیمی ترقی کی خاطر بلکہ سیاسی، معاشرتی اور مذہبی اعتبار سے بھی انگریزی تعلیم حاصل
نے کی سخت ضرورت ہے ! اہالیان ہند میں برادران وطن نے اس ضرورت کو محسوس کرلیا اور انگریزی تعلیم حاصل کر کے
ہ مند ہو رہے ہیں لیکن مسلمان انگریزی سے متنفر نظر آتے ہیں اور ان کی یہ نفرت ان کی ترقی کے راستے میں مزاحمت بن
ی ہے ۔سرسید نے انگریزی تعلیم کی اشاعت کی خاطر اور اسے اپنانے کے لیے یہ استدلال پیش کیا کہ "حکمران قوم کی زبان
نے میں ہی ترقی ہوتی ہے ۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے زمانے میں عربی زبان کا رواج تھا۔ ہندوؤں کے عہد میں سنسکرت برا ج
تھی اور مسلمانوں کے دور حکومت میں فارسی کا دور دورہ تھا اور اب ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت ہے اس لئے
ریزی زبان ترقی پر ہے لیکن مسلمانوں نے انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں کوتاہی کی ہے جو ان کی بڑی غلطی ہے ۔ یہ
، ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مسلمان انگریزی زبان سے اس لیے نفرت کرتے ہیں کہ ان کا بڑا گروہ خصوصاً علمائے وقت
ریزی کی تعلیم کو اسلام کے منافی تصور کرتا ہے ۔سرسید نے اس خیال کی تردید میں کہا کہ "اکثر ثقہ لوگ انگریزی پڑھے
ے طبقے کو بد عقیدہ یا دہریہ کہتے ہیں ۔ یہ خام خیالی ہے مگر میں ایسے لوگوں کو بھی جانتا ہوں جو انگریزی مطلق نہیں جانتے
ن بد عقیدہ ہیں ۔ "سرسید نے مزید کہا کہ جو علمائے اسلام یہ کہتے ہیں کہ انگریزی کی تعلیم اور علوم جدیدہ میں ترقی کرنے میں
لمانوں کے ایمان میں خلل ہوتا ہے ان کو یہ معلوم ہونا چاہیے ۔ کہ اسلام میں اور دنیاوی عزت میں کوئی تناقض نہیں ہے ۔

سرسید کے مطابق مدارس میں مغربی علوم کو دیسی زبان میں تعلیم دینا مناسب ہے ۔ یہاں دیسی زبان سے مراد اردو
ن ہے لیکن اعلیٰ تعلیم کا ہندوستانی زبان کے ذریعے اہتمام کرنا خالی از فائدہ ہے ۔ لہٰذا اعلیٰ تعلیم کو صرف انگریزی میں دینا
رہ مند ثابت ہو گا ۔ اسی نظریہ کے پیش نظر جب حکومت نے کلکتہ یونیورسٹی کو ختم کر کے اردو یونیورسٹی قائم کرنا چاہا تو
ں نے فوراً کنارہ کشی اختیار کرلی کیونکہ ان کے خیال میں اس اقدام سے مسلمان انگریزی زبان سے محروم ہو جائیں گے اور
محرومی اعلیٰ تعلیم اور علمی ترقی کے لیے نقصان رساں ہو گی ۔

سرسید کی تعلیم سے دلچسپی اگرچہ ۱۸۵۷ء کے بعد سے شروع ہوئی لیکن ان کے افکار و خیالات آہستہ آہستہ پروان
ھنے لگے اور برسوں کے بعد ان کے تعلیمی افکار نے تعلیمی تحریک کی شکل اختیار کر لی ۔سرسید نے تعلیمی تحریک کا آغاز عملی
رپر ۱۸۵۹ء میں ایک فارسی ذریعہ تعلیم مدرسہ سے کیا اور یہ فارسی مدرسہ تحصیلی اسکول کے قائم ہوتے ہی اس کا حصہ بنایا گیا ۔
ی پور کے اس مدرسہ میں اردو فارسی عربی کے ساتھ سنسکرت کی تعلیم کا بھی اہتمام تھا ۔ یہ آج بھی وکٹوریہ اسکول کے نام
ے جاری ہے اور تعلیم کی اہمیت اور افادیت پر ایک مختصر کتابچہ تصنیف کیا اور اس میں حکومت کے قائم کیے ہوئے مشرقی
نوں کے مدرسوں پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ یہ مدرسے وقت کی ضروریات کو پورا کرنے سے قاصر ہیں اور یہ رائے دی کہ
ومت ان اسکولوں کا ذریعہ تعلیم انگریزی کر دے تا کہ ہندوستانی بچے اس سے پورا فائدہ اٹھا سکیں ۔ اگر چہ یہ صحیح ہے کہ بچے
ی ذہنی تربیت اور ترقی کے لیے مادری زبان مفید ہوتی ہے ۔سرسید نے خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کرنے کی خاطر ۱۸۶۴ء میں
ی پور میں عوام کے تعاون اور چندے سے ایک مدرسہ قائم کیا اور پر زور اپیل کی کہ اہل ہند تعلیم کا اہتمام کریں تا کہ وہ
ساس کمتری کا شکار نہ ہو جائیں ۔

سائنٹفک سوسائٹی کا قیام غازی پور میں ۱۸۶۳ء میں عمل میں آیا جو سرسید کی تعلیمی تحریک کا دوسرا سنگ میل ہے اور

غازی پور سے علی گڑھ میں تبادلہ ہوتے ہی انہوں نے اس سوسائٹی کی عمارت کا سنگ بنیاد ۱۸۶۴ء میں علی گڑھ میں رکھا عمارت میں اب طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علی گڑھ جاری ہے۔ اور اس طرح یہ عمارت آج بھی امراض انسانی کی دوا کا مرکز ہوئی ہے۔ اس سوسائٹی کے بنیادی مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی تھا کہ ادبی اور علمی کتب و رسائل انگریزی زبان سے ترجمہ کروا کر ہندوستانیوں میں نہ صرف انگریزی ادب اور مغربی علوم کا مذاق پیدا کیا جائے بلکہ علمی اور ادبی مضامین پر تبصرہ کا اہتمام بھی کیا جائے اور ساتھ ہی ایک اخبار کے ذریعے عوام کو حالات حاضرہ سے آگاہ کیا جائے۔ یہ اخبار انگریزی دونوں زبانوں میں ہو اور اس کے ممبر ہندو، مسلمان اور انگریز تینوں ہوں تاکہ باہمی قومی مغایرت اور مذہبی آہستہ آہستہ کم ہو جائے۔ اس ہفتہ وار اخبار کا نام علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ رکھا گیا۔ جو ۱۸۶۶ء میں جاری ہوا کچھ عرصے کے اخبار سہ روزہ ہو گیا۔ اس اخبار کا ایک کالم اردو میں اور ایک کالم انگریزی میں ہوا کرتا تھا۔ سرسید کی تعلیمی تحریک کے بڑھنے میں اس اخبار کی اہمیت اور افادیت سے ہرگز انکار نہیں کیا جاسکتا۔

سائنٹفک سوسائٹی کے مقاصد میں یہ بھی شامل تھا کہ ہندوستان میں کاشتکاری کے مروجہ طریقوں میں تبدیلی کی جائے تاکہ ایک طرف کاشتکار اور صنعت کار کی معاشی حالت بہتر ہو تو دوسری طرف حکومت کی آمدنی میں اضافہ ہو اور اسی پیش نظر مغرب کے ٹیکنیکی علوم کو اردو میں منتقل کیا گیا اور بالخصوص رابرٹ اور ٹینیسن کی میکانیکس کی کتابوں کو جامہ پہنا دیا اور ہندوستانیوں کو یورپ کے زراعتی کلوں اور ہتھیاروں کو سمجھنے اور ان کے استعمال کرنے کی تعلیم کا اہتمام ترجموں کے ذریعے سے کیا گیا۔ اور ایک کتاب بنام قدیم نظام دیہی ہندوستان میں سرسید نے تالیف کی اس کا ایک نسخہ بھی انڈیا آفس لائبریری میں موجود ہے۔

سرسید نے تعلیمی تحریک کے سلسلے میں وائسرائے ہند کو ایک یادداشت ۱۸۶۷ء میں پیش کی اس میں ذیل کی درج تھیں جو وقت کی پکار کے مترادف تھیں:

۱۔ مختلف علوم و فنون کی اعلیٰ تعلیم کا دیسی زبانوں میں خاطر خواہ اہتمام کیا جائے،

۲۔ امتحانات کا ذریعہ انگریزی کے ساتھ ساتھ دیسی زبانوں میں بھی تسلیم کیا جائے،

۳۔ مختلف فیکلٹیوں میں جس طرح کامیاب طالب علموں کو سندات دی جاتی ہیں اسی طرح اردو ذریعہ امتحانات میں شریک ہونے والے کامیاب طلبہ کو بھی دی جائیں،

۴۔ کلکتہ یونیورسٹی میں ایک اردو شعبہ کا انتظام کیا جائے اور

۵۔ شمالی یا مغربی ہند کی کسی ایک یونیورسٹی کو اردو یونیورسٹی بنایا جائے۔

اس یادداشت کے پیش نظر جب حکومت نے کلکتہ یونیورسٹی کو ختم کر کے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا فیصلہ کیا تو سرسید نے نہ صرف کنارہ کشی اختیار کر لی بلکہ اس فیصلہ کی سخت مخالفت کی۔ حالات کا جائزہ لینے کے بعد حکومت کو فیصلہ پر نظر ثانی کرنا پڑی۔

ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم پنجاب نے ۱۸۶۸ء میں سرکار پنجاب کو ایک میمورینڈم ارسال کیا۔ جس میں یہ سفارش کی کہ حکومت لاہور میں اردو یونیورسٹی اور دہلی میں دائرۃ الترجمہ قائم کرے اور اگر دونوں صوبوں کے لیے ایک اردو یونیورسٹی

رنا ہے تو اس کا مقام دہلی ہو سرسید نے اعلیٰ پیمانے پر جدید قسم کی درسگاہیں اور تعلیمی ادارے قائم کرنے کے لیے ستان کے سفر کو ضروری سمجھا تا کہ وہاں کی طرز تعلیم سے وہ واقفیت حاصل کریں اور اس کی روشنی میں مسلمانوں کے لئے سگاہوں کا منصوبہ بنا سکیں۔ آخر کار انہوں نے انگلستان کے سفر کا مصمم ارادہ کرلیا۔ اگر چہ ان کی مالی حیثیت اس کی اجازت یں دیتی تھی تاہم محسن الملک نواب سید مہدی علی کے الفاظ میں: "جب سید احمد خاں لندن جانے کو تھے تو مالی مشکلات اس م کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادے کو پورا نہ کرسکتا۔ انہوں نے اپنے کتب خانہ کو بیچا، گھر اور کوٹھی رہن رکھا اور سفر کی تیاری کی۔ انہوں نے بارہا مجھ سے اس بارے میں پیشتر ذکر کیا تھا کہ میرا مقصود پورا نہیں ہو سکتا جب تک ں بذات خود اس اصول و طرز تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کرلوں۔"

الغرض یکم اپریل ۱۸۶۹ء کو وہ بنارس سے لندن کے لیے روانہ ہو گئے اور انہوں نے تمام حالات سفر کو ایک سفرنامہ کی ورت میں تحریر کیا جو تہذیب الاخلاق میں باقاعدہ شائع ہوتا رہا۔ سرسید نے انگلستان کے طرز تعلیم کو دیکھا۔ کیمبرج اور کسفورڈ یونیورسٹیوں کا خود جا کر معائنہ کیا اور وہاں کے ماہرین تعلیم سے صلاح و مشورہ کرنے کے بعد ایک تعلیمی منصوبہ بنایا ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے کارآمد اور مفید ثابت ہوا۔ دوسرے لفظوں میں ایک کالج قائم کرنے کے لیے سرسید نے ک اسکیم تیار کی اور یہ اسکیم صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو ارسال کی جو حکومت ہند نے بخوشی منظور کرلی اور اینگلو اورینٹل کالج قائم کرنے کا فیصلہ کرلیا اور مسلمانوں کے آرا کے پیش نظر علی گڑھ کو مجوزہ کالج کے لیے انتخاب کیا گیا۔ ایک کمیٹی استگار ترقی تعلیم مسلمانان ہند نے دسمبر ۱۸۷۲ء میں ابتدائی مدرسہ کے قیام کی تجویز پاس کی اور ۱۸۷۵ء میں مخالفت کے باوجود ں مدرسہ کا افتتاح ہوا اور باقاعدہ تعلیم شروع ہو گئی۔

سرسید نے ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد علی گڑھ میں سکونت اختیار کی اور اپنی انتھک مساعی، اپنے فرصت کے اوقات اور اپنی تمام صلاحیتیں کالج کے قیام کے لیے وقف کردیں اور ۱۸۷۷ء میں وائسرائے ہند نے اس کالج کا سنگ بنیاد کھا جس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور اردو میں مدرسۃ العلوم تجویز کیا گیا۔

سرسید کی خواہش کے مطابق مسلمانوں نے متفقہ طور پر کالج کو یونیورسٹی کا روپ دینا منظور کیا۔ اس تعلیمی ادارے کی بنیاد چھ نکات پر رکھی گئی جن میں سے درج ذیل اہم ہیں:

۱) اس یونیورسٹی کا نظم و نسق مکمل طور پر حکومت کے دخل سے آزاد رہیگا۔

۲) یہ یونیورسٹی خود کفیل ہو گی اور کسی خارجی امداد کو قبول نہیں کریگی نیز اپنی سالانہ آمدنی خود پیدا کریگی۔

۳) اس یونیورسٹی کی اقامتی زندگی اور اس کے ضابطوں کی پابندی اتنی ہی لازمی ہو گی جتنی حصول تعلیم ضروری اور لابدی گی۔

سرسید نے انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے جنوری ۱۸۷۷ء کے شمارے میں تحریر فرمایا کہ اس کالج کی بنیاد ایسے اسباب پر رکھی گئی ہے جو ماضی میں اس ملک کو پہلے کبھی دیکھنے کے لیے نصیب نہیں ہوئی۔ یہ کالج بے تعصبی اور ترقی کے اصول پر مبنی ہے س کی نظیر مشرق کی تاریخ میں ہنوز نہیں پائی جاتی ہے۔

سرسید کی رائے میں یہ کالج جدید و قدیم خیالات کا سنگم بنے اور مشرق و مغرب کے درمیان پل کا کام دے دوسرے

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۳ء

شرقی علوم کے احیاء کے ساتھ مذہبی تعلیم کی اشاعت کا اہتمام کرے اور تیسرے آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے ہونے پر یہ کالج خصوصی توجہ دے اور ان میں نمایاں فرق صرف یہ ہو کہ جہاں انگریزی یونیورسٹیوں میں عیسائیت کی تعلیم دی جاتی ہے وہاں اس کالج میں اسلامیات کی تعلیم دی جائے آج یہ کالج مسلم یونیورسٹی (علی گڑھ) کے نام سے موسوم ہے اور یہ ہندوستان ہی میں نہیں بلکہ ایشیا میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا تعلیمی اور ثقافتی مسلم ادارہ تصور کیا جاتا ہے۔

مدرسۃ العلوم کے قیام کے بعد سرسید نے ایک کل ہند تعلیمی ادارے کے قیام کی ضرورت محسوس کی اور ۱۸۸۶ء میں انہوں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جو بعد میں آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم ہو گئی۔اس کے مقاصد میں مسلمانان ہند کے عمل میں اتحاد اور ارادوں میں ہم آہنگی پیدا ہو اور اپنی قومی تعلیم، معاشرتی ترقی اور اقتصادی استحکام کے بارے میں جمع ہو کر تبادلہ خیال کر سکیں۔ آج یہ کانفرنس مسلمانوں کی علمی اور تعلیمی بلکہ درپردہ تہذیبی اور ثقافتی سرگرمیوں کا محور بن گئی ہے اور سرسید کی وفات حسرت آیات کے بعد بھی یہ کانفرنس روز بروز ترقی کر رہی ہے اور اسی کانفرنس کی صدائے بازگشت کے طور پر ہندوستان کے مختلف مقامات پر مسلم ادارے قائم ہوئے جن میں انجمن اسلام بمبئی (۱۸۷۵ء) انجمن حمایت اسلام لاہور (۱۸۸۵ء) انجمن اسلام جنجیرہ (۱۹۰۷ء) اور اس قبیل کے دیگر تعلیمی ادارے قابل ذکر ہیں۔

اس ضمن میں ایک اور امر کی طرف اشارہ کرنا بھی ضروری اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ انگلستان سے واپسی کے بعد سرسید نے تہذیب الاخلاق نامی رسالے کا اجرا کیا جو انگلستان کے ٹیٹلو، اسپیکٹیٹر اور گارجین نامی رسالوں کے طرز پر تھا۔ تہذیب الاخلاق ابن خازن کی کتاب کا نام ہے جو سرسید کو بہت پسند آئی۔اس رسالے نے جہاں معاشرتی، اصلاحی اور لسانی حیثیت سے زبردست کام کیا ہے وہاں سرسید کے تعلیمی افکار اور اعمال کی اشاعت میں بھی معقول رول ادا کیا ہے تہذیب الاخلاق تین ادوار میں نکلا۔ پہلا شمارہ ۱۸۷۰ء میں شائع ہوا اور ۱۸۷۶ء تک نکلتا رہا۔بعد میں تین سال اور تیسرے دور میں بھی تین سال تک برابر جاری رہا۔اور آج بھی کوئی دس سال سے برابر نکل رہا ہے جس کے لیے سابق وائس چانسلر سید حامد صاحب قابل مبارکباد ہیں۔

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سرسید احمد خاں نے اگرچہ اپنا تن من دھن سب کچھ مسلمانوں کے لئے وقف کر دیا تھا مگر مسلم قوم نے انکے احساسات کو فراموش ہی نہیں کیا بلکہ ان پر فبن کا بھی الزام لگایا جو ان کی موت کا سبب بنا۔ع

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے!

.فیسر محمد یٰسین *

سر سیّد کی سیاسی بصیرت

مغلیہ حکومت کے زوال کے بعد نہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کا اقتدار ختم ہو گیا بلکہ ان کے معاشی حالات بھی ابتر
.نے لگے اور مسلم معاشرہ میں ایسی خرابیاں پیدا ہونے لگیں جو اس بحرانی دور کا خاصہ تھیں۔ اٹھارھویں صدی میں علمائے
.ام اور ملی رہنماؤں نے قومی قیادت کا بیڑا اٹھایا لیکن وہ اپنی "طوفانی قیادت" کے انجام سے بے نیاز رہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ
ب کوئی قوم حال کی روشنی میں اپنی حالت سدھارنے کے بجائے ماضی کے خول میں سمٹتی ہے تو پھر اس کے سنبھلنے کے
کانات کم ہوتے جاتے ہیں۔ علماء انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت اور علاقائی سطح پر ابھرتی ہوئی سیاسی قوتوں سے بے خبر
ں رغمی جنگ لڑتے رہے اور پسپا ہوتے رہے۔ ۱۸۵۷ء کے غدر کے دوران جب میرٹھ چھاؤنی سے بغاوت کی چنگاریاں شمالی ہند
یں پھیلنے لگیں تو بوڑھے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر نے کمان سنبھالی لیکن وہ بھی انگریزوں کی عیاری، ہندوستانیوں کی غداری
راہنوں کی سازش کے آگے بے بس ہو گئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کو شاندار فتح نصیب ہوئی اور ہندوستانیوں کو
ں ناک شکست۔ اس ہار میں انگریزوں سے دشمنی کا سب سے زیادہ خمیازہ مسلمانوں کو بھگتنا پڑا۔ غدر کے دوران اور اس کے بعد
رنگیوں نے مسلمانوں کو پھانسی دینے اور ان کی جائیدادیں ضبط کرنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ انھیں اپنا مستقل دشمن سمجھ کر
ن کو حکومت اور انتظامیہ سے دور رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ اس اعتماد شکنی سے اکثریتی طبقہ نے بھرپور فائدہ اٹھایا مگر
سلمان ذلیل و خوار ہوتے رہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سر سید نے اپنی دانشمندی، مصلحت پسندی، بصیرت اور دور اندیشی سے
م لے کر علی گڑھ تحریک کی بنیاد ڈالی۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سر سید کو قدرت نے ہندوستانی مسلمانوں کی حالت سدھارنے اور انھیں قعر مذلت سے نکالنے
کے لئے ہی معمور کیا تھا۔ ہوش سنبھالتے ہی انھوں نے اندازہ لگا لیا کہ انگریز ہندوستان میں پوری طرح اپنے قدم جما چکے ہیں
ر مستقبل قریب میں ان کی پسپائی کا خواب بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔ چنانچہ انھوں نے مغلیہ دربار سے وابستگی کے بجائے انگریز
سرکار کی ملازمت کو ترجیح دی۔ اس دوران ہندوستان کے سیاسی حالات کا جائزہ لے کر وہ اس نتیجہ پر پہونچے کہ انگریزوں سے
زید نبرد آزمائی خلا میں تیر چلانا اور اپنی بربادی کو دعوت دینا ہے۔ اگر اپنی بقا منظور ہے تو ان کے ساتھ باعزت سمجھوتہ ضروری
ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ابتدائی مرحلہ میں انگریز حاکموں کے دل و دماغ سے وہ شکوک رفع کر دینا چاہئے جن کی وجہ سے مسلمانوں
سے خائف تھے۔ "اسباب بغاوت ہند" وہ معرکتہ الآرا تصنیف ہے جس نے بہت حد تک انگریزوں کو مسلمانوں کی وفاداری تسلیم

* سابق پروفیسر شعبۂ انگریزی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

کرنے پر آمادہ کیا اور پھر سیاسی پشت پناہی ملنے پر سرسید کو اپنے اصلاحی کاموں کو سر انجام دینے کے لیے زمین ہموار ہونے لگی۔ علی گڑھ تحریک مسلمانوں کو عملی سیاست کے بجائے تعلیم، اصلاح معاشرہ اور اتحاد و تنظیم کی طرف متوجہ کرنے کی پہلی سنجیدہ کوشش تھی۔ سرسید کو برادران وطن کی تعلیمی برتری کا شدید احساس تھا۔ انھیں یہ بات بھی اچھی طرح معلوم تھی کہ انڈین نیشنل کانگریس کے مقاصد ملک کی آزادی اور جمہوری نظام کا قیام تھا لیکن غیر تعلیم یافتہ مسلمان اس سلسلہ میں نہ ملک کے لئے کچھ کرسکتے تھے اور نہ ملت کی ترقی میں معاون ہوسکتے تھے۔ لہٰذا انہوں نے مسلم قیادت کا رخ سیاست سے تعلیم کی طرف موڑ دیا۔ سرسید نے مسلمانوں کے تشخص، اردو زبان اور مسلم کلچر کے تحفظ کے لئے جو نسخہ کیمیا تجویز کیا وہ تعلیم و تنظیم ہی تھی۔ ایم۔اے۔او کالج کا قیام، تہذیب الاخلاق کا اجرا، سائنٹفک سوسائٹی، ہندو مسلم اتحاد اور قومی یک جہتی کا تصور ان کے عظیم تعمیری مقاصد کی عکاسی کرتے ہیں۔

علی گڑھ تحریک کے ذریعہ سرسید نے پوری ملت کو نئے مستقبل کی بشارت دی اور رفقائے سید نے اس ملی تحریک کو بڑے جوش و انہماک سے آگے بڑھایا۔ ملک میں مسلم ادارے قائم ہونے لگے اور مسلمانوں میں سیاسی بیداری بھی پیدا ہونے لگی۔ بدقسمتی سے پہلی جنگ عظیم کے بعد ہندوستانی سیاست نے ایسی کروٹ لی کہ کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مفاہمت نہ ہوسکی اور بالآخر انگریزوں نے ہندوستانیوں کے باہمی نفاق سے فائدہ اٹھا کر ملک کی تقسیم کردی۔ ۱۹۴۷ء میں غدر کے بعد نوے سال کے اندر ہی برصغیر کے مسلمانوں کو دوسرا زبردست جھٹکا لگا۔ آزادی کے جلوس میں قتل و غارت گری کا جو بھیانک ڈرامہ کھیلا گیا اس کے تصور سے دل کانپ جاتا ہے۔ لاکھوں آدمی مع اہل و عیال ہندوستان و پاکستان کی سرحدوں میں مہاجر ہوگئے اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ایک دوسرے کے خلاف نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ آزاد ہندوستان میں جب پنج سالہ منصوبوں کی تکمیل کے بعد ملک کے مختلف طبقوں اور فرقوں کی ترقی کے اعداد و شمار سامنے آئے تو معلوم ہوا کہ ہندوستانی مسلمان ترقی کی دوڑ میں برادران وطن سے بہت پیچھے ہوگئے۔ تعلیم یافتہ اور متمول مسلم طبقہ نے پاکستان کا رخ اختیار کرلیا تھا لیکن ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمان نہ صرف تعلیم بلکہ معیشت میں بھی پسماندہ رہ گئے۔ مسلمانوں پر ملک سے غداری کا الزام لگایا گیا اور انھیں تقسیم کا ذمہ دار بھی ٹھہرایا گیا۔ پولیس اور فوج میں ان کی ملازمت کے دروازے بند ہوگئے۔ عدلیہ اور سول سروس میں بھی ان کی نمائندگی برائے نام رہ گئی۔ اردو کو پورے ملک بالخصوص ہندی پردیش کی ریاستوں میں تعلیمی نظام سے خارج کردیا گیا۔ مسلم قیادت کے لئے مولانا آزاد، ڈاکٹر سید محمود، مولانا حفظ الرحمن اور پروفیسر ہمایوں کبیر میدان میں رہ گئے۔ ان مشاہیر نے اپنی بساط بھر کوشش کی کہ مسلمانوں میں خود اعتمادی پیدا ہو، ان کے اندر ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ ابھرے تاکہ وہ پھر اہل وطن کے شانہ بشانہ چل سکیں مگر ایسا نہ ہوسکا۔ یہ وطن عزیز کے لئے اتنا ہی بڑا المیہ ہے جتنا کہ مسلمانوں کے لئے۔

جس زمانے میں سرسید علی گڑھ تحریک کے ذریعہ مسلمانوں کی تعلیمی و معاشرتی اصلاح کے لئے جدوجہد کر رہے تھے وہ دور بھی کچھ کم پر آشوب نہیں تھا۔ ۱۸۵۷ء میں غدر کے بعد مسلمانوں نے جو نقصانات اٹھائے ان کا مقابلہ ۱۹۴۷ء کی تباہ کاریوں سے کیا جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ آزادی کے بعد گزشتہ پچاس برسوں میں مسلمانوں نے فرقہ وارانہ فسادات سے کافی نقصان اٹھایا ہے۔ فسطائی قوتیں برابر ان کے خلاف سازش کرتی رہیں اور انھیں اکثریتی طبقے اور سرکاری عملے کے ایسے افراد سے

ن ملتی رہی جو "ہندو، ہندی، ہندوستان" کے نعرے لگاتے رہے۔ گاندھی ٹوپی کے نیچے کیا ہے اس کا اندازہ ریاستی ں اور پارلمنٹ میں مسلم نمائندگی سے کیا جا سکتا ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ جہاں کہیں مسلمانوں کی اچھی آبادی ہے وہاں ی طور پر انتخابی حلقوں کی حد بندی کچھ اس طرح سے کی گئی کہ مسلم امیدوار کبھی اپنے بل بوتے پر کامیاب نہ ہوسکیں۔ ندوستان میں مسلمانوں کی پسپائی اور پسماندگی کی داستان طویل ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہے کہ آئین ہند میں دی گئی دہانیوں کے خلاف سرکاری ذرائع ابلاغ اور نیشنل پریس نے برابر مسلم پرسنل لا کی جگہ یونیفارم سول کوڈ، اردو کی جگہ ی، فارسی رسم الخط کی جگہ ناگری لپی اور مشترکہ قومیت کی بجائے اکثریتی ثقافت کا پرچار شروع کر دیا ہے۔

دسمبر ۱۹۹۲ء کے المناک حادثہ کے بعد سیکولرزم اور قومی یک جہتی کے تصور کو جو دھکا لگا اس سے ہم ابھی تک سنبھل ائے ہیں۔ مسلم ووٹ بینک کو اپنے حق میں کرانے کے لئے سیاسی پارٹیاں اپنی پینترہ بازیاں اور منافقانہ سازشیں جاری ہوئے ہیں لیکن مسلمان تذبذب اور عدم یقین کا شکار ہے۔ اس بحرانی دور میں کیا مسلمان علی گڈھ تحریک سے کچھ سبق سکتے ہیں۔ علی گڈھ تحریک بنیادی طور پر تعلیمی و معاشرتی اصلاح کی تحریک تھی اس میں سیاسی پہلو زیادہ نمایاں نہیں لیکن ر کے مضامین اور خطبات کے مطالعہ سے یہ بات صاف ظاہر ہے کہ جب اپنے اندر حریف کو مات دینے کی سکت نہ ہو تو اپنی ں کو تعمیری کام میں لگا دینا چاہئے۔ علی گڈھ تحریک کی معنویت اور اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آج ملک تعلیمی، معاشرتی اصلاح کی کئی تنظیمیں کام کر رہی ہیں۔ مقامی و ریاستی سطح پر اکثر انجمنیں قائم ہوئی ہیں جن سے آئندہ و ترقی کی امید کی جا سکتی ہے۔ یو۔ پی میں رابطہ کمیٹی، بہار میں تعمیر ملت کمیٹی، مرکزی مسلم پرسنل لا بورڈ، ملی کونسل وغ اردو کی بیشتر تنظیمیں اپنے نصب العین کے لئے کوشاں ہیں۔

جہاں تک مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کا سوال ہے اس تلخ حقیقت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا کہ اکثریتی طبقہ چاہے وہ بھی پارٹی سے تعلق رکھتا ہو، مسلمانوں کی الگ سیاسی جماعت کا وجود گوارا نہیں کر سکتا۔ ہماری آبادی کہیں بھی ۱۵ سے ۲۰ سے زائد نہیں۔ ہمارے پاس اتنا سرمایہ نہیں کہ "جنگ زرگری" جس کا دوسرا نام الکشن ہے، کا خواب دیکھ سکیں۔ یہی نہیں تہ تجربوں سے بھی ثابت ہوا ہے کہ مختلف سیاسی پارٹیاں ہمارے نام نہاد لیڈروں کو خرید لینے یا سماج دشمن عناصر کے ان کے حوصلے پست کرنے کے فن میں ید طولیٰ رکھتی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں سیاسی فضا مسلمانوں حق میں نہیں ہے۔ راقم الحروف کا خیال ہے کہ مسلمان اپنی الگ سیاسی پارٹی بنانے سے پہلے اپنے کو متحد کریں، تعلیم میدان میں آگے بڑھیں اور اپنی معاشرتی حالت بہتر بنانے کے لئے سخت محنت کریں۔ اس سے بھی ضروری ہے کہ ان دین سے اپنا رشتہ استوار کریں اور ملی اتحاد کے لئے ذاتی مفادات سے اوپر اٹھنے کی کوشش کریں۔ ہمیں نہ تو "آدم سینا" نے کی حماقت کرنی چاہئے اور نہ "فرنٹ اور ٹکٹ" فارمولہ کے تحت خود سپردگی اور حلقہ بگوشی قبول کر کے "بے مسئلہ فرقہ" لو اپنے حق میں آب حیات سمجھنا چاہئے۔ ہمارے لئے "بے مسئلہ فرقہ" (No Problem community) بننے کا انجام اتنا رناک ہو سکتا ہے جتنا کہ جذباتیت سے مغلوب ہو کر کوئی اقدام کرنا۔ موجودہ حالات میں ہمارے لئے اشد ضروری ہے کہ ایسی غیر سیاسی جماعت بنائیں جس میں علماء، اساتذہ، وکلا اور سیاسی پارٹیوں کے ہمدرد، قائدین اور صحافی سب مل کر ایک کے 'Think tank' کا کام کریں اور اہم مسائل پر ملت کی رہنمائی کریں۔

تہذیب الاخلاق، علی گڈھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

عقیلہ شاہین *

تبیین الکلام

خواجہ الطاف حسین حالی نے سر سید کی سوانح حیات جاوید کے دیباچہ میں لکھا ہے۔

"ہم کو اس کتاب میں اس شخص کا حال لکھنا ہے جس نے چالیس برس تعصب اور جہالت، کا مقابلہ کیا ہے۔ تقلید کی جو کاٹی ہے۔ بڑے بڑے علما و مفسرین کو لتاڑا ہے اماموں اور مجتہدوں سے اختلاف کیا ہے ـــــ جس کو مذہب کے لحاظ سے ایک گروہ نے صدیق کہا ہے تو دوسرے نے زندیق خطاب دیا ہے۔ پالٹکس کے لحاظ سے کسی نے ٹائم سرور سمجھا ہے تو کسی نے نہایت راست باز لبرل جانا ہے ـــــ وہ ہم میں پہلا شخص ہے جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی ہے"

"اس بات کا ہم کو خود بھی یقین ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ اوروں کو بھی یقین دلائیں کہ سر سید کا کوئی کام بھلائی سے خالی نہ تھا اس لئے ضرور ہے کہ ان کے ہر کام کو نکتہ چینی کی نگاہ سے دیکھا جائے کیونکہ صرف سچ میں ہی کرامت ہے کہ جس قدر اس میں کرید کی جاتی ہے اسی قدر اس کے جوہر زیادہ آب و تاب سے ظاہر ہوتے ہیں"

صادق القول حالی کی گواہی اور تجزیہ کے سوا بھی اس دور کی تاریخی سیاسی اور تمدنی کیفیت کا جائزہ لینے والا کوئی بھی حق پسند اسی نتیجے پر پہونچے گا کہ سر سید کی طبیعت میں شاہ ولی اللہی تحریک کے اوصاف خلوص، سچائی اور علم و عمل کی لگن موجود تھی اور اسی نسبت سے دین محمدی کی حقانیت پر جان و تن لٹا دینے کی سر شاری رچی بسی ہوئی تھی ملک کی زمام اختیار مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل جانے کا انکو دکھ اس قدر تھا کہ اس صورت حالی کو اپنی آنکھوں سے دیکھنے کی بہ نسبت یہاں سے ہجرت کر جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ دلی اجڑنے کے مناظر دیکھ کر دلی کا رہنا ہی ترک کر دیا تھا۔ احساس تھا کہ کبھی یہ مقام

چپے چپے پہ ہیں یاں گوہر یکتا تہ خاک　　دفن ہو گا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز　　(حالی)

اسی دلی کی محبت نے ان سے آثار الصنادید لکھوائی تھی۔ مگر یہ بھی جانتے تھے کہ سیاسی تغیر اور صحیح اخلاقی اقدار کے بغیر نہ غیر ملکی ٹل سکتے تھے نہ اپنا کھویا ہوا وقار واپس آسکتا تھا وقت کا فیصلہ ایک زیادہ با عمل ۔ زیادہ منظم اور زیادہ سیاسی موجھ بوجھ رکھنے والی قوم کے حق میں ہو چکا تھا۔

ہوائیں انکی فضائیں انکی، سمندر انکا جہاز انکے　　گرہ بھنور کی کھلے تو کیونکہ بھنور ہے تقدیر کا بہانہ　　(اقبال)

* Printing Gallery, Ist clair Ave, ONTARIO, 'CANADA

سرسید کا اپنا خاندان متمول اور صاحب علم لوگوں پر مشتمل تھا۔لیکن سب خاندانوں کا یہ حال نہیں تھا۔ اکثر کم علم اور وقتی د
بستگی کے مشاغل میں لگے رہتے تھے جس کا سرسید کو شدید احساس تھا۔ عام طور پر ملک میں علمی لیاقت کا فقدان تھا۔ سیاست
معاشیات معاشرتی علوم کے ماہرین ناپید تھے۔ جغرافیہ کی ترقی مسلمانوں ہی کے ذریعہ ہوی تھی حساب اورعلم ہیت ان کے
ذریعہ ہندوستان سے نکل کر دنیا بھر میں متعارف ہوا تھا اور الجبراء تو خاص انہیں کا ایجاد کردہ علم ہے۔ لیکن اب تو شیخ ا
سرہندی (مجدد الف ثانی) نے بھی حساب کے متعلق یہ فرمادیا تھا "ایسے علم سے کیا فائدہ جس سے آخرت میں کچھ فائدہ نہ
حالانکہ خود حساب کے ماہر تھے۔ ابوالاعلیٰ مودودی نے اسلام کے مجددین اور اسلامی علماء کی ناکامی کے اسباب کو اس طرح و
کیا ہے

"جس دور میں شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز اور شاہ اسماعیل شہید پیدا ہوئے اسی دور میں یورپ نیند سے بیدار ہو کر
طاقت کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ اور وہاں علم و فن کے محققین اور موجدین اس کثرت سے پیدا ہوئے کہ انہوں نے دنیا کی د
بدل ڈالی۔ جنھوں نے اخلاقیات، ادب، قانون مذہب، سیاست اور علوم عمرانی پر زبر دست اثر ڈالا۔ اور انتہائی جرات و بے با
کے ساتھ قدیم دنیا پر تنقید کر کے نظریات و افکار کی ایک نئی بناء ڈالی۔ پریس کے استعمال، اشاعت کی کثرت۔ عام فہم زبا
کو ذریعہ اظہار بنانے کی وجہ سے ان کے خیالات نہایت وسیع پیمانے پر پھیلے۔ انہوں نے افراد کو نہیں قوموں کو بحیثیہ
مجموعی متاثر کیا۔ ذہنیتیں بدل دیں، اخلاق بدل دئے۔ نظام تعلیم بدل دیا۔ نظریہ حیات اور مقدر زندگی بدل دیا تمدن ا
سیاست کا پورا نظام بدل دیا۔

اسی زمانے میں مشین کی ایجاد نے صنعتی انقلاب برپا کیا جس نے ایک نیا تمدن، نئی طاقت اور نئے مسائل زندگی
ساتھ پیدا کیا۔ انجینیرنگ کو غیر معمولی ترقی ہوئی جس سے یورپ کو وہ قوتیں حاصل ہوئیں کہ پہلے دنیا کی کسی قوم کو حا
نہ تھیں۔ اسی زمانے میں قدیم فن جنگ کی جگہ نیا فن جنگ، نئے آلات اور نئی تدابیر کے ساتھ پیدا ہوا۔ باقاعدہ ڈرل کے ذر
فوجوں کو منظم کرنے کا سلسلہ شروع ہوا جس کی وجہ سے پلٹنیں میدان جنگ میں مشین کی طرح حرکت کرنے لگیں اور پرا
طرز کی فوجوں کا ان کے مقابلے میں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔"

مودودی صاحب کے، تو اتنے درست تجزیئے کے بعد بھی اہل مغرب میں ہزاروں کیڑے نکالے ہیں لیکن سر
باریک بینی سے حالات کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ تاریخ فیروز شاہی اور آئین اکبری کی تصحیح کے دوران ہی ان کو اندازہ ہوگیا
کہ مسلمانوں کی حکومتیں اور انکے سربراہ ترویج علم اور شرف انسانیت کی اشاعت کے لحاظ سے کتنے پانی میں ہیں انہوں نے
انگلستان کے دوران اس تگ و تاز کا بھی جائیزہ لے لیا تھا جس نے بابر کی فتح پانی پت کے پہلے ہی بحر ہند کو ایک پرتگیز
جھیل بنادیا تھا جس میں جہاز رانی پر تگیزی اجازت ناموں کے بغیر مخدوش بلکہ ناممکن تھی (رود کوثر ص۱۲۹)

انگلستان سے واپسی پر انہوں نے کالج کی بنیاد ڈالی کیونکہ وہ مسلمان نوجوانوں کو مشنریوں کی دست برد سے
چاہتے تھے۔ وہ اپنے بیٹے سید محمود ہی کی تعلیم سے مطمئن نہیں تھے "جب ان کا تقرر ہائی کورٹ کی ججی پر ہوا ہے تو سرسید
بارہا یہ بات کہی کہ میرا جو اصلی مقصد سید محمود کی تعلیم سے تھا وہ حاصل نہیں ہوا۔ سید محمود ملازمت کے صیغے میں چاہے کتنی
ترقی کریں مگر قوم کو جس قسم کے تعلیم یافتوں کی ضرورت ہے اس میں سید محمود سے کچھ مدد نہیں پہونچ سکتی۔" (مو

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، ۱ اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

وثر ص ۱۴۷) اسباب بغاوت ہند میں بھی بڑے دکھ سے اس بات کا تذکرہ کرتے ہیں کہ کالے صاحب پولیس کے سپاہیوں کو
اتھ دے کر جوتوں سمیت مسجدوں میں گھس آتے ہیں اور ہمارے رسول اور دیگر اکابر کی اہانت کرتے ہیں۔ ایک طرف
مرانوں کا اور مشنریوں کا غرور عروج پر تھا اور دوسری طرف جنگ ہارنے کے بعد بھی غیرت کے میدان کی چنگاریاں ابھی
نڈی نہیں ہوئی تھیں ابھی تو شہیدان آزادی کے کفن بھی میلے نہیں ہوئے تھے، جسم شل تھے مگر دماغ و دل آمادہ پیکار۔ یہ
یفیت خاک وطن کے ذروں میں ایک خاموش گونج بن کر بسی ہوئی تھی۔ اسلامی حمیت اور کرب انگیز حالت نے ایک راستہ
کھایا اور سر سید نے سرزمین عرب کے تین مذاہب یہودیت۔ عیسائیت اور اسلام کا تقابلی بیان 'تبیین الکلام' کے نام سے لکھنا
روع کیا جس میں اناجیل کی تفسیر اس طرح کرنی شروع کی کہ اگر موجودہ اناجیل کو صحیح بھی مان لیا جائے تب بھی ان سے
ضرت عیسیٰ اور عیسائیت کے متعلق وہی عقائد اخذ ہوں گے جنہیں اسلام صحیح سمجھتا ہے (موج کوثر صفحہ ۱۵۸) بقول اقبال

ہفت کشور جس سے ہوں تسخیر بے تیغ و تفنگ — تو اگر سمجھے تو تیرے پاس وہ ساماں بھی ہے

مقصد خود سر سید کی نگاہ میں کتنا عظیم تھا اور اس کے حصول کے لئے انہوں نے کس قدر اہتمام کیا تھا حالی کے قلم سے نکلی
ئی عبارت اس کی گواہ ہے۔ "مطلب یہ تھا کہ اصول اسلام اور اصول اہل کتاب میں جہاں تک ہو سکے مطابقت ثابت کی جائے
ر جہاں اختلاف پایا جائے وہاں اختلاف کی وجہ بیان کی جائے۔ اسلام کی نسبت جو بد گمانیاں عیسائیوں کو ہیں وہ رفع کی جائیں
ر مسلمان جو موجودہ بائیبل کو مطلقاً "استناد کے قابل نہیں سمجھتے اور اس میں تحریف لفظی کے قائل ہیں اس غلطی کو دور کیا
ائے،، یہ کام نہایت مشکل تھا اور سلف میں سے کسی نے کبھی ایسا ارادہ نہیں کیا تھا۔۔۔ یہ کام دشواریوں سے خالی نہ تھا انہوں
نے اس تفسیر کے چھاپنے کے لئے کئی ہزار کا پریس رڑکی سے منگوایا۔ اردو ٹائپ کے علاوہ عبرانی اور انگریزی ٹائپ کے
روف بھی منگوائے۔ سالم نامی ایک یہودی کو نوکر رکھا اور اس سے عبرانی پڑھنی شروع کی۔ مولوی عنایت رسول چریا کوٹی
سے، جو عبرانی اور عربی کے بہت بڑے عالم وقت تھے، اعانت حاصل کی۔ بائیبل سے متعلق تمام ضروری کتابیں مہیا
لیں جو کچھ لکھتے اس کا ترجمہ کرنے کے لئے ایک کتاب بیک وقت انگریزی عبرانی اور اردو زبانوں اور رسم الخط میں چھاپی جاتی
ں اور آخر میں تفسیر لکھی جاتی تھی۔،، یہ تمام کثیر اخراجات پورے کس طرح ہوئے تھے۔ ""غدر کے زمانے کی رکی ہوئی
نواہوں اور بجنور کے لئے ہوئے ساماں کا جو معاوضہ ملا سب اسی مد میں خرچ ہوا"۔ یہ تفسیر تحریف لفظی سے انکار کی بنا پر
سمائے اسلام کے خلاف کی اور تثلیث، کفارہ اور تکذیب خاتم النبیین کے غلط ٹھہرانے کی بناء پر عیسائیوں کو بھی پسند نہ آئی۔
رسید کے محققانہ رویے اور مخلصانہ کوشش کو بہت کم داد اور زیادہ تر بے داد سے نوازا گیا۔ نیز اس پر بے انتہا محنت اور روپیہ
رف ہوتا تھا اور بکنے کی بالکل امید نہ تھی۔ اس لیے صرف دو جلد چھپ کر رہ گئیں ـــــ چونکہ اس کا پورا کرنا قوم کی تائید کے
یر ان کی طاقت سے باہر تھا ـــــ مگر جو نمونہ ان کے زبردست ہاتھوں سے تیار ہو گیا ہے۔ اس کے موافق اس تفسیر کا پورا کرنا
ب ویسا ہی مشکل نہیں رہا، جیسا ابتدا میں نظر آتا تھا۔" (حیات جاوید ص ۱۴۹)

تفسیر مکمل تو نہیں ہو سکی لیکن اس کی اہمیت اور ضرورت کا احساس اور مستقبل میں کسی اور سے ہونے
ا خیال حالی اور سر سید دونوں کی پیش بینی اور زمانہ کی نبض شناسی کی دلیل ہے۔ فی زمانہ مشرق و مغرب کے سیاسی اور معیشی

حالات اور ناگفتہ بہ فرقہ وارانہ معاملات کے پیش نظر ہندوستانی مسلمان جس طرح ملکوں ملکوں منتشر ہوئے ہیں ان کو ہر ہر قدم پر مغربی ممالک میں زندگی گذارنے کے لیے تبیینُ الکام کی رہنمائی درکار ہے۔ آج افرنگ کا ہر قریہ اسی طرح فردوس کی مانند ہے بلکہ دن بدن بڑھتی ہوئی ایجادات نے ان کو اور بھی دنیا بھر کے وسائل پر اختیار دے دیا ہے۔ اور ساری دنیا کی سیادت علمی طور پر ان ہی میں آ گئی ہے۔ مشرق وسطیٰ کے مسلماں یا چین و جاپان کے بدھ۔ ہند کے مختلف مذہب والے ہوں یا افریقہ کے قبائلی لوگ سب کے مشیر اور ذہنی و عملی رہنما اس وقت اہل مغرب ہی ہیں ہر بین الاقوامی مسئلے پر انہی کے تدبر اور معاملہ فہمی کے حوالوں سے گفتگو کی جاتی ہے باہمی مسائل نپٹانے کے لئے انہی کے ناخن تدبیر سے اپیل کی جاتی ہے کہیں سرحدی نزع ہوں تو حکم یہی ہونگے۔ کہیں قحط، طوفاں۔ طغیانی، وبا آئے ان ہی کی امداد پہونچے گی زمین کی تہ میں سونا ہیرے چھپے ہوں تو اس کے لئے ان ہی کی خدمات کی ضرورت۔ ہمارے ہم قوم جو یہاں وارد ہوئے ہیں مغرب کا بہ نظر غور مشاہدہ کرنے سے اس نتیجہ پر پہونچتے ہیں کہ ہمارے مساجد کے ائمہ کا دکھایا ہوا مغربی تمدن کا نقشہ اور عیسائی کفار، کا تصور، صحیح نہیں ہے وہ تعلیم و تربیت جس کے ہونے سے ہم اہل مشرق کی آزادی کے خواب کی تعبیریں بھی الٹی ہو گئیں۔ جس ہمت تحمل اور وسعت نظری سے حکومت کرنے کا سلیقہ آتا ہے جس تنظیم عمل۔ تدبیر امور اور انصاف کی روش سے قومیں بنتی ہیں اس کا سرمایہ تو مغرب میں مشرق سے کہیں زیادہ موجود ہے۔ اور سرسید کا یہ اندازہ صحیح تھا کہ اب مشرق کو خاص طور سے مسلمانوں کو اہل مغرب کے متاع دین و دنیا سے آگاہی حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ سرسید کا یہ کہنا بھی صحیح تھا کہ اعلیٰ درجے کی فنی اور مشینی تربیت صرف انہی کے اداروں میں حاصل ہوتی ہے۔ اہل مغرب کے درمیاں رہ کر ہم شدت سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ نوع انسانی کی بہبودی اور شرف انسانیت کو برقرار رکھنے میں ان کی سرگرمیاں عظیم اور قابل اعتراف ہیں بنیادی حقوق انسانی کے تحفظ کی ذمہداری ان ہی کے سپرد ہے انسانی آبادی کے ہر مسئلہ میں انہی کی سوچ رہنمائی کرتی ہے۔ یہی مزدوری، دست کاروں، خواتین صنعت کاروں، سیاسی اور اخلاقی قیدیوں، یہاں تک کہ کوڑا کرکٹ اٹھانے والوں کے لیے قواعد بناتے ہیں، ان سے کام لینے کے ضوابط تیار کرتے ہیں۔ صحت تندرستی اور طبی مسئلوں میں انہی کی تحقیق سب سے افضل ہے۔ انہوں نے ہی اپنی قوم کو توانا بنانے کے لیے ماں اور بچے کی صحت کے اصولوں پر تحقیقی کتابوں کے انبار لگائے ہیں انہی نے کیسی باریک بینی سے تعمیر قوم کے لئے ہر چھوٹے سے چھوٹے محلے میں باغ، مدرسے، کتب خانے مہیا کئے ہیں کس سوز دلی کے ساتھ ہزارہا اہل ثروت مرتے وقت اپنی اولادوں کو بہت تھوڑا سا ورثہ دیکر خطیر رقومات اسکولوں کالجوں۔ یونیورسٹیوں اور کتب خانوں کے لئے وقف کر دیتے ہیں ان لوگوں نے کھیلوں کے شعبے کو ترقی دیکر انسانی جسموں کو یونانی دیوتاؤں کی سی خوبصورتی اور صحت کے مجسموں میں ڈھال دیا ہے فطرت سے محبت کا حال دیکھئے تو درختوں، پھولوں، جنگلوں، صحراؤں، دریاؤں، چشموں، جھیلوں، تالابوں تک قدرتی خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے لئے جان لڑائے رکھتے ہیں اخلاقی تربیت کو دیکھئے تو ہر شعبہ میں زندگی سے متعلق ایک یونیورسٹی اسی علاقے میں قائم کرنا جہاں کے لوگوں کو اس کی ضرورت ہے انہی کے ہاتھوں رواج پایا۔ اگر پروفیسروں سے ملنے کا اتفاق ہو تو اکثر کو درویش صفت، دو جہاں سے بے نیاز اپنی علمی غلش میں لگے ہوئے ملیں گے۔ یہی ان لوگوں کا دین ہے۔ (اکثر لوگ مروجہ گرجاؤں پر اعتقاد نہیں رکھتے اور مکمل سیکیولر ہیں)۔ عصر حاضر میں مسلمانوں کو سمجھنا ہوگا کہ اب حالات بہت مختلف ہیں۔ اس زمانے میں عیسائیوں کے ساتھ زبانی یا تحریری مباحثے کرنے کا مخاصمانہ طریقہ اس لیے

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

رائج ہوا تھا کہ عیسائی مشنریوں کا طریقہ بھی بہت مخاصمانہ تھا۔ مسلمانوں کو خوف یہ تھا کہ حکومت کے ساتھ کہیں دین کا سرشتہ بھی ہاتھ سے نہ چھوٹ جائے۔ یہی تبدیلی مذہب کا خوف تھا کہ مولوی چراغ علی، ڈپٹی نذیر احمد، سرسید اور بہت سے علماء نے مشنریوں سے چوراہوں اور میدانوں میں مناظرے کیے اور ان کو دلیل سے قائل کیا اس کا دوسرا فائدہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کو اسلام سے صحیح آگاہی بھی حاصل ہو جاتی تھی۔ لیکن اب کسی مسلم ملک پر براہ راست انکی حکومت نہیں ہے نہ ہی اہل مغرب کی عیسائیت میں وہ شدت باقی ہے۔ اب تو پادریوں اور گرجاؤں کو احتساب کے ذریعہ خرابیوں سے پاک کرنے اور نوع انسانی کی بہبودی کی سطح پر تمام مذاہب کی خوبیاں چن لینے کا مقصد ان کے پیش نظر ہے یہ ایک حقیقت ہے کہ یا تو ہمارے اکابر کے اسلام پر اصرار کی شدت کے سبب یا مشرق وسطیٰ میں سیال سونا (زیر زمین تیل دولت) کے سبب مغرب میں پہلے سے کہیں زیادہ وسیع پیمانے پر اسلام کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ فی الحال امریکہ و یورپ کی شاید ہی کوئی یونیورسٹی ایسی ہو گی جہاں مطالعہ اسلام کا شعبہ قائم نہ ہو۔ اسلام کی یہ خاصیت کہ غور سے پڑھنے والوں کو مطمئن کر دیتا ہے اس کے حوالے اکثر بڑے مصنفین کی تحریروں اور تقاریر میں نظر آجاتے ہیں مثلاً دور جدید کا ایک مشہور پروفیسر جو ٹورنٹو میں (انگریزی وادب) ادب کا ماہر سمجھا جاتا تھا قرآن کے ذکر میں ہمیشہ بہت باادب طریقہ اختیار کیا کرتا تھا۔ نارتھروپ فرائی کی ایک کتاب "گریٹ کوڈ" کا پہلا باب اس طرح شروع ہوتا ہے۔ "ایک مقدس کتاب بلند ترین شاعرانہ عظمت کے ساتھ ظہور میں آتی ہے مثلاً قرآن عربی زبان کی خوبیوں سے ایسا آراستہ ہے کہ جہاں جہاں اسلام پہونچا وہاں وہاں عربی زبان بھی حاوی ہوتی چلی گئی۔ اس طرح تالمود بھی عبرانی (پرانی عربی) کے توسط سے سمجھی جاتی رہی ہے اس لیے نہ صرف قرآن بلکہ قرآن کی زبان عربی، یونانی زبانوں سے زیادہ الہامی کتابوں کا ماخذ ہونے کے سبب سے قابل تحصیل ہے۔ "حضرت مریم کا نام عیسائیوں کے نزدیک میری ہے لیکن فرائی مریم کے حق میں فیصلہ دیتا ہے" کیونکہ ارمنی میں یہ لفظ مریم ہی تھا اور قرآن کی تیسری سورۃ میں مریم ہی نام دیا گیا ہے "ایک اور جگہ بھی فرائی قرآن کو بطور سند بھی پیش کرتا ہے" (Great Code- P. 137) "بابل کے بادشاہ کا مشیر Aesop جس نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور دوسری خوبیوں کی وجہ سے یونانی ادب پر بہت اثرات چھوڑے ہیں اتنا عظیم تھا کہ اس کا ذکر قرآن کی دسویں سورہ میں بھی آتا ہے" (Great Code P. 123.) اسی باب میں صفحہ ۲۰۶ پر قرآن اور بائیبل کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے "قرآن اپنا ایک خاص انداز بیان رکھتا ہے اگرچہ اس کو مختلف کاتبوں نے لکھا مگر زبان ایک ہی نبی کی ہے۔ اور اس میں کسی ترمیم یا اضافے کا امکان بھی نہیں ہے اس لیے بائیبل میں ایسی یکسانیت تلاش کرنا مناسب نہیں ہوگا۔ کیونکہ یہ مختلف ادوار اور اذہان کی تالیف ہے اس لیے کی تفسیر بھی مختلف ہو گی"

ان حالات میں مسلمانوں کی نئی نسل کی رہنمائی اس طرف ہونی چاہیے کہ سرسید سوا سو سال پہلے مغربی عقلیت پسندی کے ساتھ اسلامی روح شامل کر کے مسلمانوں کا مستقبل تاب ناک، کرنے کی کوشش میں تھے تا کہ عصر نو کی تشکیل میں اسلام بھی اپنا فعال کردار ادا کر سکے۔ آج مغرب کے مفکر اور دانش ور صنعتی اور سائنسی ترقیوں کو اخلاق اور آفاقی اصولوں سے بار بط بنا کر انسانوں کی روحانی تسکین کا ساماں مہیا کرنا چاہتے ہیں۔ اس دور میں ان دونوں کا ایک دوسرے کی فکر و ادراک سے قریب آنا فطرت کے مقاصد میں مددگار ثابت ہو سکے گا۔ یہی سرسید کی تمنا اور عصر نو کے نام پیغام تھا اور یہی نئی نسل کے لئے عصر نو کی نوید ہو گی۔

ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی *

سرسید فکر و عمل کے بعض گوشے

ماہ و سال حسب معمول گزر رہے تھے کہ ۱۸۵۷ء آ گیا۔۔۔ ہندوستانی مسلمانوں کے لیے قہر سامانیوں کا محضر نامہ۔ گھر لٹ گئے، بچے تہ تیغ کیے گئے۔ جوانوں کو پھانسی نصیب ہوئی، اشراف کے حصے میں ذلت و خواری آئی، حوصلوں نے دم توڑ دیا۔ امیدوں کے چراغ گل ہو گئے۔ یہ سب اس لیے ہوا کہ انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کرنے کی کوشش ناکام ہو گئی تھی۔ حکمراں طبقے نے اس کوشش کو بغاوت سے تعبیر کیا، مسلمانوں کو اپنا حریف جانا اور انھیں ہر طرح سے کچل ڈالنا ضروری سمجھا

"کوئی آفت ایسی نہیں ہے جو اس زمانے میں ہوئی ہو اور یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے کی گو وہ رام دین یا ماتا دین ہی نے کی ہو۔ کوئی بلا آسمان پر نہیں چلی جس نے زمین پر پہنچنے سے پہلے مسلمانوں کا گھر نہ ڈھونڈا ہو۔۔۔ کوئی کانٹوں والا درخت اس زمانے میں نہیں لگا جس کی نسبت یہ نہ کہا گیا ہو کہ اس کا بیج مسلمانوں نے بویا تھا اور کوئی آتشیں بگولا نہیں اٹھا جو یہ نہ کہا گیا ہو کہ مسلمانوں نے اٹھایا تھا۔"

ان حالات میں اس سوال نے کہ اب کیا کیا جائے، بہتوں کو پریشان کر دیا۔ سرسید بھی پریشان ہوئے۔ سوچا کہ یہ ملک ہی چھوڑ کر چلے جائیں لیکن پھر: "یہ خیال پیدا ہوا کہ نہایت نامردی اور بے مروتی کی بات ہے کہ اپنی قوم کو اس تباہی کی حالت میں چھوڑ کر میں خود کسی گوشۂ عافیت میں جا بیٹھوں۔ نہیں اس کی مصیبت میں شریک رہنا چاہیے اور جو مصیبت پڑے اس کو دور کرنے میں ہمت باندھنا قومی فرض ہے۔" اور اس فرض کی ادائی میں انھوں نے ساری زندگی گزاری۔ خود نقصان اٹھایا مگر قوم کا بھلا چاہا اور بالآخر ذہنوں میں یہ بات بٹھا دی کہ قومی ہمدردی انسان کا فرض اولین ہے ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر قوم کے لیے کچھ کرنے کی ضرورت کل بھی تھی، آج بھی ہے بلکہ یہ عجب اتفاق ہے کہ زندگی کے اکثر مسائل بھی ویسے ہی نظر آتے ہیں۔

سرسید کو جس صورت حال نے بے چین کیا تھا وہ تھی ہندی مسلمانوں کی زبوں حالی، پس ماندگی، نئے زمانے کے تقاضوں سے بے خبری۔ اس بے خبری کو آگہی میں بدلنے کے لیے انھوں نے جدید علوم کے حصول کو لازمی قرار دیا۔ بتایا کہ پرانا نظام تعلیم ہماری ضرورتوں کے لیے کافی نہیں۔ اب قیاسی دلائل کی جگہ عملی تجربوں نے لے لی ہے اس لیے عزت کے

---

* لکچرر شعبہ اردو، جوائنٹ ایڈیٹر خبر و نظر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ساتھ رہنا ہے تو نئے علوم و فنون سیکھو۔ معاشرے میں ملک میں، دنیا میں اعلیٰ مقام پانے کے لیے اعلیٰ تعلیم ضروری ہے۔ اس نکتے کو سرسید نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ انھوں نے تعلیم کے فائدہ پر روشنی ڈالتے ہوئے ایک موقع پر کہا تھا :

"اکثر لوگ ہیں جن کے خیال میں یہ گذرتا ہے کہ تعلیم یا ہائی ایجوکیشن سے کیا نتیجہ ہوگا۔ نوکری تو بہت کم ہے۔ اگر بہت لوگ بی اے اور ایم اے ہو جائیں گے تو دس روپے کی نوکری بھی ان کو نہ ملے گی۔ مگر یہ خیال غلطی سے بھرا ہوا ہے۔ یہ سچ ہے کہ گورنمنٹ سب کو اعلیٰ عہدے نہیں دے سکتی مگر تم یہ دیکھو کہ کوئی اور نتیجہ بھی تعلیم کا ہے یا نہیں ۔۔ ہزاروں قسم کی چیزیں تجارت کے فائدے کے واسطے موجود ہیں۔ ہم کو چاہیے کہ دوسرے ملک میں آڑھت اور کمپنیاں قائم کریں جس سے اعلیٰ درجے کے تاجر ہوں۔ ملک کی پیداوار قدرتی چیزیں، جو زمین میں گویا پڑی ہیں ان سے فائدہ اٹھاویں۔ سب باتیں ہم کو صرف ہائی ایجوکیشن کے نہ ہونے سے حاصل نہیں ہوتیں۔"

ایک اور موقع پر انھوں نے تعلیم کے دور رس نتائج کی وضاحت ان الفاظ میں کی : "ہمیشہ تعلیم سے یہ مقصود رہا ہے کہ انسان میں ایک ملکہ اور اس کے عقل اور ذہن میں ایک جودت پیدا ہو، تاکہ جو امور پیش آئیں ان کے سمجھنے کی، برائی بھلائی جاننے کی اور عجائبات قدرتی الٰہی پر فکر کرنے کی اس کو طاقت ہو۔" جدید تعلیم کو گھر گھر پہنچانے کے لیے سرسید نے تین سطحوں پر کام کیا۔ کتابوں کے ترجمے کے لیے سائنٹفک سوسائٹی کی بنیاد رکھی۔ مغرب کی معیاری درسگاہوں کے طرز پر علی گڑھ میں ایک کالج کی طرح بنیاد ڈالی اور ملک کے طول و عرض میں تعلیمی بیداری پیدا کرنے کے لیے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا سہارا لیا۔

ان تینوں خطوط پر کام کرنے کی آج بھی ضرورت ہے۔ ضرورت ہے مادری زبان میں اعلیٰ درجے کی کتابوں کی، اچھے اسکولوں، کالجوں اور اساتذہ کی اور تعلیمی انجمنوں کے قیام کی۔ یہ کام کسی نہ کسی سطح پر ہو رہے ہیں علم و فنون کی کتابوں کے ترجمے بھی ہو رہے ہیں۔ اقلیتی اسکول اور کالج بھی قائم کیے جا رہے ہیں۔ کئی ادارے اور انجمنیں اشاعت علم میں سرگرم ہیں لیکن اچھا ہوتا اگر ایک مرکزی قیادت بھی ہوتی اور اس سلسلے میں علی گڑھ اپنا کردار ادا کرتا۔

سرسید کی مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے طرز پر ایک آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کے طرز پر ایک آل انڈیا ایجوکیشنل کانفرنس کی جا سکتی ہے۔ جس کی متعدد مقامی شاخیں ہوں۔ مقامی شاخوں کی تنظیم کا کام ملک کے طول و عرض میں موجود فرزندان علی گڑھ کے سپرد کر دیا جائے اور ان شاخوں کو علی گڑھ سے جوڑ دیا جائے۔ کیا علی گڑھ یہ کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہے؟ فرزندان علی گڑھ سے یہ سوال نقد جواب چاہتا ہے۔ کرنے کے لیے اور بھی کئی کام ہیں۔ ملک کے گوشے گوشے میں دینی مدارس کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہ مدارس اپنی حد تک علم کی اشاعت میں اہم کردار ادا کر رہے ہیں۔ مگر ان کا دائرہ دینی علوم تک محدود ہے۔ مدارس سے رابطہ قائم کر کے ہمارے رضا کاروں کی ٹیم انھیں اپنی خدمات پیش کر سکتی ہے۔ پیشہ وارانہ تعلیم وقت کا تقاضا ہے، دینی مدرسوں کے منتظمین کو بھی احساس دلانا چاہیے۔ وقت کی یہ ایک بڑی ضرورت ہے کہ مذہبی اور دنیاوی تعلیم کے دھاروں کو قریب لایا جائے۔ سرسید نے اس نکتے کو بہت پہلے سمجھ لیا تھا اور خواہش ظاہر کی تھی کہ :

"ہم کو زمانہ گزشتہ اور حال پر نظر کر کے ایسا طریقہ متعین کرنا چاہیے جس سے علوم دینی اور دنیوی دونوں میں قسم کی اعلیٰ تعلیم حاصل ہو۔"

"فلسفہ ہمارے نوجوانوں کے داہنے ہاتھ میں ہو، نیچرل سائنس بائیں ہاتھ میں اور کلمہ طیبہ کا تاج سر پر جگمگا رہا ہو۔"

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

تعلیم کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ رگ و ریشے میں سمائی ہوئی چاپلوسی، کاہلی، نفاق، منافقت، بد گمانی، عیب جوئی اور ایسی دوسری بہت ساری بری باتوں سے چھٹکارا پایا جائے کہ یہ وہ امراض ہیں جو انفرادی اور اجتماعی زندگی کو زمانہ سرسید سے آج تک گھن کی طرح کھا رہے ہیں۔ بہ قول سرسید "دل کی جس قدر بیماریاں ہیں ان میں سب سے زیادہ مہلک خوشامد کا اچھا لگنا ہے۔"

"لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہاتھ پاؤں سے محنت کرنا، کام کاج محنت مزدوری میں چستی نہ کرنا، اٹھنے بیٹھنے، چلنے پھرنے میں سستی کرنا کاہلی ہے مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ دلی قوی کو بے کار چھوڑ دینا سب سے بڑی کاہلی ہے۔"

"بد گمانی کے عوض اگر نیک گمان کریں اور نیک کام میں مدد دیں اور غلطیوں کی اصلاح پر کوشش فرمائیں تو صرف مخالفت کرنے سے ہزار درجہ ہمارے اور ہماری قوم کے لیے بہتر ہو گا۔"

کسی نے کہا کہ اگر آج سرسید ہوتے تو وہ مسلمانوں کو پہلا مشورہ یہی دیتے کہ برادران وطن سے میل جول بڑھاؤ۔ درست، مگر یہ مشورہ تو سرسید ہندو اور مسلمانوں دونوں کو بہت پہلے دے چکے:

"اے ہندو اور مسلمانو! کیا تم ہندوستان کے سوا اور ملک کے رہنے والے ہو۔ کیا اسی زمین پر تم دونوں نہیں بستے۔ کیا اسی زمین میں تم دفن نہیں ہوتے ہو۔ یا اسی زمین کے گھاٹ پر جلائے نہیں جاتے۔ اسی پر مرتے ہو اور اسی پر جیتے ہو تو یاد رکھو کہ ہندو مسلمان اور عیسائی جو اسی ملک میں رہتے ہیں، اس اعتبار سے اب ایک ہی قوم ہیں۔ جو لوگ ملک کی بھلائی چاہتے ہیں ان کا پہلا فرض یہ ہے کہ بلا لحاظ قوم و مذہب کے کل باشندگان ملک کی بھلائی پر کوشش کریں کیوں کہ جس طرح ایک انسان کی اس کے تمام اعضا کے صحیح و سالم رہے بغیر زندگی یا پوری تندرستی محال ہے اسی طرح ملک کے تمام باشندوں کی خوش حالی اور بہبودی کے بغیر ملک کی زندگی یا پوری ترقی نا ممکن ہے۔"

سرسید کی نیت پر شبہ کرنے والوں کو چاہیے کہ موقع ملے تو وہ اس آئینے میں اپنی صورت بھی دیکھ لیں اور ممکن ہو تو سرسید کی تحریریں پڑھ ڈالیں۔ انھیں پتا چل جائے گا کہ قوم کسے کہتے ہیں، وطن کیا چیز ہے، دل کی کون کون سی بیماریاں ہیں اور ان میں سب سے مہلک بیماری خوشامد کیوں ہے۔ تعصب کسے کہتے ہیں اور حسد کی آگ کس طرح آدمی کو جلا کر خاک کر دیتی ہے۔ نا مساعد حالات میں زندگی کس طرح گزاری جاتی ہے اور عزم کیوں کر عمل کے سانچے میں ڈھلتا ہے۔ سرسید کی یاد منانے والوں کو بھی ان پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے۔

تحریک و تلاش

پروفیسر محمد شفیع *

سرسیّد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

اٹھارھویں صدی کے آخر میں مغلیہ حکومت کا چراغ ہندوستان میں ٹمٹما رہا تھا۔ انگریزوں کا دور دورہ اور اقتدار بڑھ رہا تھا۔ مغل باہر سے آئے تھے لیکن ہندوستان کو انھوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا بنالیا تھا۔ ہندوستانیوں میں وہ گھل مل گئے تھے۔ انگریزوں کی نظر ہندوستان کی دولت اور یہاں کی خام پیداوار پر تھی تا کہ اپنی صنعتوں کو فروغ دیں اور یہاں کی صنعتوں کو یکسر ختم کردیں۔ چنانچہ انگریزوں کے خلاف ہندوستانیوں میں نفرت اور غصہ کی آگ آہستہ آہستہ سلگ رہی تھیں۔ ۱۸۵۷ء میں یہ لاوا پھوٹ پڑا انگریزوں نے اسے بغاوت کا نام دیا۔ ہندوستانیوں نے اسے پہلی جنگ آزادی کہا۔ ہندو اور مسلمان مل کر لڑے لیکن وہ بے سر وساماں تھے اور آخر جیت انگریزوں کی ہوئی انگریزوں نے جنتا سے خوب بدلہ لیا لیکن مسلمانوں پر ضرب گہری پڑی۔ سرسید نے اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کی املاک اور عزت کو لٹتے ہوئے دیکھا۔ مسلمانوں کا عزم و حوصلہ چور چور ہوگیا۔ انگریزوں کی ہر چیز سے انھیں نفرت ہو گئی۔ انگریزی زبان اور انگریزی تعلیم سے قطعی طور پر کنارہ کشی کرلی۔ ہندوؤں پر چونکہ انگریزوں کی ضرب اتنی شدید نہ تھی جتنی مسلمانوں پر اس لئے وہ انگریزی زبان اور انگریزی تعلیم حاصل کرتے رہے اور مسلمان رفتہ رفتہ اس زبان سے جس میں نئے علوم و فنون، سائنس اور نئی قدریں آرہی تھیں بے بہرہ رہے۔

سرسید احمد خاں قوم پرست اور بہت ہی دور اندیش انسان تھے۔ وہ اس راز کو بخوبی سمجھ گئے تھے کہ اگر مسلمانوں میں انگریزی زبان سے جس کے ذریعہ سے نئی تعلیم، سائنس کی تعلیم ملک میں آرہی تھی، نفرت قایم رہی تو وہ اس قدر پچھڑ جائیں گے کہ پھر سنبھلنا مشکل ہوگا۔ سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان جاگیردارانہ ذہنیت سے ہٹ کر نئی تعلیم، نئی روش جس کی بنیاد سائنسی تحقیق اور تدقیق پر ہے، اپنائیں۔ کام بہت مشکل تھا اور اگر سرسید کا آہنی عزم نہ ہوتا تو کامیابی مشکل تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب سرسید نے مسلمانوں کو اس نئی تعلیم کی طرف متوجہ کرنا چاہا تو ان پر دہریہ ہونے کا الزام عاید کیا گیا۔ قتل کی دھمکیاں دی گئیں۔ لیکن یہ مرد مجاہد عزم کا پکا تھا اور ۱۸۷۵ء میں ایک اسکول قایم کردیا۔ اس کام میں سرسید کو کچھ ایسے رفقا مل گئے تھے جنھوں نے ان کی بہت مدد کی مثلاً سید مہدی علی محسن الملک، ذکاءاللہ، ڈاکٹر نذیر احمد، حالی اور شبلی۔ سرسید انگلینڈ گئے

---

* پرو وائس چانسلر، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

اور خاص طور پر آکسفورڈ اور کیمبرج یونیورسٹیوں کے تعلیمی نظام کا مطالعہ کیا۔ ۱۸۷۰ء میں واپسی پر ایک رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے نام سے جاری کیا۔ اس رسالہ کا مقصد مسلمانوں کو مغربی تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا۔ سرسید کا مقصد مسلمانوں کو انگریزی زبان اور مغربی علوم کی طرف مائل کرنے کا صرف یہ نہ تھا کہ اس کے ذریعہ سے مسلمانوں کو گورنمنٹ میں نوکریاں ملیں بلکہ وہ یہ سمجھ گئے تھے کہ سائنسی علم جس تیزی کے ساتھ انگریزی زبان میں آرہا ہے اور مغربی تعلیم جس طور پر اس کو اپنا رہی ہے اسے حاصل کرنا مسلمانوں کے لئے اشد ضروری ہے۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ایک طرف مسلمان دینی تعلیم حاصل کریں اور دوسری طرف سائنس کی تعلیم سے بہرہ ور ہوں۔ وہ یہ جانتے تھے کہ مسلمانوں نے اگر ایسا نہ کیا تو وہ ترقی کی دوڑ میں بہت پیچھے رہ جائیں گے۔ یہی وہ جذبہ تھا جس نے ان کو ۱۸۷۵ء میں مدرستہ العلوم قایم کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان کا عقیدہ تھا کہ مذہب کی تعلیم اور سائنس کے مطالعہ میں کوئی تضاد نہیں۔

سرسید ایک غیر معمولی قوم پرست انسان تھے۔ جو مدرستہ العلوم انھوں نے قایم کیا وہ چند سال کے بعد محمڈن اینگلو اورینٹل کالج بن گیا۔ کالج کے دروازے بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے واسطے کھلے رہے۔ ۳ فروری ۱۸۸۴ء کو ایک تقریر کے دوران جالندھر میں انھوں نے کہا کہ "اگر دونوں یعنی ہندو اور مسلمان نے ایک ہی بنچ پر بیٹھ کر تعلیم حاصل کی۔ ایک ہی بورڈنگ ہاؤس میں دونوں اکٹھا رہے اور ایک ہی استاد سے علم کا استفادہ کیا تو دونوں میں اخوت، ہمدردی اور محبت پیدا ہو گی۔" سرسید کا خواب مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ایک ایسا ادارہ قایم کرنا تھا جو دنیا کے بہترین تعلیمی اداروں میں ہو جہاں تعلیم کے ساتھ ان کی بہترین تربیت ہو۔

سخت مخالفت کے باوجود اسکول اور کالج قایم ہو گیا۔ مخالفت اتنی شدید تھی کہ ملک کے کونے کونے سے فتوے آنے لگے کہ جو بھی اس اسکول میں تعلیم حاصل کرے گا وہ کافر ہو گا۔ نوبت یہاں تک پہونچی کہ عرب سے سرسید پر کفر کا فتوا آگیا اور فتوے میں یہ کہا گیا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ ایسے اسکول کو مسمار کر دیں جو مسلمانوں کو گمراہ کرتا ہو۔ لیکن وہ مرد مومن اپنی دھن کا پکا تھا۔ سرسید اس شعر کو اکثر گنگناتے تھے

وہ ہو کے ترش رو مجھے گالی ہزار دے — یہ وہ نشا نہیں جسے ترشی اتار دے

سرسید کی دلی خواہش تھی کہ علی گڑھ اسکول و کالج معیاری تعلیمی ادارے ہوں اور اپنی تعلیم، تربیت اور تہذیب کے لئے ملک میں مثال قایم کریں۔ ان پر کالج کی چھاپ ہو ان کے طرز گفتار، طور طریقے، ادب و آداب، تعلیمی معیار سے لوگ فوراً سمجھ لیں کہ یہ علی گڑھ کے پڑھے ہوئے لڑکے ہیں۔ سرسید نے اپنی بقیہ زندگی اسکول اور کالج کے لئے وقف کر دی۔ ۱۹۲۰ء میں سر آغا خاں کی مدد سے کالج کو یونیورسٹی کا چارٹر مل گیا اور سرسید کا وہ خواب جو ایک پودے کی شکل میں نمودار ہوا تھا ایک تناور درخت بن گیا۔ اس یونیورسٹی سے ملک کے قابل ترین فرزند نکلے جو بعد میں ممتاز ادیب، شاعر، سائنس داں، سیاست داں، مصور، ڈرامہ نویس، کھیل کے ہر میدان میں سبقت لے جانے والے، اردو اور انگریزی کے بہترین مقرر، غرض ہر میدان میں قابل ترین انسان پیدا کئے۔

۱۹۴۷ء میں ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور پڑھے لکھے مسلمانوں کی ایک کثیر تعداد پاکستان چلی گئی۔ کچھ دن بعد ڈاکٹر ذاکر حسین جو بعد میں صدر جمہوریہ کے عہدہ پر فائز ہوئے اس یونیورسٹی کے وائس چانسلر بنے۔ یونیورسٹی میں مایوسی کا دور دورہ

تھا۔ ذاکر صاحب بہت ہی دور اندیش انسان تھے۔ انھوں نے وقت کے تقاضے کو سمجھا اور باہر کے قابل اور مشہور پروفیسروں کا یونیورسٹی کے مختلف شعبوں میں تقرر کیا اور ساتھ ہی ساتھ یہاں کے اچھے اور ہونہار اساتذہ کو بیرونی ممالک میں بھیج کر اعلی تعلیم دلوائی۔ غرض ذاکر صاحب نے اپنی ذاتی دلچسپی سے اس یونیورسٹی کو بہت سنبھالا دیا۔ اور چند ہی سال میں گورنمنٹ کی مدد سے اس یونیورسٹی کا کھویا ہوا وقار واپس آگیا۔

۱۰۰سال قبل سرسید مسلمانوں کے ذہن میں تعلیمی اعتبار سے ایک انقلاب لے آئے اور اگر سرسید ایسا نہ کرتے تو نتیجہ شاید اتنا بھیانک ہوتا کہ اس کا سوچنا بھی عقل سے بعید ہے مسلمانوں نے دینی تعلیم کے ساتھ مغربی علوم و فنون میں مہارت حاصل کی اور ترقی کے آسمان پر درخشندہ ستارے بن کر چمکے۔

سرسید چونکہ ایک قوم پرست انسان تھے اور سیکولر مزاج کے حامی تھے لہذا وہ اسکول اور کالج جو انھوں نے قایم کیا اس کے دروازے بلا امتیاز مذہب و ملت سب کے لئے کھلے رکھے۔ کالج کا نصب العین مسلمانوں کو جو تعلیم میں پچھڑے ہوئے تھے اوپر اٹھانا تھا لیکن برادران وطن سے مل کر۔ ان سے علیحدگی اختیار کر کے نہیں۔ ۲۷ جنوری ۱۸۷۳ء میں (اسکول کے قیام سے قبل) جو بات انھوں نے کہی وہ زریں حروف میں لکھنے کے قابل ہے کہتے ہیں "اے لوگو اگر کوئی ہندو ہے یا کوئی مسلمان ہے وہ اس کا اپنا ذاتی عقیدہ ہے لیکن اس کا کوئی تعلق دنیاوی امور اور آپس کے معاملات سے نہیں ہے۔ ہندوستان ہم دونوں کا ہے (ہندوؤں اور مسلمانوں کا) ہم دونوں ہندوستان کی ہوا میں سانس لیتے ہیں اور دونوں گنگا اور جمنا کا پانی پیتے ہیں اور ایک دوسرے کی خوشی اور رنج کے موقع پر برابر کے حصہ دار ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ہم دونوں اسی ملک میں رہتے ہیں اس لئے ایک قوم ہیں"۔ یہ وہ اقوال زریں ہیں جن پر ہندوستان کے مستقبل کا دارومدار ہے۔

تقسیم ہند کے بعد یونیورسٹی ایکٹ میں چند ایسی تبدیلیاں کی گئیں جس سے اس کا پرانا کردار مجروح ہوگیا۔ چنانچہ ایک نئی مہم شروع ہوئی اس مہم میں مسلمان پیش پیش تھے لیکن ان کے ہم آواز چند معقول برادران وطن بھی تھے۔ جدوجہد یہ تھی کہ گورنمنٹ یہ تسلیم کرے کہ اینگلو محمڈن اورینٹل کالج جسے مسلمانوں نے قایم کیا تھا۔ جس نے آگے چل کر یونیورسٹی کی شکل اختیار کی اور چونکہ یہ یونیورسٹی مسلمانوں کی قایم کردہ ہے اس لئے اس کا اقلیتی کردار تسلیم کیا جائے۔ ایک لمبی جدوجہد کے بعد ۱۹۸۱ء میں نیا ایکٹ پارلیمنٹ سے پاس ہوا جس میں اس بات کو تسلیم کیا گیا۔ یونیورسٹی کی کورٹ بحال کی گئی اور یہ بھی تسلیم کیا گیا کہ کورٹ یونیورسٹی کی سب سے اعلی انتظامیہ مجلس ہوگی۔ چانسلر اور پرو چانسلر اور آنریری ٹریژرر کا انتخاب ہوگا اور پارلیمنٹ نے اپنی فراخدلی میں یہ بھی منظور کیا کہ یہ یونیورسٹی ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی و تہذیبی ترقی کے لئے بھی پوری کوشش کرے گی۔ اور وائس چانسلر کے انتخاب کا حق یونیورسٹی کی مجلس انتظامیہ اور کورٹ کے سپرد کیا گیا اور صدر جمہوریہ جو یونیورسٹی کے وزیٹر ہوں گے کورٹ کے بھیجے ہوئے تین ناموں میں سے ایک نام کا انتخاب بحیثیت وائس چانسلر کریں گے۔

یونیورسٹی ایکٹ کا یہ کلاز کہ "یونیورسٹی ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیمی و تہذیبی ترقی کی پوری کوشش کرے گی" بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے ۱۹۸۷ء میں کافی بحث کی اور تقریباً ۱۳ اشخاص پر مبنی (جس میں یونیورسٹی کے ڈین، چیرمین، دیگر پروفیسران اور ہندوستان کے چند مشہور ماہران تعلیم) ایک کمیٹی کی تشکیل کی کہ اس سلسلہ

میں یونیورسٹی کو کیا قدم اٹھانا چاہیے۔ کونسل نے راقم الحروف کو اس کمیٹی کا کنوینر مقرر کیا اور سید ہاشم علی صاحب نے جو اس وقت یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے اس کمیٹی کا نام "شفیع کمیٹی" رکھا اس کمیٹی نے دو دن کا ایک سمپوزیم منعقد کیا جس کی تین نشستیں ہوئیں اور یونیورسٹی نے اس کمیٹی کی سفارشات کو مد نظر رکھتے ہوئے ایک کتابچہ بہ عنوان "مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے ، نکاتی پروگرام" شائع کیا اور یونیورسٹی میں ان تجاویز کو عمل میں لانے کے لئے ایک ڈائریکٹریٹ قایم کیا۔ یونیورسٹی کی اکیڈمک کونسل نے ان ، تجاویز کو منظور کرلیا۔ یونیورسٹی کورٹ نے چھ تجاویز منظور کرلیں لیکن داخلوں کی تجویز کے سلسلے میں مسلمانوں کے ریزرویشن کے لیے زور دیا اور طیب جی کی صدارت میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی کہ وہ اس امر پر غور کرے۔ طیب جی کمیٹی نے داخلوں کے سلسلے میں مسلمان طلبہ کے ریزرویشن کی حمایت کی اگرچہ اس پر ابھی تک کوئی قطعی فیصلہ نہیں ہوا ہے۔

اس مسئلہ پر یقیناً ٹھنڈے دل سے غور کرنا چاہیئے۔ داخلوں کے سلسلہ میں یونیورسٹی کی موجودہ پالیسی ۵۰ فیصد اندرونی طلبہ اور ۵۰ فیصد بیرونی طلبہ کی ہے لیکن اندرونی طالب علم جو سر فہرست ہو اس کا مقابلہ بیرونی طلبہ کی فہرست کے آخری طالب علم سے کیا جائے تو یہ مقابلہ تشویش ناک ہوتا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ یونیورسٹی میں خاص طور پر اسکول اور گیارہویں اور بارہویں جماعت کی تعلیم کو بہتر بنانے کی اشد ضرورت ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا لیباریٹری، ساز و سامان، کلاس روم، مستقل اساتذہ کی تقرری، مستقل پرنسپل کی تقرری، اور تعلیم کے شیڈول پر سختی سے عمل ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر داخلوں میں اعداد و شمار کا مطالعہ کریں تو پتہ چلتا ہے کہ ذہین، ہوشیار مسلمان لڑکے مقابلہ کے امتحانوں میں زیادہ تعداد میں بیٹھ رہے ہیں اور کامیابی حاصل کر رہے ہیں۔ اور ان کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے لہذا غور طلب بات یہ ہے کہ داخلہ کے سلسلے میں مسلمان طلبہ کو یہ احساس ہو کہ وہ اپنی محنت اور قابلیت سے داخلہ حاصل کرتے ہیں یا یہ کہ محنت کی ضرورت نہیں اور داخلہ ریزرویشن کی بنا پر ہو جائے گا میڈیکل کے امتحان میں فی الحال کوئی ریزرویشن نہیں ہے لیکن اس میں باہر کے مسلمان طلبہ و طالبات کی اچھی خاصی تعداد کامیاب ہو رہی ہے۔ اور یہی صورت حال انجینیرنگ اور دوسرے مقابلے کے امتحانوں کی ہے لہذا مسئلہ یہ ہے کہ کیا ہم ملک کے قابل اور تیز مسلمان طلبہ و طالبات کے داخلے کے لئے فکرمند ہوں یا کمزور طلبہ کے لئے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کے دوسرے کورسیز میں، جس میں انجینیرنگ بھی شامل ہے وائس چانسلر کو یونیورسٹی نے اختیار دیا ہے کہ وہ ۲۰ فیصد (جواب بڑھ کر ۲۵ فیصد ہو گیا ہے) طلبہ کو جنھوں نے مقابلہ کے امتحانوں میں کامیابی حاصل کی ہے نامزد کر سکتے ہیں۔ لہذا ان سہولتوں کے باوجود اور اس نظریہ کے پیش نظر کہ قوم کو بیساکھی سے چلانے کے بجائے محنت، قابلیت و قوت و بازو سے چلایا جائے، کیا ریزرویشن کی ضرورت داخلوں میں باقی رہتی ہے؟ کیا داخلوں میں ریزرویشن کی پالیسی کا اثر ملک میں مسلم طلبہ کی ملازمت پر کوئی ناخوشگوار اثر نہیں ڈالے گی۔ بانی یونیورسٹی نے ادارہ مسلمانوں کی تعلیم کے لئے خاص طور پر قایم کیا لیکن انھوں نے کبھی ریزرویشن کا ذکر نہیں کیا۔

بیسویں صدی ختم ہونے کے قریب ہے یونیورسٹی اکیسویں صدی میں جلد داخل ہوگی۔ سر سید مسلمانوں میں تعلیم انقلاب لے آئے اور اس میں کوئی شک نہیں کامیاب ہوئے۔ وہ پودا جو سر سید نے انیسویں صدی کے آخر میں لگایا تھا وہ بیسویں صدی میں ایک قد آور درخت بن گیا۔ اب اس درخت کی آبیاری کے لیے نئی کھاد کی ضرورت ہے۔ ایک نئے تعلیم

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر، ۱۹۹۴ء

انقلاب کی ضرورت ہے وہ تعلیم جو ایک طرف سرسید کے بنیادی مقاصد کو پوری کرتی ہو اور دوسری طرف ۲۱ کیسویں صدی میں سائنس اور ٹکنالوجی کا جو تعلیمی انقلاب آنے والا ہے اس سے یونیورسٹی پوری طرح مقابلہ کرنے کو تیار ہو اس میں کوئی شک نہیں کہ گزشتہ چند سالوں میں یونیورسٹی میں بہت سے نئے کورسیز کا قیام وجود میں آیا ہے۔ جو طلبہ و طالبات کو معاش حاصل کرنے میں مددگار ہوگا۔ بہت سے ایسے کورسیز کھولے گئے ہیں جن کو پروفیشنل کورسیز کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ کمپیوٹر کے۔ نئے نئے کورسیز کھل گئے ہیں انجینئرنگ کی فیکلٹی میں روایتی کورسیز کے ساتھ تقریباً چھ نئے کورسیز کا قیام وجود میں آیا ہے۔ مثلاً ٹیلی میٹکس، ماحولیاتی انجینئرنگ اور کمپیوٹر انجینئرنگ ان کورسیز کا قیام قابل تحسین ہے۔

لیکن یہاں پر یہ امر قابل ذکر ہے کہ ہمارے طلبہ اپنے اندر کس درجہ کی اہلیت پیدا کر رہے ہیں۔ ہم کو مقابلہ کی دوڑ میں ڈٹ کر مقابلہ کرنا ہوگا۔ ہمیں اس نظریہ کو تیاگ دینا ہوگا کہ ہم کو کون لے گا؟ ہم کو ہمت اور اولوالعزمی سے کام لینا ہوگا۔ ہم کو مقابلہ کے امتحانوں میں پوری تیاری کے ساتھ بیٹھنا ہوگا انٹرویو کی زبردست تیاری کرنی ہوگی۔ اور یہ ثابت کرنا ہوگا کہ وہ اہلیت اور قابلیت اور کارکردگی میں دوسروں سے بہتر ہیں۔

اس موقع پر مجھے ذاکر صاحب کا وہ جملہ یاد آتا ہے جو انھوں نے جناب سیدنا طاہر سیف الدین کو یونیورسٹی کے چانسلر کی حیثیت سے ۴۰ سال قبل خوش آمدید کہتے ہوئے کہا تھا۔ "سیدالمحترم اب تک یونیورسٹی کا جو ذکر میں نے کیا تھا وہ اس کے ساز و سامان کا ذکر تھا، لیکن اس کی اصل روح تو اس کے اساتذہ اور طلبہ ہیں، اور میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہاں کے اساتذہ اور طلبہ ملک کے بہترین اساتذہ اور طلبہ میں ہیں جن کی سرداری آپ نے قبول فرمائی ہے۔

ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ کیا تعلیمی اور تہذیبی معیار پر ہم ذاکر صاحب کے قول پر پورے اتر رہے ہیں۔ اور اگر نہیں تو اس کمی کو پورا کرنے کے لئے ہمیں کیا قدم اٹھانا چاہیئے۔

سید حامد *

علی گڑھ تحریک

ہر بڑی تحریک کی طرح علیگڑھ تحریک نشیب و فراز سے گزری، اس نے چولے بھی بدلے۔ اپنے رفیع الشان بانی کی بدولت اس کی ساکھ ایک عرصے تک قایم رہی، اس وقت بھی جب کہ وہ دم توڑ چکی تھی۔ سر سید اور ان کے ساتھیوں نے اس تحریک سے بڑے کام لئے۔ ایم اے او کالج کے محور پر گردش کرتے ہوئے علیگڑھ تحریک نے ہندوستان کے مسلمانوں اور ان کے مسایل کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، انھیں اوپر کی طرف کھینچا، ان کے حل ڈھونڈھ نکالے۔ یہ تحریک تعلیم کے علاوہ باخبری اور اصلاح معاشرہ کی تحریک بھی تھی۔ اس نے جڑوں کو مذہب میں پیوست رکھا لیکن برگ و بار عقل کی فضا میں نکالے۔ جذبات سے اس نے عقل کی ہدایت میں بقدر ضرورت ہی کام لیا۔ عقل اور جذبہ کے درمیان مناسب رشتہ اور موزوں ترتیب بھی یہی ہے۔ شمالی ہندوستان میں اس وقت مسلمانوں کے جو بہترین دماغ تھے وہ سر سید کی مقناطیسی کشش کے مدار میں آگئے۔ کیا فکر، کیا اظہار، محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس کا عوام و خواص کو انتظار رہتا تھا کہ یہی ایک سچا، کھرا اور باتدبیر فورم تھا ہندوستانی مسلمانوں کے مسایل پر گفتگو کا۔ یہیں سے وہ کرنیں پھوٹیں جنھوں نے تاریکی اور مایوسی کے پیرہن کو چاک کر دیا، جنھوں نے افتاد طبع اور زاویہ نگاہ کے قالب سے جذباتیت کے دبیز غلاف کو اتار دیا۔

تعلیم اور تعمیر کی اس تحریک کے اندر سیاست تو سر سید کی زندگی میں ہی در آئی تھی، لیکن انھوں نے اسے حدود میں رکھا، بے قابو نہ ہونے دیا۔ سیاست کا مزاج استیلا ہے چنانچہ سر سید کی آنکھ بند ہوتے ہی سیاست چوتھ وصول کرنے لگی۔ بیسویں صدی کی شروعات (۱۹۰۶) میں ہی کانفرنس کے بطن سے مسلم لیگ پیدا ہوئی، اور خود کانفرنس کا دھیان تعلیم کی مرکزیت کی طرف سے کچھ ہٹنے سا لگا۔ پھر بھی ہر چند کہ کانفرنس کے سالانہ اجلاس جامعیت اور ہمہ گیری کی طرف بڑھ رہے تھے تعلیم کی اولیت کو زیادہ ٹھیس نہیں پہونچی اور غور و فکر اور عقلیت کا بھرم بہر حال قایم رہا۔ اس مومینٹم کے تحت جو سر سید اور ان کے رفقا نے جگایا اور بنایا تھا، مسلمانوں کے اسکول اور کالج دیار و امصار میں کھلتے رہے۔ سیاست کی در اندازی سے تعلیم کو نقصان اس قدر نہیں پہنچا جتنا عقلیت کو، جس پر جذبات نے ہر طرف یورش کرنا شروع کر دی۔ حالیہ صدی کی تیسری

---

* سکریٹری، ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی، تعلیم آباد، سنگم وہار، نئی دہلی

ئی میں خلافت کی تحریک نے جس کی قیادت مولانا محمد علی، شوکت علی اور گاندھی جی کر رہے تھے، جذباتیت کا بول بالا کر دیا۔ ں تحریک نے مسلمانوں کو نیازمندی، فراواں احتیاط خوف اور ہچکچاہٹ سے چھٹکارا دلایا۔ آزادی ہمارا حق ہے، ہم اسے لے کر رہیں گے، والا رخ اختیار کرنے کی توفیق دی۔ اسی نے کچھ عرصے کے لئے فرقہ واریت کو دبا دیا۔ اقلیت اکثریت کے ساتھ، ی کی خاطر، کندھے سے کندھا ملا کر کھڑی ہوگئی۔ لیکن اس سے ایک بڑا نقصان بھی ہوا کہ علیگوھ تحریک کا وہ کلیدی حصہ ہوش و گوش سے عبارت تھا، جس نے مسلمانوں کے عام ردعمل، ان کی افتادطبع، ان کی طرز فکر کو درست کرنے کی کوشش تھی، وہ اس دوسری تحریک، یعنی تحریک خلافت کی نذر ہوگیا۔ اس نقصان پر مہر تقسیم کی جدو جہد نے لگا دی۔ سرسید کے بالرغم ان کی تعلیمات کے بالکل برعکس، مسلمانوں نے سوجھ بوجھ کو خیر باد کہا اور جذبات کو اوڑھنا بچھونا بنالیا۔ ایسے میں غرضی اور استحصال پیشہ رہنما ابھرتے ہیں۔ تیس چالیس سال سے اب یہی ہو رہا ہے۔ ان کی ناعاقبت اندیشی کے تلے لمان روندے جا رہے ہیں۔

ایک زاویہ سے دیکھیے تو علیگوھ تحریک کے عناصر تین تھے (۱) ہوش و گوش یا تیز رو زندگی کے بدلتے ہوئے اضوں سے ہم آہنگی (۲) اردو زبان کو پروان چڑھانا (۳) مسلمانوں کو جدید تعلیم کی طرف ملتفت کرنا۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ پہلا عنصر سیاست (اور ایک حد تک جہالت) کی نذر ہوگیا۔ اب دوسرے عنصر کو لیجئے۔ آزادی کے اردو کے لئے ماحول ناساز گار ہو گیا، کہیں کم کہیں زیادہ، سب سے زیادہ اتر پردیش اور دہلی اور پوری ہندی بیلٹ میں۔ لمانوں نے اردو کی بحالی اور ترقی کے لئے مطالبات کئے۔ لیکن اردو کا رشتہ علیگوھ تحریک سے ٹوٹ گیا۔ اردو کے لئے بالعموم ئی جمع خرچ کے علاوہ علیگوھ نے کچھ نہیں کیا۔ اور بالآخر وہ وقت بھی آ گیا جب علیگوھ مسلم یونیورسٹی میں ہندی جاننے ں کی تعداد اردو جاننے والوں (یعنی اردو میں لکھنے پڑھنے والوں) سے بہت زیادہ ہوگئی۔ علیگوھ کے طلبہ اور ان کے رہنما جو ح و بلیغ اردو بھی تک بولتے ہیں، وہ سب زبانی جمع خرچ ہے۔ وہ بالعموم اردو پڑھنا اور لکھنا نہیں جانتے۔ اور اردو پڑھانے یثیت شعبۂ اردو کے اساتذہ کا جو فرض ہے، اب تو ایک مدت سے اس کا احساس بھی ختم ہوگیا۔ ظاہر ہے کہ اردو کی اشاعت ے لئے گرد و نواح میں توسیعی کام کرنے کا ان کو خیال بھی نہیں آتا۔ یہ لوگ اردو کی تحریک کو لے کر کیوں چلنے لگے؟ یگوھ مسلم یونیورسٹی، اس کے اساتذہ اور طلبہ نے بہت سی دوسری یونیورسٹیوں کی طرح اردو زبان کے ساتھ متواتر بے مہری ی ہے۔ یونیورسٹی بجھ گئی ہے، اس کی راکھ میں چنگاریاں ڈھونڈنا بے سود ہو گا۔

رہ گیا تعلیم کا فروغ۔ آگے بڑھنے سے پہلے اس ادارہ کا دوبارہ ذکر دیا جائے جسے علیگوھ تحریک نے یہ کام سپرد کیا تھا۔ ڈن ایجو کیشنل کانفرنس ہم دیکھ چکے ہیں، تعلیم کو اولیت دینا بیسویں صدی کے آغاز میں ہی بند کر دیا تھا۔ کئی متفرق ں اس کے ذہن پر چھا گئیں۔ تاہم جہاں تک تعلیم کے فروغ کا تعلق ہے ۱۹۲۰ء تک تحریک نے زندگی کا ثبوت دیا۔ ایم اے کالج نے علیگوھ مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کی تو علیگوھ تحریک کے جاں نثاروں اور وفاداروں اور کانفرنس کے اراکین ے یہ سمجھ لیا کہ ان کا کام پایہ تکمیل کو پہنچ گیا۔ مقصد حاصل ہو گیا، اب کوئی مقصد باقی نہیں رہا جو انھیں جہد آمادہ اور گرم عمل رکھے۔ وہ بھول گئے کہ سید والا گہر نے جو کام کانفرنس کے سپرد کیا تھا امتداد ایام کے ساتھ اس کے امکانات ساں ہو گئے ہیں اور ملک میں پھیل کر کام کرنے کا زمانہ تو اب آیا ہے۔ کانفرنس لڑھکتے لڑھکتے ہوئے چلتی رہی۔ نہ اس نے

کوئی اسکول کھولے نہ کالج ۔ چوتھی دہائی کے قریب مختلف ریاستوں کے مسلمانوں کے ساتھ اس کا رابطہ ٹوٹ گیا۔ پہلے کانفرنس کو میدان عمل سمجھا جاتا تھا اور آرزوؤں اور خوابوں کی آماجگاہ ۔ اب وہ جاگیریں بن گئی، اب کھوکھلی شخصیتیں کانفرنس سے نام و نمود اور اقتدار حاصل کرنے لگیں ۔ کانفرنس پر جو کوئی متصرف ہوا دوامی پٹہ لے کر آیا ۔ یہ دور کوئی نصف صدی تک چلا۔

کانفرنس مفلوج و معطل رہی، پچاس سال سے زیادہ، تقریباً ساٹھ سال تک ۔ جنوبی ہندوستان والے رہنمائی کے لئے حسب دستور شمال کی طرف دیکھتے رہے ۔ یہ عمل پچیس تیس سال تک جاری رہا۔ جب مایوس ہوگئے تو انھوں نے تعلیم کے فروغ، اور ادارے کھولنے کے لئے نئی انجمنیں قایم کیں، کیرالا میں مسلم ایجو کیشنل سوسائٹی، بنگلور میں الامین سوسائٹی، مدراس میں ایس آئی ای ٹی اس کی چند نمایاں مثالیں ہیں۔ تعلیم کی جو تحریکیں ۱۹۶۵ء کے لگ بھگ جنوبی بھارت میں شروع ہوئیں ان کا تعلق علیگڑھ سے نہیں تھا، سوائے اس کے کہ مسلم ایجو کیشن سوسائٹی کی داغ بیل علیگڑھ کے ابنائے قدیم، جیسے ڈاکٹر عبد الغفور مرحوم، اور پروفیسر بہاالدین نے ڈالی تھی، اور الامین سوسائیٹی کے بانی ڈاکٹر ممتاز احمد خاں صاحب کی والدہ ماجدہ علیگڑھ کی بنات قدیم میں سے ہیں۔

سید حامد کے دور (۸۵-۱۹۸۰ء) میں کچھ کوششیں علیگڑھ تحریک کے احیا کے لئے کی گئیں تہذیب الاخلاق کو جو علیگڑھ تحریک کا آرگن رہا تھا نئی زندگی دی گئی۔ اسے نکلتے ہوئے اب ساڑھے بارہ سال ہوگئے ۔ دینی مدارس سے بھی رابطہ قایم کیا گیا اور ان کی اسناد یونیورسٹی میں داخلے کے لئے تسلیم کی گئیں، تاکہ علیگڑھ کی مرکزیت بحال ہو اور ملت دو نیم ہونے کی حالت سے نکل آئے اور متحدہ رائے عامہ پیش کرسکے ۔ یہ دونوں کوششیں یک گونہ کامیاب ہوئیں۔ تہذیب الاخلاق نے تعلیم اور اصلاح معاشرہ، تجدید نظر اور سائنس کے فروغ کی جانب دھیان دیا۔

اگرچہ وہ تحریک جو سرسید نے شروع کی تھی پایان کو پہنچ گئی، وہ جو کچھ زندہ ہے ابنائے قدیم یا اولڈ بوائز کے اس نیٹ ورک کی وجہ سے زندہ ہے جو مشرق و مغرب میں پھیلا ہوا ہے ۔ تاہم علیگڑھ تحریک کا نام ہنوز وابستگی اور عزت کے ساتھ لیا جاتا ہے اور اہل نظر اور اہل عمل اب بھی اس سے روشنی اور حرارت اخذ کرتے ہیں۔ البتہ نئی نسل اب جنوب کی طرف منتقل ہوگئی ہے، وہاں تعلیم کا چرچا ہے، بڑے بڑے ادارے کھولے جا رہے ہیں، وہاں مسلمان خوش اطوار، سنجیدہ اور بردبار اور مہم جو، اور خدمت آمادہ اور فلاح جو ہیں۔

پروفیسر عشرت حسین فاروقی *

علی گڑھ تحریک: عوامل اور اثرات

تعلیم بنی نوع انسان میں سرمایہ کاری کا دوسرا نام ہے۔ اس کے فوائد زندگی کے مختلف معاشی، معاشرتی، ثقافتی، تہذیبی اور سیاسی شعبوں میں محسوس کئے جا سکتے ہیں، تعلیم ہی آدمی کو صحیح معنی میں انسان بناتی ہے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ تعلیم و تربیت پر مادی ذرائع بکثرت خرچ کیے جائیں، بلکہ زیادہ اہمیت اس بات کی ہے کہ ان وسائل کو مختلف تعلیمی ادوار میں کس طرح صرف کیا جاتا ہے۔ یعنی ابتدائی تعلیم سے لے کر اعلیٰ ترین تعلیم پر ذاتی، اجتماعی اور سرکاری وسائل کو کس انداز میں انسان کی ترقی و ترویج پر صرف کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر تعلیم کے دو اہم نظریات مروج رہے ہیں جو کسی حد تک ایک دوسرے سے متضاد کہے جا سکتے ہیں۔ ایک تصور یہ ہے کہ تعلیم کا مقصد ذہنی ارتقا اور عقل و دانش کا فروغ ہے جسے انگریزی میں Intellectual development کہا جاتا ہے۔ تعلیم کا دوسرا تصور مادی منفعت حاصل کرنا ہے۔ جس کو ہم معاشی پیمانہ پر تول اور پرکھ سکتے ہیں۔ ماضی میں اول الذکر کو فوقیت حاصل تھی مگر آج کے دور میں تعلیمی اداروں کی بنیاد اور مختلف نصابات کی تیاری میں اہمیت جس مقصد کو دی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان تعلیم حاصل کرنے کے بعد زیادہ سے زیادہ معاشی خوشحالی کیسے اور کیونکر حاصل کر سکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ تعلیم کے مقاصد میں تبدیلیاں آتی رہتی ہیں جن کے عوامل مذہبی عقائد، سیاسی نظریات، معاشی نظام اور ثقافتی اقدار ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر گرد و پیش کا اثر تعلیم اور اس کی تنظیم پر پڑتا رہا ہے۔ عیسائیت کے شروع دور میں تعلیم کا مقصد انسانی اقدار کو فروغ دینا تھا۔ لہذا مذہبی اور اخلاقی تربیت پر زیادہ زور دیا گیا اور ذہنی نشو و نما کو ثانوی درجہ ملا۔ تعلیم کے عیسائی نقطہ نظر میں آگے چل کر نمایاں تبدیلی آئی، یہاں تک کہ مارٹن لوتھر نے تعلیم کو ایک نئے احساس سے روشناس کرایا۔ اسلامی نظریہ تعلیم اپنی نمایاں خصوصیت کے اعتبار سے دوسرے مذہبی یا ثقافتی طبقات سے مختلف رہا ہے اور یہ کہنا بڑی حد تک صحیح ہوگا کہ مغرب کو بعض تصورات سے اسلام نے روشناس کرایا اور یورپ کو قرون وسطیٰ سے باہر لانے کا سہرا بھی مسلم تعلیمی نظریات پر ہے، جن کے مراکز بغداد قاہرہ اور قرطبہ وغیرہ تھے۔ ایک امریکن ماہر تعلیم نے اس خیال کا

---

* "آدرش" بیک روڈ، علی گڑھ، سابق پروفیسر کامرس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

بھی اظہار کیا ہے کہ قرون وسطی میں مسلمانوں کا نظام تعلیم "سیکولر" ذہنیت کا حامل تھا۔ جس کے ثبوت میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ انھوں نے یونانی، چینی، ہندوستانی اور دوسری تہذیبوں سے اپنے تعلیمی نظام کو سنوارا۔ یہ کہنا بھی حقیقت پر مبنی ہو گا کہ تحقیق کا سائنسی نظریہ اور تجرباتی (experimentation) تصور بھی مسلم معاشرہ اور نظام تعلیم کی دین ہے۔

صنعتی انقلاب کے بعد عالم اسلام کے افق پر جن عظیم شخصیات کا ظہور ہوا ان میں سر سید کی شخصیت منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ سرسید کی شخصیت اور تعلیم سے متعلق ان کے نظریات نے برصغیر کے مسلمانوں کے علاوہ وسط ایشیا اور جنوبی ایشیا کی خاصی بڑی آبادی کو متاثر کیا۔ سید صاحب ہندوستان میں اس وقت پیدا ہوئے جب افراتفری اور طوائف الملوکی کا دور تھا۔ ایسے ماحول میں راسخ العقیدہ اور صحیح خطوط پر سوچنے اور کام کرنے والے افراد مشکل ہی سے نمودار ہوتے ہیں اس ماحول میں سرسید ہندوستان کی سماجی اور تعلیمی فضا پر ایک آفتاب کی مانند ابھرے جس کی کرنوں نے گردوپیش کو غیر معمولی فیض پہونچایا۔ سرسید اپنی ابتدائی زندگی میں سرکاری ملازمت کی ذمہ داریوں میں منہمک رہے لیکن اپنے بڑے بھائی کے انتقال کے بعد مذہب کی جانب ان کا جھکاؤ بڑھ گیا۔ مگر جب ۵۲ - ۵۳ برس کی عمر میں انگلستان جانے کا موقعہ ملا تو ان میں ایک بڑی اور اہم تبدیلی رونما ہوئی، جس نے صرف ایک ادارہ یا ایک مقصد کو جنم نہیں دیا بلکہ ایک تحریک کی بنیاد ڈالی۔ مغربی دنیا میں بہت سی یونیورسٹیاں چودھویں اور پندرہویں صدی میں قائم کی گئیں جیسے آکسفورڈ، کیمبرج، سارلون، لوین، ہائیڈل برگ، پیٹرس برگ اور برلن وغیرہ، مگر ان کی حیثیت تعلیمی اداروں تک ہی محدود رہی اور تحریک کی شکل اختیار نہ کر سکیں ہندوستان میں بھی برادران وطن نے ادارے قائم کئے جیسے مدن موہن مالویہ نے بنارس میں، ٹیگور نے شانتی نکیتن میں یا انگریزی سرکار نے فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں۔ لیکن انہیں بھی یہ شرف حاصل نہ ہو سکا کہ ان سے کسی تحریک کا نام منسوب کیا جاتا۔ اس کے برخلاف سرسید کے قائم کردہ ادارہ اور دوسری انجمنوں یعنی "آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس" "سائینٹفک سوسائٹی" اور "تہذیب الاخلاق" وغیرہ نے ایک تحریک کی شکل اختیار کی۔ جو اپنی زندگی کی ایک صدی پوری کر چکی ہے اور یقیناً اس تحریک کی ضرورت ہندوستان کے مسلمانوں کو آئندہ بھی رہے گی، انیسویں صدی کے آخری ربع سے برصغیر کے مسلمانوں کی زبوں حالی، درماندگی، ذہنی پستی، معاشی بدحالی اور آپسی نفاق کو دور کرنے میں اس تحریک نے بڑا اہم رول ادا کیا۔ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ علی گڑھ تحریک نے ہندوستان، پاکستان اور بنگلہ دیش کے مسلمانوں کو، جن کی مجموعی آبادی تقریباً (۳۶) کروڑ ہوتی ہے اور جو مسلمانوں کی کل آبادی کا تقریباً (۴۰) فیصد ہے۔ بالواسطہ یا بلاواسطہ فیض پہونچایا۔

سرسید نے تعلیم کو ہر مسئلہ پر فوقیت دی اور اپنے مقالات میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ یہ بات کہی کہ تعلیم کے بغیر سیاست، معاشیات، تہذیب اور ثقافت الغرض کسی شعبہ حیات میں خاطر خواہ ترقی ممکن نہیں ہے۔ جس طرح سے کہ کھیت میں بیج ڈالنے سے پہلے اگر آبپاشی یا آبیاری کر دی جائے تو پیداوار خاطر خواہ نہیں ہو سکتی ہے۔ لہذا تعلیم ہی وہ بیج ہے جس سے پیدائش اور افزائش ممکن ہے۔ اپنے ایک اور مقالہ میں تعلیم کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے سرسید نے کہا کہ انسان بغیر تعلیم کے ایک کھنگرے سنگ مرمر کی طرح ہے اور تعلیم اس میں تراش خراش کر کے اسے سڈول بناتی ہے اور اس کو جلا دیتی ہے اور اس کی خوشنما نسیں اور بیل بوٹے عیاں ہوتے ہیں۔ سرسید نے کہا:

"میں اپنی قوم میں ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ، ان میں نہایت دلیری اور جرات پاتا ہوں پر خوفناک ان میں نہایت

قوی استقلال دیکھتا ہوں پر بے ڈھنگا۔ ان میں صبر و قناعت بھی ہے پر غیر مفید اور بے موقع۔ بس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جائیں تو دین اور دنیا دونوں کے لیے کیسی کچھ مفید ہوں۔"

انیسویں صدی کے وسط میں مسلمانوں کی تعلیم بڑی حد تک قدیم اور روائتی علوم تک محدود تھی اور جدید علوم فنون سے مسلمان بے بہرہ تھا اس لیے زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ اپنے کو تبدیل نہیں کر سکے اور مجبور ہو کر رہ گئے اس میں شک نہیں کہ ہمارے اسلاف نے بڑے معرکے سر کیے اور علم کی دنیا میں نئے چراغ روشن کیے، مگر سرسید کے اعتبار سے یہ چراغ پرانے ہو گئے تھے۔ اسلاف کے ان کارناموں سے دنیا کی قوموں نے استفادہ کیا مگر جب ہم نے اپنے اوپر ترقی کے راستے مسدود کر لیے تو لکیر کے فقیر ہو کر رہ گئے۔ سرسید نے اس پلستی سے اوپر اٹھنے کے لیے اس بات پر زور دیا کہ مسلمان بھی دنیا کی علمی ترقی میں برابر کے حصہ دار بنیں۔ بقول سرسید مسلمانوں کے علمی سفر کا آغاز قرآن سے ہوا جس کو یکجا کر کے کتاب کی شکل دے دی گئی اور اس کے بعد علم کا دوسرا اہم قدم احادیث کی تدوین، صحابہ اکرام، تابعین اور تبع تابعین کے اقوال و ارشادات کا قلمبند کرنا، اور پھر تفسیر، علم کلام اور دیگر علوم و فنون پر مسلمان دانشوروں نے بیش بہا اضافہ کیا۔ اموی اور عباسی خلفاء کے زمانے میں یونانی علوم کی کتابوں کے ترجمے کیے گئے اور مغرب و مشرق کے علوم سے بھی استفادہ کیا گیا۔ سرسید کے نزدیک وہ دور جس میں بو علی سینا، ابن خلدون اور دوسرے مفکرین نے علم کا بول بالا کیا سنہری دور تھا۔ مگر سرسید پدرم سلطان بود کے قائل نہ تھے اور مغرب کے سفر نے ان کے اندر حقیقت پسندی (realism) کا شعور پیدا کر دیا۔

ہندوستانی مسلمانوں کے دونوں عظیم مفکر سرسید اور علامہ اقبال کو مغربی اقدار، طریقۂ زندگی، وہاں کی علمی اور تہذیبی ترقی اور دیگر عوامل نے اس قدر متاثر کیا کہ دونوں کے نظریات میں وہاں کے مشاہدات کی بنیاد پر تبدیلی آئی۔ سرسید نے تعلیم اور ثقافت کے میدان میں ہندوستانی مسلمانوں کو جھنجھوڑا تا کہ وہ ترقی یافتہ اقوام کے شانہ بشانہ چل سکیں۔ علی ھذا القیاس علامہ اقبال پر مغربی مشاہدات بالخصوص وہاں کی نیشنلزم نے انھیں "پان اسلامزم" کے تصور پر کار بند کیا اور وہ کہہ اٹھے:

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے   نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاکِ کاشغر

اقبال نے شاعری اور سیاست کے ذریعہ ہندوستانی مسلمانوں میں ملی بیداری پیدا کرنے کی کوشش کی اور سرسید نے تعلیم کو اپنا مطمح نظر بنایا۔ اور اس کو ہندوستانی مسلمانوں کی سماجی بہبود اور اقتصادی ترقی کا ذریعہ بنایا۔ سرسید کے دور میں یہ حقیقت آشکارا ہو چکی تھی کہ انگریزی نہ صرف حکومت کی زبان ہو گی بلکہ معاشرتی، اقتصادی اور سماجی ضروریات کی لئے انگریزی سے واقفیت نا گزیر ہو گی۔ غیر مسلموں نے اس کو بہت پہلے محسوس کر لیا مگر مسلمان اس حقیقت کو یا تو سمجھ نہ پائے یا پھر سمجھنا نہیں چاہتے تھے انگریزی کیلئے مثبت رجحان پیدا کرنے کی غرض سے سرسید نے جو دلیلیں پیش کیں ان میں سب سے اہم دلیل یہ تھی کہ جس کی حکومت ہوتی ہے اسی کی زبان بھی مروج ہو جاتی ہے۔ بنو امیہ اور عباسیوں کے زمانے میں پورے مشرق وسطی میں عربی کا دور دورہ رہا۔ مسلمان جب یہاں حاکم رہے تو حکومت کی زبان فارسی بنی جس کو ہندوستان میں رہنے والوں نے اپنایا، اور اس کے بعد مغلوں کے دور میں ملی جلی زبان نے جسے ہم اردو کہتے ہیں مقبولیت حاصل کی۔ سرسید نے

مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ انگریزی پڑھنا کسی طرح بھی اسلام کے منافی نہیں ہو سکتا ہے اور یہ بھی ذہن نشین کرانے کی کوشش کی کہ جب بھی مسلمانوں نے دین کے ساتھ حصول دنیا میں پیش رفت کی، وہی دور ان کی شان شوکت کا مظہر رہا۔ الغرض وہ اس نظریہ کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ مسلمان تارک الدنیا ہو کر ادھوری زندگی گذاریں۔ ان پر یہ الزام بھی بے بنیاد تھا کہ وہ مادری زبان یا مذہب کی زبان میں تعلیم کو اہمیت نہیں دیتے تھے۔ سر سید نے اس دور میں اردو یونیورسٹی کے قیام کی حمایت کی تھی۔ مگر وہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ کلکتہ یونیورسٹی کو اردو یونیورسٹی میں بدل دیا جائے۔ ان کا بنیادی نظریہ یہ تھا کہ مغربی اور جدید علوم کو انگریزی کے ذریعے سے ہی عام مسلمانوں تک پہونچایا جا سکتا ہے۔ انھیں اردو کی کم مائیگی کا احساس تھا اور سمجھتے تھے کہ وہ ذریعہ تعلیم نہیں بن سکتی ہے اور اس کم مائیگی کو دور کرنے کے لیے سر سید نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تا کہ سائنسی علوم کا ترجمہ اردو میں ہو اور آگے چل کر اردو اس قابل ہو سکے کہ سائنسی علوم اس کے ذریعہ پڑھائے جا سکیں۔

سر سید کا ایک اور اہم مسلک یہ تھا کہ تعلیم کی ذمہ داری یکسر حکومت پر نہیں ڈالی جانی چاہیئے بلکہ ہر طبقہ اور ہر فرقہ اپنی تعلیمی ضروریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اسکول و کالج اور دوسرے ادارے قائم کرے۔ لہذا انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران کئی جگہ اسکول قائم کئے اور بالآخر علی گڈھ کالج کی بنیاد ڈالی جدید علوم کی اہمیت کو پیش نظر رکھتے ہوئے روایتی طریقہ تعلیم مثلاً درس نظامی وغیرہ کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ وقت کی ضرورت کو پورا نہیں کر سکتے۔ علی گڈھ کالج کے قیام کا منصوبہ تیار کرنے سے پہلے سر سید نے انگلستان کے طرز تعلیم بالخصوص کیمبرج کا بڑا عمیق مطالعہ کیا اور علی گڈھ کالج بڑی حد تک انھیں خطوط پر قائم کیا گیا، اس منصوبہ کو بروئے کار لانے کے لئے یہ ضروری تھا کہ مسلمانوں کی پسماندگی سے متعلق حقائق جمع کیے جائیں اور عام مسلمانوں کو ان سے روشناس کرایا جائے۔ اس غرض سے "کمیٹی خواستگار ترقی مسلمانان ہند" قائم کی اور جو معلومات فراہم ہوئیں انھیں بذریعہ "تہذیب الاخلاق" جس کا اجراء (۱۸۷۰ء) میں ہوا منظر عام پر لائے۔ سر سید نے رائل کمیشن آف ایجوکیشن جو سر ولیم ہنٹر کی صدارت میں قایم ہوا تھا کے سامنے بھی مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور ملازمتوں میں ان کی غیر مناسب نمائندگی کے متعلق اعداد و شمار پیش کیے اور کچھ تجاویز رکھیں۔

اس کمیٹی نے جو حقائق معلوم کئے ان کی روشنی میں سر سید نے ایک مفصل رپوٹ تیار کی اور ان تمام عوامل پر بحث کی جو مسلمانوں کی پستی کے ذمہ دار تھے اور جنکی وجہ سے مسلمان انگریزی تعلیم کے خلاف تھے اس رپورٹ سے مسلمانوں کے بعض سمجھدار حلقوں میں انگریزی کے خلاف تعصب کو دور کرنے میں کامیابی ہوئی، جیسا کہ سر سید کا خیال تھا۔ "مسلمانوں کو اپنی ضروریات کے مطابق اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کا انتظام خود کرنا چاہیئے۔" وہ اپنی اس رائے کو تسلیم کروانے کی برابر جد و جہد کرتے رہے۔ ظاہر ہے اس مقصد کے حصول کے لیے خاصا مالی سرمایہ درکار تھا۔ لہذا اس کی فراہمی کیلئے کمیٹی قائم کی گئی جس کا نام "خزینۃ البضاعۃ التاسیس مدرسۃ المسلمین" تھا۔ اور اس کے سکریٹری سر سید خود بنے۔ رائے عامہ کے رجحان کے مطابق علی گڈھ کو کالج کے قیام کیلئے منتخب کیا گیا۔ سید محمود نے ایک مدرسہ کی بھی تجویز پیش کی تھی مگر سر سید کی ساری توجہ کا مرکز علی گڈھ کالج رہا، اور وہ پنشن پر سبکدوش ہو کر علی گڈھ آگئے اور تن من دھن سے اس کے قیام کے لیے جد و جہد میں مصروف ہو گئے۔ ۸ / جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لیٹن وائسرائے ہند نے سنگ بنیاد رکھا اور اس کا انگریزی نا

"محمڈن اینگلو اورینٹل کالج" اور اردو میں "مدرسۃ العلوم" رکھا گیا۔ سرسید شاندار عمارات کی تعمیر کے بھی قائل تھے تاکہ بہتر تعلیمی ماحول قائم ہو سکے۔ انھوں نے ایک پر شکوہ جامع مسجد کی بنیاد بھی ڈالی جس کا شمار ہندوستان کی چند خوبصورت مساجد میں ہوتا ہے اس ادارہ کو اعلیٰ جدید تعلیم کا مرکز بنانا ان کا نصب العین تھا اور تعلیم کے ساتھ ساتھ بہتر تربیت یعنی جینے کا سلیقہ سکھانے کو بھی فوقیت دی گئی اور خاص اہتمام کیا گیا۔ رہائشی زندگی کی مناسب سہولتیں، کھیل کود اور جسمانی صحت وغیرہ کا مناسب انتظام کیا گیا۔

کالج کے قیام سے جدوجہد کا ایک باب مکمل ہوا۔ لیکن جو خواب سرسید نے پورے ملک کے مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا دیکھا تھا وہ یقیناً صرف کالج کے قیام سے تکمیل کو نہیں پہونچ سکتا تھا۔ لہٰذا "محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس" قائم کی گئی تاکہ ملک کے مختلف حصوں کے لوگ یکجا ہو کر تعلیمی، تہذیبی، معاشرتی اور دوسرے اہم مسائل پر تبادلہ خیال کر سکیں اور ایک دوسرے کے تجربات سے فیضیاب ہوں۔ اس کی شاخیں مختلف جگہوں پر قائم کی گئیں اور فروغ تعلیم نسواں اس کے منشور میں شامل کیا گیا اس طرح سرسید نے اپنی تحریک کو ملک گیر تحریک بنا دیا۔

سطور بالا میں علی گڑھ تحریک کی وسعت، گہرائی اور افادیت کا ذکر کیا گیا ہے اس تحریک کے دونوں پہلو یعنی تعلیم کا فروغ اور تعلیم کے معیار کی بلندی کو سرسید نے یکساں طور پر اہم سمجھا اور یہ بات آج بھی اتنی ہی اہم ہے بالفاظ دیگر وسعت کیلئے ہم معیار کو قربان نہیں کر سکتے اور معیار کے حصول کیلئے ہم تعلیم کو محدود کرنے کا اصول بھی نہیں اپنا سکتے۔

سرسید تحریک کے اثر کا اندازہ تعلیم کی وسعت کی بنا پر اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ سری نگر سے لیکر ترچنا پلی تک اور چٹا گانگ (بنگلہ دیش) سے لے کر کراچی (پاکستان) تک مسلمانوں کی کوششوں سے اس برصغیر میں آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد بھی بہت سے ادارے قائم ہوئے آزادی کے فوراً بعد کراچی کے پاس ملیر میں علی گڑھ اور جامعہ کے طرز پر ایک ادارہ قائم کیا گیا اور راقم الحروف دو سال قبل جب بنگلہ دیش کی یونیورسٹیوں کی دعوت پر گیا تو وہاں علی گڑھ اولڈ بوائز ایسوسی ایشن کی تعلیمی سرگرمیوں سے اندازہ ہوا کہ علی گڑھ تحریک وہاں آج بھی زندہ ہے۔ چند سال قبل پاکستان سے ایک وفد اس غرض سے علی گڑھ آیا تھا کہ یہاں کے نظام کا مطالعہ کرے اور راولپنڈی میں ایسا ہی ایک ادارہ قائم کیا جائے۔ ہندوستان میں تین یونیورسٹیاں یعنی علی گڑھ، جامعہ ملیہ اور جامعہ ہمدرد مسلمانوں کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں، کرناٹک اور آندھرا پردیش وغیرہ میں مسلمانوں نے میڈیکل کالجز قائم کیے اور دیگر کئی ریاستوں میں انجینیرنگ کالج اور ایسے دوسرے بہت سے ادارے قائم کیے گیے جن میں سے اکثر کو اقلیتی ادارہ تسلیم کیا گیا ہے۔

سارے ملک میں تعلیمی انجمنیں قائم ہیں اور ان میں سے بعض اپنی زندگی کی ایک صدی یا نصف صدی پوری کر چکی ہیں۔ ایک تخمینہ کے اعتبار سے اس وقت ملک میں ...۷ سے زیادہ ڈگری کالج پلس ٹو کالج اور ہائی اسکول ہیں جن کا انتظام مسلمانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اعداد و شمار کے اعتبار سے اعلیٰ تعلیم یعنی یونیورسٹی اور ڈگری کالجوں میں کل طلبہ کی تعداد کا ۴ فیصد مسلم طلبہ و طالبات پر مشتمل ہے۔ یہ تناسب مسلمانوں کی آبادی کو دیکھتے ہوئے جو ملک میں تقریباً چودہ فیصد ہے یقیناً کم ہے۔ بلخصوص اس وجہ سے بھی کہ مسلمانوں کی آبادی کا بڑا حصہ شہروں میں رہتا ہے۔ جہاں تعلیمی سہولتیں نسبتاً زیادہ مہیا ہیں یہ بات بلا خوف تردید کہی جا سکتی ہے کہ یہ ۴ فیصد تناسب اور سات سو تعلیمی ادارے علی گڑھ تحریک کی دین ہیں۔ ایک اندازہ کے

مطابق تقریباً ۴۰ فیصد زیر تعلیم بچے اسکولوں اور کالجوں میں عصری تعلیم حاصل کر رہے ہیں اور بقیہ ۶۰ فیصد مدارس اور قدیم طریقہ تعلیم سے مستفیض ہو رہے ہیں۔ سرسید کا خواب اسی وقت پورا ہو سکتا ہے جب مسلمانوں کا اندراج اعلیٰ تعلیم میں ان کی آبادی کے تناسب کے اعتبار سے ہو۔ اور جو ۶۰ فیصد عصری تعلیم سے محروم ہیں وہ بھی عصری تعلیم سے بہرہ ور ہو سکیں۔

سرسید تحریک کا دوسرا اہم جزو تعلیم کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنا تھا۔ تحریک کے ابتدائی دور میں یہ مقصد بڑی حد تک پورا ہوا مگر اب یہ بات میں بڑے کرب کے ساتھ لکھنے پر مجبور ہوں کہ علی گڑھ تحریک اس کامیابی کو برقرار نہ رکھ سکی۔ سرسید کا مقصد توسیع کے ساتھ معیار کی بلندی بھی تھا، اور علی گڑھ کالج کو کیمبرج یا انگلینڈ کے دیگر اداروں کے طرز پر قائم کرنے کا مقصد یہی تھا کہ مسلم ادارے معیاری تعلیم دے سکیں۔ علی گڑھ کا ماضی بہت تابناک تھا اور ملک میں بعض اور مسلم ادارے بھی اپنے علاقہ میں مشہور و مقبول تھے۔ سرسید کے بہت سے رفقاء نے علی گڑھ کے باہر بھی کوششیں جاری رکھیں جن میں بہت سے لوگوں کو سرسید سے ترغیب ملی۔ ان میں ان کے اپنے بیٹے اور پوتے سید محمود اور سر راس مسعود کے علاوہ شبلی نعمانی، مولانا حالی، ذکاء اللہ، مولوی سمیع اللہ، ڈپٹی نذیر احمد اور خان بہادر بشیر الدین وغیرہ تھے اور ان لوگوں سے جو شخصیات متاثر ہوئیں اور جنھوں نے مسلمانوں میں اعلیٰ تعلیمی معیار برقرار رکھنے کی کوشش کی ان میں سر ضیاء الدین احمد، بدر الدین طیب جی، ڈاکٹر ذاکر حسین اور خواجہ غلام السیدین، عبدالمجید خواجہ وغیرہ شامل ہیں۔

آج کے ہندوستان میں اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں کے بیشتر ادارے جن میں تحریک کا ستون علی گڑھ بھی شامل ہے، انحطاط کا شکار ہیں، بد قسمتی سے ہندوستان میں شاید ہی کوئی ایسا شہر ہو جہاں مسلمانوں کے قائم کردہ اداروں کا شمار صف اول میں کیا جاتا ہو۔ موجودہ دور میں مسلمانوں کے لیے یہ بہت بڑا چیلنج ہے اور سرسید کے خواب کی تعبیر کے لیے لازم ہے کہ ان اداروں کا معیار بلند سے بلند تر ہو۔ ظاہر ہے کہ جب کسی ادارہ کا شمار صف اول میں نہ ہوگا تو وہاں تعلیم کے حصول کے لیے وہی آئیں گے جن کو معیاری اداروں میں جگہ نہ مل سکے گی۔

آخر میں سرسید تحریک کے ان مقاصد کے حصول کے لیے یہی کہا جا سکتا ہے کہ کاش مسلم اداروں کو فرض شناس دیانتدار، پر خلوص، بے لوث، درد مند اور عزم و ارادہ کے مضبوط رہنما میسر ہوں اور لوگ ذاتی مفاد سے اوپر اٹھ کر سوچیں اور عمل کریں۔ صرف اسی شکل میں علی گڑھ تحریک زندہ رہ سکتی ہے اور سرسید کے خواب پورے ہو سکتے ہیں۔

پروفیسر عابدہ سمیع الدین *

علی گڑھ تحریک موجودہ سیاست کے تناظر میں

علی گڑھ تحریک کے آغاز اور عصر جدید میں سیاسی اعتبار سے اس کی معنویت کا احاطہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ وسط انیسویں صدی میں امت مسلمہ کے سیاسی، سماجی، تعلیمی، ثقافتی نیز مذہبی پس منظر کو ذہن میں رکھا جائے۔ ۱۸۵۷ء کے طوفان کے تھمنے کے بعد انگریزی سامراجیت کے قہر و عتاب کا شکار مسلمان اور صرف مسلمان تھے گرچہ انگریزوں کے خلاف محاذ آرائی میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے۔ ۱۸۸۶ء میں ممبر پارلیمنٹ سیموئل اسمتھ نے کینٹمبری ریویو میں لکھا کہ ہندوستانی آبادی میں مستقل بے اطمینانی کا عنصر مسلمان ہیں۔ لارڈ ایلن برو نے لندن کو متنبہ کیا کہ مسلمان قوم بنیادی اعتبار سے ہم سے مخاصمت رکھتی ہے، یہ رجحان کم از کم ۱۹۱۰ء تک جاری رہا جب ہنری جان اسٹون نے لکھا کہ ۱۸۵۷ء کی بغاوت قطعی طور پر انگریز اور ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں کی اپنی سلطنت قائم کرنے کی ایک کوشش تھی۔ مختصراً ایک طرف انگریزوں کی انتقامی کارروائیاں تھیں تو دوسری طرف مسلم قوم بحیثیت مجموعی ۱۸۵۷ء کی حادثاتی تبدیلی کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لئے آمادہ نہ تھی۔ اس بدلے ہوئے تناظر میں بقا کا مسئلہ مسلمانوں کا سب سے اہم مسئلہ تھا۔ فنا و بقا کی اس کش مکش میں مسلمانوں کے ایک طبقے نے فاتح قوم سے منافرت کا رویہ اپنا کر فنا کے راستے کا انتخاب کیا۔ سر سید کے ذہن رسا نے نوشتہ تقدیر پڑھ لیا تھا۔ وہ ذہنی اعتبار سے قبول کر چکے تھے کہ انگریز قوم جو علم و حکمت، سائنس، تجارت، صنعت و حرفت اور میدان سیاست میں نمایاں امتیاز حاصل کر چکی تھی اب عرصہ دراز تک ملک پر حکومت کرے گی۔ مسلمانوں کو قعر مذلت سے نکالنے کی خاطر قوم کے اس مسیحا نے دو اہم قدم اٹھائے۔ فاتح قوم کی جانب دوستی کا ہاتھ بڑھانے نیز اس کی بد گمانیاں دور کرنے کے لئے تحقیقاتی سطح پر دلنشین انداز میں "اسباب بغاوت ہند" لکھ کر کمال کی جرات اور دور اندیشی کا ثبوت دیا۔

ان کا دوسرا قدم خود اعتمادی کے ساتھ مسلمانوں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرنا تھا۔ فاتح قوم کو مثالی نمونہ قرار دے کر انھوں نے اپنی قوم کو سمجھانے کی کوشش کی کہ بے علمی مفلسی کی ماں ہے، تعلیم، تحقیقی ذہن اور جہد مسلسل ہی کسی

---

* سابق پروفیسر شعبہ سیاسیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

قوم کی ترقی کی ضمانت کرسکتے ہیں۔ مسلمان اپنی تمام تر توجہ، کاوشیں اور وسائل صرف تعلیم پر مرکوز کرسکیں اس لئے سر نے انھیں سیاست سے کنارہ کشی کی تلقین کی، بد قسمتی سے اسی طرز فکر کے باعث کئی دھندھلے ذہن والے مورخین نے کا شمار نہ صرف کانگریس مخالفین میں کیا بلکہ دو قومی نظریے کے علمبرداروں کی صف اول میں ان کو لا کھڑا کیا ہے۔ مز ظریفی تو یہ کہ اسی مناسبت سے وہ ہندو مسلم اتحاد مخالف بھی ٹھرائے گئے ہیں۔ ۱۸۸۸ء میں للہ لاجپت رائے نے "کوہ نور" ا میں اپنی طویل مراسلت میں جس کا بعد میں اے۔او۔ ہیوم کی ایماء پر انگریزی ترجمہ بھی ہوا، خیال ظاہر کیا کہ ہندو اتحاد سے متعلق سر سید اپنے پچھلے نظریات و عقائد سے برگشتہ ہو گئے ہیں۔ انھوں نے چیلنج کیا کہ سر سید اس دوہرے نقاب اتار دیں۔ کانگریس کے چوتھے اجلاس میں جو ۱۸۸۸ء میں الہ آباد میں ہوا لاجپت رائے کو اس جرات مندانہ اقدام کے۔ مبارکباد بھی دی گئی۔ موجودہ زمانے میں تو گری لال جین نے یہاں تک اصرار کیا ہے کہ سر سید نے سب سے پہلے مسلما کے لئے لفظ "قوم" کا استعمال کیا اور یوں جس دو قومی نظریے کی داغ بیل پڑی اس کی تکمیل محمد علی جناح کے ہاتھوں۔ ڈاکٹر لال بہادر نے بھی اپنی کتاب دی مسلم لیگ (The Muslim Leage) میں علحد گی پسندی کا بیج بونے کی تمام تر داری سر سید پر ڈالی ہے جس کی کھیتی محمد علی جناح نے کاٹی۔ آئیے یہاں سے عصر جدید کے سفر کی شروعات سے پہلے معروضے کا تھوڑا تفصیلی جائزہ لیں۔

۱۸۸۵ء میں اے۔او۔ ہیوم کے ایماء پر جو انڈین نیشنل کانگریس قائم ہوئی اس کے بنیادی مقاصد اس کانگریس قطعاً مختلف تھے جس نے جنگ آزادی کی قیادت کی اور برطانوی سامراجیت سے بھر پور ٹکر لی۔ ابتدا میں خود کانگریس کا کسی بھی قسم کے تصادم سے بچنا تھا۔ یہ اہم نکتہ بھی غور طلب ہے کہ اس زمانے کے ہندوستان میں "متحدہ قومیت" کا واضح تصور ابھر کر سامنے ہی نہیں آیا تھا۔ موجودہ قومیت کے تصور کو ابھر کر مخصوص شکل اختیار کرنے میں خاصا وقت لگا۔ خود للہ لاجپت رائے نے کائستھ سماچار میں کانگریس کے نام اپنے خط میں نومبر ۱۹۰۱ء میں تجویز پیش کی کہ کانگریس ایک کھلی ہندو سیاسی تنظیم ہونا چاہیے، ہندو، مسلمان، عیسائی علیحدہ علیحدہ مذہبی قومیں ہیں انہیں کانگریس پلیٹ فارم پر متحد ممکن نہیں۔ اس ضمن میں یہ تذکرہ بھی بے محل نہ ہوگا کہ جب سر سید نے کانگریس کے تیسرے صدر بدر الدین طیب جی کو "میں نہیں سمجھا انڈین نیشنل کانگریس سے آپ کی مراد کیا ہے۔ کیا وہ تمام ذاتیں اور مذاہب جو ہندوستان میں بستے ہیں قوم ہیں یا ایک قوم بن سکتے ہیں؟ یا ان کے مقاصد و خواہشات میں کوئی یکسانیت ہو سکتی ہے؟ میں سمجھتا ہوں یہ ناممکن ہے بدرالدین طیب جی کا جواب تھا، "کوئی فرد یہاں کی تمام اقوام کو ایک قوم تصور نہیں کرتا۔ تاہم کچھ مسائل ہیں جن کا ہندوستان کی سبھی اقوام اور ملتوں (Communities) سے ہے۔" واضح رہے کہ کانگریس صدر نے اپنے اس جواب میں قوم صیغہ واحد میں نہیں، صیغہ جمع میں استعمال کیا ہے جو اس بات کا بین ثبوت ہے کہ متحدہ قومیت کا تصور سر سید کے کے زمانے کا ہے۔ اس لئے وہ بجا طور پر ہندوستان کو مختلف قومیتوں کا "ایک ملک" تصور کرتے تھے جن کے درمیان باہمی آہنگی کی انھوں نے ہمیشہ اپنے فکر و عمل سے کوشش کی۔ "لفظ قوم سے میری مراد ہندو مسلمان دونوں سے ہے۔ یہی وہ ہیں جس میں، میں لفظ نیشن کی تعبیر کرتا ہوں۔ میرے لیے یہ امر چنداں لحاظ کے لائق نہیں کہ ان کا مذہبی عقیدہ کیا ہے اس کے برعکس قومیت کے اس مبہم تصور کے پس منظر میں جہاں ایک طرف بنگال اور مہاراشٹر میں رجعت پسند و احیائی طا

.بھار رہی تھیں، یو۔ پی میں کچھ کوتاہ بینوں نے دیوتا گری تحریک شروع کی جس نے سرسید کے فکری سفر کو یقیناً متاثر اور آنے والے زمانے نے یہ ثابت بھی کر دیا کہ ان کے یہ خدشات بے بنیاد نہیں تھے، ہندو و مسلم اتحاد کے سلسلے میں سید کے نظریات و پختہ عقائد پر جتنا کچھ لکھا جائے کم ہے۔ کانگریس سے ان کی مخالفت ہندوؤں سے مخاصمت کے سبب ں تھی، وہ خلوص نیت سے سمجھتے تھے کہ انیسویں صدی کے عصری منظر نامے میں کوئی بھی سیاسی تحریک مسلمانوں کے حق سم قاتل تھی، کانگریس ہی نہیں انھوں نے جسٹس امیر علی کی محمڈن نیشنل کانفرنس میں بھی شرکت قبول نہیں کی۔

بلاشبہ سرسید نے نمائندہ حکومت (Representative Government) کی مخالفت کی کیونکہ انیسویں صدی میں سے ہندوستان کے لئے قبل از وقت سمجھتے تھے۔ ان کا جمہوریت پر یقین تھا تاہم وہ بجا طور پر یہ بھی سمجھتے تھے کہ تعلیمی بار سے مسلم نمائندے "اتنے باصلاحیت نہیں تھے کہ قانون سازی میں ملی مفادات کا تحفظ کر پاتے۔" ان کا یقین تھا کہ یہ مسلمان باصلاحیت بنیں، ملک و قوم کو ترقی کی راہ پر لے جانے کے لئے ضروری ہے کہ ملک کا ہر طبقہ تعلیمی و معاشی اعتبار برابر ہو۔ یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے۔ سرسید کے اس نظریے کی صحت کا اعتراف پنڈت نہرو نے بھی کیا ہے۔ سید کا یہ فیصلہ کہ تمام کوششیں مسلمانوں کو جدید تعلیم سے آراستہ کرنے پر صرف کر دینی چاہئیں یقیناً صحیح و درست تھا بغیر ، تعلیم کے میرا خیال ہے کہ مسلمان جدید طرز قومیت کی تعمیر میں کوئی موثر حصہ نہیں لے سکتے تھے بلکہ یہ اندیشہ تھا کہ وہ .وؤں کے مقابلے میں غیر موثر بن جائیں گے جو تعلیم میں بھی ان سے آگے تھے اور معاشی اعتبار سے بھی زیادہ مضبوط ۔۔ اس لئے ہندوستانی مسلمانوں کی زبوں حالی کا علاج انھوں نے جدید تعلیم میں تلاش کیا اور محض رض کی تشخیص ں کی، نسخہ بھی تجویز کیا اور عملی اقدامات بھی۔ مسلمانوں کے مسائل پر خصوصی توجہ دینے کے سلسلے میں ان کی اس توجیہ کا رکون ہوسکتا ہے کہ جو بھائی بیماری اور خرابی صحت کا شکار ہوتا ہے وہ اپنے دوسرے بھائیوں کی خصوصی توجہ اور دیکھ بھال ستحق ہوتا ہے اسی مقصد کے حصول کی خاطر وہ اپنے ہندو بھائیوں کی مدد کے خواہاں تھے۔ پھر مذہبی منافرت کا سوال ہی ل پیدا ہوتا ہے انھوں نے لالہ لاجپت رائے کی طرح کہیں نہیں لکھا کہ "میرے دل میں اسلام کی جو عظمت بچپن کی یت کے سبب تھی نفرت میں تبدیل ہو چکی ہے۔" (سوانح عمری)

اپنی غازی پور کی ۱۸۶۴ء کی تقریر میں جمہوریت کی افادیت سے متعلق سرسید نے جو کچھ کہا اس کے بعد کسی حت کی ضرورت باقی نہیں رہتی، انھوں نے کہا تھا: "چند ہندوستانیوں کا لیجسلیٹو کاؤنسل میں داخل ہونا ہندوستانیوں کی ں کا شروع ہے۔ تم میری اس پیشین گوئی کو یاد رکھو کہ وہ دن کچھ دور نہیں ہے کہ ہر ضلع میں سے ایک کا کاؤنسل میں داخل ضروری ہو گا۔ وہ دن آئے گا کہ تم خود ہی قانون بناؤ گے اور خود ہی اس پر عمل کرو گے۔"

اس کے ساتھ سرسید کے تدبر اور مسلم قوم کے لئے ان کی مسیحائی جو راجہ رام موہن رائے نے ان سے قبل اپنی کے لئے کی اس کے ڈانڈے محمد علی جناح کی ۱۹۴۷ء والی دو قومی نظریے کی مسلم لیگ سے ملاتے وقت یہ نکتہ بھی ذہن ن کرنا ضروری ہے کہ لکھنؤ پیکٹ کے پس منظر میں خلافت و تحریک عدم تعاون تک کانگریس اور مسلم لیگ نے شانہ بشانہ کیا۔ بنیادی اختلافات ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ سے شروع ہوئے، سرسید پر دو قومی نظریے کا لیبل لگانا جارحانہ قومیت کے برداروں کی طرز فکر کا وہی ایک پہلو ہے جس کے تحت تاریخ کو دوبارہ لکھنے کی مذموم کوششیں شروع ہو چکی ہیں۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۳ء

آج تاریخ پھر اپنے کو دہرا رہی ہے۔ خیال رہے کہ جب ہم تاریخ دہرانے کی بات کرتے ہیں تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ واقعات کا تسلسل نیز عوامل کی فعالیت بجنسہٖ پہلی جیسی ہی ترتیب سے عمل میں آئے۔ نئی صورتحال کا سابقہ صورت حال سے بڑی حد تک مماثلت کا ہونا ہی تاریخ کا اپنے آپ کو دہرانے کا عمل ہے۔ مسلمانوں کی موجودہ تعلیمی پس ماندگی معاشی بدحالی اور سب سے بڑھ کر بابری مسجد کی شہادت سے پیدا شدہ نفسیاتی خوف و دل شکستگی سے انھیں پھر اسی دوراہے پر لا کھڑا کیا ہے جہاں فنا و بقا کے راستے ایک بار پھر سے گڈمڈ ہو گئے ہیں، عصر جدید کے تناظر میں علی گڑھ تحریک کی معنویت متعین کرنے کے لئے آئیے سوچیں کہ سرسید کے عقائد و نظریات کس حد تک مسلمانوں کے مسائل حل کرنے میں ممد و معاون ہو سکتے ہیں:

۶ دسمبر کے المیے کے بعد سے سیاست میں مسلمانوں کے کردار کا سوال آج ہر پریشان ذہن کا بوجھ ہے، ہر آنکھ نم اور ہر دل مضطرب ہے۔ ایسے میں مسلمانوں میں ایک نظریہ فکر ابھرا ہے کہ عصری تقاضوں کے تحت انھیں ایک بار پھر سیاست سے مکمل علیحدگی اختیار کر کے اپنی تمام تر کاوشوں کو تعلیم اور صرف تعلیم پر مرکوز کر دینا چاہئے۔ یہ طرز فکر ہمیں کس حد تک لے جا سکتا ہے خاصا مشکوک ہے۔ بیسویں صدی کی آخری دہائی اور ۱۸۵۷ء کی حادثاتی تبدیلی میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ آئیے تھوڑی تفصیل میں چلیں۔

تعلیم کی اہمیت آج بھی اپنی جگہ مسلم، مسلمان آج بھی اس میدان میں اپنے ہم وطنوں سے بہت پیچھے ہیں تھوڑ اور تاریخ کے صفحات الٹیے، تو اندازہ ہو گا کہ ہندوستان میں جن لوگوں نے قبول اسلام کیا وہ زیادہ تر نچلے طبقے سے تعلق رکھتے تھے۔ قبول اسلام نے انھیں ذات و پات کے بندھن اور ظلم سے نجات تو ضرور دی تاہم ان کی سماجی، ثقافتی، تعلیمی اور معاشی، حیثیت میں کوئی نمایاں فرق نہیں ہوا۔ سرسید تحریک کا نشانہ بھی تعلیمی اعتبار سے "اشراف" ہی تھے جن کی اکثریت نقل وطن کر گئی۔ "اجلاف" آج بھی پسماندہ اور استحصال کا شکار ہیں۔ ہاں ایک بنیادی فرق ضرور ہے کہ ان میں اپنی موجودہ حالت کا شعور پوری طرح بیدار ہو چکا ہے جس نے نئی الجھنوں، نئی پیچیدگیوں کو جنم دیا ہے۔ یہ الجھنیں خوش آئند بھی ہیں اور بہتر کی ضمانت بھی۔ تعلیمی پس ماندگی اور معاشی بدحالی کا چولی دامن کا ساتھ ہے، مستقبل کے کسی بھی لائحہ عمل میں یقیناً ترجیح آج بھی تعلیم ہی کو ہونا چاہئے تاہم سیاست سے مکمل علیحدگی باعث خودکشی ہو گی۔ ہم دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے باعزت شہری ہونے کے ناطے مساوی حقوق رکھتے ہیں ان پر کوئی ضرب لگے تو آواز اٹھانا بھی ہمارا حق ہے، ہمیں حکومتی اقتدار میں متناسب حصہ اور ایوان نمائندگان میں متناسب نمائندگی بھی چاہئے۔ انیسویں صدی میں ہمارا مقابلہ ایک انتہائی قوی، دشمن سے تھا جس کے لئے ہم پوری طرح تیار نہیں تھے۔ آج ہمیں اپنے ہی افراد خاندان سے اپنے جائز حقوق کی بات کرنا ہے۔ کسی سیاسی پارٹی کا ووٹ بینک بننے کے لئے ہم قطعی تیار نہیں۔ ہمیں سیکولر عناصر کے اشتراک سے فسطائی عناصر سے بھی مورچہ لینا ہے۔ آخر یہی عناصر تھے جنھوں نے ۶ دسمبر کے فسطائی جنون کے تانڈو رقص کو عوام کے سامنے بے نقاب کیا۔ ان کے نئے نشانے ہبلی کی عید گاہ کے معاملے میں بحیثیت مجموعی اکثریتی طبقے کی بے رخی نے یقیناً جارحانہ قومیت کے علمبرداروں کو مایوس کیا ہے۔ یہ عناصر مسلمانوں کو سبق سکھانے میں بھی ناکام رہے ہیں۔ ہر طوفان کے بعد مفید نتائج سامنے آتے ہیں، ہر برائی سے ایک اچھائی جنم لیتی ہے۔ اکثریت میں احساس شرمندگی اور اقلیت میں نئی ہمت، نئی سوچ ایک

روشن مستقبل کی ضمانت ہیں پھر سیاست سے فرار کیونکر ممکن ہوسکتا ہے؟ تاہم اس ضمن میں ہمیں یہ سنہری اصول بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ قرآن کریم نے ہر معاملے میں ہمیں "امۃ متوسط" کے خطاب سے نوازا ہے۔ اعتدال کی یہی راہ سرسید نے ہمیں دکھائی ہے۔ ایک کثیر قومی ملک میں اپنے جائز حقوق کے لئے بھی سنجیدگی، متانت اور تدبر سے اپنی راہیں ہموار کرنا ہوتی ہیں۔ سرسید نے نہ صرف اس کی تلقین کی بلکہ اپنے عمل و کردار سے اس کی افادیت بھی ثابت کر دکھائی کہ قوموں کی مسیحائی کے لئے جوش سے زیادہ ہوش کی ضرورت ہوتی ہے۔

جنگ آزادی کی جدوجہد کے درمیان جس جذباتی قیادت نے جنم لیا، بد قسمتی سے اس کا کردار آج بھی تبدیل نہیں ہوا ہے۔ ہماری یہی جذباتی قیادت بڑی حد تک بابری مسجد کی شہادت کے لئے ذمہ دار ہے۔ آج کے پر آشوب حالات میں مسلم دانشور قیادت کے اس خلا کو پر کرسکتے تھے لیکن اسے ستم ظریفی ہی کہئے کہ ان کا عوام سے کوئی رابطہ قائم نہیں ہے۔ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ جنگ آزادی کے دوران مسلمانوں میں کوئی ایسا لیڈر پیدا نہیں ہوا جو عوامی مفادات کا تحفظ کرسکتا اور آزاد ہندوستان میں ان کے لئے باوقار مقام محفوظ کرسکتا۔ جاگیر دارانہ طبقے کا جب آنے والے آزاد ہندوستان میں اعلیٰ طبقے کے ہندوؤں سے اقتدار کی ساجھے داری میں کوئی سمجھوتہ ممکن نہ ہوسکا تو ملک تقسیم ہو گیا۔ مسلم عوام کی مفلوک الحالی اور ان سے جڑے مسائل آج بھی اپنی جگہ ایک تلخ حقیقت ہیں جنھیں "ہندوتو" کے بڑھتے ہوئے طوفان نے اور زیادہ پیچیدہ بنادیا ہے۔

عصری حالات کے اس تناظر میں سرسید کی نظریاتی فکر کی معنویت اور بڑھ جاتی ہے اس فکر کو مشعل راہ بنا کر ہم ایک بار پھر مایوسی و دل شکستگی کی دلدل سے باہر نکل سکتے ہیں۔ اس نظریاتی فکر کے کتنے ہی پہلو ہیں جن کی جامعیت سے بحث ایک مضمون میں ناممکن ہے۔ سماجی اصلاحات میں ان کی روشن خیالی، خواتین کے سماج میں جائز مقام کے لئے ان کے اجتہادی نظریات، اسلام پر رکیک حملوں کے جواب میں جذباتی نعرے بازیوں کی جگہ "خطبات احمدیہ" لکھ کر اسلام کی صحیح تصویر مخالفین کے سامنے پیش کرنا، تجارت کی اہمیت پر زور، جس کی اہمیت سے موجودہ آزادانہ معیشت کی نئی حکمت عملی میں انکار ممکن نہیں اور جس میں مسلمانوں کی فعالیت ہی ان کے بقا کی ضامن ہے وغیرہ وغیرہ۔

سرسید نے سائنسی نظریہ، قومی اتحاد، علمی تحقیق، علمی معاملات میں وسیع المشربی اور مذہبی جوش میں توازن کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑنے کے جو اصول وسط انیسویں صدی میں وضع کئے تھے وہ آج بھی ہماری تاریک راہوں کے لئے مشعل راہ بن سکتے ہیں۔

ڈاکٹر اشفاق محمد خاں *

سرسیّد تحریک اور اجتہاد

۱۸۵۷ء کے بعد سرسید کو اپنی بدحال قوم یا فرقہ کی سماجی اصلاح و فلاح، ترقی اور تحفظ کے لئے دو محاذ پر جدو جہد کرنا پڑی۔ یعنی پہلے محاذ پر مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کے ذریعہ معاشی پسماندگی دور کرکے ان کو باعزت اور باعظمت شہری بنانا تھا۔ اور دوسرے محاذ پر مذہبی اصلاح کے ذریعہ مسلمانوں کو قدامت پسندی سے نکال کر ذہنی رفعت کے ذریعہ روشن خیال بنانا تھا تاکہ وہ اپنے ہمسایوں اور دوسری ترقی یافتہ قوموں کی ہمسری کرنے کے لائق بن سکیں۔

پہلے محاذ پر سرسید کو بڑی حد تک کامیابی حاصل ہوئی یعنی ان کا قائم کردہ مدرسہ پہلے ایم۔اے۔او کالج اور پھر انتقال کے ۲۴ برس بعد مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ اس طرح کم از کم قوم کے اعلیٰ متوسط اور متوسط طبقے کے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کا انتظام سرسید کی تعلیمی اصلاحی تحریک کا ہی نتیجہ ہے۔

لیکن مذہبی اصلاح کا کام ہر مصلح کی طرح سرسید کے لئے بھی بڑا دشوار اور جان لیوا تھا۔ صرف اس لئے کہ سرسید کے سامنے مذہب اسلام کی عام طور پر جو عملی شکل تھی وہ ان کے نقطۂ نظر، اعلیٰ شعور اور علم و بصیرت کے اعتبار سے سراسر اسلام کے خلاف تھی۔ یعنی اسلام میں بیشتر غیر اسلامی خیالات اور عناصر عیسائیوں اور یہودیوں کے مذاہب سے داخل ہو چکے تھے اور ہندوستان پہنچ کر مسلمان یہاں کی قدیم تہذیبی روایات اور ہندو دھرم سے بھی اثرات قبول کر چکے تھے۔ ان سب عناصر کے داخل ہونے کے اسباب سرسید کے نزدیک یہ تھے کہ ہم (مسلمانوں) نے قرآن کی اصل روح کی غلط تعبیر کی ہے علاوہ ازیں غیر معتمد احادیث پر اعتقاد اور جدید علوم و فنون سے خود کو نہ صرف بے بہرہ رکھا ہے بلکہ ان کو خلاف اسلام بھی سمجھا ہے۔ اس طرح سرسید نے ایسے تمام عناصر اور خیالات کو اسلام سے خارج کرنے کے لئے عملی قدم اٹھایا اور انھوں نے بعض بے بنیاد عقائد، بدعتوں اور خرافاتی خیالات وغیرہ کو قرآن سے ثابت کیا کہ یہ سب بے حقیقت اور من گھڑت باتیں ہیں ان کا تعلق اسلام سے قطعاً نہیں ہے اور انھوں نے جدید سائنس اور نئے علوم کی تحقیقات کے پیش نظر اسلام کو ایک اچھا سچا اور ترقی پسند مذہب ثابت کرنے کی کوشش کی۔ درج ذیل بیان میرے اس خیال کی تائید ہے۔

"سرسید نے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ اہل سنت و جماعت نے اجتہاد کو ختم اور مجتہد کو معدوم خیال کرلیا ہے اور شیعہ

* سنٹر آف انڈین لنگویجز، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

فرقے کی اس بات کے لئے تعریف کی کہ وہ سنیوں کے برعکس ہر زمانہ میں مجتہد کا ہونا ضروری خیال کرتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ زمانہ تغیر پذیر ہے بدلتے وقت کے ساتھ نئے نئے مسائل اور نئی نئی ضرورتیں پیش آتی ہیں اس لئے ان میں اور مذہب کے درمیان مطابقت پیدا کرنے کے لئے ہر زمانے میں مجتہد کی ضرورت ہوگی جو مذہب کی ترجمانی نئے علوم وفنون کی روشنی میں کر سکے۔ سرسید کا خیال تھا کہ جس طرح دنیوی خیالات، عادات اور رسم و رواج، حالت تمدن اور معاشرت پر زمانے کا اثر ہوتا ہے اسی طرح مذہب اور اعتقاد پر بھی زمانہ کا اثر ہوتا ہے۔ حال کا زمانہ شک کا زمانہ ہے اسی لئے سرسید نے کہا کہ کسی بھی بات کو آج کے انسان اس وقت تک سچ نہیں مانتے جب تک اس کے سچ ہونے کا یقین نہ آوے اور یہی سبب ہے کہ انسانوں کے مذہب پر یا یوں کہو کہ ان کے اعتقادات پر زمانے نے سب سے بڑا اثر ڈالا ہے۔ سرسید نے کہا کہ مذہب اسلام میں کچھ ایسا نہیں ہے جو کہ ترقی کے مانع ہو اور زمانے کے دوش بہ دوش نہ چل سکتا ہو۔ انھوں نے مزید کہا کہ اسلام میں جو کچھ بھی ایسا نظر آتا ہے وہ صحیح اسلام نہیں ہے بلکہ بعد کے زمانے کی اختراع ہے اس لئے وہ مذہب اسلام کی تحقیق کی طرف مائل ہونے اور قرآن کی روح کی ترجمانی اور حدیثوں کی اصل چھان بین کی۔ سرسید نے کہا کہ اگر وہ اسلام کی سچائی کی تحقیقات کی طرف متوجہ نہ ہوتے تو یقینی مذہب اسلام کو چھوڑ دیتے۔ انھوں نے تمام معلومہ مذاہب سے اسلام کا موازنہ کیا اور ان کی تحقیقات نے ان کو اسلام کے سچ ہونے کا یقین دلایا"۔(۱)

اس بیان کے بعد ہمارا ذہن سرسید کے مذہبی نقطۂ نظر کو اچھی طرح سمجھ سکتا ہے۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ سرسید نے عمیق مطالعہ اور ذہانت کی بدولت مذہب اسلام کی اصل روح تک پہنچ سکے تھے اور سمجھ چکے تھے کہ ہماری قوم رائج الوقت سب کی جس ڈگر پر سیکڑوں سال سے گامزن ہے وہ اب خطرناک ہے اور یہ بھی جانتے تھے کہ مذہب اسلام کو تو شاید اتنا رہ لاحق نہیں ہے کیونکہ وہ کتابوں اور سینوں میں محفوظ ہے لیکن اس کے ماننے والے (مسلمان) ضرور ایک نہ ایک دن دی اور تباہی میں مبتلا ہوکر رہیں گے۔ چنانچہ سرسید نے اس تباہی سے بچانے کے لئے مذہبی اصلاح کا جو کام شروع کیا تھا ، کی بنا پر ان کو بے پناہ پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جاہل قوم کی گالیاں کھانا پڑیں اور طرح طرح کے دل آزار فتووں سے ا گیا، قتل کی بھی دھمکیاں دی گئیں وغیرہ وغیرہ ۔۔۔ لیکن سرسید کی خود اعتمادی، تحمل اور استقلال نے قوم کی لعن طعن کا غانہ اثر قبول نہیں کیا بلکہ ان کا جوش عمل اور قوی ہوتا گیا۔ فرماتے ہیں :

جوں جوں لوگ گالیاں دیتے ہیں، جوں جوں تکلیف دیتے ہیں، میرا جوش (عمل) بڑھتا جاتا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ نہیں سمجھتے"۔(۲)

اس طرح قومی اصلاح کی تحریک میں سرسید کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے وقت کے تقاضوں کے تحت اسلام کی نئے انداز اور نئے زاویوں سے تفسیر بیان کی اور ایک نئے مذہبی طرز فکر کی بنیاد ڈالی۔ تفسیر قرآن لکھ کر مذہب اسلام کی تعلیمات و فلسفہ کی مکمل تعبیر موجودہ عہد کی ضروریات کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی لیکن یہ کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا۔ علاوہ ازیں توریت اور انجیل کی تفاسیر بھی اس نقطۂ نظر سے لکھیں کہ مسلمان اور عیسائی ذہنی اور جذباتی طور پر ایک دوسرے کے قریب آجائیں اور وہ خود اس نتیجے پر پہنچ جائیں کہ اسلام اور مسیحیت کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور الہامی کتب میں کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے اور وہ اپنی اصل شکل میں موجود ہیں۔

سرسید اسلام اور نیچر (فطرت) کی ہم آہنگی اور یگانگت کے قائل تھے اور اس دعوے کے پیش نظر کہ الاسلام ھو طرۃ و الفطرۃ ھی الاسلام۔ وہ تمام عقائد اور احکام اسلام کو نیچر ہی کی بنا پر ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چوں کہ ، کے قوانین اللہ کے بنائے ہوئے ہیں اور اسلام بھی اللہ کا بنایا ہوا ایک اچھا اور سچا دین ہے اس لئے دونوں میں یگانگت د

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، ۱ اکتوبر، نومبر ۱۹۹۰ء

اتفاق ضروری بلکہ لازمی ہے ۔اس طرح اسلام کا کوئی حکم اورشرعی قانون، فطرت کے تقاضوں کا مخالف نہیں ہوسکتا۔لیکن جب سرسید سے شکایت کی گئی کہ نیچر یا اس کے قوانین کو کس طرح معلوم کیا جاسکتا ہے تو انھوں نے اس کی توجیہ اس طرح کی کہ اللہ تعالی نے انسان کو عقل عطا فرمائی ہے ۔عقل ہی کے ذریعے سے ہم قوانین قدرت کو معلوم کرتے ہیں ۔عقل ہی ہمیں فطرت انسانی کے قوانین اور ضابطوں سے آگاہ کرتی ہے گویا عقل اور نیچر میں ایک ہم آہنگی ۔چونکہ دین اسلام اور نیچر میں مکمل مطابقت ہے اس لئے اسلام اور عقل میں مطابقت اور یگانگت بھی ضروری بلکہ لازمی ہے ۔بالفاظ دیگر سرسید کے نزدیک اسلام عین عقل کے مطابق ہے وہ اسلام کو دین فطرت اور فطرت انسانی کے مطابق سمجھتے ہیں اور اس سلسلے میں فرماتے ہیں :

"میں نے مذاہب کی صداقت دریافت کرنے کے لئے اور مذاہب کی جانچ کے لئے بھی یہ اصول قرار دیا ہے کہ وہ فطرت انسانی کے مطابق ہے یا نہیں ----اور مجھ کو یقین ہوا ہے کہ اسلام اس فطرت کے مطابق ہے ---ان لوگوں پر جنھوں نے دانستہ فطری یا نیچری ہونے کا دوسرے معنوں میں مجھ پر الزام لگایا ہے ان کو خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا ۔خدا سب چیزوں کا پیدا کرنے والا ہے ------وہ جس طرح ہمارا اور تمہارا سب کا خالق ہے اسی طرح نیچر کا بھی خالق ہے ۔پس مخالفین کا یہ کہنا کہ میں نیچر کو خالق یا نعوذ باللہ نیچر کو خدا کہتا ہوں کس قدر بہتان ہے جس کو میں مخلوق کہتا ہوں وہ کہتے ہیں کہ وہ اس کو خالق کہتا ہے۔"(۲)

ہم نے دیکھا کہ سرسید کے نزدیک اسلام، نیچر اور عقل ایک ایسا مثلث ہے جس کے تینوں زاویوں کو الگ الگ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔بالخصوص دنیا کے معاملات و مسائل میں عقل کا دخل ہی ہر ہر سطح پر ہماری رہنمائی کرتا ہے اور کارآمد ثابت ہوتا ہے۔

مسلمانوں کی اصلاح و ترقی سے متعلق سرسید کے افکار و اعمال کی ضرورت اور اہمیت ان کے عہد کے مقابلے میں آج کچھ زیادہ ہی معلوم ہو رہی ہے۔ نہایت افسوس کی بات یہ ہے کہ سرسید کے بعد سے آج تک سرسید کے کارناموں یا ان کے اصلاحی منصوبوں پر بالخصوص مذہبی اجتہاد کے سلسلے میں ہمارے فرقے کے علما یا رہبران ملت نے کوئی توجہ نہیں فرمائی ۔اور بقول ایک دانشور اب تو کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "اللہ تعالی نے مسلمانوں کو ایک اچھا دین تو عطا کیا مگر دانائی چھین لی"۔میرا خیال ہے اگر آج سرسید ہمارے درمیان ہوتے تو وہ بھی شاید اسی طرح کی بات کہنے پر مجبور ہوتے۔اور مسلمانوں کو موجودہ عہد کے تقاضوں کے مطابق مسلمان بنانے کی جدوجہد کرتے ۔یعنی وہ نوجوانوں سے فرماتے کہ تم اب صرف نام کی بنا پر مسلمان کہے جانے کے مستحق نہیں ہوسکتے اور نہ ہی دنیا میں سرخروئی حاصل کرسکتے ہو تاوقتیکہ تم ان عقائد و فرائض کے علاوہ جو تم پر تمہارے دین و مذہب' نے پہلے سے عائد کر رکھے ہیں ان کے ساتھ ساتھ کچھ مزید کام عبادت کے طور پر اپنے اوپر فرض نہ کرلو اور وہ فرائض یا کام اس طرح سے ہیں :

۱۔علم حاصل کرو (خواہ کہیں بھی جانا پڑے)

۲۔محنت کرو، تساہلی کو خیرباد کہو۔

۳۔اکل حلال کھاؤ۔

۴۔فرقہ پرستی کو پاس نہ آنے دو۔انسان دوستی کو گلے لگاؤ۔

۵۔روشن خیال اور سیکولر بن جاؤ۔

باقی صفحہ ۵ ۱۴ پر

ڈاکٹر محمد صلاح الدین عمری *

سرسید تحریک کی معنویت

"حقیقت یہ ہے کہ اللہ کسی قوم کے حال کو نہیں بدلتا جب تک کہ وہ خود اپنے اوصاف کو نہیں بدل دیتی۔"

انسانی زندگی تغیر پذیر اور جہد و عمل سے عبارت ہے۔ زندگی میں ارتقائی عمل ہی اس کو حرکت و حرارت بخشتا ہے جو حیات کی علامت اور تہذیبی ارتقا کا سبب ہے۔ اور ارتقائی عمل کی موقوفی اور معین طرز زندگی پر قیام سکوت و ٹھہراؤ کا باعث ہوتا ہے جو موت کی علامت اور تہذیبی انحطاط کا سبب ہے۔ زندگی کے نئے نئے مسائل اور مختلف مشکلات پر اسی وقت قابو پایا جاسکتا ہے جب انسان طرز کہن کے تقدس کے بت کو توڑنے کی جرات اپنے اندر پیدا کرلے، اور اپنے ذہنی افق کو کھلے دل سے وسیع سے وسیع تر کرنے پر آمادہ ہو۔ دنیا کی تاریخ پر نظر ڈالئے تو وہی اقوام ترقی کی راہ پر گامزن ملیں گی جنھوں نے جمود و تعطل کے جال سے خود کو آزاد کرلیا اور عقلی بنیادوں پر رفتار زمانہ کا ساتھ دیا۔ اس کے برخلاف وہ اقوام پسماندگی کی ذلتوں کو برداشت کرتی رہیں جو قدامت و فرسودگی کی جکڑ بندیوں سے خود کو نجات دلانے کا حوصلہ پیدا نہیں کر سکیں اور جہالت و تنگ ذہنی کا شکار رہیں۔ دور جدید کے علمی و سائنسی انفجار اور صنعتی تہذیب کی یلغار نے اس حقیقت کو مزید واضح کر دیا ہے اور علمی اعتبار سے پسماندگی کی شکار اقوام کو مزید پسماندگی میں دھکیل دیا ہے۔

مسلم قوم اگرچہ اس انقلابی فکر کی حامل دعوت کی پیروکار ہے جس نے "آباؤ اجداد" کے بتوں کو توڑنے اور حقائق کو غیر مشروط طور پر تسلیم کرنے کی آواز لگائی تھی اور جس کے داعی پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعوت کے ذریعہ حصول علم کے ایسے مثالی اور آفاقی مقصد کی جانب رہنمائی کی تھی جو دین و دنیا دونوں کی فلاح و سعادت کی ضمانت دیتا ہے اور ارتقاء کے اصول پر قائم ہے۔ لیکن اب وہی قوم اپنی کوتاہ اندیشی کی وجہ سے ملتی اور جمود کا شکار ہو چلی تھی۔ ظاہری اور باطنی ایسی کوئی خامی اور کمزوری نہیں تھی جو ان میں سرایت نہ کر گئی ہو۔ مذہبی اعتبار سے کھوکھلی، اخلاقی اعتبار سے قلاش، سماجی اعتبار سے پست اور بے وزن، اقتصادی اعتبار سے مفلس اور علمی اعتبار سے جاہل۔

ہندوستانی مسلمانوں کی حالت اس حیثیت سے اور بھی زیادہ خراب تھی کہ ان میں احساس زیاں جاتا رہا تھا جس کے نتیجہ میں ان

* استاذ، شعبہ عربی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

میں تعلّی کا مہلک مرض پیدا ہو گیا تھا اور اب ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ اپنی کمزوریوں کی ذمہ داری دوسروں پر ڈالنے میں چرب زبان، احساس برتری میں سب سے آگے، خود ساختہ رسوم و رواج پر نازاں، اپنی کھوکھلی تہذیب پر مغرور، اعتراضات میں ماہر، دوسروں پر تنقید کرنے اور بزعم خود نیچا دکھانے میں شاداں و فرحاں اور اپنی جہالت و کم علمی کے باوجود ہمہ دانی کے بڑے بڑے دعووں میں مشغول تھے۔ الغرض انفرادی اور اجتماعی دونوں حیثیتوں سے ھندوستانی مسلمانوں کی یہ حالت دردمند دل رکھنے والوں کے لئے بجا طور پر تشویشناک تھی۔ لیکن عموماً اصلاح قوم کا بیڑا اٹھانے والوں کے سامنے سب سے بڑی مشکل یہ ہوتی ہے کہ قوم کے خود ساختہ سماجی اور مذھبی رھنما جنکی معاش کا دارومدار ہی قوم کو جاہل وپسماندہ رکھ کر اپنے پیچھے بھیڑ چال چلوانے پر ہوتا ہے، ان کے آگے کسی مخلص اور حقیقت میں قوم کا درد رکھنے والوں کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے قوم کی اس حالت کے ذمہ دار ماضی میں رونما ہونے والے کچھ ایسے عوامل تھے جو قوموں کی زندگی کو تہس نہس کر دیا کرتے ہیں۔ ان کی تفصیل کی گنجائش یہاں نہیں، البتہ یہ بہر حال حقیقت ہے کہ مسلم قوم کے انحطاط کی اصل وجہ قوم کے ارباب حل و عقد کی غفلت، ناعاقبت اندیشی اور مجموعی ترقی کی رفتار میں دوڑتے دوڑتے اچانک تھک ہار کر بیٹھ جانے میں ہی پنہاں ہے۔ سیاسی بساط الٹنے کے بعد انیسویں صدی تک پہونچتے پہونچتے ھندوستانی مسلمان علمی اور اخلاقی اعتبار سے پوری طرح پسماندگی کے شکنجہ میں جکڑ چکا تھا۔ رہی سہی کسر ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے مابعد اثرات نے پوری کر دی۔ جنگ آزادی کے بعد جو دلخراش مناظر سرسید نے دیکھے اور اس میں مسلمانوں کو جو ذلت آمیز قیمت چکانی پڑ رہی تھی، اس نے سرسید کے ذہن کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اولاً انھوں نے ہجرت کر جانے کا ارادہ کیا لیکن اپنے وطن اور قوم کی گرتی ہوئی حالت نے ان کے قدموں کو روک دیا، اور انھوں نے اس راہ میں آنے والی دشواریوں اور پریشانیوں کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے قوم و وطن کی خدمت کے جذبہ سے سرشار ہو کر ایک ہمہ جہتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ اس تفصیل سے قطع نظر کہ اس راہ میں ان کو کن دشواریوں اور رکاوٹوں کا سامنا کرنا پڑا اور انھوں نے اپنی اصلاحی دعوت کا آغاز کس طرح کیا، یہ بات اپنی جگہ انتہائی اہمیت کی حامل ہے کہ سرسید نے اخلاص سے مسائل کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور مطالعہ و مشاہدہ کی روشنی میں ایک محکم اور مناسب حل تلاش کر کے قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس سلسلے میں ان کو جن مخالفتوں اور سازشوں کا سامنا کرنا پڑا وہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ تمام مصلحین کے ساتھ یہی ہوتا آیا ہے کیونکہ وہ اپنی اصلاحی دعوت میں کسی نئی راہ کی نشاندہی کرتے ہیں جبکہ عوام جن چیزوں سے مانوس ہوتے ہیں انھیں پر کاربند رہنے کو دین و مذھب سمجھتے ہیں، اور ان کے مذھبی رھنما ان کو یہی بات سمجھاتے بھی ہیں۔ لیکن مصلحین ان سازشوں اور مخالفتوں سے دل برداشتہ نہیں ہوا کرتے، انکو اپنی اصلاحی تحریک پر کامل یقین و اعتماد ہوتا ہے اور وہ اپنی قوم کے تئیں مخلص ہوتے ہیں۔ وہ قوم کو ایک ایسے مریض کی حیثیت سے دیکھتے ہیں جو معالج سے تعاون نہ کرتا ہو اور ضدی ہو گیا ہو، لیکن بہر حال معالج کا فرض مریض کے مرض کی تشخیص اور اس کا مناسب علاج کرنا ہوتا ہے۔

چنانچہ سرسید نے اپنی قوم کی رھنمائی کے لئے کافی غور و خوض کے بعد جو پہلو قابل اصلاح سمجھے ان میں انفرادی، اجتماعی، مذھبی، معاشرتی، لسانی اور معاشی تقریباً سارے پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ مذکورہ تمام پہلوؤں پر انھوں نے اظہار رائے کیا ہے اور قوم کی زبوں حالی کے اسباب کا بڑا سائینٹفک تجزیہ کیا ہے، اور اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر انھوں نے اپنے افکار و نظریات اور قول و عمل سے قوم کی بر وقت رھنمائی نہ کی ہوتی تو آج یہ قوم اپنے تمام تر دعووں کا بوجھ لادے بے شعوری

کے جرم میں ماخوذ ہو کر مزید ذلت و خواری کا شکار ہوتی اور اس کا کوئی پرسان حال نہ ہوتا۔ لیکن ان سب پہلوؤں کی اصلاح کے نزدیک جب ہی ممکن تھی جب قوم جہالت کی ظلمتوں سے نکل کر علم و عمل کی دنیا میں قدم رکھے۔ اس لحاظ سے تعلیم تہذیبی سطح پر سرسید نے جو اصلاحی کوششیں کی ہیں وہ گویا ہمہ جہتی اصلاح کی کوششیں ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں :

"پس ہم کو اپنے اوپر رحم کرنا چاہیئے اور ایسی تعلیم اختیار کرنی چاہیئے جو اندرونی قوی کو شگفتہ و شاداب کرے۔"(۱)

علم انسان کی اولین ضرورت ہے۔ اللہ نے اپنے اولین نبی۔ انسان اول۔ حضرت آدم علیہ السلام کو تخلیق کے اشیاء کا علم عطا کیا تھا، اور آخری نبی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہلی وحی بھی قرات اور قلم و علم کے ذ مشتمل تھی، قرآن نے بھی متعدد مقامات پر علم و عمل پر زور دیا ہے اور جہل کے خلاف آواز بلند کیا ہے۔ سرسید نے اصلاحی دعوت کی بنیاد اسی "سنت مبارکہ" پر رکھی تھی کہ اسی میں قوم کی روحانی و مادی ترقی کا راز مضمر ہے کہ وہ علوم و میں ترقی کرے۔ علم ہی انسان کو انسانیت کا درس دیتا ہے اور ایک ایسا گوہر بے بہا ہے جو انسان کی انفرادی حالت بھی درست کرتا ہے اور اقوام کے اجتماعی حالات کو بھی درست کر کے ان کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔ چنانچہ اس میں سرسید فرماتے ہیں :

"ہم کو زمانہ گذشتہ اور حال پر نظر کر کے ایک ایسا طریقہ تعلیم معین کرنا چاہیئے جس سے علوم دین و دنیوی دونوں قسم کی تعلیم کا اعلیٰ درجہ تک ہم کو قابو ملے۔"(۲)

سرسید کے نزدیک کسی قوم میں خواہ کتنی ہی خوبیاں کیوں نہ ہوں تعلیم کے بغیر اس کی خوبیاں بھی خامیوا درجہ لے لیتی ہیں چنانچہ فرماتے ہیں :

"انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا اس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوئی ہیں اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں، ظاہر نہیں ہوتیں۔"(۳)

تعلیم و تربیت سے انسان کی خوبیوں کو جلا ملتی ہے اور انسان میں غیر مہذب اور ناشائستہ حرکات کو تعلیم کے مہذب بنایا جا سکتا ہے۔ تعلیم کے لئے صرف کتابوں کا سہارا لینا بے سود اور غیر نفع بخش ہے۔ اس سے تعلیم کا جامع مقصد نہیں ہوتا اس جامع مقصد کو اسی وقت حاصل کیا جا سکتا ہے، جبکہ کتابوں کے ساتھ ساتھ طالب علم کو تعلیم کیلئے عمدہ سو بھی مہیا ہو۔ یعنی علم کوئی ایسی مجرد شئے نہیں جس کو کتاب سے حاصل کر کے تعلیم یافتہ ہوا جا سکے اور اس کے وہ خصا اپنے اندر پیدا کئے جا سکیں جو انسانوں کو مہذب بناتے ہیں، بلکہ تعلیم کے ساتھ عملی تربیت اور اس کا ماحول ضروری ہے تعامل سے علم کی افادیت ذہنوں میں پیوست ہو سکے اور ایک مخصوص تہذیب و کلچر وجود میں آئے۔ تعلیم و تربیت بظاہر اگرچہ دو الگ الگ شئے ہیں لیکن معنوی اعتبار سے باہم اتنے مربوط ہیں کہ ایک کے بغیر دوسرے کے اثرات ناقص ر ہیں۔ سرسید تعلیم و تربیت کے فرق کو واضح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"جو قوتیں کہ خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں ان کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے اور اس کو کسی بات کا مخزن و مجمع بنانا اس کی تربیت ہے۔"(۴)

وہ مزید لکھتے ہیں کہ :

"اندرونی قوی کو حرکت دینے بغیر تربیت تو ہو جاتی ہے مگر تعلیم کبھی نہیں ہوتی ۔ اس لئے ممکن ہے کہ ایک شخص کی تربیت تو بہت اچھی ہو اور تعلیم بہت بری ۔ یہی حال ٹھیک ہم مسلمانوں کے عالموں اور تربیت یافتہ لوگوں کا ہے کہ تربیت تو نہایت اچھی ہے اور تعلیم کچھ نہیں ۔ ظاہر میں دیکھو تو طمطراق بہت کچھ مگر جب اصلیت ڈھونڈو تو کچھ نہیں ۔ بھاری بھرکم تو عمامہ و دستار جبہ و کرتہ سے بہت کچھ مگر ان کی اندرونی قوی کی شگفتگی دیکھو تو کچھ بھی نہیں ۔"(۵)

سرسید نے جو تعلیمی نظریہ پیش کیا ہے اس کے خط و خال اجاگر کئے جائیں تو جو نقشہ واضح ہوتا ہے اس کے مطابق وہ ایک ایسے تعلیمی نظریہ کی دعوت دے رہے تھے جو بیک وقت عقلی بنیادوں پر مستحکم ، سائنسی نقطہ نظر کا حامل اور اخلاقیات کا پابند ہو ۔ اور مجموعی طور پر اس میں حریت ، تعاملی تسلسل اور حرارت عمل کی روح کارفرما ہو تاکہ کسی وقت وہ جمود و تعطل شکار ہو کر قدامت و فرسودگی کی علامت نہ بن سکے ۔

اسی تناظر میں ان کے افکار کو دیکھا جاسکتا ہے جو انھوں نے مذہب کی تعبیر و تشریح کے سلسلے میں پیش کئے ہیں ۔ انھوں نے مذہب کی تعبیر و تشریح میں تقلیدی رویہ کے خلاف مسلم قوم کو بیدار کرتے ہوئے تحقیقی اور خالص اسلامی انداز اپنانے کی دعوت دی ہے ۔ اور ان غیر اسلامی عقائد کو ذہنوں سے کھرچ پھینکنے کی بات بڑی جرات مندی سے کی ہے جو مذہب کا روپ اختیار کرکے مسلمانوں کے ذہنوں اور ان کی مذہبی کتب کا حصہ بن چکے تھے یہ اور بات کہ انکے مذہبی افکار میں کہیں کہیں بے جا مرعوبیت اور تجدد پسندی کا غلبہ محسوس ہوتا ہے ۔ الغرض سرسید کے افکار و اقوال کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ انھوں نے تعلیم کا جو تصور دیا تھا وہ ایک جامع تصور تھا ۔ وہ اس وقت کی انگریز حکومت کی پالیسی سے بھی متصادم تھا ، کیونکہ انگریز ہندوستانیوں کو محض اسی قدر تعلیم دینا چاہتے تھے جس سے ان کی دفتری اور سرکاری کام کاج کی ضروریات پوری ہو سکیں ۔ اسی طرح انکا نظریہ تعلیم مذہبی حلقہ کے اس نظریہ تعلیم سے بھی مختلف تھا ، جو اولاً مخصوص حالات میں دین اور دینی ورثہ کو محفوظ کرنے کی کوششوں کے سلسلہ میں وجود پذیر ہوا تھا اور جسکو ہم اصلاً اسلامی نظریہ تعلیم نہیں کہہ سکتے ۔ لیکن بعد کے ادوار میں اس عبوری دور کے نظریہ تعلیم کو ہی عین اسلامی نظریہ تعلیم کی حیثیت سے جانا گیا اور کسی حد تک ہنوز اس کا سلسلہ جاری ہے ۔ ورنہ دراصل اسلام نے نظریاتی طور پر مقصد تعلیم و تربیت کے حوالے سے تنگ نظری کا ثبوت کبھی نہیں دیا بلکہ بڑی فراخ دلی اور وسعت نظر کا ثبوت دیتے ہوئے کائنات اور اس سے متعلق تمام امور پر غور و فکر اور تدبر کرنے کی واضح ہدایات دی ہیں ۔ چنانچہ قرآن و حدیث کی ان واضح ہدایات کی روشنی میں مسلم علماء نے جو تعلیمی نظریہ پیش کیا ہے اس میں علماء کے مابین عقلی مذاہب کے اختلاف کے باوجود مقاصد تعلیم و تربیت میں دین ، دنیا اور علم تین باتیں یقیناً مشترک ہیں ۔ جدید دور میں علمی رفتار اور صنعتی انقلاب نے اس ضرورت کو اور اہم بنا دیا اور اب قوم کیلئے یہ تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں کہ تعلیم کے مقاصد میں دین سماج ، عقل ، علم اور مادیت کا امتزاج ہونا چاہیئے ۔ علم کا مزاج ہے کہ اس میں ارتقاء ہوتا رہتا ہے اور اگر کسی حلقہ نے علم کے تمام پہلوؤں کو نظر انداز کر کے صرف ایک پہلو کو ہی اپنا مقصد بنایا ہے تو گویا وہ ناقص تعلیم سے چمٹا ہوا ہے اور قوم کی مجموعی ترقی میں حصہ دار نہیں ، لہذا اسے ترقی کے وہ مواقع بھی نہیں مل سکتے جو تعلیم کے مجموعی مقاصد کی تکمیل کی صورت میں ملتے ہیں اور نتیجتاً وہ حلقہ پسماندگی اور پستی کا شکار

تہذیب الاخلاق ، علی گڑھ ، اکتوبر ، نومبر ۱۹۹۲ء

رہے گا۔سرسید نے انھیں خطوط پر غور کرنے کے بعد تعلیم کے پہلوؤں کا جس طرح احاطہ کیا ہے وہ اس بات کا غماز ہے کہ ان کے ذہن میں تعلیم کا ایک ایسا وسیع اور جامع تصور تھا جسکو حاصل کر کے اقوام اپنے پیروں پر کھڑی ہوتی ہیں اور اپنے ورثہ کی محافظ بھی خود ہی ہوتی ہیں۔

سرسید نے تعلیم کا جو خاکہ مرتب کیا تھا اس کو صرف دعوت کی حد تک محدود نہ رکھا بلکہ اس کیلئے ذہنوں کو تیار کرنے اور رائے عامہ ہموار کرنے کیلئے انھوں نے "تہذیب الاخلاق" کا اجرا کیا جس کے مضامین نے قوم کے درد مندوں اور مخلصین کی ذہنوں کو جھنجھوڑا اور سرسید کے ارد گرد ان کے حامیین اور موافقین کی ایک جماعت اکٹھا ہو گئی۔اپنی دعوت کو عملی شکل میں پیش کرنے کے لئے انھوں نے مدرستہ العلوم کی بنیاد رکھی۔جہاں قوم کے بچے اپنے ماحول سے الگ ہو کر تعلیم و تربیت حاصل کریں۔وہ تعلیم و تربیت جو ان کو باوقار شہری کی زندگی گذارنے کے ساتھ جدید دور کے مسائل سے نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دے سکے اور ان کو جمود و تعطل کے تعفن سے نکال کر حرکت و حیات کے پر بہار ماحول میں لے آئے، جہاں تقلید پرستی اور تعصب و تنگ نظری کے ماحول سے نکال کر ان کو جدید دور کی علمی ترقیات، سائنسی انکشافات، تہذیبی ارتقا اور عقل و ذہن کی وسعتوں سے آشنا کرایا جا سکے۔جہاں مذہب کو تہذیب جدید سے ہم آہنگ کرنے کوششیں ہوں نہ کہ تصادم و ٹکراؤ کا رویہ اپنایا جائے۔یہ ادارہ جہاں تعلیم و تربیت کو یکساں طور پر ملحوظ رکھا گیا تھا، بنیادی طور پر جن اہم خصائص سے متصف تھا، ان میں جمود و تعطل اور تقلید رسوم کے برخلاف ارتقاء، وسعت قلب و نظر اور حریت فکر کی روح رچی بسی تھی۔ لیکن یہ حریت مطلقہ نہیں تھی بلکہ اخلاقی ضابطوں کی پابند حریت تھی۔اس میں کسی بھی قسم کے تعصب کو جہالت کے زمرہ میں رکھا گیا تھا، یہاں کے دروازے وطن عزیز کے ہر بچہ کیلئے کھلے ہوئے تھے خواہ وہ کسی بھی مذہب و مسلک سے متعلق ہو، یہاں تعاون و تسامح کے جذبہ کو عملی شکل دی گئی تھی، اور ہندوستان کی دو بڑی قوموں ہندو اور مسلمان کو وطن عزیز کی دو خوبصورت آنکھوں کی عملی تعبیر پیش کی گئی تھی۔اس کی تعلیمی پالیسی ہی یہ تھی کہ قوم کے بچے مغربی اور مشرقی علوم کو یکساں طور پر پڑھیں اور مجموعی ترقی میں ترقی یافتہ اقوام کے شانہ بشانہ چلنے کی صلاحیت اپنے اندر پیدا کریں۔ادارہ کے انتظامی امور میں اجتماعی زندگی گذارنے کی تربیب دینے اور قوم کے بچوں کو جہالت کے ماحول سے محفوظ رکھنے اور ان کو اخلاقی تربیت دینے کے غرض سے خصوصی طور پر اقامتی زندگی کا نظم انتہائی اہم نظم تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ ادارہ کی مجموعی تعلیمی پالیسی کے تحت زیر تعلیم بچوں کی تربیت ادارہ ہی کے ماہر اور مخلص اساتذہ کے ذریعہ کرائی جائے۔اور بچہ جب فارغ التحصیل ہو کر نکلے تو اس کے پاس محض ڈگری ہی نہ ہو بلکہ وہ ایک مثالی شہری اور قوم و وطن کا ایک ذمہ دار فرد ہو کر نکلے۔گویا سرسید کا قائم کردہ یہ ادارہ محض درسگاہ ہی نہیں بلکہ کردار سازی اور انسانیت کا درس دینے والے ایک ایسے مرکزی ادارہ کی شکل میں پروان چڑھا کہ نہ صرف قوم کو تعلیمی میدان میں ترقی کے مواقع ملے بلکہ رفتہ رفتہ یہ تہذیبی، لسانی، معاشرتی اور علمی تحریکوں کا مرکز بن گیا اور ان تمام تحریکوں میں ایک چیز بہر حال مشترک رہی ہے اور وہ ہے "وسعت ثقافت۔"

سرسید کے نزدیک قوم کی زبوں حالی اور پستی کا واحد علاج تعلیم و تربیت میں مضمر ہے۔وہی قوم ذلیل و خوار ہوتی ہے جس نے جہالت کی زندگی کو اپنا رکھا ہے اور دین و مذہب کے نام پر اوہام و خرافات اور رسوم کی پابندیاں ان کا شعار بن چکی ہیں۔جس کے افراد کے ذہنوں کے دریچے بند ہو گئے ہیں۔جبکہ ترقی ایک حالت سے بہتر حالت کی جانب مسلسل

منتقلی کا نام ہے نہ کہ صدیوں قبل کی اس تہذیب سے جکڑے رہنے کا نام جو اپنے وقت میں ترقی یافتہ اور جدید ترین شکل تھی لیکن اب رفتار زمانہ کے ساتھ قدیم اور فرسودہ ہو چکی ہے، ہماری قوم کا المیہ یہ ہے کہ ہر قدیم چیز سے چمٹے رہنا اور ہر جدید چیز سے نفرت اس کی فطرت ثانیہ بن چکی ہے۔ حالانکہ نہ تو دنیاوی ترقی کے اصول اس کی تصدیق کرتے ہیں نہ قانون فطرت اور نہ مذہبی اقدار و روایات، کہ اسلام خود تقلید پرستی کا زبردست مخالف، ترقی کا علمبردار اور علوم و فنون میں مہارت حاصل کرنے کی ہمت افزائی کرتا ہے، اور اس سلسلہ میں اس کا رویہ اتنا فراخ دلانا ہے کہ وہ ہر حکمت کو خواہ وہ کہیں بھی ہو، مومن کی گم شدہ شئے سمجھتا ہے۔ (۶) سرسید نے اس تحریک کے ذریعہ اسلام کی عطا کردہ اسی حکمت سے کام لیا اور مہذب اقوام کی نفع بخش اور مفید باتوں کو اپنا لینے میں کوئی عار محسوس نہیں کیا۔ سرسید پر یہ الزام کہ وہ اس تحریک کے ذریعے انگریزوں کی کورانہ تقلید کی دعوت دے رہے تھے، بے بنیاد ہے۔ انھوں نے اگرچہ نامہذب اقوام کو تہذیب یافتہ اقوام کی پیروی کی ضرورت کو تسلیم کیا ہے۔ لیکن ساتھ ہی اندھا دھند اور تقلید محض کے نقصانات سے بھی قوم کو آگاہ کیا ہے۔ چنانچہ اپنے ایک مضمون "مہذب قوموں کی پیروی" میں واضح الفاظ میں تحریر فرماتے ہیں:

> "ہم بلاشبہ اپنی قوم کو، اپنے ہم وطنوں کو سولائزڈ قوم کی پیروی کی ترغیب کرتے ہیں: مگر ان سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ ان میں جو خوبیاں ہیں، اور جن کے سبب وہ معزز اور قابل ادب سمجھی جاتی ہیں، اور سولائزڈ شمار ہوتی ہیں ان کی پیروی کریں نہ ان باتوں کی جو ان کے کمال میں نقص کا باعث ہیں۔"(۷)

ان کا خیال ہے کہ ایسی کورانہ تقلید سے۔ بجائے فائدہ، الٹا نقصان ہوتا ہے:

> "اور جس قدر ہم نامہذب ہوتے ہیں، اس سے زیادہ ناشائستہ ہو جاتے ہیں"(۸)

سرسید کے پورے اصلاحی اور تعلیمی مشن اور اس کی کامیابی کا راز ان کے خلوص، شجاعت، صراحت اور تعاون و تسامح کی خصوصیات میں مضمر ہے۔ انھوں نے جو تعلیمی پالیسی مرتب کی تھی اور قوم کی اصلاح کے سلسلہ میں جو رائے قائم کی تھی اس پر پوری جرات اور اخلاص سے عمل کیا اور اس سلسلہ میں مخالفین کی مخالفت سے نہ دل برداشتہ ہوئے اور نہ انتقامی جذبات کو اپنے اندر پنپنے دیا۔ ان کی عظمت یہ ہے کہ انھوں نے اپنے ضمیر کا سودا کبھی نہیں کیا اور جس بات کو قوم کے لئے بہتر و نفع بخش سمجھا، لاکھ مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں کے باوجود اس کو صراحت سے پیش کرنے میں جھجھک محسوس نہیں کی۔ انگریزوں کی اچھی باتوں کو سراہا تو ان کی غلطیوں کی گرفت بھی کی، اپنی قوم کی خوبیوں کا اعتراف کیا تو ان کی پسماندگی اور جہالت پر تنقید بھی کی۔ عام طور پر مصلحین یا تو اتنے مثالی افکار و نظریات پیش کرتے ہیں کہ ان کا عملی دنیا سے ہم آہنگ ہونا محال ہوتا ہے اور یا صرف زبانی جمع و خرچ کرتے اور عملی دنیا سے الگ تھلگ رہتے ہیں لیکن سرسید عملی مصلح تھے انھوں نے جو بھی نظریات پیش کئے ان کو عملی شکل میں پیش کرنے کی کوشش کی جو ان کی تحریک کی کامیابی کا بنیادی سبب ہے۔ اسی کے ساتھ سرسید کی تحریک اس حیثیت سے بھی انفرادی حیثیت رکھتی ہے کہ انھوں نے اپنے اردگرد مخلصین اور ہمنواؤں کی ایک ایسی جماعت اکٹھا کر لی تھی جس نے ان کی تحریک کی روح کو بعد تک باقی رکھا اور انھیں خطوط پر ادارہ کو پروان چڑھایا جن پر سرسید نے اس کو قائم کیا تھا۔ عام طور پر تحریکیں اپنے بانیین کے بعد تاریخ کا حصہ بن جایا کرتی ہیں اور ضرورت باقی رہنے کے باوجود بعد کے جانشینوں کے عدم اخلاص کا شکار ہو جاتی ہیں اور پھر آہستہ آہستہ مرور ایام کے ساتھ

ان تحریکوں کی وہ افادیت بھی باقی نہیں رہ جاتی، کیونکہ جن مخصوص حالات میں کسی تحریک کا وجود ہوتا ہے، حالات کے تغیر سے تحریک کی معنویت بھی ختم ہو جاتی ہے لیکن بعض تحریکات ایسی اصولی ہوتی ہیں کہ وہ تسلسل کی متقاضی ہوتی ہیں۔ سرسید تحریک کی روح بھی چونکہ ارتقاء اور انسان کی بنیادی ضرورت تعلیم و تعلم ہے اور علم میں روز افزاں اضافہ اور ترقی ہوتی رہتی ہے لہذا اس کی افادیت کسی مخصوص زمانہ یا حالات پر منحصر نہیں بلکہ علمی ترقی کے تسلسل کے ساتھ ساتھ یہ اصولی تحریک بھی تسلسل کا تقاضہ کرتی ہے اور اس میں کسی قسم کی کوتاہی یا اہمال اس کو اسی جمود و تعطل کا شکار بنا دیگا جس جمود کو توڑنے کے لئے سرسید نے اس تحریک کو برپا کیا تھا۔ واللہ اعلم

حوالے

(۱) "تعلیم و تربیت"، مقالات سرسید ۸۱/ (۲) "کن کن چیزوں میں تہذیب چاہیئے"، مقالات سرسید ۶۱/ (۳) "تعلیم"، مقالات سرسید / ۷۵ (۴) تعلیم تربیت، مقالات سرسید / ۸۰ (۵) حوالہ مذکورہ / ۸۰-۸۱ (۶) ملاحظہ ہو حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم : "الکلمۃ الحکمۃ ضالۃ المومن فحیث وجدھا فھو احق بھا۔" (ترمذی : ابواب العلم) (۷) مہذب قوموں کی پیروی، مقالات سرسید / ۶۷ (۸) حوالہ مذکورہ / ۶۶

صفحہ ۱۳۸ کا باقی

آخر میں یہ بھی عرض کردوں کہ سرسید اور علی گڑھ تحریک کے سلسلے میں آج ہمارے سماج کی مختلف سطحوں پر تقاضوں اور ضرورتوں کے تحت تحریک کے پرانے مقاصد اور منصوبوں میں ترمیم اور اضافے کی طرف غور و فکر اور توجہ کرنا بے حد ضروری ہوگیا ہے۔ اب تک جو کچھ بھی تحریری، تقریری اور عملی کام ہوئے ہیں زمانہ اس سے بہت زیادہ آگے نکل چکا ہے۔ لہذا اشد ضرورت ہے کہ آج ہم نئے سرے سے سرسید اور معاشرتی اصلاحی تحریک کا جائزہ لے کر ایک شاندار مستقبل کی طرف قدم اٹھائیں۔

حوالے

(۱) ڈاکٹر مظہر حسین علی گڑھ تحریک، صفحہ ۱۰۴۔ (۲) سرسید، لکچروں کا مجموعہ مرتبہ محمد سراج الدین، لاہور۔ ۱۸۹۰، صفحہ ۲۰۲۔ (۳) سرسید، لکچروں کا مجموعہ مرتبہ محمد سراج الدین، لاہور ۱۸۹۰ء، صفحہ ۲۱۳-۲۱۴۔

اشفاق احمد عارفی *

علی گڑھ تحریک: حقیقت اور ضرورت

انیسویں صدی کا زمانہ ہندوستانیوں کے لیے تاریک عہد تھا۔ انگریزوں کے ذریعہ استحصال اپنی انتہا کو پہنچ گیا تھا۔ انھیں حالات میں ۱۸۵۷ء کا غدر رونما ہوا۔ آزادی کی اس جنگ کا خاتمہ ہندوستانیوں کی ناکامی پر ہوا۔ اس جنگ میں مسلمانوں کے پیش پیش ہونے کی وجہ سے انگریز حکمرانوں کی نظر میں غدر کا سبب ہندوستانی مسلمان بنے ــــــ سیاسی، سماجی، معاشی، بالخصوص علمی سطح پر مسلمان ہم وطن قوموں کے مقابلہ میں پسماندہ تو تھے ہی حکمرانوں کی بد گمانیوں نے انھیں مزید ذلیل و خوار بنا دیا۔ غدر کے بعد انگریزوں کے ظلم و ستم کا خاص نشانہ مسلمان بنے۔ ان کا بے دریغ قتل عام کیا گیا اور جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ نام نہاد بادشاہ اور مغلیہ سلطنت کا آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر قید کر کے رنگون بھیج دیا گیا اور مسلمانوں کا اقتدار دن بہ دن افلاس و ادبار میں تبدیل ہوتا گیا۔۔ سرسید نے ان حالات کو اپنی نظروں سے دیکھا تھا۔ بقول خود ــــــ "انھوں نے محمد بن تغلق کی اولاد کو ہل چلاتے اور خلیل اللہ شاہجہانی کے پوتوں کو پیر دباتے دیکھا تھا" (۱)

غدر کے بعد کے یہی بدلے ہوئے حالات تھے جن کے پیش نظر سرسید نے قوم کو ہمہ گیر ذلت و خواری سے نکال کر ایک مہذب اور باعزت قوم بنانے کے لیے اپنی کوششوں کا آغاز کیا۔ ابتدا میں بڑی بڑی مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ قتل کی کی دھمکی اور کفر کا فتوا سہنا پڑا لیکن یہ سرسید کی نیک نیتی، خلوص اور وقت کا تقاضہ تھا کہ آہستہ آہستہ لوگوں کی تعداد اور مخالفوں کی جماعت ان کے ساتھ ہوتی گئی اور جلد ہی ان کی کوشش ایک تحریک میں تبدیل ہوگئی جو سرسید تحریک یا علی گڑھ تحریک کے نام سے جانی گئی۔

سرسید کا اصل مقصد اپنی قوم کو دنیا کی سویلائزڈ قوموں کے برابر لانا تھا۔ اسی لیے انھوں نے قومی زندگی کے تمام شعبوں میں اصلاح چاہی۔ یہ وقت کا تقاضا تھا کہ انھوں نے قوم کی تاریخ، تعلیم و تمدن، معاش، معاشرت، مذہب، سیاست اور

---

* ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ادب پر ایک ساتھ توجہ کی۔سرسید کے تمام کارنامے آثار الصنادید (۱۸۴۶ء)، اسباب بغاوت ہند (۱۸۵۸ء)، خطبات احمدیہ (۱۸۷۵ء) کی تصنیف سائنٹفک سوسائٹی کا قیام، مدرستہ العلوم اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (۷۷۔۱۸۷۵ء) کی بنیاد، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس (۱۸۸۶ء) کا آغاز اور تہذیب الاخلاق (۱۸۷۰ء) کا اجرا سب اسی تحریک کی کڑیاں ہیں۔اسلاف کے کارناموں کا تحفظ، مسلمانوں کے متعلق انگریز حکمرانوں کی بد گمانیوں کا خاتمہ، پیغمبر اسلام کی سیرت کی پاکیزگی اور اسلام کے تقدس کا اعلان، مسلمانوں میں جدید اور سائنسی علوم وفنون کی نشر و اشاعت، نئی اور نوجوان نسل کی تعلیم اور تربیت اور ادب کی تعمیر و ترقی، ان کارناموں کے مقاصد تھے۔

سرسید کا خیال تھا کہ قوم کی ترقی اور تہذیب کے لیے ان علوم وفنون پر عبور حاصل کرنا ضروری ہے جن سے ترقی یافتہ اقوام بہرہ ور تھیں۔اس لیے انھوں نے اپنی ساری توجہ قوم کے لیے جدید تعلیم پر مرکوز کردی۔ مختلف مواقع پر انھوں نے کہا کہ ــــــــــ "اگر گورنمنٹ نے ہمارے کچھ حقوق اب تک ہم کو نہیں دیئے ہیں جن کی ہم کو شکایت ہے تو بھی ہائی ایجوکیشن وہ چیز ہے کہ خواہ مخواہ طوعاً و کرہاً ہم کو دلا دے گی"۔(۲)

اسی ہائی ایجوکیشن اور جدید علوم وفنون کی تحقیق کے لیے مدرستہ العلوم یا محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام ہوا جو ۱۹۲۰ سے ہندوستان میں اپنی نوعیت کی واحد اقامتی یونیورسٹی ہے۔

علی گڑھ کا قیام صرف ایک تعلیمی ادارہ کی حیثیت سے نہیں ہوا، جدید تعلیم کے ساتھ اس کا ایک اہم مقصد زیر تعلیم طلبہ نونوجوانوں کی ذہنی اور اخلاقی تہذیب و تربیت بھی تھا جس سے سرسید کے خیال میں آدمی انسان بن سکے۔سرسید کے نزدیک شخصیت کی تکمیل کے لئے تعلیم کے ساتھ اخلاق اور معاملات کی بہتری ضروری ہے۔اسی خیال کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے ایک لکچر میں کہا تھا :

> "صرف تعلیم سے آدمی انسان نہیں بنتا بلکہ تربیت سے بنتا ہے۔بولنے میں تو یوں آتا ہے کہ تعلیم اور تربیت مگر تربیت میری سمجھ میں تعلیم پر مقدم ہے ــــ تعلیم کا اصل مقصد مارل کی درستگی ہے ۔بہت سے تعلیم یافتہ ہیں جن کا طریقہ اخلاق ایسا خراب ہے جس کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کاش وہ بے تعلیم ہی رہتے تو اچھا تھا"(۳)

اسی مقصد سے علی گڑھ میں بڑے پیمانے پر ہاسٹلوں کا انتظام کیا گیا اور اس کام کی نگرانی کے لیے قابل اساتذہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔خود سرسید طلبہ کو براہ راست اخلاقی نصیحتیں کیا کرتے ایک دفعہ طلبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا :

> "سب سے اول اور تمام برکتوں کی جڑ تمہارا آپس میں سلوک اور محبت سے رہنا ہے۔ تمام طالب علم، پورب کے ہوں یا پچھم کے اتر کے ہوں یا دکھن کے جب وہ سب تمہاری عاقل و بالغ ماں (کالج) کی گود میں پڑے ہیں تو وہ سب تمہارے بھائی ہیں۔اگر تم نے ان کے ساتھ مثل بھائی بھائی کے برتاؤ نہ کیا اور برادرانہ محبت ایک دوسرے کے ساتھ نہ برتی تو تم نے اس پہلے اصول کو کہ تم سب ایک عاقل و بالغ ماں کی اولاد ہو توڑ دیا"(۴)

علی گڑھ کا بورڈنگ ہاؤس بہت دنوں تک یہ ذمہ داری حسن و خوبی کے ساتھ انجام دیتا رہا۔ سرسید نے اپنی تقریروں میں اس کا فخریہ اظہار بھی کیا :

> "آؤ ہمارے ساتھ علی گڑھ چلو اور ہمارے کالج کے ان پیارے عزیز بچوں کو دیکھو جو بطور بورڈر کے وہاں رہتے ہیں جن

کی صورت دیکھکر ہمارے دل میں پیار آتا ہے جن کے خیال سے ہماری روح خوش ہوتی ہے۔ ان کو جو محبت ہمارے ساتھ ہے ان کا تماشہ دیکھو۔ باپ سے زیادہ ہم سے محبت کرتے ہیں۔ ہماری خفگی سے کوئی چیز ان کو زیادہ رنج دینے والی نہیں ہوتی۔ ہماری جھڑکی، ہمارا طمانچہ، ہمارے ہاتھ کی سنٹی سے ان کو عبرت اور نصیحت ہوتی ہے مگر وہ اس کو ایسی ہی عزت سے قبول کرتے ہیں جیسے بیٹا اپنے باپ کی تادیب و تنبیہ کو ـــــ چلو ہمارے عزیز مگر باعث افتخار مولوی سمیع اللہ خاں کا حال دیکھو کہ بورڈروں کے پیچھے کس طرح اپنی جان لگائے ہوئے ہیں۔ کسی بورڈر کی بیماری میں ان کی بے قراری کو دیکھو اور اندازہ کرو کہ آیا باپ کو اس سے زیادہ ہو سکتی ہے۔ خود اپنی آنکھ سے چل کر دیکھو کہ جو محبت اور سرپرستی مولوی سمیع اللہ خاں بورڈروں کی کرتے ہیں آیا کوئی باپ اپنے بیٹے کی بھی کرتا ہے ـــــ ایسا بورڈنگ ہاؤس البتہ ہماری قوم کے بچوں کو تربیت دینے کے قابل ہو سکتا ہے۔ مگر افسوس اے ہماری قوم کے بزرگو تم کو ان کی قدر نہیں۔ خدا تم کو ایسا دل دے کہ اس کی قدر کرو اور ایسی بصیرت دے کہ اس کو پہچانو"(۴)

جدید علوم و فنون کی اشاعت کے لیے سائنٹفک سوسائٹی کا قیام ایک عملی کوشش تھی جس کے ذریعہ انگریزی دوسری زبانوں سے اردو ترجموں کے ذریعہ نئے علمی موضوعات سے قوم کو واقف کرانا تھا۔ اس سوسائٹی کے ذریعہ بہت جدید اور مفید معلومات فراہم کی گئیں۔ ملک اور بیرون ملک کے علما و ماہرین کی خدمات حاصل کرکے سوسائٹی نے سائنس علمی مواد کو عام کیا۔

سرسید کے بعض ناقدین کے مطابق سائنٹفک سوسائٹی کا قیام اپنے پہلے ہی مرحلہ میں سرسید تحریک کی ناکامی زینہ تھی اس لیے کہ اس کے ذریعہ تراجم کے سارے جدید اور سائنسی علوم و فنون پر توجہ نے تحریک کو جزوی کامیابی کی سے آگے نہیں بڑھنے دیا مگر یہ کہتے وقت شاید ایک بڑی حقیقت فراموش کر دی جاتی ہے کہ مدرسۃ العلوم کی ابتدا سے بارہ ۔ پہلے سائنٹفک سوسائٹی کا قیام نئے سائنسی علوم و فنون سے قوم کی دلچسپی اور تحریک کی عملی کامیابی کی پہلی کڑی تھی۔

سرسید نے اپنے تعلیمی اور اصلاحی مشن کو ملک بھر میں وسعت دینے کے لیے عوامی سطح پر جو سب سے بڑا قدم ا؟ وہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس (۱۸۸۶ء) کا آغاز ہے۔ اس کانفرنس کا مقصد ملک کے مختلف حصوں میں علمی و اصلاحی کام کرنا اس سمت میں ہو رہی ترقی و تبدیلی کی نگرانی و رہنمائی تھا۔ کانفرنس کا مقصد بیان کرتے ہوئے سرسید خود فرماتے ہیں

"مسلمانوں میں ہر قسم کی تعلیم کے تنزل کا لحاظ کرکے اور اس خیال سے کہ ان کی ہر قسم کی ترقی میں قومی اتفاق اور قومی امداد سے کوشش کی جاوے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہر سال ان امور پر غور کرنے کے لیے مختلف اضلاع کے لوگوں کا جلسہ ہوا کرے جو محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے موسوم ہو"(۵)

کسی ملک اور قوم کی تہذیب و تمدن کا ایک پہلو اس کے آرٹ اور ادب سے متعلق ہوتا ہے اور قومی تعمیر و ترقی معیار اس کے ادب سے متعین ہوتا ہے اس لیے سرسید نے قومی زندگی کے اس پہلو پر بھی پوری توجہ دی۔ اس وقت تک ا نظم و نثر قصہ کہانیوں اور فوق فطرت داستانوں سے بھری تھی اسلوب اور طرز ادا کی ساری خوبی مقفیٰ مسجع عبارتوں اور پر آ تحریروں تک محدود تھی۔ سرسید نے ۱۸۷۰ء میں "تہذیب الاخلاق" جاری کرکے پہلی دفعہ اردو ادب کو مقصدیت اور زندگی ۔ ہمکنار کیا اور اس میں زندگی، سماج و معاشرت کے تقاضوں اور وقت کے میلانات کے مطابق سنجیدہ مضامین سلیس، سادہ او

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

آسان زبان اور اسلوب میں لکھنے کا رواج ڈالا۔اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

"جہاں تک ہم سے ہوسکا ہم نے اردو کے علم ادب کی ترقی میں اپنے ان ناچیز پرچوں کے ذریعہ سے کوشش کی۔ مضمون کو ادا کرنے کا ایک سیدھا اور صاف طریقہ اختیار کیا۔جہاں تک ہماری کج مج زبان نے یاری دی الفاظ کی درستی اور بول چال کی صفائی پر کوشش کی۔ رنگینئی عبارت سے جو تشبیہات و استعارات خیالی سے بھری ہوئی ہے اور جس کی شان صرف لفظوں ہی میں رہتی ہے اور دل پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا پرہیز کیا۔ تک بندی سے جو اس زمانے میں مقفی عبارت کہلاتی ہے ہاتھ اٹھایا۔جہاں تک ہوسکا سادگی عبارت پر توجہ کی۔اس میں کوشش کی کہ جو کچھ لطف ہو وہ صرف مضمون کے ادا میں ہو۔جو اپنے دل میں ہو وہی دوسرے کے دل میں پڑے تا کہ دل سے نکلے اور دل میں بیٹھے "(۶)

اس طرح سرسید کی مساعی اپنے مقاصد اور وسعت کے اعتبار سے ایک تحریک کی ذمہ داری انجام دیتی رہی اور علی گڑھ کو اس کی مرکزیت کا شرف حاصل رہا لیکن ایک صدی کے بعد نئے حالات اور نئی ضرورتوں نے بعض بنیادی سوال پیدا کیے ہیں کیا سرسید کی کوششوں کو ایک تحریک کا نام دیا جا سکتا ہے؟ سرسید کا فیصلہ کس حد تک درست تھا؟ اور آج علی گڑھ اپنا تاریخی کردار کیوں ادا نہیں کر رہا ہے؟

بعض نئے لکھنے والے جو اپنے آپ کو ان حالات اور ضرورتوں سے بالکل جدا کر کے سوچتے ہیں،جن میں سرسید سب کچھ کر رہے تھے، علی گڑھ تحریک نام کی کسی چیز کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ وہ کوئی باضابطہ منشور اور وفاقی نظام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ حالانکہ علی گڑھ تحریک کی نوعیت اور اس کے ذریعہ فراہم کیے گیے لٹریچر کا بغور مطالعہ کیا جائے تو اسکا باقاعدہ منشور بھی ملے گا اور ایک تحریکی نظام کا سراغ بھی۔مذہب،سیاست، تعلیم، تہذیب و تمدن اور معاش و معاشرت زندگی کے تمام گوشوں سے متعلق لٹریچر اور نظریات رکھنے والی یہ تحریک اپنا سارا تاریخی پس منظر اور جواز رکھتی ہے۔

سرسید سے پہلے دوسرے لوگ مذہبی اور علاقائی سطحوں پر علمی اور اصلاحی تحریکیں شروع کر چکے تھے۔ رام موہن رائے،اور دوسرے ہندو مفکرین و ماہرین، ہندوؤں کے اندر علمی اور سماجی اصلاح کا کام شروع کر چکے تھے۔جس کے نتیجے میں ہندو قوم مسلمانوں کے مقابلہ میں جدید علوم و فنون کے میدان میں کہیں زیادہ آگے بڑھ چکی تھی۔ مسلمان ان کی گرد راہ دیکھ رہے تھے اس وقت ان کے لیے ہندوؤں کے کارواں میں شریک ہونا ممکن تھا نہ مناسب۔غدر کے بعد مسلمانوں پر انگریزوں کے مظالم ان کے لیے ستم بالائے ستم تھا۔ایسے وقت میں یہ وقت کی بڑی ضرورت تھی کہ مسلمانوں میں علاحدہ سے ایک کوشش شروع کی جائے جس سے ان کی علمی پسماندگی بھی دور ہو اور حکمرانوں کی بدگمانیوں کا بھی ازالہ ہوسکے۔ سرسید نے یہی ضروری کام اپنے سر لیا۔یہاں یہ اعتراف بے جا نہ ہوگا کہ سرسید کی ذات اس کام کے آغاز کے لیے زیادہ مناسب تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کا شاہی اور درباری جاہ و جلال بھی دیکھا تھا اور انگریزوں کی پالیسی اور انتظام بھی۔ وہ غدر کے حالات کے چشم دید گواہ تھے اور اس کے بعد مسلمانوں کی حالت زار کے بھی اور ہمدرد و مشاہد بھی، ان کی تحریریں اور بیانات شاہد ہیں کہ ان کا فیصلہ کوئی جذباتی ابال یا محض ہمدردی کا خیال نہیں بلکہ اندرون کی پکار تھا۔

سرسید نے ان حالات میں جو فیصلہ کیا وہ دوسرے فرقے کے مفکرین کی طرح نہیں تھا۔انکی کوششوں کا دائرہ صرف مسلمانوں تک محدود نہیں تھا بلکہ ان کا ذہن مسلمانوں کے ساتھ ساتھ دوسروں کے لیے بھی کھلا تھا۔ قوم کے لفظ سے ان

کی مراد اہل ہند تھے، مدرسۃ العلوم کے جلسوں میں ان کے خطاب اور دوسرے بیانات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ اسی لیے جب محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کا قیام عمل میں آیا تو مسلمانوں کے ساتھ اس میں دوسرے مذاہب کے طلبہ کو بھی داخلہ دیا گیا۔ علی گڑھ کے قیام کے وقت سرسید کا مقصد یہ بالکل نہیں تھا کہ یہاں پورے ہندوستان کے مسلم طلبہ زیر تعلیم ہوں اور نہ ہی یہ اس وقت ممکن تھا اور نہ اب۔ ہاں ایک مخصوص اور مثالی ادارہ کا قیام ضرور مقصود تھا جس میں تمام جدید تر اور اعلیٰ علوم و فنون کے ساتھ ہر قسم کی اچھی تربیت بھی دی جائے اور پھر اس کے نمونے پر دوسرے مقامات میں اس قسم کے ادارے قایم ہوں اور ان شعبوں سے فارغ طلبہ علی گڑھ تحریک کے مقاصد کو عام کریں۔

آج اپنی انتہائی ترقی یافتہ شکل میں ادارہ بھی ہے ہاسٹل بھی، تہذیب الاخلاق بھی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس اور مرکز برائے فروغ سائنس کی شکل میں سائنٹفک سوسائٹی بھی، پھر بھی علی گڑھ اپنا تاریخی کردار کیوں ادا نہیں کر رہا ہے؟

ایک زمانہ تھا جب علی گڑھ کا ہر فرد اپنے عہدہ کو گراں بار فرض محسوس کرتا تھا، اب اس کی جگہ عہدہ اور افسری کے خیال نے لے لی ہے۔ اب طلبہ، اساتذہ خاص طور سے بورڈروں اور وارڈن کے درمیان باپ بیٹے کا رشتہ اور بات اور حالات نہیں جو کبھی علی گڑھ کا امتیاز اور سرسید کے لیے باعث افتخار تھا۔ منتظمین اور نگراں کی پدرانہ شفقت، حاکمانہ خیال اور آمرانہ رعب میں تبدیل ہو چکا ہے۔ اب جھڑکی، طمانچہ اور سنٹی سے عبرت حاصل کرنے والا کوئی بورڈر نہیں۔ وارڈن تو اب تک ہیں لیکن نہ تو مولوی سمیع اللہ خاں جیسا باپ سے زیادہ جان لگانے والا کوئی سرپرست ہے اور نہ بورڈروں کی بیماری میں کسی وارڈن کی بے قراری۔ صوبائیت، علاقہ پرستی اور اقربا نوازی کا فروغ اور دوسرے ناقابل بیان حالات نے ایک بڑی تعداد کو ماضی کے رخ کھڑا کر دیا ہے اور لوگ علی گڑھ سے ان توقعات اور مطالبات کو وابستہ کرکے شاکی اور بدظن ہو رہے ہیں جو اس کا تاریخی ورثہ ہیں حالانکہ نئے حالات میں ان تقاضوں کی تکمیل شاید ممکن نہیں، اس کے لیے تو وہی آج سے سو سال پہلے کے حالات اور ماحول درکار ہیں۔ علی گڑھ کو سوالیہ نشانوں کے ساتھ دیکھنے کے بجائے ان سوالوں اور تقاضوں پر غور کرنے کی ضرورت ہے جو اس سے وابستہ ہیں فرق سوچنے کا ہے ہم انیس سو چورانوے میں کھڑے ہو کر اٹھارہ سو پچھتر میں سوچ رہے ہیں۔ واپس آ کر سوچیں تو شاید شکایات باقی نہ رہیں آج جب گھروں میں بیٹے کے لیے باپ کی معنویت کم ہوگئی ہے اور سماج میں چھوٹوں کے لیے بڑوں کی اہمیت نہیں رہی تو علی گڑھ میں طلبہ کے لیے اساتذہ کی وقعت اور ہاسٹل میں وارڈن کے لیے بورڈر کی معنویت کا سوال اور مطالبہ کہاں تک درست ہے؟

حوالے

(۱) لکچر سرسید ۲۶ مئی ۱۸۷۳ء، بمقام پٹنہ مشمولہ لکچروں کا مجموعہ ص ۴۰۔ (۲) لکچر سرسید، بمقام امرتسر، مجموعہ لکچرز ص ۲۵۴۔ (۳)۔ لکچر سرسید، مدرسہ گورداس پور، ۲۷ جنوری ۱۸۸۴ء، مجموعہ "لکچرز"۔ (۴) لکچر سرسید، ۲۷ جنوری ۱۸۸۳ء، بمقام پٹنہ۔ (۵)۔ تجویز سرسید اجلاس اول محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ، ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء۔ (۶) آخری پرچہ تہذیب الاخلاق۔ ستمبر ۱۸۷۶ء

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

راحت ابرار *

سرسید تحریک کے اثرات

(تعلیمی ادارے)

خالدہ ادیب خانم نے سرسید احمد خاں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ "سرسید احمد خاں کو کسی بھی پہلو سے دیکھا جائے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بڑا سا پتھر ہندوستان کی اسلامی سوسائٹی کے ٹھہرے ہوئے پانی میں لوھکا دیا گیا ہو۔ اس نے جو لہریں اٹھائیں وہ اب تک حرکت میں ہیں۔ خواہ ہمیشہ اس سمت میں نہ ہوں جو سرسید پسند کرتے۔"

سرسید احمد خاں نے ١٨٥٧ء کے انقلاب کے بعد جب مسلمانوں کا جاہ و جلال ختم ہو گیا اور وہ اپنے آپ ایک حسرت و یاس کی تصویر بن کر رہ گئے تو اس وقت انھوں نے ملک و قوم کی ترقی کے لئے تعلیم کو ہتھیار بنایا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ جہاں علم ہوتا ہے وہیں دولت اور حکومت بھی ہوتی ہے۔ انھوں نے اپنی تحریک کو جاری رکھنے کے لئے تین طریقے اختیار کئے۔ مسلمانوں میں سائنسی نقطۂ نظر کو فروغ دیا تاکہ وہ عقل کی کسوٹی پر ہر چیز کو پرکھ سکیں۔ سرسید جانتے تھے کہ قیاسی دلائل سے قیاسی مسائل کا حل ممکن نہیں ہے۔ انھوں نے اپنی ایک تحریر میں نئے دور کے نئے تقاضوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "ہمارے بزرگوں کو نہایت آسانی تھی کہ مسجدوں اور خانقاہوں کے حجروں میں بیٹھے بیٹھے قیاسی مسائل کو قیاسی دلائل اور عقلی کو عقلی براہین سے توڑتے پھوڑتے رہے ہیں اور ان کو تسلیم نہ کریں مگر اس زمانہ میں ایک نئی صورت پیدا ہوئی ہے جو اس زمانہ کے فلسفہ و حکمت کی تحقیقات سے بالکل علیحدہ ہے۔ اب مسائل طبعی تجربے سے ثابت کیے جاتے ہیں اور وہ ہم کو دکھائے جاتے ہیں۔ یہ مسائل ایسے نہیں جو قیاسی دلائل سے اٹھا دیئے جائیں"۔

سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کے لئے قلم کا سہارا لیا اور صحافت کو نیا روپ دیا۔ انگریزی صحافت کو حکمراں طبقہ تک مسلمانوں کے مسائل سے روشناس کرانے اور اردو صحافت کو معاشرہ کی اصلاح اور فروغ تعلیم کے لئے استعمال کیا۔

سرسید احمد خاں کا خواب علی گڈھ میں محض ایک یونیورسٹی قائم کرنا نہیں تھا بلکہ آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے توسط سے ملک بھر میں مسلم تعلیمی اداروں کا جال بچھانا تھا۔ سرسید نے اس کانفرنس کی مدد سے مسلمانوں کے منتشر شیرازہ کو یکجا کیا اور ان میں تعلیمی روح پھونکی۔ سرسید نے علم کا ایک پودا لگایا جس کی آبیاری میں ہر دردمند علم دوست انسان نے مقدور بھر کوشش کی۔

---

* ضیا کمپاؤنڈ، میرس روڈ، علی گڈھ

سر سید احمد خاں نے اپنی تعلیمی تحریک کو شروع کرنے سے پہلے ملک بھر کے تعلیمی اداروں کا سروے کیا تاکہ ان کی روشنی میں مستقبل کی منصوبہ بندی کی جاسکے۔ ۱۸۷۵ء میں الفرڈ کرافٹ نے جو تعلیمی رپورٹ تیار کی تھی اس کے مطابق پورے ملک میں صرف ۲۰ مسلمان گریجویٹ تھے۔ سرسید کے تعلیمی سروے کے مطابق ۱۸۶۷ء میں ۱۲۵۰ امیدواروں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا جس میں مسلم امیدواروں کی تعداد صرف ۸۳ تھی۔ ۱۸۸۳ء میں غیر مسلموں کی تعداد بڑھ کر ۱۴۵۸ ہو گئی جب کہ مسلم امیدواروں کی تعداد میں صرف چار کا اضافہ ہوا اس طرح ۸۷ امیدواروں نے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا۔

۱۸۸۰ء میں ۱۲۴۳ امیدواروں نے بی۔ اے کا امتحان پاس کیا تھا جس میں مسلمانوں کی تعداد ۳۰ تھی جب کہ کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کرنے والے ۳۲۶ امیدواروں میں سے صرف پانچ کا تعلق مسلم فرقہ سے تھا۔ پیشہ ورانہ تعلیم میں تو مسلمانوں کا تناسب اور بھی مایوس کن تھا۔ ۲۵ سال کے عرصہ میں صرف تین مسلمانوں نے انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کی تھی۔

سرسید احمد خاں کے صاحبزادے اور ممتاز قانون داں سید محمود نے ۱۸۷۱ء سے ۱۸۹۳ء تک کی تعلیمی صورت حال پر ایک کتاب "ہسٹری آف انگلش ایجوکیشن ان انڈیا" تصنیف کی جس میں ملک کی پانچ یونیورسٹیوں کلکتہ، مدراس، بمبئی، پنجاب اور الہ آباد یونیورسٹیوں میں مسلمان طلبہ کا تناسب بیان کیا گیا ہے۔ اس رپورٹ کے مطابق پورے ملک میں صرف ۵۴۶ مسلمان گریجویٹ تھے جب کہ پورے ملک میں مسلمانوں کی آبادی کا تناسب ۱۸۸۱ء کی مردم شماری کے مطابق ۱۹٫۰۹ فیصد تھا۔ ۱۸۹۳ء تک پورے ہندوستان میں صرف تین انجینئرنگ گریجویٹ تھے جس میں ایک کلکتہ یونیورسٹی سے اور دو پنجاب یونیورسٹی سے ڈگری حاصل کئے ہوئے تھے۔ ۵۴۶ مسلم گریجویٹ میں آرٹ مضامین کے طلبہ کی تعداد ۳۹۹، قانون کے ۱۱۰ اور میڈیسن کے ۳۴ طلبہ تھے۔

انھیں اعداد و شمار کی روشنی میں سرسید نے اپنی ساری توانائی تعلیم پر مرکوز کردی۔ ان کی آرزو تھی کہ "میں اپنی قوم کے بچوں کو آسمان کے تاروں سے اونچا اور سورج کی طرح چمکتا دیکھوں۔ ان کی روشنی اس نیلے نیلے گنبد کے اندر ایسی چمکے کہ سورج اور چاند اور ستارے سب اس کے آگے ماند ہوجائیں۔"

اسی مقصد کے حصول کے لئے سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء نے ۲۷ دسمبر ۱۸۸۶ء کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جس کا بنیادی مقصد مسلمانوں کی تعلیمی معاملات کی رہنمائی کرنا اور انھیں جدید تعلیم کی طرف راغب کرنا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ایسا پلیٹ فارم بھی مہیا کرانا تھا جس کی مدد سے مختلف شہروں کے لوگ کسی موقعہ پر آپس میں ایک جگہ جمع ہوں تاکہ مسلمانوں کی تعلیمی پیش رفت کا جائزہ لیا جاسکے اور آپس میں محبت، اخلاص، باہمی ہمدردی اور یگانگت کی فضا پیدا ہو سکے۔

اس کانفرنس کی کوششوں کا ہی نتیجہ تھا کہ علی گڑھ مسلمانوں کی تعلیم کا مرکز بن گیا۔ مسلم یونیورسٹی کا قیام بھی اسی کانفرنس کی دین ہے۔ کانفرنس نے ہی سب سے پہلے ۱۸۹۸ء میں "مسلم یونیورسٹی" کے قیام کی قرارداد منظور کی تھی اور آہستہ آہستہ یہ ایک عوامی تحریک بن گئی اور حکومت برطانیہ کو ۱۹۲۰ء میں مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا۔ مولانا ابو الکلام آزاد نے خود اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا ہے کہ "مرحوم سرسید اور ان کے ساتھیوں نے علی گڑھ میں صرف ایک کالج ہی قائم نہیں کیا تھا بلکہ وقت کی تمام علمی اور ادبی سرگرمیوں کا ایک ترقی پسند حلقہ پیدا کردیا تھا۔ اس حلقہ کی مرکزی

حیثیت خود ان کا وجود تھا اور اس کے ارد گرد ملک کے بہترین دماغ جمع ہو گئے تھے"

مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے جتنے لوگ بھی وابستہ رہے۔ انھوں نے نہ صرف سرسید کی تحریک کو لبیک کہا بلکہ اپنے اپنے علاقوں میں اسکول اور کالج قائم کیے بابائے اردو مولانا عبد الحق نے حیدر آباد جا کر جامعہ عثمانیہ قائم کی جب کہ علی گڑھ کے بعض باغیوں نے انگریزی نظام کے خلاف تحریک خلافت شروع کی اور علی گڑھ سے الگ ہو کر جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد رکھی۔ سرسید تحریک کے ممتاز مبلغ مولانا اسماعیل میرٹھی نے میرٹھ میں لڑکیوں کا ایک اسکول قائم کیا جو اب اسماعیل نیشنل گرلس ڈگری کالج ہے۔ مولوی کرامت حسین نے لکھنؤ میں اسکول قائم کیا جو کرامت حسین ڈگری کالج کے نام سے مشہور ہے۔ نواب مزمل اللہ خاں نے سکندرہ راؤ میں اسلامیہ انٹر کالج قائم کیا تو دوسرے ساتھی مولوی بشیر نے اٹاوہ میں اسلامیہ اسکول کھول دیا۔ مولانا طفیل احمد منگلوری نے علی گڑھ میں ہی ایک اسکول قائم کر دیا۔ شیخ محمد عبد اللہ پاپا میاں نے لڑکیوں کا اسکول قائم کیا جو ویمنز کالج کے نام سے برصغیر کے مسلمانوں کی ایک اہم دانش گاہ ہے۔ مولانا شبلی نعمانی نے اعظم گڑھ میں دار المصنفین کی داغ بیل ڈالی اور شبلی ڈگری کالج بھی انھیں کی یادگار ہے۔

علی گڑھ کے فرزندوں نے اپنے ادارے کے بانی کے مشن کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کیا۔ پاکستان کے اسلام آباد شہر میں یہاں کے سابق طلبہ نے سرسید میموریل سوسائٹی قائم کی اور سرسید سائنس اینڈ ٹیکنالوجی یونیورسٹی کا منصوبہ تیار کیا۔ پاکستان کے سابق میجر جنرل علی نواب نے اور ان کے رفقاء نے اس مقصد کے لئے علی گڑھ سمیت ملک کے اہم تکنیکی اداروں کا معائنہ کیا اور آئی آئی ٹی دلی، آئی آئی ٹی کانپور، جے این یو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے نظام کا مطالعہ کیا۔

کراچی ڈیولپمنٹ اتھارٹی کے سابق ڈائرکٹر جنرل انجینئر ظل احمد نظامی کی سربراہی میں گلشن اقبال میں ۱۸ ایکڑ زمین پر علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی قائم کیا گیا ہے جس میں الیکٹرونکس ٹیکنالوجی، سکریٹریل ٹیکنالوجی، کمپیوٹر سائنس کی تعلیم فراہم کرائی جا رہی ہے۔ یہ انسٹی ٹیوٹ اے ایم یو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن، پاکستان کے زیر اہتمام کام کر رہا ہے۔

پوری دنیا میں جہاں کہیں بھی علی گڑھ والے ہیں کچھ نہ کچھ کام ضرور انجام دے رہے ہیں اور سرسید کے مشن کو جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اے ایم یو اسٹوڈینٹس یونین کے سابق صدر عابد اللہ غازی نے امریکہ کے شکاگو شہر میں اقراء ایجوکیشنل فاؤنڈیشن قائم کیا ہے جس کا مقصد اسلامی نقطۂ نظر سے کتابیں شائع کرنا اور انگریزی اسکولوں میں اسلامی تعلیم فراہم کرنا ہے۔ اس فاؤنڈیشن نے بہت سے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ بھی تیار کیے ہیں تاکہ علم کی روشنی گھر گھر پہنچ سکے۔

سعودی عرب میں مقیم بہت سے اولڈ بوائز ہندوستان میں تعلیم حاصل کرنے والے غریب اور نادار طلبہ کی تعلیمی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے وظیفے دیتے ہیں تاکہ محض غربت کی وجہ سے یہ مسلم نوجوان تعلیم کی نعمتوں سے محروم نہ رہ جائیں۔

پوری دنیا میں یوم سرسید تقریبات کا اہتمام بڑے ہی شان و شوکت سے کیا جاتا ہے اور علیگ برادری سال میں ایک مرتبہ ان جلسوں میں شریک ہوتی ہے۔ پلاننگ کمیشن کے رکن پروفیسر سید ظہور قاسم کے مطابق انھوں نے ایک مرتبہ پانی کے جہاز میں سرسید ڈے منایا اور پورا جہاز میرے چمن کے نغمے سے گونجنے لگا۔

امریکہ سے خبر آئی ہے کہ وہاں اس برس یوم سرسید کے موقعہ پر ایک بین اقوامی مشاعرہ کا اہتمام کیا جا رہا ہے جس

میں ہندوستان سے عمار بارہ بنکوی، مغفور ہاشمی اور آشفتہ چنگیزی کو مدعو کیا گیا ہے۔ جدہ میں سرسید ڈے کی تقریب کے لیے ماہر سرسید پروفیسر خلیق احمد نظامی صاحب سے رابطہ قائم کیا جارہا ہے۔ لندن کے اولڈ بوائز اس موقع پر "علیگ" کے نام سے ایک میگزین شائع کرتے ہیں جس میں سرسید تحریک کے مختلف گوشوں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔

۱۸۵۷ء کے انقلاب نے سرسید کو علی گڑھ میں مدرسۃ العلوم قائم کرنے کا موقعہ فراہم کیا اور ۶ دسمبر ۹۲ء کو بابری مسجد کی شہادت نے مسلمانوں میں ایک نئی فکر کو جنم دیا ہے اور اب ہر شہر میں سرسید تحریک کا احیاء ہو رہا ہے اور ہندوستانی مسلمانوں میں ادارہ سازی کا رجحان فروغ پا رہا ہے اور ہر شہر میں کم سے کم دس نئے تعلیمی ادارے ہر سال قائم ہو رہے ہیں۔ ہر تاریک رات روشن صبح کی تمہید ہوتی ہے۔ مسلمان بھی روشن مستقبل کے لئے منظم پیمانہ پر کام کر رہے ہیں۔ آج کی تعلیمی سرگرمیوں کی قدر و قیمت مستقبل کے زمانے میں متعین ہو گی۔

اترپردیش میں جن اہم تعلیمی اداروں کی داغ بیل ڈالی جا چکی ہے ان میں لکھنؤ کے نزدیک فیاض نگر میں بیس کروڑ روپیہ کی لاگت سے ایک میڈیکل کالج کا قیام، بنارس میں سرسید سوسائٹی کے زیر اہتمام دس کروڑ روپیہ کی لاگت سے سرسید ایجوکیشنل کمپلیکس، علی گڑھ میں دس کروڑ روپیہ سے عائشہ ترین ماڈل پبلک اسکول ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ سرسید کے تعلق سے بنارس کے محلہ قاضی سرائے میں پچاس ایکڑ زمین پر ایک علمی بستی "سرسید نگر" آباد کی جارہی ہے اور اس سرسید نگر میں ایک ایجوکیشنل کمپلیکس کا سنگ بنیاد ہندوستان میں مقیم سعودی عربیہ سفارت خانے کے ناظم الامور جناب عبدالرحیم اے ایس احمد نے رکھا۔ اس پروجیکٹ کا بنیادی مقصد ہندوستان میں اسلامی علوم اور ثقافت کے ارتقاء اور ملت کی نشاۃ ثانیہ کے لئے سرسید احمد خاں کے عظیم مشن کو آگے بڑھانا ہے اور اکیسویں صدی کے لئے مسلمانوں کو تیار کرنا ہے۔ اس پروجیکٹ کے تحت طلبہ و طالبات کے لیے الگ الگ اقامتی کالج، صنعتی تعلیم کے لئے پالی ٹیکنک، اسلامیات کے مطالعہ کے لئے کتب خانہ، نمازیوں کے لئے شاندار مسجد، ادبی اور ثقافتی تقریبات کے لئے آڈیٹوریم سہولتیں فراہم ہونگی۔ جناب حبیب اللہ اور جناب محمد طاہر علی انصاری کی خاموش خدمت لگن اور سرسید نوازی سے یہ امیدیں وابستہ ہیں کہ مستقبل میں یہ ادارہ سرسید یونیورسٹی کا روپ اختیار کر سکتا ہے۔ اس پروجیکٹ کے لیے اسلامک ڈیولپمنٹ بینک سے بھی مالی تعاون حاصل ہوا ہے۔ کانپور اولڈ بوائز ایسوسی ایشن نے سرسید پبلک اسکول قائم کیا ہے اور اس علاقہ کا یہ ایک معیاری اور مثالی اسکول سمجھا جاتا ہے۔ گونڈہ کی علیگ برادری نے سرسید میموریل اسکول قائم کیا ہے جو اسی علاقہ کے مسلمانوں کی ضرورتوں کو پورا کر رہا ہے۔ مئو ناتھ بھنجن میں سرسید ویلفیر سینٹر قائم کر دیا گیا ہے جو ضرورت مند بے سہارا بیماروں کے علاج کا انتظام کرتا ہے۔ اس سینٹر کا مقصد ایک مسلم کونوینٹ اسکول اور ایک مسلم نسواں کالج قائم کرنے کا بھی ہے۔ علی گڑھ، مراد آباد، فیروز آباد اور بے شمار قصبوں میں سرسید اور ان کے رفقاء کے نام پر ادارے قائم کئے جا رہے ہیں۔

غرض کہ سرسید تحریک کے عالمی اثرات مرتب ہو رہے ہیں اور سرسید تحریک کی معنویت اور اہمیت میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہو رہا ہے اور ہر دردمند اور مخلص انسان اس تعلیمی تحریک سے روشنی حاصل کر رہا ہے۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء

باتیں اپنی

پچھلے کئی مہینوں سے ہم اس کوشش میں لگے ہوئے تھے کہ ۱۷ اکتوبر میں سرسید ڈے کے موقع پر ایک ایسا شمارہ قارئین کی خدمت میں پیش کیا جائے جو سید عالی مقام کے شایان شان ہو، مگر یہ ہو نہ سکا البتہ دیر آید درست آید کے تسلی بخش مفہوم نے ہم کو سہارا دیا، اور مطمئن کر دیا کہ کچھ نہ ہونے سے ہونا بہتر ہے، چاہے تاخیر سے ہو۔ ہوا یوں کہ مضامین کا ترشح ابر نیساں کی طرح رک رک کر ہوتا رہا اور پھر آپ تو جانتے ہی ہیں کہ طباعت اور اشاعت کے بحر ذخار میں غواصی جوکھم کا کام ہے، ہرچہ باداباد۔ اب پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہے اور ہم نے جان کی امان پانے کے لیے اس کو اکتوبر، نومبر ۱۹۹۴ء کا مشترکہ شمارہ قرار دیدیا۔ ترتیب کا نیا چکر بھی اسی لئے چلایا کہ رسالہ کھولتے ہی اداریہ، قسم کی چیز پر آپ کی نظر نہ پڑے تا کہ آپ اور ہم نظری اور ذہنی خلل سے محفوظ رہیں۔ امید ہے کہ ہمارا معروضہ آپ کو قابل قبول ہو گا۔

جناب عابد حسین کے سرسید میموریل لکچر سے ہم نے اس شمارہ کا آغاز کیا ہے لکچر انگریزی میں دیا گیا تھا، لیکن اتنا بھرپور تھا کہ ہم نے اسکو بطور پیش گفتار، منتخب کیا گو کہ اردو ترجمہ میں انگریزی والی جامعیت، روانی اور شگفتگی تو پیدا نہیں ہو سکی۔ لیکن لکچر کے درج ذیل مندرجات کی روشنی میں ہم کو مناسب معلوم ہوا کہ شروعات اسی سے کی جائے۔

"سرسید جنوبی ایشیا کی تاریخ میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں۔ انھوں نے تمام عمر اسلامی روایات اور عصر جدید میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش کی۔ وہ جن مسائل سے نبرد آزما ہوئے وہ آج بھی مسلم معاشرہ میں برقرار ہیں۔ ان مسائل کو حل کرنے کے لیے جو راستے انھوں نے اختیار کیے تھے۔ آج بھی ان کی افادیت بدستور ہے۔"

"آپ کی یونیورسٹی کو علم و خیر کے حصول کا علمبردار ہونا چاہیے۔ یہی وہ صفات ہیں جن کی بنیاد پر کوئی یونیورسٹی یا معاشرہ اچھا قرار دیا جا سکتا ہے ہمیں انہیں مقاصد کو مدنظر رکھتے ہوئے کام کرنا ہوگا۔ تا کہ زندگی اور انسانوں کے معاملات میں حق اور نیکی کو بالادستی حاصل رہے۔"

ضروری نہیں کہ عابد حسین نے جن نظریات کو پیش کیا ہے ان سب سے ہم اتفاق کریں ہاں ان میں جو باتیں کام کی ہیں ان کو ضرور مان لینا چاہیے اور ان پر عمل بھی کرنا چاہیے۔ سرسید نے خود ساری زندگی مفید اور کار آمد باتیں خواہ وہ کسی ملک کی ہوں اختیار کیں۔ اور سب کو اسی بات کی تلقین بھی کی۔ انھوں نے انیسویں صدی میں فکری اجتہاد اور تجدد کی ایسی راہیں مسلمانوں کے لیے کھول دیں جن کی بدولت برصغیر کے مسلمان آج نہ صرف عالم اسلام میں بلکہ دنیا میں نمایاں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ سرسید کی مذکورہ حیثیت کی لاج رکھنا ہمارا فرض اولیں ہے۔

اس ضمن میں مسلسل خود احتسابی کی ضرورت ہے۔ کیا ہم علم و خیر کی علم برداری کی اہلیت رکھتے ہیں؟ نہیں رکھتے ہیں تو اس اہلیت کے حامل کیوں نہیں؟ مسئلہ بہت جٹل ہے، اس کے حصول کے لیے زبردست ڈسپلن، علمی ماحول اور انتہائی سنجیدگی درکار ہوں گے جس کی فی الوقت بڑی کمی دکھائی دیتی ہے۔ اس شمارے کے بیشتر مشمولات بہت واضح طور پر سرسید کے وارثوں

(علیگ برادری) کی ذمہ داریوں کی طرف اشارے کرتے ہوئے ملیں گے، خدا کرے ہم سب بحسن و خوبی ان سے عہدہ بر آ ہوں اور ملک و ملت ہم سے جو آس لگائے ہوئے ہے وہ پوری ہو۔ آمین

سرسید نے اپنی زندگی ملک و ملت اور معاشرے کے لیے وقف کر رکھی تھی، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی اس کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ اس ادارہ کے بارے میں ہندوستان کے لوگوں میں ایک غلط فہمی بہت عام ہے۔ مسلمان یہ سمجھتے ہیں کہ یہ ادارہ بلا شرکت غیرے ان کا ہے، برادران وطن بھی بالعموم اسکو مسلم ادارہ ہی سمجھتے ہیں۔ لیکن وقتاً فوقتاً سوالیہ نشان بھی لگاتے رہتے ہیں۔ لیکن یہ بات کسی کی سمجھ میں نہیں آتی کہ روز اول سے یہ ادارہ ایک قومی ادارہ ہے اس نے سب کو یکساں فیض پہنچایا ہے۔ کیا سورج کی روشنی سب کے لیے یکساں نہیں، کیا گنگا کا پانی صرف ہندوؤں کی کھیتی ہی کو سیراب کرتا ہے؟ علم ایک روشنی ہے، ہوا ہے، حرارت ہے جو بلا تخصیص مذہب، نسل اور زبان، بنی نوع انسان کے لیے مخلوق ہوا ہے۔

راجہ رام موہن رائے اور سرسید جیسے مصلحین نے کبھی بھی ایسے ہندوستان کا خواب نہیں دیکھا تھا جو ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے، جہاں مندر و مسجد دھوست (منہدم) کیے جائیں، جس کی مزید تقسیم مذہبی اور لسانی بنیادوں پر کی جانے کی تمنا ہو، جہاں مقامی ریت و رواج کو ایک الگ قومیت کا نشان قرار دیا جائے، جہاں علاقائیت بربریت کا مظہر بن جائے، جہاں ذاتوں کی تفریق موت کا بازار گرم کر دے، جہاں عید گاہ میدان پر قومی پرچم لہرانا قومی فریضہ سمجھا جائے، جہاں اس ملک کی بے حد مقبول اور قومی زبانوں میں سے ایک زبان کی براڈ کاسٹ، قتل و غارت گری، لوٹ مار اور آتش زنی کا سبب بن جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر آج ان دونوں کو دوسری زندگی بخشی جائے تو اول تو وہ قبول ہی نہیں کریں گے اور اگر بدرجہ مجبوری آمادہ بھی ہوئے تو بارگاہ ایزدی میں گڑگڑا کر کہیں گے کہ "اے رب العزت تو ہمیں اگر دوسری زندگی دنیا ہی چاہتا ہے تو ہمارے ساتھ ہمارے زمانے کو بھی پیدا کر۔"

اس شمارے میں صرف علی گڑھ (سرسید) تحریک سے متعلق مضامین شائع کرنے کا ارادہ تھا لیکن چند ایسے مضامین بھی جو سرسید کی زندگی اور کارناموں پر ایک خاص زاویہ سے روشنی ڈالتے ہیں شامل کیے جا رہے ہیں۔ مضامین کی تقسیم چند عنوانات کے تحت کی گئی ہے۔ 'بازیافت' کے عنوان سے سرسید اور رشید احمد صدیقی کے خطبات کے مخاطبین طلبہ ہیں۔ آج بھی ان خطبات کی ضرورت ہے۔ ہمیں امید ہے کہ وہ طلبہ جو (تہذیب الاخلاق) کو پابندی سے پڑھتے ہیں ان کو دوسروں کو بھی پڑھ کر سنائیں گے آج کے حالات میں وقت کا سب سے بڑا تقاضا یہی ہے۔

ادارہ تہذیب الاخلاق مضمون نگار حضرات کا تہہ دل سے ممنوں ہے کہ انھوں نے وقت کی تنگی کے باوجود ہماری فرمائش پوری کی آخیر میں احمد مجتبیٰ قریشی، اسسٹنٹ ایڈیٹر کی دلی کی دوڑ کا ذکر ضروری ہے۔ انھوں نے سہ پہیہ اور پیر گاڑی کر کے دلی کو گھر آنگن بنا لیا تبھی یہ ممکن ہوا کہ یہ شمارہ تھوڑی تاخیر سے سہی مگر آپ تک پہنچ ضرور گیا۔ ہم مسٹر رتن گپتا، مینجر لیتھو کلر پرنٹرس، علی گڑھ کا بھی شکریہ ادا کرتے ہیں اس امید کے ساتھ کہ وہ آئندہ اس بار سے بھی زیادہ مستعدی کا مظاہرہ کریں گے۔ سرورق کے تزئین کار خلیق اشفاق، لکچرر، ویمنس کالج ہمارے خاص شکریہ کے مستحق ہیں کہ انھوں نے ہماری فرمائش پر بہت ہی کم وقت میں اس کام کو سر انجام دیا۔

مدیر

اعلانِ ملکیت

مالک : علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ
قومیت : ہندوستانی
ایڈیٹر : مسعود عالم
پرنٹر، پبلشر: مسعود عالم
پریس : علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ
اشاعت کی مدت : ماہانہ
مقامِ اشاعت : ماہنامہ تہذیب الاخلاق اور نشانات، اے۔ ایم۔ یو۔ علی گڑھ

مندرجہ بالا اطلاعات درست ہیں۔ مسعود عالم

تہذیب الاخلاق

شرح اشتہارات

۱۔	بیک ٹائیٹل پیج	(پورا صفحہ)	۱۲۰۰	روپے
	بیک ٹائیٹل پیج	(آدھا صفحہ)	۶۰۰	روپے
	بیک ٹائیٹل پیج	(چوتھائی صفحہ)	۳۰۰	روپے
۲۔	بیک انر ٹائیٹل پیج	(پورا صفحہ)	۱۰۰۰	روپے
	بیک انر ٹائیٹل پیج	(آدھا صفحہ)	۵۰۰	روپے
	بیک انر ٹائیٹل پیج	(چوتھائی صفحہ)	۲۵۰	روپے
۳۔	انر سائڈ پیج	(پورا صفحہ)	۷۵۰	روپے
	انر سائڈ پیج	(آدھا صفحہ)	۴۰۰	روپے
	انر سائڈ پیج	(چوتھائی صفحہ)	۲۰۰	روپے

نوٹ : مشتہرین کو ۳۳ فی صد کی رعایت دی جائے گی۔

سرکولیشن انچارج


جہاد نوا بی بی ٹانک)
پٹھوں کے تمام اعضا کو طاقت بخشتا ہے اور دانت
نکلنے کی تکلیف سے گزرتا ہے
شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ
کے لئے
دماغین
تمام دماغی کام کرنے والوں
کے لئے نایاب تحفہ
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے
پھنسی، خارش اور داد
کھجلی کی دوا
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڈھ

ایک مکمل ہیلتھ ٹانک ، بلکہ اور بھی بہت کچھ !



سنکارا
آپ کی صحت کے لیے ایک بھرپور ٹانک

سنکارا لازمی عناصر، جڑی بوٹیوں اور وٹامنوں کا نادر مرکب ہے ۔ اس میں آئرن ، کیلشیم اور زِنک کی کافی مقدار ہے ۔ اتنا ہی نہیں ، سنکارا میں الکحل بالکل نہیں ہے ۔ سنکارا آپ کی کس طرح مدد کرتا ہے ؟

اسکول جانے والے بچّوں کے لیے :

سنکارا بھوک اور ذہنی توانائی بڑھانے میں مدد کرتا ہے ۔ اس کی وجہ ہے سنکارا میں موجود مقوّی عناصر (بالخصوص زِنک اور آیوڈین) جو دماغ کے خلیوں کو بڑی مقدار میں غذا فراہم کرتے ہیں ۔ یہ قوتِ حافظہ کی اصلاح بھی کرتا ہے ۔

حاملہ خواتین کے لیے :

سنکارا حاملہ خواتین اور دودھ پلانے والی ماؤں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے ۔ اس میں ماں اور بچّہ کی صحت کے لیے ضروری فولک ایسڈ، وٹامن بی ۱۲ ، آئرن ، کیلشیم اور زِنک کافی مقدار میں ہیں ۔

بالغوں کے لیے :

دباؤ اور تناؤ بھری اس دنیا میں سنکارا مہلک امراض سے حفاظت کا سب سے بہترین ذریعہ ہے ۔ سنکارا دورانِ خون کو معمول کے مطابق رکھنے اور جگر کے اطراف میں کثافتوں کے جمع ہونے سے روکنے میں مدد کرتا ہے ۔

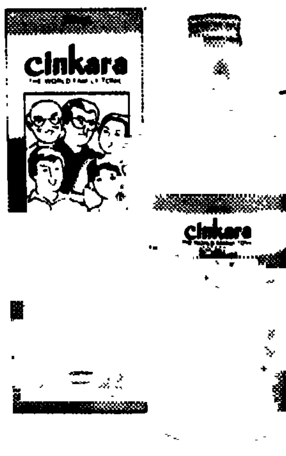
ضعیفوں کے لیے :

سنکارا ضعیفوں کے لیے قابلِ مثال اور طاقت بحال کرنے والا ٹانک ہے ۔ اعتدال میں کمی آجانے کے سبب پیدا ہونے والے امراض اور ضعیفی میں پریشان کرنے والی بیماریوں سے حفاظت کرتا ہے ۔ ان میں اکثر امراض کا سبب خراب اور غیر متناسب غذا ہے ۔

تو آج ہی سنکارا لے آیئے ۔ یہ پورے خاندان کے لیے قابلِ مثال صحت بخش ٹانک ہے ۔

چند مشہور ٹانکوں میں موجود آئرن ، کیلشیم ، زِنک اور الکحل کی مقدار (فی خوراک) کا موازنہ ۔

Reputed brands of tonics	Iron (mg)	Calcium (mn)	Zinc (mg)	Alcohol content percent (V/V)	Contents per unit pack
1	—	12.4	—	12.00	400
2.	—	—	—	11.0	240
3.	9.68	—	—	—	454
4.	13.00	—	—	—	200
5.	21.50	—	0.00682	5.5	200
6.	.16.709	—	—	—	300
7.	—	—	—	—	200
8.	7.63	—	0.50	—	100
9.	5.60	9.50	—	9.5	300
Cinkara	[illegible]	19.67	2.00	[illegible]	[illegible]



لازمی بنیادی عناصر، وِٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب

ہمدرد
سنکارا
مشہور عالمی فیملی ٹانک ، ہر موسم میں سب کے لیے

1/3/96

تہذیب الاخلاق

ادارہ تہذیب الاخلاق اورنشانت
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی۔ علی گڑھ

مجلسِ ادارت

THE MOHAMMEDAN SOCIAL REFORMER

تہذیب الاخلاق

جلد ۱۳ | دسمبر ۱۹۹۴ء | شمارہ ۱۲

بانی : سرسید احمد خاں

مدیر

پروفیسر مسعود عالم

نائب مدیر : احمد مجتبیٰ قریشی

سرکولیشن انچارج : شفیق احمد

فی شمارہ	6.50	روپے
زرسالانہ	65.00	روپے
بیرونی ممالک (ہوائی ڈاک)	30.00	امریکی ڈالر
بیرونی ممالک (عام ڈاک)	15.00	امریکی ڈالر

ترسیل زر کا پتہ

ایڈیٹر تہذیب الاخلاق اور ثقافت

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

۲۰۲۰۰۲ (یو پی) انڈیا فون : 401027

ترتیب

تہذیب الاخلاق کے مضامین میں جن خیالات کا اظہار کیا جاتا ہے ضروری نہیں کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی ان سے متفق ہو۔

اداریہ

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی جس سنگین دور سے گزر رہی ہے اس سے سبھی واقف ہیں۔ تعلیمی اداروں میں ایسے حالات کا پیش آنا انہونی یا حیرت کی بات نہیں۔ ہندوستان کے بیشتر تعلیمی ادارے اسی صورتِ حال کے شکار ہیں لیکن ایسے حالات کا مسلم یونیورسٹی میں پیش آنا فکر کی بات ہے۔ پچھلے دنوں جو حالات پیش آئے اس کے کئی اسباب ہیں۔ طلبا اور اساتذہ میں ایسی بے چینی اور بے اطمینانی پیدا ہوئی جس کے سبب تعلیمی سرگرمیاں متاثر ہونے لگیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ یونیورسٹی کو موسم سرما کی تعطیلات سے قبل سرمائی تعطیلات کا نام دے کر بند کرنا پڑا۔ پھر بھی حالات بدستور سنگین بنے رہے۔ اسی غیر یقینی صورت حال کے پیشِ نظر وائس چانسلر پروفیسر محمد نسیم فاروقی نے وائس چانسلری کے عہدے سے استعفا دے دیا۔ اس سے قبل ندوۃ العلما میں پولیس کی مداخلت سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہوئے اور اس کارروائی کی مذمت بالعموم ہر حلقہ میں کی گئی۔ سمجھا جاتا ہے کہ اگر حکومت ہند اس اقدام کیلئے مولانا سید علی میاں سے تعاون چاہتی تو مولانا پورا تعاون دیتے لیکن مولانا کو نظرانداز کیا گیا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر طرف سے اس اقدام کی نکتہ چینی ہونے لگی ادھر مسلم یونیورسٹی کے وائس چانسلر کا استعفا، حکومت فوراً منظور کرکے ندوہ کی طرح نکتہ چینی کا موضوع نہیں بننا چاہتی تھی اس لیے اس اقدام سے پہلے وہ ہونے والے ردِّعمل پر غور کرتی رہی آخر کار انسانی وسائل کی وزارت کی سفارش پر صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر شنکر دیال شرما (جو یونیورسٹی کے وزیٹر ہیں) نے ۹ دسمبر ۹۳ء کو استعفا منظور کر لیا اور پروفیسر شمیم احمد کو کارگزار وائس چانسلر مقرر کر دیا گیا۔

آئیے اب ہم مختصر طور پر اس بات کا جائزہ لیں کہ اس صورتِ حال کا ذمہ دار کون ہے؟ کوئی ایک یا ہم سب۔ طلبا نے اگر سابقہ روایات کو بالائے طاق رکھ دیا ہے تو اساتذہ کے پدرانہ اور مشفقانہ جذبوں اور رشتوں میں بھی خاصی کمی واقع ہوئی ہے یہی وہ اسباب و عوامل ہیں جن کی وجہ سے اساتذہ اور طلبا کے بیچ دراڑ سی پڑ گئی ہے اور نت نئے مسائل ابھر کر سامنے آ گئے ہیں ہم جن روایات کے علمبردار ہونے کے دعوے دار ہیں اور جن اقدار کی وجہ سے ہم انفرادی مقام کے حامل سمجھے جاتے ہیں وہ پچھلے چند برسوں میں ختم سے ہوتے جا رہے ہیں۔ اگر ہمیں علی گڑھ کو زندہ رکھنا ہے تو آپسی اختلافات کو بھولنا ہوگا اور ایک نیا لائحہ عمل تیار کرنا ہوگا۔ ہمیں پچھلے دنوں میں ہوئے اسمبلی انتخابات سے سبق حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ کانگریسیوں کی آپسی لڑائی ہی ان کی ہار کا سبب بنی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری آپسی لڑائی اس ادارے کو نقصان پہنچا جائے۔ ہمارا آپ کا تعاون ہی اس ادارے کو ایک بہتر اور ہمدرد وائس چانسلر دے سکتا ہے۔ اب فیصلہ ہم سب پر ہے کہ ہم مادر درس گاہ کے لیے کیا کرتے ہیں۔

ہم امید کرتے ہیں کہ یونیورسٹی میں یہ عارضی بے چینی اور بے اطمینانی کی فضا ختم ہو جائے گی اور استحکام، ہمدردی، رواداری، تہذیب و شائستگی کا وہ دور پھر لوٹ کر آئے گا، جس نے ہمیں ایک منفرد مقام عطا کیا اور جس کے لیے سر سید احمد خاں نے اپنی پوری زندگی صرف کی تھی۔

——— نائب مدیر

پروفیسر مختارالدین احمد *

شیخ عبدالحق حقی بغدادی

شیخ عبدالحق بغدادی اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ عربی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کے حالات بہت کم معلوم ہیں (۱) جو کچھ معلوم ہو سکا وہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں۔

عبدالحق حقی آفندی، بغداد کے مضافات میں اعظمیہ نام کے ایک قصبے میں ۱۲۹۰ھ / ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے۔ تعلیم جامع ازہر میں حاصل کی۔ علامہ رشید رضا مصری ان کے اساتذہ میں تھے۔ تلاش معاش میں وہ ہندوستان آئے اور بمبئی میں مقیم ہوئے۔ بمبئی اس زمانے میں عربی و فارسی مطبوعات کی اہم منڈی تھی جہاں سے پورے ہندوستان میں کتابیں بھیجی جاتی تھیں۔ شیخ برسوں وہاں مقیم رہ کر کتابوں کی تجارت کرتے رہے اور ساتھ ہی ساتھ انھوں نے کچھ علمی سلسلہ بھی جاری رکھا۔

حکومت ہند نے ۱۹۰۶ میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ کو عربی زبان و ادب کی تعلیم و ترویج کے لیے دس ہزار روپے سالانہ کی ایک گراں قدر رقم دی اور شرط یہ رکھی کہ یہاں عربی کا پروفیسر کوئی نامور مستشرق مقرر کیا جائے۔ (٭) چنانچہ مشہور جرمن مستشرق جوزف ہوروو ٹس (۱۸۷۴-۱۹۳۱) علی گڑھ میں عربی کے پہلے پروفیسر مقرر ہوئے۔ اسی سال مولانا حمیدالدین فراہی (۱۸۶۲-۱۹۳۰) کا تقرر عربی کے اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے علی گڑھ میں ہوا۔ مولانا ۱۹۰۸ میں جب پروفیسر ہو کر علی گڑھ سے الہ آباد چلے گئے۔ تو ان کی جگہ پر شیخ عبدالحق حقی بغدادی کا تقرر اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ہوا۔ میں نے کسی مضمون میں مولانا حقی کا تقرر ۱۹۱۴ میں لکھا ہوا دیکھا ہے۔ (۲) لیکن یہ صحیح نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ شیخ کے دو عربی رسالے جو ۱۹۱۱ اور ۱۹۱۲ میں علی گڑھ میں طبع ہوئے ہیں ان پر مصنف کے نام کے ساتھ اسسٹنٹ پروفیسر چھپا ہوا ملتا ہے۔

شیخ عبدالحق حقی کے نام مولانا حمیدالدین فراہی کے تین عربی خطوط کے مسودات ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی (اسلام آباد) کو ملے ہیں۔ ان خطوط کا عربی متن اور ان کا اردو ترجمہ انھوں نے "مکاتیب فراہی" (۳) میں شائع کیے ہیں۔ یہ خطوط محررہ ۲ شوال ۱۳۲۶ھ (اکتوبر ۱۹۰۸) ۱۹، ۲۰ دسمبر ۱۹۰۸ اور ۱۸ رجب المرجب ۱۳۲۷ھ (۵ اگست ۱۹۰۹) کے جواب میں لکھے گئے ہیں۔ اکتوبر ۱۹۰۸ کے خط کے جواب میں مولانا فراہی لکھتے ہیں "مجھے آپ کی دی ہوئی اس خبر سے خوشی ہوئی کہ آپ خیر و عافیت سے

٭ سابق صدر شعبہ عربی و ناظم ادارہ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہیں اور آپ کو رسل گنج میں ایک مکان مل گیا ہے اور آپ اہل خاندان کے ساتھ اس میں اقامت پذیر ہیں۔"

اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۵ اکتوبر ۱۹۰۸ میں علی گڑھ آچکے تھے۔ اس زمانے میں کالج میں مکانات کی تعداد بہت محدود تھی، اس زمانے میں کالج کے اساتذہ زیادہ تر علی گڑھ شہر میں رہتے تھے۔ میرے علم کے مطابق عربی کے اساتذہ میں مولوی عباس حسین، شمس العلماء مولانا خلیل احمد اسرائیلی (۱۸۴۴-۱۹۲۲)، مولوی محمد اکبر، اور بعد کے زمانے کے اساتذہ عربی میں علامہ عبدالعزیز میمن (۱۸۸۸-۱۹۷۸ء)، مولانا بدرالدین علوی (۱۸۹۳-۱۹۶۵) علی گڑھ شہر ہی میں اقامت پذیر تھے۔ یہ دونوں بعد کو بدر باغ اور نذیر احمد روڈ پر منتقل ہوئے۔ اس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ حتی علی گڑھ شہر کے مشہور محلہ رسل گنج میں اپنے خاندان کے لوگوں کے ساتھ مقیم تھے۔

مولانا فراہی کے دوسرے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ دسمبر ۱۹۰۸ میں شیخ حتی بمبئی میں مقیم تھے۔ مولانا انھیں لکھتے ہیں "میں امید کرتا ہوں کہ آپ مجھے بمبئی میں اپنی جائے قیام سے آگاہ کریں گے، اس کے بعد میں آپ کو مطلوبہ رقم یا اس کے قریب روپے بھیج دوں گا"۔ خط میں روپے بھیجنے کا ذکر ہے یہ عربی کتابوں کی خریداری کے سلسلے میں ہو تو عجب نہیں، اس لیے کہ اس خط میں یاقوت الحموی کی معجم البلدان کے پہنچنے کی رسید ہے اور مطول اور اور شرح المواقف کی خریداری کا ذکر ہے۔ شیخ کے تین رسالوں کا اب تک پتہ چلا ہے:

(۱) کتاب ایضاح و بیان عن اکبر مدرسۃ اسلامیہ عصریہ

نواب وقار الملک کی فرمائش پر مدرسۃ العلوم علی گڑھ کی تاریخ، اس کے مقاصد، نصاب تعلیم، قواعد داخلہ اخراجات وغیرہ پر مشتمل عربی زبان کا یہ مفید اور پر معلومات کتابچہ ہے اس کی تحریر و اشاعت کا مقصد یہ تھا کہ دنیائے اسلام خاص طور پر عرب ممالک سے طلباء تعلیم کی تحصیل و تکمیل کے لیے زیادہ سے زیادہ تعداد میں علی گڑھ آئیں اور یہاں رہ کر علمی فیوض حاصل کریں۔ یہ کتابچہ پہلے مضمون کی شکل میں جریدہ "ریاض" بغداد میں اشاعت پذیر ہوا، پھر وقار الملک کے حکم سے کتابی شکل میں ۲۸ صفحات پر مطبع شاہ بندر بغداد سے ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں شائع کیا گیا۔

(۲) العرب والعربیہ

اس عربی رسالے میں اس بات پر زور دیا گیا ہے کہ عرب اور عربیت ہی میں امت اسلامیہ بلکہ جمیع امم بشریہ کی فلاح ہے۔ یہ رسالہ ان کے علی گڑھ کے قیام کے دوران ۱۳۲۹ھ / ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا۔

(۳) اعجب العجب من احوال العرب

یہ عربی کا ایک طویل شعری قصیدہ ہے جس کے اشعار کی تعداد ۲۲۹ ہے۔ اس کے پڑھنے سے عرب کے جاہلی شعرا کے قصائد و معلقات کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ قصیدے کے ذیلی عنوانات یہ ہیں۔ تحیۃ و دعا، سیرت عرب، احوال عرب ایام حاضرہ میں، مطالب بامت عربیہ اور آخر میں رب العزۃ والجلال کی بارگاہ میں دعاء۔ ابتداء اور درمیان میں نثر کی بھی کچھ عبارتیں ہیں۔ میرا قیاس یہ ہے کہ یہ قصیدہ علی گڑھ کے طلبا کے نصاب میں داخل ہوگا، اس لیے کہ جس طرح درسی کتابوں میں حل لغات درج کیا جاتا ہے، اس منظومے کے آخر میں ۱۴۲ الفاظ کے معانی و مطالب درج کیے گئے ہیں۔ اس پر مصر کے مصطفے صادق الرافعی جیسے مشہور اور مستند اہل قلم کا مقدمہ ثبت ہے جس میں انھوں نے اس قصیدے کے محاسن کا بہت اچھے الفاظ میں ذکر کیا

ہے۔ یہ قصیدہ علی گڑھ سے غالباً ۱۹۱۱ء میں چھپا تھا۔ اس کا دوسرا ایڈیشن مکتبہ عروبہ، دیر الزور سوریہ سے ۱۴۰۲ھ / ۱۹۸۲ء میں شائع ہوا ہے۔(۴)

یہ تو حال اولاد معنوی کا ہوا۔ شیخ نے تین عقد کیے، دوسری بی بی سے ان کے تین بچے ہوئے۔ ایک صاحب زادے عبدالودود عرف بدو میاں تھے اور ایک بیٹی جن کی صاحبزادی آج کل لندن میں مقیم ہیں۔ یہ انگلستان میں اردو کے مشہور اور سرگرم کارکن جناب مجاہد ترمذی (۵) کی اہلیہ ہیں۔ تیسری اولاد کا کچھ حال معلوم نہ ہو سکا۔

شیخ حج و زیارت کے ارادے سے وسط فروری ۱۹۲۴ء میں علی گڑھ سے روانہ ہوئے۔(۶) بغداد شریف، بیت المقدس ہوتے ہوئے وہ مدینہ منورہ پہنچے اور وہاں سے حج کے موسم میں مکہ مکرمہ حاضر ہوئے، وہیں ۱۹ ذوالحجہ ۱۳۴۲ھ (مطابق جولائی ۱۹۲۴) کو ان کی وفات ہوئی۔ ان کی نعش بمبئی لائی گئی اور وہ وہیں مدفون ہیں۔

شیخ حق بغدادی عربی کے بڑے جید عالم تھے۔ عربی ان کی مادری زبان تھی۔ انھوں نے تعلیم ازہر میں حاصل کی تھی، علامہ رشید رضا جیسے مشہور زمانہ استاد سے انھوں نے علمی فیوض حاصل کیے تھے۔ اپنی علمی صلاحیتوں ہی کی بنا پر وہ علی گڑھ میں استاد مقرر ہوئے۔ جوزف ہورووٹس عربی کے مشکل مسائل کے حل میں ان کی مدد لیتے تھے۔ استاد مرحوم علامہ عبدالعزیز میمن فرماتے تھے کہ اے۔ ایس۔ ٹریٹن جو ہورووٹس کے بعد علی گڑھ میں پروفیسر ہو کر آئے تھے، اپنے قیام کے دوران مولانا حق سے عربی سیکھتے رہے۔ اور ان سے استفادہ کرتے رہے۔

علامہ میمن کو بھی میں نے شیخ کا معترف پایا۔ دونوں کے تعلقات بہت اچھے تھے دونوں میں خط کتابت بھی تھی۔(۷) علامہ اقبال سے بھی شیخ کی خط و کتابت تھی، وہ ان کی علمی بصیرت اور ادبی صلاحیت کے معترف تھے۔ علامہ کے ایک خط بنام راغب احسن مرحوم (۱۹۰۶-۱۹۷۵) میں حسب ذیل سطریں ملتی ہیں۔(۸)

"عرب نوجوان کا مضمون بہت سطحی ہے۔ یہ محض ہندوؤں کے پروپیگنڈے کا اثر ہے، آپ اس کا جواب ضرور لکھیں، عربی میں ترجمہ کرا کر اسی اخبار کو بھیجنا چاہیے۔ عربی کا ترجمہ اس کا علی گڑھ کے مولوی حق بغدادی کریں گے۔ میں خود ان کو اس کے بارے میں لکھوں گا۔"

اقبال کے اس خط پر تاریخ تحریر درج نہیں، اسے جولائی ۱۹۲۴ء سے پہلے کا لکھا ہوا ہونا چاہیے۔ شیخ حق بغدادی سولہ سترہ سال تک علی گڑھ کالج سے منسلک رہے۔ کالج کے جلسوں کا افتتاح ان کی تلاوت قرآن پاک سے ہوتا تھا جس سے مجمع بے حد متاثر ہوتا تھا۔ کلاس میں درس بھی وہ بلند آواز سے اور ایک خاص لحن کے ساتھ دیا کرتے تھے۔ ان کی وفات کے بعد انھی کی جگہ پر علامہ عبدالعزیز میمن کا تقرر عمل میں آیا۔(۹)

حواشی

(۱) شیخ حق بغدادی کی وفات کو اب تقریباً ستر سال ہوئے۔ آج تک ان پر کوئی مضمون نہیں لکھا گیا۔ اب علی گڑھ میں کوئی ان کا جاننے والا یا انھیں دیکھنے والا نہیں رہا جن سے ان کے حالات معلوم ہوں۔ اس زمانے میں کالج کے آنریری سکریٹری وقارالملک نواب مشتاق حسین (۱۸۴۱-۱۹۱۷) تھے جن کی مفصل اور ضخیم سوانح حیات مولوی محمد اکرام اللہ خاں ندوی مرحوم نے لکھی ہے اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے "وقار حیات" کے نام سے ۱۹۲۵ میں شائع کی ہے، اس میں شیخ کا اشارۃً بھی کہیں ذکر نہیں۔ یونیورسٹی کے ریکارڈ آفس میں ان کی کوئی

فائل نہیں ملی۔ مجھے بتایا گیا کہ سارے قدیم ریکارڈ اور دستاویزات یونیورسٹی لائبریری کو بھیج دیے گئے۔ وہاں معلوم ہوا یہ سارا ذخیرہ سرسید ہاؤس میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ وہاں کے دفتر کے ملازمین اس قیمتی اور نایاب ذخیرے کے بارے میں کوئی اطلاع نہیں رکھتے۔ ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم کے حفید، احمد ضیاء الدین نے مجھے بتایا کہ مہینوں سے وہ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کی پرسنل فائل، ریکارڈ آفس اور سرسید ہاؤس میں تلاش کر رہے ہیں۔ انہیں آج تک نہیں ملی۔ ظاہر ضائع ہو گئی یا کہیں گم ہے۔ یونیورسٹی کے ارباب اختیار توجہ فرمائیں کہ کاغذات و دستاویزات کا یہ قیمتی ورثہ محفوظ رہے اور لوگ اس سے مستفید ہوں۔

(۲) اس وقت یاد نہیں آتا کہ ۱۹۲۲ء میں شیخ کے تقرر کی اطلاع میں نے کہاں دیکھی۔

(۳) مطبوعہ رسالہ "اشراق" لاہور مئی ۱۹۹۴ء۔

(۴) دمشق سے اس قصیدے کی اشاعت کے سلسلے میں مکتبہ عروبہ نے شاعر کی زندگی کے حالات کے لیے ہندوستان کے سفیر کو جو سوریہ میں متعین تھے متوجہ کیا تھا۔ سفارت خانہ نے مجھے لکھا لیکن میں ان کی کوئی خاطر خواہ مدد نہ کر سکا۔ ڈاکٹر شرف الدین اصلاحی کو شیخ کے بہت سے عربی مخطوط بنام علامہ فراہی دستیاب ہوئے ہیں۔ ان کے عکس مجھے مل گئے تو شیخ کے قصائد کے ساتھ انہیں بھی شائع کرنے کا خیال ہے۔

(۵) ۱۹۹۱ کے وسط میں ڈاکٹر محمد حسن نے جو لندن میں مجاہد ترمذی صاحب کے یہاں مقیم تھے مجھے خط لکھا کہ مجاہد صاحب کی اہلیہ شیخ عبدالحق حقی بغدادی کی عزیزہ ہیں۔ وہ ان کے حالات جاننا چاہتی ہیں۔ اس وقت تک جو کچھ مجھے معلوم تھا وہ میں نے انہیں لکھ کر بھیج دیا اور شیخ کے عربی قصیدے کا ایک نسخہ بھی جو میرے پاس دمشق سے چھپ کر آیا تھا۔

(۶) شیخ کی وفات کے کوئی ایک ماہ بعد مسلم یونیورسٹی گزٹ (۲۰/۱ اگست مورخہ ۱۹۲۴) میں ان کی وفات پر ایک مختصر نوٹ چھپا ہے۔ جناب مہر الہی کا ممنون ہوں کہ انھوں نے ۱۹۲۴ کے گزٹ کے پورے سال کی فائل دیکھ کر ان کی وفات کی خبر اس میں تلاش کی اور اس کی نقل مجھے عنایت کی۔ اس میں صرف تاریخ وفات ۱۹ ذوالحجہ درج ہے سال کا اندراج نہیں۔

(۷) میمن صاحب نے ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم کے نام ایک خط (مورخہ یکم جنوری ۱۹۳۶) میں شیخ کے ایک طویل مکتوب (مرقومہ ۱۹۲۴) کا ذکر کیا ہے جس میں شیخ نے اپنے علی گڑھ کے حالات لکھے ہیں اور یہ اطلاع درج کی ہے کہ وہ بہ حیثیت اسسٹنٹ پروفیسر ۴۰۰-۵۰-۷۰۰ کے گریڈ میں ہیں۔ (مجلۃ المجمع العلمی الہندی مرتبہ مختار الدین احمد مجلد ۱۱: ۳۱ (جون ۱۹۸۶) ص ۴۵۹

(۸) جہان دیگر مرتبہ جناب فریدالحق ایڈووکیٹ کراچی ۱۹۸۲ء

(۹) اخباروں میں اس جگہ کا اعلان اگست ۱۹۲۴ء میں ابتدا میں ہوا۔ علامہ میمن نے درخواست لاہور سے ۱۹ ستمبر کو رجسٹرار کو بھیجی۔ تقرری کی اطلاع پانے پر اورینٹل کالج لاہور سے آکر انھوں نے ۱۲ نومبر ۱۹۲۵ء کو یہاں ریڈرشپ کا چارج لیا۔ اس وقت صاحبزادہ آفتاب احمد خاں (۱۸۶۲-۱۹۳۰) وائس چانسلر تھے جن کے اخلاق و محبت اور ان کی قدردانی کے میمن صاحب ہمیشہ معترف رہے۔

* یہ مضمون کمپوز ہو چکا تھا کہ حسن اتفاق سے ڈاکٹر ضیاء الدین احمد مرحوم کا ایک خط (مورخہ ۲۲ مارچ ۱۹۰۶ء) بنام محسن الملک، احمد ضیاء الدین صاحب سے حاصل ہوا۔ یہاں ان کے شکریے کے ساتھ درج کیا جاتا ہے: "عربی کے پروفیسر کے لیے گورنمنٹ کی بہت تاکید ہے۔ انگلش مین تو کوئی ملتا نہیں ہز آنر لفٹیننٹ گورنر کی بھی یہی رائے ہے کہ جرمن بلالیا جائے۔ میں نے اور آرچبولڈ صاحب نے مل کر مارلین صاحب کو ایک چٹھی لکھی ہے اور ان کو انتخاب کا مشورہ آپ کے اختیار دیا ہے۔ غالباً وہ آپ کو بھی لکھیں گے۔ لائق آدمی جلد منتخب کیجیے۔ سائنس اسکول کے لیے بھی انتظام ہو گیا ہے اور ہم فوراً کام شروع کر سکتے ہیں۔ گورنمنٹ میں باضابطہ درخواست بھیجی ہے، منظوری آنے کے بعد پروفیسر کے انتخاب کے لیے آپ کو اور مارلین صاحب کو لکھا جائے گا۔"

پروفیسر کبیر احمد جائسی*

آزاد ہندوستان میں فارسی زبان کے مطالعے کی اہمیت

(یہ توسیعی خطبہ ۵ / ۱ اکتوبر ۱۹۹۳ء کو بنارس ہندو یونیورسٹی، وارانسی کے شعبۂ فارسی کے ایک جلسے میں پڑھا گیا)

میں صدر شعبۂ فارسی بنارس ہندو یونیورسٹی کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے مجھے آپ حضرات کے درمیان آنے اور اظہار خیال کرنے کا موقع عنایت فرمایا۔ میں ایک ایسے احساس مسرت و حیرت کے ساتھ آپ کے سامنے کھڑا ہوا ہوں جس کو میرا قلم الفاظ کا جامہ پہنانے سے قاصر ہے۔ مسرت اس بات کی بھی ہے کہ میں اس ادارے میں آپ سے مخاطب ہوں جس کے ایک لایق استاد مولوی مہیش پرشاد صاحب بھی تھے جنہوں نے اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ غالب شناسی کے لیے وقف کر رکھا تھا۔ انہوں نے جو علمی و ادبی سرمایہ اپنی یادگار چھوڑا ہے وہ آج بھی ہمارے لیے معتبر اور بامعنی ہے۔ میں بنارس ہندو یونیورسٹی میں ایک ایسے ادارے کی نمائندگی کر رہا ہوں جس کے ایک لایق استاد پنڈت حبیب الرحمن شاستری تھے جن کی کتاب "رس" آج بھی اہل علم کی نگاہوں کا سرمہ ہے اور جنہوں نے اپنی زندگی کے قیمتی لمحات اپنشد کے مسلسل مطالعے میں صرف کئے اور نتیجے کے طور پر اردو پڑھنے لکھنے اور جاننے والوں کو 'آئینۂ حقیقت' نامی کتاب دے گئے۔ میری دعا ہے کہ بنارس ہندو یونیورسٹی میں مولوی مہیش پرشاد اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں پنڈت حبیب الرحمن شاستری پیدا ہوتے رہیں تاکہ چراغ سے چراغ جلنے کا عمل تیز سے تیز تر رہے اور زمانے کی کوئی بھی آندھی تہذیبی لین دین کے چراغ کو گل نہ کر سکے۔ ان ابتدائی کلمات کے بعد اب میں اصل موضوع کی طرف آتا ہوں۔

اکثر ذہنوں میں یہ سوال گونجتا رہتا ہے کہ آزاد ہندوستان میں جس کی سرکاری زبان ہندی اور بین الصوبائی رابطے کی زبان انگریزی ہے، یونیورسٹیوں، کالجوں اور اسکولوں میں فارسی زبان کی تعلیم دینے کے لیے افرادی قوت اور ایک معتدبہ رقم کیوں خرچ کی جا رہی ہے؟ فارسی نہ تو ہندوستانیوں کی مادری زبان ہے نہ ہی ایک صوبے کا دوسرے صوبے سے ربط قائم رکھنے کا ذریعہ۔ اس کی تعلیم و تدریس کا سلسلہ آج بھی کیوں باقی ہے اور کچھ "دیوانے" کیوں دن رات اس زبان کے مطالعے کو فروغ دینے کے کوشاں ہیں اس سوال کا ایک سیدھا سادا سا جواب تو یہ ہے کہ فارسی ایک زندہ زبان ہے جس کو کروڑوں افراد بولتے لکھتے اور پڑھتے ہیں۔ اس کا بیش قیمت ادب ہے جس کے مطالعے سے مسرت و بصیرت دونوں حاصل ہوتی ہے۔ یہ زبان ایران،

---

* سابق ناظم ادارۂ علوم اسلامیہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

افغانستان اور تاجیکستان کے عوام کی مادری زبان بھی ہے اور سرکاری زبان بھی۔ ہندوستان کو ان ملکوں سے رابطہ رکھنے اور سیاسی تعلقات قائم کرنے کے لیے ایسے افراد کی ضرورت ہے جو اچھے فارسی داں ہوں، آل انڈیا ریڈیو کے فارسی اور دری یونٹوں کا کام کاج کر سکیں، وزارت خارجہ اور وزارت داخلہ کے خفیہ محکمے میں بھی ایسے افراد کی ضرورت ہے جو ایک طرف ضرورت پڑنے پر اپنے ملک کا دفاع اسی زبان میں کر سکیں اور دوسری طرف اس مراسلت و مکاتبت پر بھی نظر رکھ سکیں جو فارسی زبان میں ہوتی ہے ایسے مخلوط ہندوستان میں آتے بھی ہیں اور ہندوستان سے باہر جاتے بھی ہیں۔

میرے نزدیک یہ جواب اگرچہ صداقت کا حامل ہے مگر مکمل نہیں ہے۔ مذکورہ بالا حقائق سے قطع نظر اوپر جو سوال کیا گیا ہے اس کا مکمل اور بھرپور جواب یہ ہے کہ آزاد ہندوستان میں فارسی زبان کا مطالعہ ہماری قومی اور تہذیبی ضرورت ہے۔ فرض کر لیجیے کہ ہمارے ملک کے تعلقات ایران افغانستان اور تاجیکستان سے خراب ہو جاتے ہیں اور ان کے سفارت خانے بند ہو جاتے ہیں، ان ملکوں کا ایک بھی فرد ہمارے ملک میں نہیں رہ جاتا جو فارسی زبان میں اپنے وطن خط لکھے یا اس کے وطن سے کوئی خط آئے۔ اب نہ تو کسی سرکاری محکمے میں مترجم کی ضرورت باقی رہتی ہے نہ ہی فارسی زبان کے ماہرین کی۔ اس وقت بھی فارسی زبان کا مطالعہ ہمارے لیے ناگزیر ہوگا۔ ناگزیر اس لیے کہ یہ ہماری قومی اور تہذیبی ضرورت ہے اور کوئی بھی باہوش و باعقل فرد اپنی قومی اور تہذیبی ضرورت سے صرف نظر کرنے کا خیال تک اپنے دل میں نہیں لا سکتا۔

ہمارے ملک میں دو غیر ملکی زبانوں کو سرکاری زبان کا درجہ حاصل رہا ہے۔ ایک فارسی اور دوسری انگریزی، اس فرق کے ساتھ فارسی تقریباً آٹھ سو برسوں تک ہمارے ملک کی سرکاری زبان رہی اور انگریزی صرف اسی نوے برسوں تک، گوکہ آزاد ہندوستان میں آج بھی انگریزی کا تسلط جاری ہے مگر اس کی وہ سرکاری حیثیت نہیں رہی ہے جو ۱۹۴۷ء سے پہلے تھی۔ انگریزی جتنے عرصے تک سرکاری زبان رہی اتنے عرصے تک صرف اسی کا سکہ نہیں چلتا رہا بلکہ اس کے علاوہ دوسری ہندوستانی زبانوں میں بھی تصنیف و تالیف کا کام برابر ہوتا رہا، غالباً یہی وجہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزی زبان میں علوم وفنون کی کتابوں کا وہ ذخیرہ مہیا نہیں کیا جا سکا جس سے ناواقفیت کی بنا پر ہمارا قومی اور تہذیبی نقصان ہو اور جس کے مطالعے کے بغیر ہمارا اپنے ماضی سے سارا رشتہ کٹ کر رہ جائے۔ اس کے برخلاف فارسی زبان میں ہمارا جو قومی اور تہذیبی سرمایہ موجود ہے اگر اس سے صرف نظر کر لیا جاتا ہے تو ہم اپنے ملک کی تاریخ کے تقریباً آٹھ سو سالہ تاریخ سے ناآشنائے محض ہو کر رہ جائیں گے۔

زندہ قوموں کا اصل سرمایۂ حیات تاریخ ہی ہوتی ہے۔ تاریخ صرف گذشتہ بادشاہوں کے عہد حکومت کے سیاسی واقعات و حادثات ہی کا نام نہیں ہے بلکہ نام ہے عہد گذشتہ کی تمام قومی، تہذیبی، لسانی اور سیاسی سرگرمیوں کے مصدقہ رکارڈ کا۔ تاریخ کے دامن میں صرف بادشاہوں، شاہزادوں، درباریوں اور سرکاری اہل کاروں ہی کو جگہ نہیں ملتی بلکہ اس کے دامن میں اہل حرفہ، صناعوں، علوم وفنون کے ماہروں، مذہبی عالموں، تہذیبی قدروں کو فروغ دینے والوں اور مستقبل کا حسین خواب دیکھنے والوں کو بھی جگہ ملتی ہے۔ تاریخ ہی ہمارے ماضی کو حال کا تسلسل بناتی اور آئندہ کے سمت سفر کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ ہندوستان کی آٹھ سو سالہ تاریخ کا جو ذخیرہ فارسی زبان میں محفوظ ہے اتنا بیش قیمت ہے کہ کوئی بھی ایماندار اور منصف مزاج شخص اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا۔ ہم نے اپنے مطالعے کی آسانی کے لیے تاریخ کو تین ادوار میں تقسیم کر رکھا ہے، عہد

٭

قدیم، عہد وسطیٰ اور عہد جدید۔ جس طرح قدیم ہندوستان کی تاریخ کا کامل مطالعہ سنسکرت زبان پر دسترس کے بغیر ناممکن ہے اسی طرح ہندوستان کے عہد وسطیٰ کا مکمل اور صحیح مطالعہ فارسی زبان کے علم کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ یہ مطالعہ نہ تو انگریزی میں لکھی ہوئی نسبتاً جدید کتابوں کے ذریعے ممکن ہے اور نہ ہی ان ترجموں کے ذریعے جو برطانوی تسلط کے بعد معرض وجود میں آئے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ ہندوستان کی تاریخ کے موضوع پر آٹھ سو برسوں میں جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان سب کتابوں کا ترجمہ سو دو سو برس میں بھی ممکن نہیں ہے۔ اگر بفرض محال ترجمے کو اصل کی جگہ دے بھی دی جائے تب بھی فارسی زبان میں ہمارے لیے مہارت حاصل کرنا اس وقت تک لازمی قرار پائے گا جب تک کہ ہم سارے سرمایے کا کسی ہندوستانی زبان میں ترجمہ کر کے آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ نہ کر دیں۔

عہد وسطیٰ کے ہندوستان کی تاریخ کے نہ جانے کتنے ایسے واقعات ہیں جن کا ذکر صرف فارسی کی کتابوں میں ملتا ہے۔ میں طول کلام سے بچنے کے لیے۔ یہاں صرف ایک مثال پیش کرنے پر اکتفا کروں گا۔ ابوالفضل بیہقی فارسی زبان کا ایک مشہور تاریخ نگار ہے جس نے غزنویوں کے دور کی ایک مفصل تاریخ لکھی تھی جو تیس جلدوں میں تھی۔ اس تاریخ کا جو حصہ ضائع ہونے سے بچ گیا ہے وہ سلطان مسعود غزنوی کے عہد حکومت سے بحث کرتا ہے اسی لیے اس کو تاریخ مسعودی بھی کہا جاتا ہے۔ یہ تاریخی کتاب اگرچہ ہندوستان میں بیٹھ کر نہیں لکھی گئی مگر اس میں ہندوستان پر مسعود غزنوی کے حملوں کا ذکر ہے۔ اس کتاب کے ذریعے یہ بات ہمارے علم میں آتی ہے کہ مسعود غزنوی کے ایک فوجی سردار ینال تگین نے ۴۲۱ھ (۱۰۳۰ء) میں بنارس پر بھی حملہ کیا تھا اس زمانے میں بنارس پر راجہ گنگ (ممکن ہے اصل نام گنگا داہو جس کو بیہقی نے گنگ لکھا) کی حکومت تھی میرے استاد پروفیسر نذیر احمد صاحب نے ایک مقالہ لکھنے کے سلسلے میں اس بات کی تلاش شروع کی کہ سنسکرت اور دوسری مقامی زبانوں میں اس حملے سے متعلق جو بھی مواد مل جائے اس کا بیہقی کے بیان سے تقابلی مطالعہ کر کے راجاؤں، امیروں، شہروں، قلعوں اور دریاؤں وغیرہ کے نام درست کر لیے جائیں اور ہندوستانی زبانوں میں محفوظ معلومات کا بیہقی کی تحریر سے موازنہ کر کے یہ دیکھا جائے کہ بیہقی نے کس حد تک سارے واقعات نقل کئے ہیں اور کس حد تک ان واقعات کو پوشیدہ رکھا ہے جن کا ذکر ہندوستانی ماخذوں میں محفوظ ہے۔ استاد محترم کی تلاش و جستجو کا جو نتیجہ نکلا وہ ان ہی کے الفاظ میں سن لیجئے۔

"میرا قیاس تھا کہ ہندوستان کے اس قدیم شہر (بنارس) سے متعلق سنسکرت اور یہاں کی دوسری زبانوں میں کافی مواد ملتا ہو گا لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب مجھے معلوم ہوا کہ بنارس کی تاریخ کے سلسلے میں سب سے قدیم اور قابل وثوق ماخذ تاریخ بیہقی ہی ہے"(۱)

صرف اسی ایک مثال سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اپنے قومی سرمایے یعنی عہد وسطیٰ کی تاریخ تک دسترس حاصل کرنے کے لیے ہم کس حد تک فارسی زبان کے محتاج ہیں۔

کسی قوم کی تاریخ کا خام مواد ان فرمانوں اور دفتری کاغذوں میں محفوظ رہتا ہے جو وقتاً فوقتاً جاری ہوتے رہتے ہیں۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں لاکھوں نہیں بلکہ کروڑوں فرمان جاری ہوئے جن کی زبان فارسی تھی۔ افسوس ہے کہ ہمارا دور آتے آتے فرمانوں کا بہت بڑا حصہ ضائع ہو چکا ہے اور یہ کہنا مبالغہ نہ ہو گا کہ نیشنل آرکائز، مختلف کتب خانوں اور شخصی ذخیروں میں

جو فرمان محفوظ ہیں وہ تمام فرمانوں کا صرف ہزارواں حصہ ہیں۔ ہماری بے توفیقی یہ ہے کہ ہم نہ تو ان فرمانوں کو مرتب کر پائے ہیں نہ ہی ہم نے ان کا مفصل جائزہ لے کر ان کی روشنی میں اپنے ملک کی تاریخ لکھنے کی کوشش کی ہے۔

میں یہاں پر ایک تحریر کا خاص طور سے ذکر کرنا چاہوں گا۔ جس کا فوٹو میری بھی نظر سے گذرا ہے اور جس برادری کا اس تحریر میں تذکرہ ہے اس کے بعض نوجوانوں سے اپنی نوجوانی کے زمانے میں میری بھی ملاقات رہی ہے۔ یہ تحریر کسی جاگیر کے متعلق نہیں ہے بلکہ سزا کے بارے میں ہے۔ اس تحریر سے علمی دنیا کو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے ۱۹۳۲ء میں "ہندؤں کا ایک عجیب فرقہ" کے عنوان سے معارف (۲) کے ذریعے روشناس کرایا تھا۔ شہر اعظم گڑھ میں سوناری کا پیشہ کرنے والے ایک خاندان میں یہ تحریر عکسی طور پر محفوظ ہے۔ (۳)

مذکورہ تحریر کی ۸۱۹ھ میں دہلی کے دار القضا (آج کی جج کچہری) میں رجسٹری ہوئی تھی جس کو ۸۲۲ھ میں پیسے کی تختی پر نقش کروالیا گیا تھا میری نظر سے ۱۹۵۷ یا ۱۹۵۸ء میں پیسے کی تختی نہیں بلکہ تختی کا فوٹو گذرا تھا۔ اس تحریر میں جن دوستوں کا ذکر ہے ان میں سید بادشاہوں کے خاندان کے بانی سید خضر خاں بن ملک سلیمان (۸۱۷-۸۲۲ھ) کی دہلی پر فرمانروائی تھی۔ اس پر جن قاضی صاحب کی مہر ہے ان کا نام اطیع اللہ علوی ہے اس تحریر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے کے شاہی خزانے کے خزانچی کا نام منی رام سیٹھ تھا اور دیوان دین دیال۔ اس تحریر کا خلاصہ مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف میں شائع کر دیا ہے جو یہاں نقل کیا جاتا ہے:-

"متعدد ہندو جو شاہی چوب دار تھے کسی سرکاری الزام میں ماخوذ ہوئے اور ان کو توپ سے اڑا دینے کا حکم ہوا مگر شاہی خزانچی سیٹھ منی رام نے اپنے گرو نندجی رام چوبے ساکن جونپور کے اشارے سے بادشاہ کے حضور میں ان کی سفارش کی، جو منظور ہوئی لیکن یہ حکم ہوا کہ یہ ہتھیار نہ باندھیں، زنار نہ پہنیں اور اپنا پیشہ اور قومیت بدل لیں اور سوناری کا پیشہ اختیار کریں لیکن چونکہ ان کی معافی گروجی کے ذریعے ہوئی تھی اس لیے یہ شرط ٹھہری کہ یہ لوگ گروجی کے مرید بن جائیں اور سنسکار ادا کر کے کشب گوت بن جائیں اور درگاہی کا زنار باندھیں اور نتر (؟) وکنٹھی پہنیں اور ہر شادی میں زنار بندی کے وقت مہر اور پیشہ شروع کرتے اور دوکان کھولتے وقت مہر اور ہر سال ساون سودی اکادشی میں گروجی کے نذر کیا کریں گے اور یہ معاہدہ گروجی اور ان کے مریدوں میں نسلاً بعد نسلٍ قایم رہے گا"

بھول نامہ اور بڑی بات تو ہو گی مگر اس بات کی نشاندہی ضروری ہے کہ سید صاحب مرحوم نے جس لفظ کو نتر پڑھا ہے وہ نتر نہیں منتر ہے فارسی جملہ اس طرح ہے۔ "وپس از سنسکار ہمہ رابہ کشب گوت نامیدہ زنار درگاہی و منتر و کنٹھی بمایان ارزانی فرمودند" جس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ "سنسکار کے بعد ہم سب لوگوں کو کشب گوت میں داخل کر کے درگاہی کا زنار، منتر اور کنٹھی عطا فرمائی۔" اس تحریر میں جتنے لوگوں کو سوناری کا پیشہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان سب ناموں کا لاحقہ "سنگھ" ہے ان میں سے ایک رگھو بنسی ہیں ایک سورج بنسی اور ایک گرگ بنسی بقیہ نسبتوں سے ہمارے کان نا آشنا ہیں اس لیے ہم نے ان کو نقل نہیں کیا ہے نمونہ کے طور پر صرف ایک نام درشن سنگھ انگوریا چندیل۔ یہاں پر نقل کیا جا رہا ہے۔ ان ناموں سے یہ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ یہ سارے کے سارے چوب دار چھتری رہے ہوں گے جن کو سزا کے طور پر سوناری کا پیشہ اختیار کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ آج جس خاندان میں فارسی کی یہ تحریر موجود ہے اس کے افراد فارسی زبان نہ جاننے کی وجہ سے نہ تو

اپنے اجداد سے واقف ہیں اور نہ ہی اس بات سے آشنا کہ سوناری ان کا پیشہ نہیں رہا ہے۔

صرف اسی ایک مثال سے اس کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مختلف دفتروں، کتب خانوں اور نیشنل آر کائیوز کے علاوہ مختلف خاندانوں میں عہد وسطیٰ کے جو فرمان اور تحریریں محفوظ ہیں وہ معلومات اور انکشافات کا کیسا خزانہ ہوں گی۔ افسوس ہے کہ ہم اپنی نافہمی سے خود اپنے ہاتھوں اپنا قومی ورثہ تباہ کر رہے ہیں اور ہم کو اس کا احساس تک نہیں ہے کہ ہم کیا کر رہے ہیں۔

اب میں فارسی زبان کے مطالعے کے ایک اور پہلو کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس کو میں اپنی قومی ضرورت سمجھتا ہوں۔ یہ قومی ضرورت ہے آپسی میل جول، بھائی چارا، ایک دوسرے کے مذہبی عقیدوں کا احترام، دل آزاری، کینہ توزی اور فتنہ و فساد سے گریز اور سارے انسانوں کو ایک ہی خالق کی مخلوق سمجھنا۔ آج ان چیزوں کا پرچار کرنے کے لیے لاکھوں روپیہ صرف کئے جارہے ہیں: مذاکرے ہوتے ہیں، کتابیں چھاپی جاتی ہیں رسالوں کے خاص نمبر نکالے جاتے ہیں مگر ایک دیوانے کے ہو کر دینے سے سارا شہر آگ سے روشن ہو جاتا ہے اور بستی کی بستی جل کر خاک بن جاتی ہے۔ سارے سیمنار، کتابیں، رسالے، سیانوں اور گنیوں کی باتیں، سب کو جذبات کی تیز آندھی اڑالے جاتی ہے اور ہم کو لٹی پٹی حالت میں پھر سے اپنے کام کی ابتدا کرنی ہوتی ہے۔ ہندوستان کے عہد وسطیٰ میں جب آپسی میل جول اور بھائی چارے پر نہ تو سیمنار ہوتے تھے نہ ہی سیاسی افراد کی پرزور تقریریں اس زمانے میں فارسی زبان میں آپسی میل جول اور بھائی چارے کا جو لٹریچر عالم وجود میں آیا وہ آج کی زخمی انسانیت پر مرہم کا کام دے سکتا ہے مگر شرط یہ ہے کہ کوئی اس لٹریچر سے آشنا ہونے کی کوشش تو کرے اس تک رسائی تو حاصل کرے پھر اس کو نظر آئے گا کہ جس چیز کو حاصل کرنے کے لیے لاکھوں روپیہ صرف کیے جارہے ہیں وہ تو "پریم کا دو اکھر" پڑھ کر حاصل کیا جاسکتا ہے۔ میری مراد ہندوستان کے صوفیوں کے ملفوظات اور تصوف کے موضوع پر ان کی تحریر کی ہوئی کتابوں سے ہے۔ آٹھ سو برسوں میں صرف اس ایک موضوع پر فارسی زبان میں اتنا بڑا سرمایہ فراہم ہوگیا ہے کہ اب ان کا کسی بھی ہندوستانی زبان میں ترجمہ کرنے کے لیے صدیاں درکار ہوں گی اور اگر یہ کر بھی لیا گیا تو ان صدیوں میں کاروان علم کہاں سے کہاں نکل گیا ہوگا اور ہم اس وقت بھی پیچھے کے پیچھے ہی رہیں گے۔

میں نے حاضرین کے وقت کا خیال رکھتے ہوئے اس بات کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا ہے کہ قدیم زمانے ہی سے ہمارے ملک سے فارسی بولنے والے ملکوں کے سیاسی ہی نہیں علمی تعلقات بھی تھے۔ ظہور اسلام سے پہلے ہی نجانے کتنی سنسکرت کتابوں کا ترجمہ پہلوی زبان میں ہوچکا تھا جس کو ظہور اسلام کے بعد فارسی کے قالب میں ڈھال لیا گیا۔ تفصیل میں جانے کا یہ وقت نہیں ورنہ ان تمام کتابوں کے بارے میں بھی ایک سرسری سا اشارہ کر دیا جاتا جو سنسکرت سے پہلوی میں اور بعض پہلوی سے فارسی میں منتقل ہوئیں ان میں کچھ ایسی کتابیں بھی ہیں جو اپنی اصل زبان میں ناپید ہیں مگر ترجمے کی شکل میں آج بھی محفوظ ہیں اس کے علاوہ ظہور اسلام کے بعد ہندومت کی جو مذہبی کتابیں فارسی زبان میں ترجمہ ہوئیں، جن میں مختلف رامائنیں، بھگوت گیتا، یوگ وششٹ وغیرہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں ہمارے خصوصی مطالعے کی طلب گار ہیں۔ یہ موضوع بہت وسیع ہے اور اس کے احاطے کے لیے خاصہ وقت درکار ہے اس لیے اس قصے کو یہیں ختم کرکے آگے بڑھا جاتا ہے۔ . .

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۳ء

میں نے ابتداء میں عرض کیا تھا کہ فارسی زبان کا مطالعہ ہماری تہذیبی ضرورت بھی ہے۔ اب میں اپنے اس جملے کی تھوڑی سی تفصیل آپ کے سامنے پیش کرنا چاہتا ہوں ہماری تہذیب جن عناصر کا مرکب ہے ان میں محسوس اور غیر محسوس دونوں ہی طریقے سے فارسی کی جلوہ گری نمایاں نظر آتی ہے، چاہے ہمارا فن تعمیر ہو چاہے مصوری اور موسیقی ہو یا ادب، ہندوستانی زبانیں ہوں یا بولیاں، رسمیات کی اصطلاحیں ہوں یا کھانوں اور چیزوں کے نام غرض کہ تہذیب کا وہ کون سا عنصر ہے جس پر فارسی کا اثر نمایاں نہیں ہے۔ ہندوستانی زبانوں میں اردو سے قطع نظر صرف آریائی زبانیں ہی نہیں دراوڑی زبانوں نے بھی فارسی کا نہ صرف اثر قبول کیا ہے بلکہ اس کے بہت سے الفاظ کو تھوڑے سے تغیر کے ساتھ اس طرح اپنا لیا ہے کہ وہ الفاظ اس زبان کے اپنے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ آج کے ہندی اخباروں پر بھی یہ اثر نمایاں نظر آتا ہے آوارہ گردی، بد معاشی، آگ زنی جیسے الفاظ ہندی اخباروں میں بہ کثرت استعمال ہو رہے ہیں۔ صرف اسی مثال سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہماری قومی زبان بھی فارسی کے اثر سے عاری نہیں ہے یہ عمل صرف اس لیے ہو رہا ہے کہ ہندی ایک زندہ زبان ہے جو ارتقا کی راہوں پر گامزن ہے وہ دوسری زبانوں سے الفاظ لے کر اپنے ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ کر رہی ہے۔ زبانوں کے سلسلے میں یہ ایک فطری عمل ہے اور اس فطری عمل کو آج تک نادانی اور تعصب کی کوئی آندھی اڑانے جانے میں نہ تو کامیاب ہوئی ہے اور نہ ہی آئندہ کامیاب ہو گی۔ تہذیب کا ایک لازمی عنصر ادب بھی ہوتا ہے۔ ہندوستانی زبانوں کا ادب جس طرح فارسی زبان سے متاثر ہوا ہے وہ بجائے خود ایک ایسی مثال ہے جس کی نظیر دنیا بھر میں ڈھونڈنے کے بعد کم ہی ملے گی۔ مثال کے طور پر غزل ہی کو لے لیجیے فارسی کے اثر سے یہ صنف اردو میں آئی اور اس کی دل پذیری، جامعیت، رقت، سوز و گداز اور اثر انگیزی کو مد نظر رکھتے ہوئے دوسری ہندوستانی زبانوں بالخصوص گجراتی، پنجابی، ہندی وغیرہ میں بھی غزل لکھی جانے لگی ہے اور حیرت کی بات یہ ہے کہ شاعری کی اس صنف کے لیے پنگل کی نہیں عروض کی پابندی کی جاتی ہے یعنی مذکورہ زبانوں میں فارسی بحروں میں غزل لکھی جا رہی ہے۔ اس طرح یہ زبانیں ایک نئے تجربے سے دوچار ہو کر اپنے ادب کو وسیع تر بنا رہی ہیں۔

یہ موضوع اتنا وسیع ہے کہ اس پر کسی ایک نشست میں اظہار خیال ممکن نہیں میں نے چند اچٹتے سے اشارے کر دیئے ہیں ورنہ کہنے کے لیے ابھی بہت کچھ باقی ہے ابھی تک جو کچھ عرض کیا گیا اس سے بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا کہ فارسی زبان کا مطالعہ ہم ہندوستانیوں کی قومی اور تہذیبی ضرورت ہے۔ اس سے صرف نظر کرنا خود اپنی قومی اور تہذیبی ضرورت سے صرف نظر کرنے کے مترادف ہے۔ امید ہے کہ میری آواز صدا بہ صحرا نہ ثابت ہو گی اور بنارس ہندو یونیورسٹی کے شعبۂ فارسی کی طرف سے اس کام کا آغاز ہو گا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔

حواشی

(۱) تاریخی اور علمی مقالات، مترجم - کبیر احمد جائسی، مکتبہ برہان دہلی ۱۹۷۶ء - ص ۶ (۲)۔ نمبر ۱ ج ۲۰ (جولائی ۱۹۳۷) ص ۵-۷ (۳) شہر اعظم گڑھ میں جو سڑک پرانی کوتوالی سے جامع مسجد کی طرف جاتی ہے اس پر استاد فقیر چند کی دوکان کے پیچھے اس خاندان کا مکان ۱۹۱۰ء تک موجود تھا۔ پتہ نہیں اس کے افراد اب بھی وہیں ہیں یا کہیں اور چلے گئے۔

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۳ء

پروفیسر سعید الظفر چغتائی •

سیّد احمد خاں اور ہمارے نوجوان

سید احمد خاں کی بہت باتوں سے ان کے زمانے سے لے کر اب تک بہتوں کو اختلاف رہا ہے اور اب بھی ہے۔ مگر ان کے کارنامے اتنے ہیں اور وہ ان کے مستقبل یعنی ہمارے پچھلے سو برسوں پر اتنے اثر انداز ہوئے ہیں کہ ابھی حال میں انگلستان سے Islamic Fundamentalism پر اپنے تحقیقی مقالہ میں یوسف شوری نے بھی ہندوستانی اسلام کے ضمن میں ان کی تعلیمی کوششوں کا ذکر کیا ہے، حالانکہ عرب دانش ور انھیں پسند نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ان کی دوستی نے انگریز استعمار کے ہاتھ مضبوط کیے تھے۔

سید احمد خاں نے غیر معمولی طور پر زرخیز دماغ پایا تھا، جس سے نت نئی بات نکلتی تھی اور ان کی عملی صلاحیت ہر بات کو عملی شکل دینے میں لگ جاتی تھی۔ یہ دونوں بڑی خوبیاں ہیں۔ مگر ان میں سب سے بڑی خوبی یہ کہ انھیں مختلف کاموں اور معاملوں میں توازن، اولیت اور ترتیب کا بڑا شعور تھا۔ وہ جس کام کو زیادہ اہم اور دور رس سمجھتے، ضرورت پڑتی تو اس پر کم اہم اگرچہ اتنے ہی عزیز منصوبے کو قربان کر دیتے۔ مدرستہ العلوم اور اینگلو محمڈن کالج کو فروغ دینے کی خاطر ایک طرف مذہبی مسلمانوں کی یورش اور دوسری طرف انگریزوں کے ممکن عتاب سے بچنے کی خاطر انھوں نے ہندوستانی یا ہندی مسلمانوں کی سماجی تہذیب، اردو زبان اور رائج مذہبی روایات کی اصلاح جیسی تجویزوں کو پس پشت ڈال دیا یا ان سے منہ موڑ لیا۔ جو شخص زندگی میں کامیاب ہونا اور کچھ کر گذرنا چاہے اس کے لیے یہ حکمت عملی Pragmatism ضروری ہے۔

سید احمد خاں ہندوستانیوں اور مسلمانوں دونوں کی بھلائی چاہتے تھے۔ مگر ان کا رویہ جذبی صاحب کے تجزیے کے مطابق یہ تھا کہ ہندی مسلمانوں کی بھلائی مقدم ہے۔ اگر یہ ہندوستانیوں کے عام مفاد سے ٹکراتی تو اکثریت کا فائدہ نقصان دیکھنا ان کا کام نہ تھا۔ کچھ لوگ کہیں گے کہ یہ بات وسیع النظری کے اس اصول کے خلاف ہے کہ وسیع تناظر میں معاشرے کی بھلائی سے اس کے اجزاء کی بھلائی خود بخود نکل آتی ہے۔ اس لیے سید احمد خاں کو ہندوستانیوں کے مجموعی مفاد کے لیے کوشش کرنی چاہیے تھی مگر اس طرح کہ ہندی مسلمانوں کا مفاد مجروح نہ ہو۔ لیکن عملی زندگی کے تقاضے

• صدر شعبہ فزکس، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مثالیت کی تائید نہیں کرتے اور علی محمد خسرو کے بہ قول ہر شخص کی اپنی شخصیت اور اپنا انداز فکر ہوتا ہے۔ میں اس بات کو بھی قابل غور سمجھتا ہوں کہ سید احمد خاں نے ہندوستان کے باہر کے مسلمانوں کے مسئلوں میں کوئی عملی یا جذباتی دلچسپی نہیں لی۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ذو بتی انیسویں صدی میں ہندوستان ہی کے اپنے کم نہ تھے اور مشرق وسطی کی حالت نہ اتنی بری تھی اور نہ اس کی خبریں ہم تک اتنی پہنچتی تھیں، جتنی شروع بیسویں صدی میں مولانا محمد علی اور ان کے ساتھیوں تک پہنچنے لگیں۔

سید احمد خاں وسیع القلب اور دور اندیش تھے۔ انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے لیے مدرسہ اور کالج کھولا، مگر اس کے دروازے غیر مسلموں یا خود مسلمانوں کے کسی طبقے پر بند نہیں کیے۔ وہ جانتے تھے کہ بند پانی گندلا جاتا ہے اور طالب علموں کا فائدہ اچھے استاد رکھنے میں ہے۔ چاہے ان کا مذہب اور رنگ روپ کچھ بھی ہو۔ ہم آج اسی کالج کے استاد جادو رائے چکرورتی کو بھول گئے ہیں، جن کی کتاب آدھی صدی تک حساب Arithmetic کا حرف آخر سمجھی جاتی رہی ہے اور اس کے زیر اثر علم الحساب کو لوگ چکرورتی کہنے لگے تھے۔ سید احمد خاں ہندوستانی، خاص طور پر ہندوستان کے مسلمان، معاشرے میں سائنسی مزاج پیدا کرنا چاہتے تھے۔ جو انصاف پسندی اور حق پرستی کا نام ہے اور حالات حاضرہ سے باخبر رہنے کا۔ یہ سچائی کی مسلسل اور بقول سعدی ع - یہ یک دم منافقانہ نشیں در کمند خوش (ایک لمحہ خود اپنی تاک میں دشمن کی طرح بیٹھو!) سے بنتا ہے۔ انسان نے ہمیشہ کوشش کی ہے کہ جو نظر اور تجربے میں آئے، اس کو نتیجے اور سبب کی منطقی کڑی میں پرو دے۔ جو جو وقت گذرتا گیا۔ نت نئے مشاہدے ہوتے رہے اور پچھلے خیالوں میں سے بعض کی تصدیق، بعض کی اصلاح اور کچھ کی تردید ہوتی گئی۔ کھلے ذہن نے نئی اور پرانی دونوں باتوں کو پرکھا اور جسے معقول پایا مان لیا۔ احادیث کا سب سے معتبر مجموعہ "صحیح مسلم" جس جملہ سے شروع ہوتا ہے: "انسان کے اسلام کا حسن اس کے بے معنی کو چھوڑ کے با معنی اختیار کر لینے میں ہے"۔ وہ اسی معقولیت کی تعلیم دیتا ہے۔ مگر ہمارا ذہن قدامت پسند واقع ہوا ہے اور کوئی رائج بات غلط ہو جائے تو ہمیں اس کا بڑا ملال ہوتا ہے اور ہم مرحوم خیالات کو دفن کرنے پر مشکل سے تیار ہوتے ہیں۔ "ابطال حرکت زمین" وغیرہ لکھتے وقت سید احمد خاں کا بھی یہی حال تھا۔ مگر غالب کی تنقید نے انہیں چونکا دیا اور وہ خواب خرگوش سے جاگ کے حال کے تقاضوں، امکانات اور اچھے پہلوؤں کو سمجھنے اور ایسے خلوص سے اپنانے لگے کہ بہتوں نے اسے غلو یا مرعوبیت سے تعبیر کیا۔

سید احمد خاں جوانی ہی سے طباع، خلاق دماغ کے مالک اور کر گذرنے والے تھے۔ لیکن ان کے بڑے کارنامے ریٹائرمنٹ کے بعد شروع ہوئے، جس سے ڈر کے آج بھی ہم میں سے بہتیرے برسوں پہلے اپنی فعالیت کھونے لگتے ہیں اور ظفر کے نام جوش کا شعر یاد دلاتے ہیں۔ ع

یک مشت اجل کو جان دینا خوشتر ... مرتا ہے بہ اقساط، یہ کیا کرتا ہے

سید احمد کا اسوہ ہمیں برابر تلقین کرتا رہے گا کہ جو جو عمر بڑھتی جاتی ہے نت نئے تجربوں کی بنا پر ذہن زیادہ پختہ اور انسان کو اچھے سے اچھے اور اونچے سے اونچے کارناموں کا اہل بناتا جاتا ہے۔ اپنی صلاحیتوں کی پوری طرح استعمال کرنے کا موقع مرتے دم تک رہتا ہے۔ اور زیادہ سے زیادہ جسم کا زوال ذہن کا کمال بن سکتا ہے جیسے انیس نے کہا ہے۔

گھٹا زور، مشق سخن بڑھ گئی ... ضعیفی نے ہم کو جواں کر دیا

سید احمد خاں اس اعتبار سے بھی بڑے سائنسی مزاج کے مالک تھے کہ وہ حقیقت پسند ہمیشہ سے تھے۔ جو ہے سو ہے،

ہمیں اس سے خوشی ہو یا غم، اس کا وجود تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ یہی نہیں، اس کے اچھے پہلو سمجھو اور ان سے فائدہ اٹھاؤ۔ پھر عمر رفتہ تک پہنچتے پہنچتے وہ دوسروں کے اچھے پہلو اختیار کرنے اور اپنی برائیاں بین بین کے، دور کرنے کے قائل ہو گئے یہ خود نگری اور انصاف پسندی آج بھی ہم میں سے بہتوں کو نصیب نہیں۔ سماجی اصلاح کا خیال ان کی مخلص طبیعت میں اسی پیوست تھا جیسے کہ سماجی بہتری کے دوسرے تصورات۔ اور اس معاملے میں تہذیب الاخلاق کے مضامین جس صاف گوئی کے مظہر ہیں وہ اسی لیے تھی۔ مگر، مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر، ہوا آخر میں یہ کہ ہم نے اپنی اصلاح تو نہ کی، اور آج تک بغلیں بجاتے رہتے ہیں۔ پس غریب سید کو کالج کی خاطر اپنی زبان قلم بند کر لینی پڑی۔ آج ہم ان کا یادگار رسالہ برسوں سے پھر نکال رہے ہیں، ہمارا فرض ہے کہ تہذیب الاخلاق کے اصل مضامین موضوع وار جمع کر کے الگ الگ جلدوں میں چھاپیں اور لوگوں تک پہنچائیں۔ ان کی افادیت آج بھی ہے۔

سید احمد خاں کی تفسیر ہم میں سے بہت کم نے پڑھی ہے۔ مفسر قرآن مولانا عبدالماجد دریابادی نے پڑھی تھی اور اگرچہ تعریف یا تنقید تو نہیں کی، مگر کبھی کبھی اس کا ذکر ضرور کرتے تھے۔ میں چاہوں گا کہ آج ہمارا بالغ نظر علم دوست اور حق پسند طبقہ اسے غور سے پڑھے اور اس میں سے کام کی باتیں نکال لائے۔ ہمیں اتفاق ہو یا اختلاف پوری کتاب سے نہیں ہو سکتا، اور نکتہ بہ نکتہ، مرکز بہ مرکز مطالعہ کم از کم ہمیں اس سنجیدگی اور خلوص کا سبق ضرور دے گا۔ جو اس کتاب کی تصنیف میں کارفرما تھا۔

سید احمد خاں کی علی گڑھ تحریک پہلے دن سے ہی، بھرپور تعاون اور شدید مخالفت دونوں کا مرکز رہی ہے۔ لیکن سید احمد خاں اور ان کے رفیقوں اور سر راس مسعود جیسے جانشینوں نے ادارے کے مفاد کو بہر حال مقدم رکھا۔ تفصیل بدلتی رہی ہے مگر ہمارے حالات کی نوعیت آج بھی ویسی ہی ہے۔ ع حکایتیں بھی بہت ہیں شکایتیں بھی بہت مگر حق بات یہ ہے کہ ادارے کی ترقی رکی نہیں۔ چند برس پہلے سید حامد نے کہا تھا۔ آج کی دنیا میں جو کمپیوٹر کا استعمال نہیں کر سکتا، بہت جلد بے ہنر اسمجھا جانے لگے گا۔ ہمیں پوری یونیورسٹی کو یعنی کتب خانوں، دفاتر، حسابات سب کو کمپیوٹر کے ضابطے میں لے آنے کی منزل تک جا پہنچنا ہے۔ ورنہ دنیا کے کسی ترقی یافتہ ملک جانے کا اتفاق ہوا تو ہم اور ہمارے طلبہ نہ مشین سے ٹکٹ خرید سکیں گے اور نہ بینک سے نقد نکال سکیں گے۔ خوشی کی بات ہے کہ ہم سست قدم ہیں مگر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ان قدموں کو ابھی بہت تیز ہونا ہے۔

سید احمد خاں کی تحریک ۱۲۰ سال سے جاری ہے اس کے نتیجے میں ہندوستان کی تعلیمی، فکری اور سماجی سطح پر بڑے اثر پڑے ہیں، لیکن سید کے خواب کی پوری تعبیر ابھی نہیں نکلی ہے۔ ہماری نسل نے بھی اپنے ظرف اور حوصلے کے مطابق کچھ کیا اور ابھی چند برس کچھ نہ کچھ کرتے ہی رہیں گے۔ لیکن زمانے کی باگ ڈور نوجوانوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس ادارے اور اس سے وابستہ تصورات کی بھی ہے۔ اس ادارے کا نام دنیا کے مسلمانوں کے نام سے وابستہ ہے ہمارا فرض ہے کہ سے برابر اونچا اٹھاتے رہیں اور عالمی علمی برادری میں بلند ترین درجوں پر پہنچا کے دم لیں۔ ظاہر ہے کہ وہ منزل ابھی دور ہے۔ مگر ہمت اور خلوص کے ساتھ "کرنے اور مر مر کر بھر نبھانے" کا حوصلہ مجھے امید ہے کہ نوجوان ہم سے زیادہ کریں گے۔

محمد رشید شیروانی *

"علم حاصل کرو گہوارے سے قبر تک"

اسلام کے چند ارشادات اور احکامات کے بارے میں اپنے تاثرات پیش کرنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

"طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم و مسلمۃ" یعنی علم حاصل کرنا فرض ہے تمام مسلم مردوں اور تمام مسلم عورتوں پر۔ تمام یعنی ہر ایک۔ گویا کوئی مسلمان اس فرض سے مستثنیٰ نہیں۔ ہر ایک مسلمان پر علم حاصل کرنا فرض کیا گیا۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ آج سے ایک ہزار چار سو برس پہلے جب امریکہ "دریافت" نہیں ہوا تھا جب یورپ میں بھی تعلیم نسواں کا تصور نہیں تھا ہر ایک مسلم عورت پر بھی تعلیم حاصل کرنا اسی طرح فرض کیا گیا، جس طرح مرد پر۔

ایک اور ارشاد ہے "اطلبوا العلم من المہد الی اللحد" یعنی علم حاصل کرو گہوارے سے قبر تک۔ "قبر میں تو آدمی مرنے کے چار چھ یا آٹھ دس گھنٹے کے بعد جاتا ہے یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ مرتے دم تک علم حاصل کرو۔ مرنے سے پہلے آدمی عموماً بستر مرگ پر لیٹ جاتا ہے، مرض الموت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ جب تک صحتمند رہو علم حاصل کرتے رہو۔ بڑھاپے میں حواس جواب دینے لگتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا تھا کہ بچپن اور جوانی میں علم حاصل کر لو۔ جوانی میں آدمی حصول معاش میں لگ جاتا ہے۔ صبح سے شام تک کام اور محنت کرتا ہے اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے دو پیسے کماتا ہے۔ پھر دوا علاج اور نہ جانے کیا کیا جھگڑے ٹنٹے لگے رہتے ہیں۔ کسے فرصت ملتی ہے کہ بیٹھ کر علم حاصل کرے؟ اس لیے کہا جاسکتا تھا کہ بچپن میں یا نوجوانی میں علم حاصل کر ڈالو۔ لیکن نہیں۔ کسی عمر میں، کسی حالت میں اس فرض سے سبکدوشی نہیں۔ حکم ہوا ہے کہ علم حاصل کرتے جاؤ۔ مسلسل کرتے جاؤ۔

یہ بات، ذرا سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ہم سمجھ سکتے تھے، ہم سوچ سکتے تھے کہ ہم نے ۱۹۵۵ء میں ایم۔اے پاس کر لیا، ہم ماسٹر آف آرٹس ہو گئے۔ بس اب اور زیادہ علم حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے حکم ہوا ہے کہ قبر تک علم حاصل کرو۔ اس بات کی گہرائی میں جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر ہم نے ۱۹۵۵ء میں ایم۔اے کر لیا اور اس وقت تک کے بین الاقوامی تعلقات اور عالمی سیاسی واقعات کا مطالعہ کر لیا۔ دستور ہند کی ہر ہر دفعہ کے بارے میں، ہر ایک ماہر سیاسیات کا تجزیہ پڑھ

---

*A-12 کناٹ پلیس، نئی دہلی 110001

لیا۔ اس وقت تک کے ہر ایک اہم سیاسی مفکر کی تھیوری پڑھ ڈالی۔ اس وقت تک کے انٹر نیشنل لا کو ازبر کر لیا اور انٹر نیشنل کورٹ آف جسٹس کے تمام فیصلے دیکھ ڈالے اور سمجھ لیا کہ ہم فارغ التحصیل ہو گئے۔ پھر بھی ہم آج باعلم نہیں کیونکہ تب سے اب تک دنیا نہ جانے کہاں سے کہاں پہونچ گئی، بھارت کے آئین میں پچاس ترمیمیں ہو گئیں، انٹر نیشنل لا کے نئے مسائل پیدا ہو گئے۔ بین الاقوامی تعلقات میں نہ جانے کتنے انقلابات آچکے، پرانی سیاسی تھیوریاں رد ہو چکیں اور ان کی جگہ نئی تھیوریاں آزمائی جا رہی ہیں اس لیے ہم باعلم نہیں رہ سکتے اگر ہم مسلسل اور مستقل علم حاصل نہ کرتے رہیں گویا علم کا تصور جو ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہے وہ یہ ہے کہ علم جدید اور بالکل اپ ٹو ڈیٹ ہونا چاہیے۔ اسی لیے فرمایا کہ علم حاصل کرنا کبھی نہ چھوڑو۔ حدیہ کہ قبر میں پہونچنے تک علم حاصل کرنا چاہیے۔ یہ ہے وہ تصور جو ایک ہزار چار سو سال کے بعد بھی جدید ترین، تازہ ترین ہے۔

اب کچھ نام نہاد مولویوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ علم سے مراد دنیاوی علم نہیں بلکہ دینی علم ہے۔ اس بات کی تردید عقل سے بھی کی جا سکتی ہے۔ لیکن عقلی دلیلوں اور بحث کی ضرورت بھی نہ رہی کیونکہ ایک اور ارشاد ہوا "اطلبوا العلم ولو کان فی الصین" یعنی علم حاصل کرو چاہے چین جانا پڑے۔ اگر علم سے مراد صرف علم دین ہو تو چین جانے کی تلقین کیوں کی گئی؟ چین میں تب تک دین اسلام پہنچا ہی نہ تھا اس لیے ظاہر ہے علم سے مراد ہے علم دنیا۔ کیونکہ اس وقت چین میں کسی مسلمان کو دینی علم ملنے کا کوئی سوال ہی نہ تھا۔

آج چین جانا بہت آسان ہے لیکن غور کیجیے کہ آج سے ایک ہزار چار سو برس پہلے حجاز سے چین جانے کا کیا مطلب تھا۔ مہینوں کا سفر، راستے پر خطر، ڈاک تار ندارد۔ اگر کوئی چین جائے تو اپنے عزیزوں، اقارب سے اس کے تمام رابطے ختم۔ جانے وہ واپس بھی آئے گا یا نہیں! گویا علم حاصل کرنے کے لیے اپنے پیاروں کو چھوڑے زندگی اور موت سے کھیلے۔

کیا قیامت ہے کہ جس مذہب نے سب سے زیادہ وضاحت اور شدت کے ساتھ علم حاصل کرنے کی تلقین کی اپنے آپ کو اسی مذہب کا پیرو کہنے والے آج تعلیم میں سب سے پیچھے ہیں۔ اپنی تاریکی کو اپنی جہالت کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی *

رابی کی نصیحت

"اپنے مذہب کو سینے سے لگائے رکھنا اپنی مادری زبان کبھی نہ چھوڑنا اور کوئی ہنر ضرور سیکھنا"۔ (رابی)

رابی چند منٹ میں تم زندہ درگور کیے جانے والے ہو اس لیے تمہارا نوجوانوں کے لیے کیا پیغام ہے۔ بوڑھے مذہبی رہنما نے یہودی نوجوان کے ذریعہ وہ پیغام دیا جو یہودی قوم کے لیے مشعل راہ ہے۔ یہودیوں کو یورپ میں جس قتل و غارت گری اور تباہی سے گذرنا پڑا اس کا تصور بھی مشکل ہے۔ ویانا (Viena) میں یہودیوں کو ایک بڑے گڑھے میں ڈھکیلا جا رہا تھا ایک نوجوان دوڑتا ہوا آیا اور اس نے اپنے مذہبی عالم (رابی) سے کہا کہ بس پندرہ منٹ میں تم اس گڑھے میں ڈھکیل دیے جاؤ گے۔ ہمیں کوئی نصیحت کرو، اس پر اس نے تین باتیں کہیں، (۱) مذہب کو سینے سے لگائے رہو (۲) مادری زبان کسی قیمت پر نہ چھوڑنا اور (۳) کوئی ایک ہنر سیکھ لینا۔ آج یہودی ساری دنیا پر حکمرانی کر رہے ہیں۔ ذرائع ابلاغ ہو یا سائنس اور ریسرچ کی دنیا۔ لٹریچر ہو یا تجارت بینکنگ ہو یا صنعتی کارخانے، نوبل انعامات ہوں یا قوموں کو یرغمال بنانے کی مہم۔ ہر مسئلہ میں وہ پیش پیش ہیں بلکہ ان کا مکمل کنٹرول ہے۔ اس واقعہ میں دنیا کی کسی قوم کے لیے بڑا سبق ہے۔ ایک یہودی ماسکو سے ترک سکونت کر کے یروشلم آتا ہے اور عبرانی زبان کو زندہ کر دیتا ہے جو تقریباً مردہ ہو چکی تھی۔ لاکھوں یہودی اپنے ملکوں سے بے دخل کر دیے گئے، تہہ تیغ کر دیے گئے۔ ان پر عرصہ حیات تنگ ہو گیا ایک مرتبہ پھر خاک سے اٹھے اور زندگی کی دوڑ میں سب سے آگے نکل گئے اگر ایک مبغوض قوم اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتی ہے اور ذلت ہزاروں سال کی زنجیریں توڑ سکتے ہیں تو مسلمان جو انبیاء کرام کے نائب اور ہزاروں سال کی تاریخ رکھتے ہیں اور خدا کے محبوب کی امت سے ہیں وہ محکومی کا زہر پینے پر کیسے مجبور کئے جا سکتے ہیں۔ ان کا دین، ان کی تہذیب، ان کی مادری زبان، ان کے جیتے جی ان سے کیسے چھینی جا سکتی ہے۔ مسلمانوں کو صرف اپنی روٹی روزی کے لیے دوسروں کا طوق غلامی پہننے کے لیے کیسے آمادہ کیا جا سکتا ہے وہ بے

---

* کرامت منزل، اکبری گیٹ، لکھنؤ

زبان جانوروں کی صف میں کیسے کھڑے ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنی عزت وحمیت کا سودا کر کے اپنا سر دوسروں کے قدموں میں کیسے ڈال سکتے ہیں۔

چالیس پچاس برس قوموں کی زندگی میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔ ہزاروں سال کی خاموشی کے بعد پہاڑوں سے دریا اور چشمے ابلنے لگتے ہیں، آتش فشاں پہاڑ زمین کی گود سے سینکڑوں معدنیات اور جواہرات باہر نکال دیتے ہیں۔ ریگستان لہلہاتے میدانوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ مسلمانوں نے قرآن مجید کی دولت اپنے سینوں میں محفوظ کر رکھی ہے۔ اس کی وسعت و قوت پہاڑوں اور دریاؤں سے کہیں زیادہ طاقتور اور وسیع ہے۔ سارا مسئلہ اس کے استعمال کا ہے۔ جس قدر جلد یہ حقیقت ہمارے دماغوں کی دبیز تہوں کو چھو لیگی زندگی میں نمو کے آثار شروع ہو جائیں گے۔

ہمدرد ٹیلنٹ سرچ اسکیم کے قرض وظائف کا اعلان

سالہائے گزشتہ کی طرح اس سال بھی ہمدرد ٹیلنٹ سرچ اسکیم کے تحت ملک گیر پیمانے پر تشہیری کی گئی۔ کل ۲۰۹ درخواستیں وصول ہوئیں۔ ان میں سے ۳۲ باصلاحیت طلباء و طالبات کو ان کے تعلیمی ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے ۲۷، ۲۸/ ۱ اکتوبر ۱۹۹۴ء کو تحریری امتحان اور انٹرویو کے لیے مدعو کیا گیا۔

انٹرویو بورڈ نے مندرجہ ذیل ۱۷ طلبا و طالبات کو تعلیمی سال ۱۹۹۵ء کے لیے قرض وظائف و بک گرانٹ منظور کرنے کی سفارش کی۔ بک گرانٹ کی رقم دو ہزار روپیہ فی طالب علم ہے۔

اسکالرشپ

(۱) فیروز اشرف۔ پٹنہ۔ بہار (۲) راشد عزیز۔ علی گڑھ۔ اترپردیش (۳) مس زرینہ بیگم۔ مدلیر مٹھ۔ پانڈے چیری (۴) ٹیلر محمدی۔ احمد آباد۔ گجرات (۵) جنیدی عبد المقیم۔ لاتور۔ مہاراشٹر (۶) منصور بخش۔ بھی پاڑہ۔ اڑیسہ (۷) این منصور علی خاں۔ بیری یار۔ تامل ناڈو (۸) عبد الرحمن پردھانی۔ ترجولی۔ اروناچل پردیش (۹) مس عزیز فاطمہ۔ حیدر آباد۔ آندھرا پردیش (۱۰) امداد الاسلام۔ جورہٹ۔ آسام (۱۱) معین اختر۔ کامپٹی۔ مہاراشٹر (۱۲) محمد زاہد۔ اسلام پور۔ مغربی بنگال

بک گرانٹ

(۱) شاداب الحق۔ فراشخانہ۔ دہلی (۲) انیس احمد۔ بلڈانہ۔ مہاراشٹر (۳) نہوا کر انیس کریم۔ فاسٹے۔ مہاراشٹر (۴) پیرزادہ محمد امین۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ۔ دہلی (۵) انصاری شفیق احمد۔ پونا۔ مہاراشٹر

سکریٹری ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی

محمد اسحاق *

انگریزی زبان کی اہمیت

ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ہی بہت زور شور سے یہ ہوا چلی کہ انگریزی زبان کو بھی انگریزوں کی حکومت کے ساتھ دیش نکالا ہونا چاہیے۔ چند سیاسی جماعتیں، خصوصاً ہندی پریمی اس مہم میں آگے آگے تھے۔ ۱۹۵۲ء کے لگ بھگ مولانا عبد الماجد دریابادی مرحوم نے اپنے ہفتہ وار "صدق جدید" میں ایک واقعہ کا تذکرہ کیا تھا۔ ہوا یہ کہ ایک دن ہندی پریمیوں کا ایک ڈیلیگیشن ہندوستان کے مشہور روڑ کی انجینیرنگ کالج کے پرنسپل کے پاس پہنچا اور مطالبہ کیا کہ وہ اپنے کالج میں جلد سے جلد بجائے انگریزی میڈیم کے، ہندی میڈیم لاگو کر دیں۔ کالج کے پرنسپل ان کی باتوں کو خاموشی سے کچھ دیر تک سنتے رہے، پھر ان سب کو کالج کے لائبریری ہال میں لے گئے جہاں پر فن انجینیرنگ پر لکھی ہوئی ہزاروں کتابیں فرش سے چھت تک الماریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ پرنسپل نے کہا دیکھئے آپ ان سب کتابوں کا ہندی میں ترجمہ کر ڈالیے تو پھر ہم ہندی زبان میں تعلیم شروع کر سکتے ہیں لیکن یاد رکھئے ان سب کا ترجمہ کرنے تک آپ کو کم از کم پچاس برس لگ جائیں گے اور اس مدت میں اسی ایک فن پر دوگنی تگنی کتابیں انگریزی میں آجائیں گی۔ ہندی پریمی ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہوئے کالج سے نکل گئے۔

اٹھارویں صدی سے لے کر بیسویں صدی کے نصف دہے تک تقریباً دو سو سال انگریزوں کی حکومت دنیا کے ہر خطہ پر چھا گئی تھی۔ حکومت اور حاکم کی زبان کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ حکومت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان بھی ان ملکوں میں پھیل گئی چونکہ حکومت کے کل پرزوں کو چلانے کے لیے انگریزی زبان سے واقفیت ضروری تھی۔ وہ لوگ معاشی لحاظ سے بہت فائدے میں رہے جنھوں نے اس زبان کو جلد سیکھ لیا۔ آج ہر ملک میں انگریزی سماجی مرتبہ، عزت و وقار کی زبان ہی نہیں بلکہ روپیہ اور طاقت (MONEY AND POWER) کی زبان ہو چکی ہے۔ انگریزوں کے جاتے ہی اکثر کا خیال تھا کہ ہندوستان میں انگریزی کا خاتمہ ہو جائے گا کیوں کہ ساری صوبائی زبانیں انگڑائی لے کر اٹھ کھڑی ہو گئیں۔ یہ ایک زمانہ تک

---

* سابق پرنسپل کالج آف ایجوکیشن بازار گارڈ، حیدر آباد

گو کہ تھیں سب ایک ساتھ بولنے لگیں ہندی قومی اور رابطہ کی زبان ہونے کے باوجود انگریزی زبان کی مقبولیت پر روک لگانے میں آج ۴۵ برس بعد بھی ناکام رہی ۔ بلکہ انگریزی زبان کی اہمیت اور بھی بڑھتی ہی جارہی ہے ۔اس کی چند معقول وجوہات ہیں ۔

(۱) آج کوئی اعلیٰ فنی اور پیشہ ورانہ کورس ایسا نہیں ہے جو ہندی یا کسی صوبائی زبان کے سہارے چل سکے ۔ صوبائی زبانوں میں ادب ، شعر و شاعری ،افسانہ و ناول کے سوا کسی مضمون کی فنی کتابیں نہ ہونے کے برابر ہیں ۔ریاضی ،فزکس ، کیمسٹری ، میڈیسن ،بزنس ،الکٹرونکس ،ماحولیات ،مواصلات ، کمپیوٹر ٹکنالوجی جیسے سینکڑوں کورسس سے متعلق مقامی زبانوں میں کوئی ایک معیاری کتاب کا ملنا دشوار ہے ۔

(۲) انگریزی زبان میں صرف ۲۶ حروف تہجی(ALPHABETS)ہیں جو اور زبانوں کے مقابلہ میں سب سے کم ہیں اردو میں ۳۷ ، تلگو میں ۵۴ حرف تہجی ہیں ۔طلبہ انگریزی زبان کے حروف تہجی جس آسانی اور روانی کے ساتھ سناتے ہیں وہ کسی اور زبان کے طلبہ کے لیے آسان نہیں ،ان ہی ۲۶ حروف کی مدد سے دو لاکھ پچاس ہزار الفاظ کا ذخیرہ انگریزی زبان میں موجود ہے ۔الفاظ کی اتنی بھاری تعداد کسی اور زبان میں موجود نہیں ۔انگریزی زبان میں اردو ،فارسی ،عربی کی طرح حروف کے کچھ حصوں کو ملا کر الفاظ بنتے ہیں لیکن انگریزی میں الگ الگ حروف کو یکجا کرنے سے الفاظ بنتے ہیں جو بہت آسان ہے ۔

(۳) ساری دنیا میں چند ممالک ایسے بھی ہیں جو اپنی زبان کی بڑی حفاظت کرتے ہیں ۔جاپان ،روس ،فرانس ،جرمنی وغیرہ میں اعلیٰ تعلیم بھی اپنے ملک کی زبانوں میں دی جاتی ہے ۔ لیکن ان کے ہاں انگریزی زبان کے سرمایہ سے استفادہ کے لیے ایک زبردست مشینری کام کرتی رہتی ہے ۔دنیا کے سارے ایشیائی اور یوروپی ممالک اپنے انتظامیہ(MANAGEMENT)میں کام کرنے والوں کو ہر سال انگلینڈ بھیجتے رہتے ہیں تاکہ وہ وہاں ENGLISH - LANGUAGE - TEACHING - CENTERS میں شریک ہو کر انگریزی زبان میں تحریر و تقریر اور بول چال میں مہارت حاصل کرسکیں ۔

(۴) دنیا کی کسی زبان میں کوئی اچھی کتاب ،افسانہ ،ناول ، کوئی تحقیقی مضمون شائع ہو جائے تو اس کا مستند ترجمہ آپ کو پندرہ بیس دن میں انگریزی میں مل جائے گا ۔اس پر ماہرین کی رائے اور ریویو اخباروں اور رسالوں میں دیکھ لیں گے ۔صرف ایک انگریزی زبان سے واقف ہوتے ہی آپ کا تعلق ساری دنیا سے ہو جائے گا ۔

(۵) ۱۹۱۱ء میں THE CONCISE OXFORD DICTIONARY کا پہلا ایڈیشن شائع ہوا ۔۱۹۹۰ء میں اس کا دسواں ایڈیشن نکلا جس میں گذشتہ دس پندرہ برس کے عرصے میں ۲۰ ہزار نئے الفاظ کا اضافہ ہوا ہے ۔ یہ سب الفاظ جدید سائنس اور ٹکنالوجی ، الکٹرونکس کمپیوٹر ،ماحولیات اور مواصلات وغیرہ سے متعلق ہیں ۔سائنس کی اس تیز رفتار ترقی سے دوسری زبان والے اس کی شدید سے بھی واقف نہیں ۔ مولوی عبدالحق کی انگریزی اردو ڈکشنری ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی جس میں قریب ۴۲ ہزار انگریزی الفاظ کا ترجمہ کیا گیا ہے ۔اس جدید آکسفورڈ ڈکشنری میں ایک لاکھ بیس ہزار الفاظ شامل ہیں ۔مولوی عبدالحق صاحب نے دیباچہ میں لکھا ہے کہ "انگریزی زبان بڑھتی ہوئی دولت ہے ۔" ان کی ٹیم کو انگریزی الفاظ کا ترجمہ کرتے کرتے کئی نئے الفاظ آگئے جنہیں ضمیمہ میں شامل کرنا پڑا ۔

آپ کے ذہن میں یہ سوال ضرور آئے گا کہ ایک طرف تو سب ماہرین تعلیم ابتدائی اور فوقانی درجہ تک مادری زبان میں

تعلیم کو اہمیت دیتے ہیں ۔ انگریزی کا ہر طرف چرچا ہے کہ جب ہم اپنے بچوں کو انگلش میڈیم میں پڑھاتے ہیں تو اس کی مخالفت کی جاتی ہے ۔ دوسری طرف انگریزی زبان کی اہمیت بھی بتلائی جاتی ہے ۔ آخر ہمیں کیا کرنا ہے ؟ جب ہمارا بچہ اردو یا مادری زبان میں پڑھے گا تو کالج کی سطح کی تعلیم میں وہ ان طلبہ سے پیچھے رہ جائے گا جو ابتداء ہی سے انگریزی میڈیم سے تعلیم پائے ہوئے ہوں گے ۔ یہاں ان ہی سوالوں کا جواب دینا مقصود ہے ۔

بچوں کی نشوونما اور تعلیم کے لیے گھر کی معاشی آسودگی ضروری ہے ۔ جن کے والدین معاشی پریشانیوں میں گھرے رہتے ہیں وہ اپنے بچوں کی تعلیم کو ایک ضمنی حیثیت دیتے ہیں اور غریب طلبہ اس سکون و اطمینان سے نہیں پڑھ سکتے جو تعلیم کے لیے ضروری ہے ۔ اکثر والدین پڑھے لکھے نہیں ہوتے ۔ مالی حالت بھی مشکل ہی سے اس کی اجازت دیتی ہے پھر بھی وہ اپنے بچوں کو انگلش میڈیم میں شریک کرواتے ہیں اور اس کے اخراجات برداشت کرتے ہیں ۔ عام انگلش میڈیم اسکولوں کا معیار غیر اطمینان بخش ہے ۔ بعض اسکولوں کا معیار تعلیم پست ہے لیکن وہ اپنی آمدنی کے لیے طلبہ کو ہر سال پروموشن دیتے جاتے ہیں یہ طلبہ جب ساتویں آٹھویں جماعت میں کسی طرح پہنچ جاتے ہیں تو نصاب کے انبار کو دیکھ کر ڈر جاتے ہیں ۔ گذشتہ سات آٹھ سال کی پڑھائی بس برائے نام ہی رہی تھی ۔ اکثر تو اسکول چھوڑ دیتے ہیں جو میٹرک تک پہنچ کر امتحان دیتے ہیں وہ ایک دو سال ناکام ہو کر تعلیم کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیتے ہیں ۔ نہ تو انہیں انگلش آتی ہے اور مادری زبان سے بھی ناواقف رہ جاتے ہیں ۔ وہ اتنی تعلیم کے بعد بھی کہیں کے نہیں رہتے ۔ یہ ایک المناک بات ہے جو طلبہ کی ساری زندگی برباد کر دیتی ہے ۔

بازار کی اشیاء کی طرح اچھی تعلیم مہنگی ہوتی ہے ۔ سستی تعلیم کا معیار پست ہوتا ہے ۔ جو لوگ خود پڑھے لکھے ہیں اور اچھے انگلش میڈیم اسکولوں کے اخراجات برداشت کر سکتے ہیں اور گھر پر ٹیوشن کا انتظام کر سکتے ہیں ۔ انھیں کسی مشورہ کی ضرورت نہیں ۔ وہ ضرور اپنے بچوں کو انگلش میڈیم اسکولوں میں پڑھائیں گے ۔ لازماً ان طلبہ کا معیار انگریزی زبان میں دوسرے میڈیم کے طلبہ کے مقابلہ میں بہتر ہوتا ہے ۔ اسی لیے کسی حد تک انہیں برتری حاصل ہو جاتی ہے لیکن گذشتہ دس برس کے عرصے میں تلگو اور اردو میڈیم رزیڈینشیل اسکولوں کے طلبہ کے اعلی معیار کی وجہ سے کرسچین مشنری اسکولوں کا سحر ٹوٹتا جا رہا ہے ۔ اگر مادری زبان میں تعلیم کے لیے اچھے ٹیچرس، کتب اور مادی سہولتیں حاصل ہوں تو طلبہ غیر مادری زبان کے ذریعے تعلیم میں ان طلبہ سے آگے ہو جاتے ہیں اس لیے کہ وہ اسباق کو پانی کی طرح پیتے اور ہضم کر جاتے ہیں ۔ دوسری زبان کے ذریعہ پڑھنے کے لیے قدم قدم پر رکنا پڑتا ہے اکثر اسباق کو رٹنا پڑتا ہے ۔

مادری زبان میں تعلیم حاصل کرنے والے طلبہ کے لیے ضروری ہے کہ اسکول اور انٹرمیڈیٹ کی سطح کے امتحانات میں کامیاب ہونے تک ان کے لیے آٹھویں جماعت سے انگریزی زبان میں کسی حد تک عبور حاصل کرنے کے لیے خاص پروگرام کا اہتمام کیا جائے ۔ مہارت تو رفتہ رفتہ پیدا ہو جائے گی ۔ انتظامیہ کی جانب سے روبہ عمل لانے کے لیے چند تجاویز پیش ہیں جو قابل غور اور قابل عمل ہیں ۔

(۱) سب سے پہلے تو انگریزی پڑھانے والے ٹیچرس کی تربیت ضروری ہے اکثر اسکولوں میں انگریزی اردو ہی میں پڑھائی جاتی ہے ۔ انگریزی زبان کی بہت سی نزاکتوں سے ہمارے ٹیچرس واقف نہیں ۔ ان کی سب کمزوریاں غیر محسوس طریقہ سے طلبہ میں

بھی آجاتی ہیں ۔ ان سب کے لیے سال میں ایک دو مرتبہ یا گرمائی تعطیلات میں پندرہ بیس یوم کے لیے ENGLISH TEACHING PRACTICE کا انتظام کسی ادارہ کی جانب سے کسی مرکزی مقام پر کیا جائے تاکہ اطراف کے مدارس کے لیے ٹیچرس اس ورکشاپ میں حصہ لے سکیں اس ورکشاپ کو چلانے کے لیے CENTRAL INSTITUTE OF ENGLISH & FOREIGN LANGUAGES (عثمانیہ یونیورسٹی) کے ماہرین کی خدمات حاصل کی جا سکتی ہیں ۔ یہ ادارہ ہر وقت آپ کی رہنمائی اور مدد کے لیے تیار رہتا ہے ۔

(۲) انگریزی زبان و بیان، لہجہ اور تلفظ، گرامر اور گفتگو پر سینکڑوں AUDIO CASSETTES تیار کیے جا چکے ہیں ۔ بلکہ صرف INTONATION لہجہ اور PRONUNCIATION انداز اظہار پر کئی لوگوں نے ڈا کٹریٹ کیا ہے ۔ ان آڈیو کیسٹس کو ٹیپ ریکارڈ کے ذریعہ سارے کلاس روموں میں ہر روز پندرہ بیس منٹ کے لیے انگریزی اسباق سنائے جا سکتے ہیں ۔ خوشی اس بات کی ہے کہ حیدر آباد کے بعض اسکولوں میں اس کا انتظام ہے ۔ ان اسباق کے لیے پہلے ہی سے ٹیچرس کا تیار رہنا ضروری ہے تاکہ طلبہ سے اسی سبق پر مشق کرائی جا سکے ۔

(۳) انگریزی پڑھانے کے ماہر ٹیچرس کا DEMONSTRATION LESSON سال میں دو تین مرتبہ رکھا جائے ۔ تاکہ اطراف و اکناف کے اسکولوں کے ٹیچرس ایسے اسباق کا مشاہدہ کرسکیں ۔ وہ دوسری تیسری جماعت کے بچوں کو اس خوبی کے ساتھ اور موثر انداز میں پڑھاتے ہیں کہ چھوٹے چھوٹے طلبہ انگریزی میں روانی سے مختصر جملے بولنے لگ جاتے ہیں ۔

(۴) اسکول لائبریری میں آسان انگریزی میں لکھی ہوئی کتابیں، قصے کہانیاں اور شعر ناموں وغیرہ پر خوبصورت ٹائٹل اور تصاویر کے ساتھ سینکڑوں کتابیں مل جائیں گی ۔ طلبہ میں ان کتابوں کے پڑھنے سے انگریزی زبان سے دلچسپی بڑھ جائے گی ۔

کوٹھاری ایجو کیشن کمیشن نے انگریزی کو ہندوستان میں لائبریری زبان (LIBRARY LANGUAGE) کی حیثیت سے بڑی اہمیت دی ہے اسکول کے زمانہ ہی میں طلبہ کی انگلش کی بہتری کے لیے کوشش کی جائے تو انہیں اعلیٰ تعلیمی سطح پر کوئی دشواری نہ ہوگی ۔ اوپر دی ہوئی ایسی ہی تجاویز پر عمل اور تجربہ ضروری ہے ۔

محمد زکریا ورک *

مکئی کا تحفہ

امریکہ کا نام سنتے ہی بے اختیار دماغ میں امریکہ کے مقامی اور اصلی باشندوں "ریڈ انڈین" لوگوں کا تصور ابھر آتا ہے جس طرح یوروپ میں بسنے والے مختلف اقوام کے لوگ یوروپین کہلاتے ہیں بعینہ امریکہ میں مختلف اقوام کے مقامی لوگ ریڈ انڈین ہی کہلاتے ہیں۔یہاں پر بسنے والے چند ایک معروف قوموں کے نام حسب ذیل ہیں : IROQUIS, CREE, CHEROKEE, HURONS, OJIBWA ۱۴۹۲ء میں جب کرسٹوفر کولمبس نئی دنیا میں پہنچا تو یہاں کے مقامی باشندوں کو اس نے LOS INDIOS کہا اور اس وجہ سے ان لوگوں کو انڈین کہا جاتا ہے۔

امریکی انڈین کا نام لب پر آتے ہی لوگوں کے دماغ میں تیر و کمان ہاتھ میں لیے سر پر عقاب کے پروں کا تاج پہنے ریڈ انڈین کا چہرہ گھوم جاتا ہے۔امریکی وفاقی حکومت اور کینیڈین وفاقی حکومت کے ان لوگوں سے معاہدات کے تحت یہ لوگ خاص علاقوں میں رہتے ہیں جن کو INDIAN RESERVE کہا جاتا ہے۔اس ریزرو کے علاقہ میں ان کا اپنا چیف ہوتا ہے جو ایک کونسل BAND COUNCIL کے تعاون سے روزمرہ کے امور نظم و نسق اور حکومت کے فرائض سر انجام دیتا ہے۔ ریزرو کے علاقہ میں صرف ریڈ انڈین رہائش پذیر ہو سکتے ہیں کسی اور شخص کو وہاں رہائش اختیار کرنے کے لیے اجازت لینا درکار ہوتی ہے۔ریزرو میں رہنے والے لوگ وفاقی حکومت کو ٹیکس ادا کرنے سے مبرا ہوتے ہیں۔

دیکھنے میں یہ ریڈ انڈین سب ایک جیسے نظر آتے ہیں ان کے سیاہ بال سیدھے اور لمبے ہوتے ہیں،چہرے کی ہڈی Cheekbone نمایاں ہوتی ہے،سر کے بال گھنے مگر جسم کے دوسرے حصوں پر بال بہت کم ہوتے ہیں۔ان لوگوں کی اکثریت داڑھی اور مونچھوں کو شیو کرتی ہے۔مرد عورتوں کی طرح بال لمبے رکھتے ہیں کانوں میں زیور پہننا مردوں کے لیے معیوب نہیں سمجھا جاتا ہے۔لباس کے لیے یہ لومڑ،بھینس اور ہرن کی کھال کا لباس پہننا پسند کرتے ہیں مقامی زبان کے علاوہ انگریزی زبان پر یہ لوگ عبور رکھتے ہیں۔

امریکہ میں یہ لوگ کہاں سے آئے؟ اس سوال کا جواب مورخین یہ دیتے ہیں کہ روس کے مغربی علاقہ میں یہ لوگ آج سے ہزاروں سال قبل شکار کرتے کرتے الاسکا کے راستہ ایک بالکل مختلف دوسرے علاقے میں پہنچ گئے جو اب موجودہ حالت

* کنگسٹن، کینڈا

میں جغرافیائی تبدیلیوں کے باعث نظر نہیں آتا ہے اس مقام کو جہاں روس اور الاسکا آپس میں ملتے ہیں اور جہاں سے یہ لوگ امریکہ آئے BERING STRAIT کہا جاتا ہے۔ آج سے ہزاروں سال قبل الاسکا کے بعض حصوں میں برف شاید زیادہ نہ تھی اور یہ لوگ آسانی سے سفر کرکے نارتھ امریکہ پہنچ گئے اس سفر کے بعد یہ BERING LANDBRIDGE پانی میں ڈوب کر ختم ہو گیا اور یہ لوگ یہیں کے ہو کر رہ گئے تمام مورخین اس بات سے متفق ہیں کہ یہ لوگ MONGOLOID RACE سے تعلق رکھتے ہیں۔ امریکہ آنے کا جو راستہ آج سے ۱۲۰۰۰ سال قبل ان لوگوں نے اختیار کیا وہ یقیناً روس سے الاسکا اور الاسکا سے امریکہ تھا۔

امریکہ آنے سے قبل یہ لوگ سب ایک نسل سے تعلق رکھتے تھے مگر جب یہ نارتھ اور ساؤتھ امریکہ کے علاقوں میں آباد ہو گئے تو پھر یہ مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم ہو گئے اور کئی ایک زبانیں ایجاد ہو گئیں چنانچہ ایک ماہر لسانیات MORRIS SWADESH کے محتاط انداز سے کے مطابق جب سفید فام لوگ امریکہ آئے تو اس وقت یہ انڈین لوگ ۲۲۰۰ زبانیں بولتے تھے مرور ایام کے ساتھ ساتھ بہت سی زبانیں قبائل کے دنیا سے ختم ہونے کے ساتھ ساتھ ختم ہوتی چلی گئیں اس کے باوجود آج بھی امریکہ میں بہت سے INDIAN DIALECTS بولے جاتے ہیں۔ ساؤتھ امریکہ کے ملک پیرا گوئے (PARAQUAY) میں ۲۰ لاکھ سے زیادہ باشندے انڈین زبان گورانی (GUARANI) بولتے ہیں چنانچہ اس ملک میں ہسپانوی زبان کی طرح گورانی بھی سرکاری زبان مانی جاتی ہے۔

ریڈ انڈینس میں زمین کی ملکیت کا تصور وہ نہیں تھا جو سفید فام اقوام میں تھا مختلف اشخاص کے بجائے زمین کی ملکیت پورے قبیلے کی سمجھی جاتی تھی جس طرح ہوا، روشنی اور پانی کو تقسیم نہیں کیا جاسکتا اسی طرح ان کے خیال میں زمین تقسیم نہیں ہو سکتی تھی۔ چنانچہ سیفد فام لوگوں نے جب زمین کو افراد میں تقسیم کرنا شروع کیا تو یہ بات ان لوگوں کی سمجھ سے باہر تھی ریڈ انڈینس زمین کی حد درجہ عزت اور احترام کرتے تھے خدا نے انسان کے لیے زمین نہیں بنائی بلکہ زمین کے لیے انسان بنائے ہیں حیات بعد الممات کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ ہے کہ اس دنیا کے بعد دوسری دنیا میں زندگی پھر سے شروع ہو جاتی ہے۔

سیاسی امور میں یہ لوگ جمہوری اداروں کے قیام، فرد کی آزادی اور اپنے امور کا خود فیصلہ کرنے میں بہت سختی سے عمل کرتے تھے۔ سفید فام لوگوں نے ایک شخص کی عزت اور وقار، جمہوریت، نمائندہ حکومت کے سیاسی خیالات ان لوگوں سے اپنا کر آج کی جدید دنیا کو دیے۔ امریکی انقلاب سے پہلے ریڈ انڈین لوگ وفاقی طرز حکومت کی طرح منقسم قبائلی علاقوں میں رہتے تھے۔ چنانچہ اس ضمن میں LEAGUE OF IROQUOIS کا ذکر مشہور امریکن مصنف بنجمن فرینکلن نے ۱۷۵۴ء میں ایک مضمون میں خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ انڈین لوگوں کی اس لیگ سے امریکی سیاسی لیڈروں کو "امریکی یونین" کا خیال پیدا ہوا اور یوں چند ایک ریاستوں نے مل کر امریکی وفاقی حکومت کا سنگ بنیاد رکھا۔ امریکہ میں شخصی آزادی اور عزت کا بہت چرچا رہتا ہے اس کا تصور بھی سفید فام لوگوں کو ریڈ انڈین نے دیا۔

دور حاضر کے امریکہ کی روزمرہ زندگی کے ہر پہلو میں ریڈ انڈین لوگوں کی اعانت نمایاں نظر آتی ہے۔ زراعت، مذہب، تجارت، اقتصادیات، حکومت غرض یہ کہ کوئی ایسا شعبہ زندگی نہیں جہاں ان لوگوں کا اثر نظر نہ آتا ہو۔

جب کرسٹوفر کولمبس نئی دنیا میں پہنچا تو انڈین لوگوں نے آنے والوں کو اپنی غذا سے متعارف کیا اور پھر انہیں

پودے لگانے، مچھلی پکڑنے اور شکار کرنے کے طریقے سکھلائے ۔ دنیا میں آج کل جتنی خوراک پیدا کی جاتی ہے اس کا نصف سے زیادہ حصہ وہ ہے جو ریڈ انڈین امریکہ میں اگاتے تھے مگر سفید فام لوگوں کو اس کا علم ۱۴۹۲ء کے بعد ہوا۔ مکئی اور آلو آج دنیا میں گندم اور چاول کے بعد سب سے زیادہ کھائے جاتے ہیں جبکہ مکئی اور آلو انڈین لوگ ہزاروں سال سے کھاتے آئے ہیں۔ مکئی کے دانوں کی کئی قسمیں ہوتی ہیں بعض ایک تو قوس قزح کی طرح رنگ برنگ کے ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ مکئی کا عظیم تحفہ دنیا کو ریڈ انڈین نے دیا اور دنیا ہمیشہ ان کی ممنون رہے گی۔ مکئی آج بھی ریڈ انڈین لوگوں کی محبوب غذا ہے۔

مکئی کے علاوہ ریڈ انڈین نے سفید لوگوں کو ۸۰ سے زیادہ پودوں اور سبزیوں سے متعارف کیا ان میں سے چند ایک نام یہ ہیں مونگ پھلی، اسکوائش، ٹماٹر، کدو، انناس، مرچ (PEPPERS) سبز رنگ والی اور CHICLE نامی پودا جس سے چیونگ گم بنتی ہے۔ تمباکو کا استعمال کولمبس نے پہلی بار امریکہ میں ہوتے دیکھا اس کے بعد یہ یورپ گیا اور وہاں سے تمام دنیا میں کاشت کیا جانے لگا۔ ریڈ انڈین تمباکو کا استعمال بطور نشہ کے نہیں کرتے تھے بلکہ بطور دوائی کے استعمال کیا جاتا تھا تمباکو کا استعمال صرف مرد کرتے تھے۔

ریڈ انڈین تہذیب نے ۵۹ دوائیاں بھی دنیا کو دیں ان میں سے چند ایک کے نام حسب ذیل ہیں۔

CINCHONA BARK (Source of Quinine) COCA (for Cocaine) CURARE (MUSCLE RELAXER) DATURA (Paine Reliever) امریکہ کے ہزاروں شہروں اور ریاستوں کے نام ریڈ انڈین تہذیب کی یادگار ہیں اس کے علاوہ انگریزی زبان میں درجنوں الفاظ انڈین زبانوں سے آئے جیسے TOBACCO, CHIPMUNK,SQUASH,SKUNK, TOBOGGAN, MOOSE, PECAN, RACCOON, COUGAR, وغیرہ وغیرہ

امریکہ میں ہر سال کاروں کے نئے ماڈل مارکیٹ میں آتے ہیں ایسی کئی ایک کاروں کے نام انڈین ہیں جیسے MAVERICK, COUGAR, CHEROKEE. MUSTANG, انگریزی زبان کے مندرجہ ذیل محاورے بھی انڈین زبان سے ماخوذ ہیں - BURY THE HATCHET, WARPATH, BIG CHIEF, INDIAN SUMMER اس طرح انٹر نیشنل بوائے اسکوٹ کا خیال بھی ریڈ انڈین لوگوں کے طرز زندگی سے شروع ہوا۔

سرخ فام امریکن اور ان کی تعداد

بہت سے مورخین نے یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب ۱۴۹۲ء میں سفید فام لوگ امریکہ میں وارد ہوئے تو یہاں کتنے سرخ فام امریکن رہتے تھے۔ بعض نے اندازہ لگایا ہے کہ امریکن میں ۷۵ ملین ریڈ انڈین رہتے تھے جبکہ بعض نے قیاس آرائی کی ہے کہ یہاں صرف ۸ ملین افراد رہتے تھے۔ ایک محتاط اندازے کے مطابق جب کولمبس یہاں وارد ہوا اس وقت پندرہ سے بیس ملین ریڈ انڈین یہاں آباد تھے۔ کیلی فورنیا کی ریاست میں ساڑھے تین لاکھ ریڈ انڈین آباد تھے۔ جوں جوں سفید فام لوگ آتے گئے ریڈ انڈین کم ہوتے گئے ان کی اکثریت کو سفید فام لوگوں نے صفحۂ ہستی سے جان بوجھ کر مٹانے کی کوشش کی تاکہ سفید فام زمین کی ملکیت حاصل کر سکیں ایک زمانہ تھا جب سفید فام لوگوں کو ریڈ انڈین لوگ مارنے پر انعام سے نوازا جاتا تھا اور وہ بڑے فخر سے کہا کرتے تھے میں نے اتنے انڈین ہلاک کیے ہیں سفید فام لوگوں کے

ہاتھوں مرنے کے علاوہ جو بیماریاں یوروپ سے لوگ اپنے ساتھ لے کر آئے ان کے آگے بھی ریڈ انڈین نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ ان نت نئی بیماریوں کا ان کے پاس علاج نہ تھا۔ ۱۸۶۰ء میں امریکہ میں ۲۴۰,۰۰۰ انڈین آباد تھے مگر پچاس سال بعد ۱۹۱۰ء میں یہ تعداد گر کر ۲۲۰,۰۰۰ رہ گئی تھی اس کے بعد ان کی شرح موت کم ہو گئی اور پیدائش کی شرح قدرے بڑھ گئی چنانچہ ۵۰ سال بعد ۱۹۹۰ء میں امریکہ میں ۵۵۲،۲۲۸ انڈین اور اسکیمو آباد تھے۔ کینیڈا میں اس وقت چار لاکھ کے قریب ریڈ انڈین آباد ہیں۔

سفید فام لوگوں نے ہر طرح مقامی باشندوں کا قتل کیا ان کی جائداد اور زمین پر قبضہ کیا اور جو بچ گئے ان پر اپنے قوانین مذہب رسم و رواج کو لاگو کیا، در حقیقت امریکہ کے سفید فام باشندوں کی تاریخ کا یہ ایک سیاہ ترین باب ہے۔ سفید فام لوگوں نے کتنے انڈین کو قتل کیا، کتنوں کو غلام بنایا، کتنی عورتوں کی عصمت لوٹی یہ بات شاید کبھی بھی کوئی نہ جان سکے گا۔ غم کی بات یہ ہے کہ یہ جنگ ان مقامی باشندوں پر زبردستی تھوپی گئی۔ یہ جنگ ریڈ انڈین کی زمین پر لڑی گئی اور اس کے اصل مالک اس سے بالآخر ہاتھ دھو بیٹھے، کہتے ہیں کہ بعض ریاستوں میں ایک دن میں ہزاروں انڈین کو قتل کیا گیا تا کہ ان کی زمین ہر بھوکے، سفاک، سفید یوروپین ملکیت حاصل کر سکیں۔ قبیلوں کے قبیلے چند دنوں میں صفحۂ ہستی سے ختم کر دیئے گئے۔

یوروپین سفید فام جب امریکہ آئے تو ان کی نظر یہاں کے سونے، چاندی، قیمتی پتھروں اور ہیروں پر تھی۔ انڈین غلام بھی آمدنی کا ایک موثر ذریعہ تھے کیونکہ یہ غلام کم اجرت پر یوروپ میں جا کر اپنے سفید مالکوں کا کام کرتے تھے۔ کرسٹوفر کولمبس نے نہ صرف امریکہ میں غلامی کا آغاز کیا بلکہ دوسری قوموں کو بھی اس طرف مائل کیا۔ یوروپین تاجروں کے لیے امریکہ کے انڈین ان کے مال کی کھپت کے لیے ایک زبردست منڈی بھی تھے چنانچہ یوروپین تاجر اپنا مال یہاں لاتے اور یہاں INDIAN FUR یوروپ لے جا کر مہنگے داموں پر فروخت کرتے تھے۔

زمین پر قبضہ

انڈین لوگوں کی زمین پر قبضہ کرنے کے لیے سفید فام لوگوں نے نت نئے حربے استعمال کیے۔ بعض جگہوں پر زمین ان سے خرید لی گئی یا اس کے عوض ان کو کوئی چیز دے دی گئی، بعض ایک جگہ سفید فام لوگوں نے سازشوں، دھوکے بازی اور جھوٹی قانونی کارروائی کر کے زمین پر قبضہ کیا۔ جن علاقوں میں انڈین قبائل نے مزاحمت کی وہاں امریکی فوج کو بھیج کر ان کو تہس نہس کر دیا گیا اور اس کے فوراً بعد سفید فام لوگوں کو وہاں بسا دیا گیا بعض ایک جگہ قبیلوں کے ساتھ امن کے معاہدات کر کے ان کی زمین پر قبضہ کر لیا گیا۔

عیسائی مشنریوں نے ریڈ انڈین کے خاتمے میں حسب روایت پورا پورا دھوکے بازی سے بھرپور کردار ادا کیا مذہب کے بھیس میں ان مشنریوں نے ریڈ انڈین لوگوں کو سفید فام لوگوں کا لباس پہننے اور نام بدلنے کی تلقین کی ان مقامی باشندوں کو عیسائیت کے عقائد سکھا کر ان کو اپنے مذہب سے بے زار کیا گیا اور پھر رفتہ رفتہ ریڈ انڈین نے سفید فام باشندوں میں گھلنا ملنا شروع کر دیا اور ان کی اپنی شناخت ختم ہوتی گئی بائبل کا ترجمہ ALGONQUIN زبان میں ۱۶۶۳ء میں کیا گیا

اس کے علاوہ بائیبل کا دوسری ۱۳۲ انڈین زبانوں میں بھی ترجمہ ہو چکا ہے۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا سفید فام لوگ اپنے ساتھ یوروپ سے مخصوص بیماریاں بھی، اتھ لے کر آئے جن کے خلاف مزاحمت انڈین اقوام میں کم تھی چنانچہ انڈین قوم کی اکثریت ان بیماریوں سے ہلاک ہوئی سفید فام لوگ جو بیماریاں امریکہ لے کر آئے ان کے نام ہیں چیچک ہیضہ، تپ دق، ٹائی فائڈ اور بخار وغیرہ۔

امریکہ میں انڈین قوم کی نیشنل کانگریس آف امریکن انڈینز ہے جو مختلف قبائل کے نمائندوں سے مل کر بنی ہے یہ کانگریس امریکہ میں ریڈ انڈین کے حقوق کی ترجمانی کرتی ہے۔ کینیڈا میں چار لاکھ کے قریب انڈین قوم کی اسمبلی آف فرسٹ نیشنز ہے ان کے چیف کا نام اس وقت OVEDI MERCREDI ہے جو ایک پیشہ ور وکیل ہے۔ کینیڈا میں اس وقت ۵۸۳ ایسے انڈین قبیلے موجود ہیں۔ (STATUS BANDS) جن کو حکومت اصلی ریڈ انڈین سمجھتی ہے۔ اسمبلی آف فرسٹ نیشنز کو وفاقی حکومت ہر سال چھ ملین ڈالر امداد دیتی ہے۔

آج سے پانچ سو سال پہلے امریکہ میں جو انڈین تہذیب تھی اس کا نام و نشان اب صرف INDIAN RESERVE پر ملتا ہے۔ بہت سے قبائل نے سفید فام لوگوں کی طرز زندگی کو اپنالیا ہے مگر بعض ایک نے اپنے پرانے طور طریقے کو ابھی تک محفوظ رکھا ہے انڈین قوم کے افراد جو مخصوص کپڑے پہنتے ان کے نام یہ ہیں۔ PONCHOS, PARKAS, MOCASSINS,CUSHMAS اس کے ساتھ ساتھ بعض ایک انڈین بلیو جین میں بھی ملبوس نظر آتے ہیں۔

"انڈین ریزرو" پر جو لوگ رہتے ہیں ان کو حکومت رہائش کے لیے امداد دیتی ہے جس کے باعث وہ کاہل جاتے ہیں۔ "ریزرو" پر ان کی اپنی انڈین پولیس ہوتی ہے۔ اگر ایک انڈین عورت کسی سفید فام سے شادی کرے تو وہ اپنے حقوق اور مراعات سے ہاتھ دھو بیٹھتی ہے۔ ہر انڈین کو ایک شناختی کارڈ ملتا ہے جس کو BAND CARD کہتے ہیں۔ اس کارڈ کو دکھانے سے ان کو کسی بھی شہر میں VAT ٹیکس ادا نہیں کرنا پڑتا ہے۔ کینیڈا کی وفاقی حکومت میں ایک منسٹری کا نام DEPTT OF INDIAN AFFAIRS ہے۔ جو انڈین لوگوں کے معاملات، جھگڑوں زمین کے تنازعات وغیرہ کا خیال رکھتا ہے۔ "انڈین ریزرو" پر ہر سال مختلف علاقوں میں انڈین لوگوں کا سالانہ کنونشن ہوتا ہے جس کو POW-WOW کہتے ہیں۔

چند معروف انڈین افراد

یہاں امریکہ کے چند ایک معروف اشخاص کا ذکر کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کی HERITAGE انڈین تھی۔
سینیٹر رابرٹ اوون (R.OWEN) اور مشہور فلمی ایکٹر ول راجر (WILL ROGER) دونوں کا تعلق مشہور انڈین قبیلہ CHEROKEE سے تھا۔ امریکہ کا مشہور سنگر ELVIS انڈین تھا۔ امریکہ کا مشہور بولنے اسکوٹ ولیئم کوڈی (CODY) بھی انڈین تھا JAMES THORPE امریکہ کا مشہور فٹ بال کھلاڑی بھی انڈین تھا۔ ۱۹۱۲ء کے اولمپک کھیلوں میں اس انڈین نے DECATHCON اور PENTHALON میں ریکارڈ قائم کیا تھا۔ اس کی وفات ۱۹۵۳ء میں لاس اینجلس میں ہوئی۔

ریڈ انڈین لوگوں کے عقائد کے مطابق عقاب تمام "پرندوں کا بادشاہ" ہوتا ہے۔ ان کے نزدیک عقاب (EAGLE) طاقت و جرات کا مظہر ہے ریڈ انڈین کا ایک قبیلہ تو اس کی پوجا بھی کرتا تھا اور اسے آسمانی بادشاہ

باقی صفحہ ۳۵ پر

ڈاکٹر عرفان احمد *

ماحولیاتی توازن۔ زندگی کی ضمانت

ماحولیاتی توازن کے مسائل میں ہماری دلچسپی کوئی جذباتی بات نہیں بلکہ ان سچائیوں کی دوبارہ دریافت اور تحقیق ہے جو قدیم رشیوں، منیوں کے علم میں تھیں۔ میں اتھروید کی ایک نظم "حمد زمین" کے ایک اشلوک کا حوالہ دینا چاہوں گا جو ہمارے پیارے سرزمین سے ہمارے رشتوں کی رہنمائی کرتا ہے۔

"جو کچھ میں تجھ میں سے کھود نکالوں اسے تو پھر جلد ہی پیدا کردے۔ مگر میں تیرے اہم اور ضروری معنوی اجزاء، اعضاء اور تیرے دل کو نہ توڑوں۔"

ہمارا قومی ترانہ جس نے ہمیں تحریک آزادی میں ولولہ دیا ہماری زمین کو اس طرح بیان کرتا ہے کہ جس میں پانی، پھل اور میووں کی افراط ہے اور بڑھتے ہوئے پودوں کی سرسبزی و شادابی سے پر ہے۔ ہندوستانی روایات ہمیں انسانی، حیوانی، نباتاتی، جانداروں کی جملہ صورتوں کے قریبی ارتباط کا سبق سکھاتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ ان صورتوں میں سے کسی ایک میں بے ترتیبی پیدا ہو تو دوسری صورتوں میں عدم توازن پیدا ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے صوفی، سنت، رشی، منی نے فطرت کے گہوارہ میں ہی سکون پایا۔ جنگلوں، پہاڑوں، وادیوں اور ریگزاروں میں انھیں قدرت کی تجلیاں نظر آئیں۔ وہی ان کی ذات سے روحانی سکون کے چشمے پھوٹے جن سے انسانی آبادیاں سیراب ہوئیں۔

وہ اشیاء جو ماحولیاتی توازن میں خلل پیدا کرتی ہیں آلودگی کہلاتی ہیں۔ ماحول سے مراد ان تمام مادی، کیمیاوی اور حیاتیاتی گردوپیش سے ہے جو ہماری پیدائش، نشوونما اور فلاح و بہبود پر اثر انداز ہوتا ہے۔ ماحولیاتی توازن اور ہماری رحمت کا بہت قریبی رشتہ ہے۔ لوگوں کی خوشحالی کسی حد تک خوشگوار ماحول کا نتیجہ ہوتی ہے۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ انسان اب وہ نہیں رہا جو صدیوں پہلے تھا۔ رفتہ رفتہ انسان بدلا۔ اس کی ضرورتیں بدلیں۔ ان نئی راہوں پر گامزن ہوتے ہوئے نظام قدرت میں اس کی دخل اندازی بھی کافی حد تک بڑھتی چلی گئی اور سائنسی نظریے کے مطابق کوئی بھی چیز اگر حد سے بڑھ جائے تو مضر ثابت ہوتی ہے۔ امن، بہبودی، ترقی، آرام و آسائش سے معمور زندگی بسر کرنے کے لیے بے شمار ترقیاتی منصوبے، کل، کارخانے اور صنعتیں ظہور میں آئیں اور ایسا کرتے وقت آج کا انسان شاید یہ بھول گیا کہ نظام قدرت خوشنما انداز

---

* فزکس ڈیپارٹمنٹ، شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج، اعظم گڑھ

میں متوازن ہے۔ ہر ادنیٰ شے کی اپنے مخصوص دائرے میں افادیت ہے۔ اس متوازن نظام میں انسان کی خلل اندازیوں سے قدرت کے ردعمل کا ایک تسلسل عمل نکلتا ہے۔ چنانچہ سیلاب، خشک سالی، مٹی میں تیزابیت، زمین کا کٹاؤ، انسانوں کی مہلک بیماریاں وغیرہ قدرت کی اسی تادیبی کارروائی کا نتیجہ ہیں لیکن آج کا سے اپنی مواصلت کھو چکا ہے۔ اب وہ زمین پر کان رکھ کر کبھی سننے کی کوشش نہیں کرتا، تاکہ وہ اپنے رازہائے سربستہ اس کے کان میں کہہ سکے۔ اس نے عناصر سے اپنے ارتباط کو منقطع کر لیا ہے اور ان ذرائع و وسائل کو کمزور کر لیا ہے جو ارتقاء کے لاکھوں سالوں کا ورثہ ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لاکھوں سال پہلے کہیں ہزاروں میں ایک انواع (Species) فنا ہوتی تھی اب ہر سال ہزاروں انواع صفحہ ہستی سے مٹتی جا رہی ہیں۔ ارتقائی منازل جو آہستہ آہستہ طے ہوتی تھیں اور تب کہیں جا کر ہزاروں برس بعد نئی انواع وجود میں آتی تھیں اب ماحولیاتی توازن کے تیزی سے بگڑنے کی وجہ سے سب کچھ بے ربط سا ہوتا جا رہا ہے۔

باوجود بیرونی خلاء کی معرکہ آراسیاحی کے انسان ابھی تک زمین سے بندھا ہوا ہے۔ اس کے لیے زمین میں ہی سب کچھ محفوظ ہے۔ مکانوں اور دفتروں کی تعمیر کے لیے ہر جگہ اینٹوں کے بھٹے لگ رہے ہیں جو زرخیز زمینوں کا بھی بے دردی سے استعمال کر رہے ہیں۔ کیا اینٹیں بنانے اور استعمال کرنے والوں کو یہ معلوم ہے کہ قدرت کو صرف ایک سینٹی میٹر زرخیز اور نم زمین کی اونچی پرت بنانے کے لیے تقریباً ایک صدی درکار ہوتی ہے۔

جنگلات ملک کی معیشت میں ایک اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان سے حاصل کی ہوئی آمدنی ہماری قومی آمدنی کی تقریباً ڈھائی فی صد ہے۔ جنگلات دو خاص اہم رول ادا کرتے ہیں۔ پیداواری اور حفاظتی، لکڑی جنگلات کی سب سے اہم پیداوار ہے۔ جنگلات پر مبنی صنعتیں آبادی کے ایک بڑے حصے کو روزگار مہیا کرتی ہیں۔ اپنے حفاظتی کردار میں جنگلات زمین کی حفاظت کرتے ہیں، موسم کے ظالمانہ اثرات سے ہمیں نجات دلاتے ہیں۔ زمین کو کٹاؤ سے بچاتے ہیں اور ماحول کو کثافت سے بچانے کے ساتھ ساتھ قدرتی توازن کو برقرار رکھنے میں ہماری مدد کرتے ہیں۔ الغرض جنگلات انسانی زندگی سے اس قدر وابستہ ہیں کہ ان کے وجود کے بغیر زندگی محال ہے۔ لیکن جس طریقہ سے ہم جنگلات کو تباہ کر رہے ہیں وہ چونکا دینے والا ہے۔ ۱۹۷۵ء اور ۱۹۹۰ کے درمیان دنیا کی آبادی میں تیس فی صد اضافہ ہوا اسی عرصے میں دنیا کی زراعتی آراضی کے مجموعی رقبے میں اضافہ صرف ۲۰۵ فی صد رہا۔ اسی وجہ سے ترقی پذیر ممالک میں جنگلات اندھا دھند کٹتے رہے۔ ایندھن اور عمارتی لکڑی کے لیے تقریباً ایک کروڑ ہکٹیر جنگلات گذشتہ دس برسوں میں کاٹے جا چکے ہیں اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ ترقی پذیر ممالک میں جنگلی جڑی بوٹیاں ادویاتی ضروریات کا ۷۵ سے ۹۰ فی صد حصہ پورا کرتی ہیں اور ۲۵ فی صد دواؤں کے خاص اجزا انہیں جڑی بوٹیوں سے حاصل کیے جاتے ہیں قدرت کے اس عطیے کو ضائع کرنا یا اس کا غلط استعمال کرنا قانون قدرت کی خلاف ورزی کرنا ہے۔ ہمیں اس قومی دولت کا نہ صرف تحفظ کرنا چاہیے بلکہ مزید جنگلات لگا کر ملک کی خوشحالی کے امکانات کو اور روشن کرنا چاہیے۔

ہمارے چاروں طرف فضا ہے جس میں ہم سانس لیتے ہیں اس فضا میں ہوا، پانی اور خشکی تینوں ہی شامل ہیں۔ اگر آلودگی کی مقدار فضا میں ایک حد تک بڑھ جائے تو انسانی صحت کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔ ہمارے دور کا یہ المیہ ہے کہ فضا، پانی اور ہوا سبھی زہریلے اور گندگی سے پر ہیں۔ ہم کثافت پی رہے ہیں، کثافت کھا رہے ہیں، کثافت دیکھ رہے ہیں اور اس سے ہماری حس اور ذہن بری طرح متاثر بھی ہو رہا ہے۔ ہوا جاندار اور پیڑ پودوں کے لیے یکساں طور پر اہمیت کا باعث ہے اور بغیر اس کے

زندگی ممکن نہیں۔ قدرتاً جس تناسب میں آکسیجن اور نائٹروجن فضائے بسیط میں موجود رہتی ہیں وہ سائنسی اعتبار سے ہمارے جسم کے لیے صحیح طور پر موزوں قرار پاچکا ہے۔ مزید برآں فضا میں آکسیجن اور کاربن ڈائی آکسائڈ کا توازن اس قدر لطیف ہے کہ ان گیسوں کے امتزاج میں معمولی تبدیلی سے بھی موسمیات کے نظام میں اتھل پتھل ہو سکتی ہے۔ فضائی کاربن ڈائی آکسائڈ زمین سے نکلی حرارت کو جذب کر کے درجہ حرارت کو ۱۵ ڈگری سینٹی گریڈ کے آس پاس رکھتی ہے۔ گذشتہ صدی میں صرف نو کروڑ ٹن کاربن ڈائی آکسائڈ سالانہ فضا میں چھوڑی جاتی تھی اب یہ مقدار پانچ ارب ٹن سالانہ ہوگئی ہے۔ اقوام متحدہ کے ماحولیاتی پروگرام کا اندازہ ہے کہ اگلی صدی کے وسط تک فضا میں کاربن ڈائی آکسائڈ اس وقت کے مقابلہ میں دوگنی ہوگی۔ گذشتہ دس برسوں میں ہوا میں کاربن ڈائی آکسائڈ کی مقدار میں چودہ فی صد اضافہ ہوا ہے۔ اگر یہ عمل جاری رہا تو ۲۰۰۰ء تک زمین کا اوسط درجہ حرارت ۵ c بڑھ سکتا ہے جس کی وجہ سے قطبوں کی برف پگھل کر سطح سمندر کو کئی میٹر اونچا کرسکتی ہے جس سے نچلی سطح کی زمینیں جیسے مالدیپ، بنگلہ دیش کا بیشتر حصہ اور بھارت کے کچھ حصوں کے غرق ہونے کا اندیشہ ہے۔ بڑھتی ہوئی گرمی سے جنگلی جانور اور نباتات جو ایک خاص درجہ حرارت پر زندہ رہتے اور پروان چڑھتے ہیں دھیرے دھیرے ختم ہونے لگیں گے۔

بڑھتی ہوئی آبادی نے فضائی پیداوار کی مہم کو تیز کر دیا ہے نئی نئی کیمیاوی کھادوں کا رواج عام ہو چکا ہے۔ فاسفیٹس بنانے والے کارخانے ہوا میں فلورین، فاسفین وغیرہ زہریلی گیسیں خارج کرتے ہیں جو نہ صرف قرب و جوار کی فصلوں اور پیڑ پودوں کو ختم کرتی ہیں بلکہ مویشیوں کی ہلاکت کی بھی ذمہ دار ہیں۔ ہر سال دنیا میں تقریباً آٹھ سو نئے کیمیائی مرکب استعمال میں لائے جاتے ہیں جن کی وجہ سے ماحولیاتی توازن کا مسئلہ اور بھی بھیانک رخ اختیار کرتا جارہا ہے۔ ایسڈ، تیل اور صنعتی کچرے سے سمندری زندگی کا توازن بگڑتا جارہا ہے۔ پیٹرولیم، کوئلہ وغیرہ جلنے سے زہریلی گیسیں جیسے میتھین، کاربن ڈائی آکسائڈ، نائیٹروجن آکسائڈ، کاربن مونو آکسائڈ اور سلفر ڈائی آکسائڈ وغیرہ بہت زیادہ مقدار میں فضا میں گھل رہی ہیں جن سے عموماً ناک، کان، گلے اور پھیپھڑوں کے امراض پیدا ہو رہے ہیں۔

شور و غل فضائی آلودگی کا ایک اہم حصہ ہے جو کسی بھی طرح ہوا، پانی یا کیمیاوی آلودگی سے کم مہلک نہیں۔ اس ترقی یافتہ دور کا المیہ ہے کہ شور ہر طرف بڑھتا جارہا ہے جس کی وجہ سے فضائی آلودگی بڑھ رہی ہے۔ ۱۹۸۶ء میں ہوئے ایک سروے کے مطابق پوری دنیا میں پانچ سو کروڑ گاڑیاں دوڑ رہی تھیں جن کی تعداد میں برابر اضافہ ہو رہا ہے جس کے شور میں ہر لمحہ اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ شور کی وجہ سے خون کے خلیے، انگلیوں، پیر کے انگوٹھوں اور جلد کے بعض حصوں پر برا اثر پڑتا ہے اور اکثر یہی مضر اثرات بڑھ کر دل کے امراض کے باعث ہوتے ہیں۔ جدید تحقیق سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ شور آنکھوں کی باریک نسوں اور پتلیوں پر براہ راست اثر انداز ہوتا ہے۔ اس کے اثر سے دماغی نسیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ شور و غل کو کم کرنے میں درخت کافی اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

آج ایسڈ رین (Acid Rain) یا تیزابی بارش تمام دنیا کے لیے ایک نازک مسئلہ بن گئی ہے جس کی وجہ سے بری اور بحری ماحولیاتی توازن پر مضر اثرات پڑ رہے ہیں۔ امریکہ، کنیڈا اور مغربی یورپ میں ہزاروں جھیلیں تیزابی بارش کی وجہ سے بغیر مچھلیوں کے جو کر رہ گئی ہیں یہ مٹی کو متاثر کر کے پودوں کی افزائش پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔ اس بارش میں موجود

سلفیورک ایسڈ سنگ مرمر کو جپسم (Gypsum) میں تبدیل کر کے اس کو متھر کے کینسر میں مبتلا کر دیتا ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں تاج محل، یونان میں ایکروپولس (Acropolis)، امریکہ میں لنکن میموریل اور کیلوپٹرانیڈل (Clepetras Needle) جیسی تاریخی عمارتیں اس بارش سے متاثر ہو کر اپنی خوبصورتی کھو رہی ہیں۔

کیمیاوی کل کارخانوں نے ندی اور کنووں کے پانی کو آلودہ کر دیا ہے جس کے باعث کینسر، جلدی امراض اور نومولود بچوں میں پیدائشی نقص دیکھنے کو ملتے ہیں۔ پینے کے پانی میں فلورائڈ کی قابل لحاظ موجودگی ہڈی میں ہونے والی لاعلاج بیماری فلوروسیس کا باعث ہے۔ فلورائڈ کے علاوہ دوسرے بہت سارے عناصر ہیں جو ہوا، پانی اور فضا کو زہر آلود کر رہے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں دنیا کی تمام بیماریوں میں سے کوئی اسی فی صد بیماریاں پانی کی وجہ سے پھیلتی ہیں۔ Pesticides یعنی جراثیم کش دوائیں دیگر پر خطر اشیاء، انسانی فضلہ اور گندے نالوں کے پانی میں موجود جراثیم سے انسانی صحت کو سخت اندیشہ لاحق ہے۔ تخمینہ لگایا گیا ہے کہ ترقی پذیر ممالک کے پندرہ سے بیس لاکھ افراد Pesticides کے زہریلے اثر سے بری طرح اذیت سے دوچار ہوتے ہیں اور کوئی دس ہزار سے زائد افراد ہر برس ہلاک ہو جاتے ہیں۔

بڑھتی ہوئی آبادی کے ساتھ توانائی کا بھی مسئلہ جڑا ہوا ہے۔ آج ہر شخص کا انداز زندگی کچھ ایسا رخ اختیار کر چکا ہے کہ تمام مصروفیات توانائی کے گرد گھومتی ہیں۔ ہماری توانائی کے اہم وسائل کا مرکز کوئلہ، پیٹرولیم، قدرتی گیس اور نیوکلیائی ایندھن یورینیم، تھوریم وغیرہ ہیں۔ ایک جائزے کے مطابق ۲۰۲۰ء تک دنیا میں توانائی کی ضروریات اس وقت کے مقابلے میں دوگنی ہوں گی۔ لکڑی، کوئلہ، پیٹرول، قدرتی گیس اور نیوکلیائی ایندھن کے استعمال سے توانائی حاصل کرنے میں فضائی آلودگی کا مسئلہ اٹھ کھڑا ہوتا ہے۔ نیوکلیائی کثافت کو سب سے تباہ کن کثافت تسلیم کیا گیا ہے جو تمام جانداروں کے لیے ضرر رساں ہے۔ چرنوبل حادثے نے یہ بات مزید واضح کر دی ہے کہ نیوکلیائی فضلے (Nuclear Waste) کو ہم ایک طرح سے "سرد ایٹم بم" کہہ سکتے ہیں جس کے نقصانات محض ایک نسل تک محدود نہیں رہتے بلکہ کئی نسلوں تک چلتے رہتے ہیں۔ بین الاقوامی ایٹمی توانائی ایجنسی کے تخمینے کے مطابق ۲۰۰۰ء تک دنیا میں بیس لاکھ ٹن استعمال شدہ ایٹمی ایندھن ہو گا۔ اس ممکنہ کثافت سے بچنے کی اس کے علاوہ اور کوئی صورت نہیں ہے کہ ہم توانائی کے دیگر ذرائع پر بھی اتنی ہی توجہ اور وسائل صرف کریں جتنے کہ نیوکلیائی توانائی پر کرتے ہیں۔

فضا میں ہوا کے اوپر اوزون (Ozone) گیس زمین کو چاروں طرف گھیرے ہوئے ہے۔ یہ واحد گیس ہے جو کرہ ارض کو سورج کی الٹراوائلیٹ (Ultraviolet) شعاعوں سے محفوظ رکھتی ہے جو ہر جاندار کے لیے نقصان دہ ہیں۔ ماہرین حیاتیات (Biologists) کا خیال ہے کہ جب زندگی کے ارتقاء کی ابتدائی منازل میں اوزون کی سطح نہیں تھی جس کی وجہ سے سورج کی الٹراوائلیٹ شعاعیں زمین پر سیدھی پڑتی تھیں اور کوئی بھی جاندار زندہ نہیں رہ سکتا تھا جب تک کہ وہ پانی کی گہرائیوں میں نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی کے ارتقاء کی ابتدائی منزلیں سمندر میں طے ہوئیں۔ جب فضا میں آکسیجن کافی مقدار میں ہو گئی تو وہ آسمانی اونچائیوں پر اوزون میں تبدیل ہو گئی اور اس کی ایک پرت دنیا کے چاروں طرف بن گئی۔ اس کے بعد ہی جاندار سمندر سے زمین پر نکل آئے اور ارتقاء کی منزلیں طے ہونے لگیں۔ ۱۹۸۰ء میں سائنسدانوں کی ایک رپورٹ سے پتہ چلا کہ ۱۹۶۰ سے اوزون کے تدریجی طور پر گھٹ جانے کی وجہ سے انٹارکٹکا کے اوپر اوزون کور (Ozone Cover) میں ایک بڑا سوراخ

کھل گیا ہے ۔ اوزون پرت کے لگاتار گھٹنے سے کسی بھی ذی روح کی زندگی اس کرہ ارض پر ناممکن ہو جائے گی ۔ اب یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ اوزون پرت کو کم کرنے میں سب سے بڑا ہاتھ کلو روفلورو کاربن، یعنی CFCS نامی گیس کا ہے جو فریج، ایر کنڈیشنرز، پلاسٹک صنعت اور اسپرے پینٹنگ (Spray Painting) وغیرہ میں استعمال ہوتی ہے ۔ اس صدی کی تاریخی " کرہ ارض اعلی کانفرنس " برازیل کے شہر ریو ڈی جینرو (Rio- de- Janeiro) میں ۲ جون تا ۱۴ جون ۱۹۹۲ء منعقد کی گئی ۔ یہ کانفرنس دراصل اکیسویں صدی کے مستقبل کے ماحولیاتی ڈرافٹ تیار کرنے کے لیے منعقد کی گئی تھی ۔ اس کانفرنس میں اوزون پرت میں ہوئے سوراخ اور ماحول کو ایسی دوسری آلودگیوں سے بچانے کے لیے ریڈ کراس کی طرز پر "انٹرنیشنل گرین کراس" اور جیف (GEF) جیسی ایجنسیوں کا وجود عمل میں آیا ۔ ریو کانفرنس میں ایک معاہدے پر دستخط کئے گئے جس کے تحت ۲۰۰۰ء تک CFCS کی پیداوار کو بند کرنے کی شق شامل ہے ۔ ترقی پذیر ممالک کو اس کے لیے دس سال کی مزید مہلت دی گئی ہے ۔

ہم عموماً سائنس اور ٹکنالوجی کے الفاظ کو ملا کر گڈمڈ کر دیتے ہیں لیکن بہت سی ٹکنیک غیر سائنسی ہوتی ہیں کیونکہ ان کا تعلق فوری یا غیر ضروری استعمال سے ہوتا ہے ۔ چنانچہ طویل مدتی فلاحی کاموں کو ہم بھلا دیتے ہیں ۔ آخر تہذیب کب تک غالمانہ استعمال برداشت کرتی رہے گی ۔ بہت سے بظاہر مفید پروجکٹوں کا نقصان دہ نتیجہ نکلا ہے ۔ بلاشبہ صنعتی انقلاب انسان اور فطرت کے درمیان رشتہ کی تبدیلی کا باعث ہوا لیکن تیز رفتار اقتصادی ترقی ماحولیاتی توازن کے تخلل کے بغیر بھی حاصل کیا جاسکتا ہے ۔ بشرطیکہ وسائل کا تحفظ سماج کے ہر فرد کا طرز زندگی بن جائے ۔ ہماری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ نظام بسیط (Eco System) کے خلاف کوئی کام نہ کریں ۔ اگر کوئی تبدیلی لانا ضروری ہو تو دھیرے دھیرے اس پر عمل کریں تاکہ ماحولیاتی توازن قائم رہ سکے ۔ انسانوں میں اس بات کا شعور بیدار ہونا چاہیے کہ اس حسین دنیا کو تباہی کے غار میں نہ ڈھکیلا جائے ۔ قدرت ہمیں زندگی عطا کر کے ایک ماحول کے سپرد کر دیتی ہے اس لیے اس کے توازن کو برقرار رکھنا ہم سب کا لازمی فریضہ ہے ۔ خوشی کی بات ہے کہ اب دنیا کے کونے کونے میں ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے کی بات چل رہی ہے اور بہت سی باتوں پر لوگ اور حکومتیں عمل پیرا بھی ہیں ۔

بھارت سرکار اس بھیانک مسئلے سے پوری طرح باخبر ہے ۔ حکومت نے بڑے پیمانے پر ذرائع ابلاغ کے ذریعے فضائی آلودگی کے خلاف مہم شروع کر رکھی ہے ۔ سرکاری اور نیم سرکاری اداروں میں ایسے اقدامات کئے گئے ہیں جن سے کثافت کم سے کم ہو ۔ مثال کے طور پر حال ہی میں دہلی میں چلنے والی ڈی ۔ ٹی ۔ سی ۔ کی بسوں میں پیٹرول کی جگہ گیس کا استعمال کیا جارہا ہے ۔ ملک میں پانی کی جانچ کے لیے چار سو اسی مراکز قائم کیے گئے ہیں ۔ گنگا کے پانی کو کثافت سے بچانے کے لیے اس کی وادی میں قائم زیادہ کثافت پھیلانے والی پانچ سو نوے صنعتوں کی نشاندہی کر لی گئی ہے ۔ مرکزی کثافتی کنٹرول بورڈ نے تمام صنعتوں کو سالانہ ماحولیاتی جانچ کی رپورٹ حکومت کو پیش کرنے کے لیے نوٹس جاری کر دیا ہے ۔ ماحولیاتی توازن کو برقرار رکھنے کی سمت حکومت کی جانب سے کیے جانے والے مثبت اقدامات حکومت کی پرخلوص سعی کے آئینہ دار ہیں ۔ اب وقت آگیا ہے کہ ہم بصیرت سے کام لیں ۔ ریو (Rio) کانفرنس نے ہمیں ایک راہ دکھائی ہے کہ ہم آگے آنے والی نسلوں کو کثافت اور آلودگی کے گزند سے محفوظ کر لیں ۔ مضمون کا اختتام میں یورپ کے صوفی جان ڈوم

(John Dome) کے ان الفاظ سے کرنا چاہوں گا جن سے اس نے سترہویں صدی کے انسانی خاندانوں کے بین الاقوامی معیار کی ترجمانی کی ہے۔ وہ کہتا ہے

"کوئی بھی انسان مکمل طور پر جزیرہ کی حیثیت کا حامل نہیں ہو سکتا۔ ہر انسان براعظم کا ایک حصہ ہے۔ اصل کا ایک ٹکڑا۔ اگر سمندر کسی روڑے کو بہالے جائے یا یورپ کو بہالے جائے یا خشکی کے کسی بلند حصے کو بہالے جانے یا تمہارے اپنے دوستوں یا تمہارے اپنے متعلقین کو بہالے جائے۔ کسی بھی انسان کی موت مجھے کم کر دیتی ہے کیونکہ میں انسانیت میں شامل ہوں۔ اس لیے تم یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کرو کہ کس کا ماتم ہو رہا ہے۔ درحقیقت یہ تمہارا اپنا ماتم ہے۔"

باقی صفحہ ۲۹ کا

(SKY-KING) کہہ کے پکارتا تھا۔ عقاب کی زبردست نظر، لمبی عمر اور جس بلندی پر یہ پرواز کرتا ہے یہ سب باتیں ان کے لیے بہت اثر پذیر تھیں امریکہ کا قومی نشان بھی یہی عقاب ہے۔ کانگریس نے ۱۷۸۲ء میں سفید سر والے عقاب کو امریکہ کے قومی نشان کے طور پر منظور کیا تھا۔

ریڈ انڈین لوگ کبھی گنجے نہیں ہوتے ہیں ان کے چہرے پر بال بہت تھوڑے اگتے ہیں اور جو کوئی اگتے ہیں ان کو وہ نکال دیتے ہیں ریچھ کے جسم سے چربی نکال کر یہ تیل بناتے ہیں اور اس تیل کو سر پر لگاتے ہیں مرد اپنے بالوں کو درمیاں میں سے بانٹتے ہیں اور جہاں پر چیر نکالتے اس لائن میں یہ سرخ رنگ لگاتے ہیں۔ عورتوں کے بال لمبے ہوتے ہیں اور ان کی لمبائی پر وہ بہت فخر کرتی ہیں۔ مرد اپنے چہروں کو پینٹ کرنا بھی پسند کرتے ہیں۔

کتابیات

1.American Indian Yeaterday & Today - Bruce Grant 1960- 2. The Indians of America N. Y 1967 - John Colliers -3. Indians of North America Chicago 1961- Harold Driver -4. This land was theirs N.Y 1966 - W.H. Oswalt -5. Foods America gave the world N.Y 1937 - Hyatt Verrill

ڈاکٹر محمد سعود عالم قاسمی *

طاعون اور تعلیمات رسولؐ

طاعون ایک قدیم متعدی بیماری ہے یہ وبائی شکل میں پھیلتی ہے' اس کا سبب یرسینیا پیسٹس (yersinia pestis) نامی جرثومہ ہوتا ہے۔ اس کا مرکز چوہے ہیں' جب پسو ان چوہوں کا خون پیتے ہیں تو یہ جراثیم ان پسوؤں میں منتقل ہو جاتے ہیں پھر یہی پسو انسانوں پر حملہ آور ہو کر ان میں طاعون کے جراثیم پھیلا دیتے ہیں۔ طاعون کے متعدد اقسام ہیں جو طب کی کتابوں میں تحریر ہیں۔ ان کا علاج اور ان سے بچنے کی تدابیر بھی مرقوم ہیں۔

طاعون کے طبی اور معالجاتی پہلوؤں کے ساتھ اس کا اخلاقی اور روحانی پہلو بھی خصوصی اہمیت کا حامل ہے' اس لیے آخری رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے خاص طور پر طاعون کے سلسلے میں ہدایات اور تعلیمات دی ہیں' یہ تعلیمات نہ صرف مسلمانوں بلکہ عام انسانوں کے لیے بھی کارآمد ہیں' سب سے پہلی بات قرآن کی صراحت کے مطابق یہ ہے کہ جب بھی انسانوں پر کوئی مصیبت نازل ہوتی ہے تو وہ ان کے اپنے ہاتھوں کی کمائی ہوتی ہے یعنی ان کے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے قرآن کا ارشاد ہے۔

وما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم ویعفوا عن کثیر (الشوریٰ۔ ۳۰)

"تم لوگوں پر جو مصیبت بھی آتی ہے تمہارے اپنے ہاتھوں کی کمائی سے آتی ہے اور بہت سے قصوروں سے وہ ویسے ہی در گذر کر جاتا ہے۔"

یہ اعمال سماجی و جسمانی بھی ہو سکتے ہیں مثلاً حفظان صحت کے اصولوں سے غفلت' آلودگی گندگی اور غلاظت کی کثرت وغیرہ اور روحانی و اخلاقی بھی ہیں مثلاً اللہ کے قوانین اور اس کے احکام کی مخالفت' اس کے حدود کی پامالی اور اس کے رسول کی تعلیمات سے انحراف وغیرہ یعنی ماحول کی آلودگی اور عقیدہ و عمل کی آلودگی دونوں ہی وباؤں اور بلاؤں کا موجب ہوتی ہیں۔

اس لیے ایک طرف تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے پاکی صفائی اور عمومی طہارت کی تلقین فرمائی ہے۔ اور خاص طور پر

---

* ناظم دینیات' علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ

بدن، کپڑے، گھر، راستے وغیرہ کی صفائی کا حکم دیا ہے ساتھ ہی ضروری دواؤں اور احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کی تعلیم دی ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق دنیا میں کوئی مرض ایسا نہیں ہے جس کی دوا اللہ نے نازل نہ فرمائی ہو اور جب دوا استعمال کی جاتی ہے تو اللہ کے حکم سے شفا بھی ہوتی ہے، چنانچہ حضرت جابر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔ "لکل داء دواء فاذا اصیب دواء الداء براء باذن اللہ" (۱) ہر بیماری کی دوا ہے جب دوا استعمال کی جاتی ہے تو بیماری اللہ کے حکم سے دور ہو جاتی ہے۔

اسی طرح بروایت ابو ہریرہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ما انزل اللہ داء الا انزل لہ شفاء (۲) یعنی اللہ نے کوئی بیماری نازل نہیں کی جس کے لیے شفا نہ پیدا کی ہو اس لئے حفظان صحت کے کسی بھی حال میں دوا اور احتیاط سے غفلت نہیں برتنا چاہیے۔

دوسری طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے توبہ، استغفار، تعلق باللہ اور ذکر کے اہتمام کی طرف توجہ دلائی ہے۔ چنانچہ حضرت شداد روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ "اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ جب میں اپنے بندوں میں سے کسی مومن بندہ کو مبتلا کرتا ہوں (بیماری میں) اور وہ اس ابتلا پر میری حمد و ثنا کرتا ہے تو وہ اپنے بستر مرض سے اس طرح اٹھتا ہے جیسے وہ ابھی پیدا ہوا ہو اس پر کوئی گناہ نہ ہو۔" (۳)

مرض خواہ وبائی ہو یا غیر وبائی اس کے ازالہ میں جس طرح دواؤں کا اثر ہوتا ہے اسی طرح اذکار و استغفار اور روحانی اعمال کا بھی اثر ہوتا ہے، علامہ ابن قیم نے طاعون کے مرض میں دعا و استغفار اور روحانیت کی اثر اندازی سے متعلق لکھا ہے کہ

"طبیعت اس کی بیماری اور اس کی ہلاکت میں روحوں کی تاثیر ایک ایسا معاملہ ہے جس سے جاہل ترین انسان ہی انکار کرسکتا ہے، فضائی آلودگی اور وبا کے پھیلنے کے وقت اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے جسموں میں ان روحوں کا تصرف رکھا ہے جس طرح ان کا تصرف بعض فاسد مادوں میں رکھا ہے جو جسم میں فساد برپا کرتے ہیں بالخصوص اس وقت جب خون میں ہیجان ہو، پت سیاہ ہو جائے، شہوت میں اشتعال ہو تو شیطانی روحوں کو ایسے مریضوں پر وہ قابو مل جاتا ہے جو دوسرے لوگوں پر نہیں ہوتا جب تک کہ ان کو دفع کرنے والے ان سے مضبوط اسباب و عوامل موجود نہ ہوں، مثلاً اللہ کا ذکر، دعا، اس کے سامنے آہ وزاری، صدقہ و خیرات اور تلاوت قرآن وغیرہ ان کی بدولت مریض پاک روحوں کو اپنے پاس بلانے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور وہ شیطانی روحوں پر غالب آجاتی ہیں اور ان کی تاثیر کو ختم کر دیتی ہیں خود میں نے اور دوسرے لوگوں نے اس کا بار بار تجربہ کیا ہے۔" (۴)

طاعون کے پھیلنے کی صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک اہم ہدایت یہ ہے کہ جس شہر میں طاعون ہو وہاں سے نکلنا نہیں چاہیے اور باہر کے لوگوں کو وہاں جانا نہیں چاہیے، چنانچہ حضرت اسامہ بن زید رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں کہ

"طاعون عذاب ہے (دوسری روایت میں ہے کہ عذاب کی علامت ہے) یہ بنی اسرائیل پر یا تم سے پہلی قوموں پر بھیجا گیا تھا، جب تم سنو کہ کہیں طاعون پھیل گیا ہے تو تم وہاں مت جاؤ اور اگر کسی جگہ تم ہو اور وہاں طاعون پھیل جائے تو تم وہاں سے بھاگنے کے لیے مت نکلو۔" (۵)

تہذیب الاخلاق، علی گڑھ، نومبر ۱۹۹۷ء

جہاں تک اس کا تعلق ہے کہ طاعون زدہ علاقہ میں نہیں جانا چاہیے، علامہ ابن قیم نے اس کی پانچ وجوہ لکھی ہیں۔
۱۔ موذی اسباب سے پرہیز ۲۔ عافیت کا التزام جو کہ معاش و معاد کی بنیاد ہے۔ ۳۔ جراثیم سے آلودہ فضا سے حفاظت ۴۔ طاعون کے متاثرین سے عدم اختلاط ۵۔ متعدی امراض سے کو بچانا (۶)

واضح رہے کہ اس ممانعت سے ڈاکٹر، حفظان صحت کے خدام اور تیمار دار مستثنیٰ ہیں۔ جہاں تک طاعون زدہ علاقہ سے نکلنے پر پابندی کا تعلق ہے تو اس کا سبب بقول ابن قیم یہ ہے کہ اولاً انسان کو اللہ سے تعلق مضبوط کرنا چاہیے اور اس پر بھروسہ رکھنا چاہیے اس کے فیصلہ پر صبر کرنا چاہیے اور اس کی رضا پر راضی رہنا چاہیے۔ دوم یہ کہ اطبا کہتے ہیں کہ وبا سے بچنے کے لیے ضروری ہے کہ جسم کے فاضل رطوبات نکل جائیں، غذا کم ہو اور خشک کرنے والی تدابیر اختیار کی جائیں۔ سکون و صبر ہو یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب آدمی وہاں سے نکلے نہیں۔ (۷)

اہم بات یہ ہے کہ اگر لوگ طاعون زدہ علاقہ سے بھاگنے لگیں تو اہل خانہ، پڑوسی اور ہم سایہ کے علاج اور عیادت کا جو فرض ہے اس کی ادائیگی سے فرار ہوگا۔ دوا اور غذا وغیرہ کا انتظام بلکہ مرنے والوں کے کفن دفن کا انتظام بھی مشکل ہو جائے گا اور یہ دینی اور انسانی دونوں غیرت کے منافی ہے مگر اس ممانعت سے علاج کے لیے نکلنا اور دوسری ضروریات سے نکلنا مستثنیٰ ہے۔

اس سلسلہ میں ایک تاریخی واقعہ حضرت عمر فاروق کا ہے اس واقعہ کی روایت حضرت عبد اللہ بن عباس نے کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ عمر فاروق نے شام کا سفر کیا جب "سرغ" تک پہنچے تو اسلامی لشکر کے سپہ سالار ابو عبیدہ بن جراح اپنے فوجی احباب کے ساتھ ملے اور ان کو اطلاع دی کہ شام میں طاعون پھیل گیا ہے، ابن عباس کہتے ہیں کہ عمر فاروق نے مہاجرین صحابہ کو بلوایا اور ان سے اس بات پر مشورہ لیا کہ طاعون کی صورت میں شام جانا چاہیے کہ نہیں تو بعض صحابہ نے کہا کہ آپ جس کام کے لیے نکلے ہیں اس سے واپس نہیں ہونا چاہیے اور بعض صحابہ نے کہا کہ آپ کے ساتھ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے باقی ماندہ لوگ ہیں ان کو اس وبا میں نہ ڈالیے۔ چنانچہ حضرت عمر نے ان کو رخصت کر دیا اور انصار صحابہ کو بلوایا وہ بھی مہاجرین کی طرح دو رایوں کے حامل تھے چنانچہ حضرت عمر نے ان کو بھی رخصت کر دیا پھر آپ نے بزرگان قریش کو بلوایا اور ان سے مشورہ کیا تو ان میں دو آدمیوں نے بھی اختلاف نہ کیا اور متفق ہو کر بولے ہمارا خیال ہے کہ آپ لوگوں کے ساتھ لوٹ جائیں اور ان کو اس وبا میں نہ ڈالیں چنانچہ حضرت عمر نے اعلان کر دیا کہ صبح وہ واپس ہو رہے ہیں اور لوگوں نے سفر کا ارادہ کر لیا تو حضرت ابو عبیدہ بن جراح بولے کیا اللہ کے فیصلہ سے آپ بھاگ رہے ہیں؟ حضرت عمر نے جواب دیا، کاش تمہارے علاوہ کوئی اور یہ بات کہتا، ہاں ہم اللہ کے فیصلہ سے اللہ ہی کے فیصلہ کی طرف بھاگ رہے ہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے اگر تمہارے پاس اونٹ ہوتا اور تم ایسی وادی میں اترتے جس کا ایک حصہ چٹیل ہوتا اور دوسرا حصہ سرسبز اگر تم اپنے اونٹ کو سرسبز حصہ میں چراتے تو یہ بھی اللہ کے حکم سے اور اگر چٹیل حصہ میں چراتے تو وہ بھی اللہ ہی کے حکم سے، اس وقت حضرت عبد الرحمان بن عوف وہاں آپہنچے اور بولے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ حدیث معلوم ہے کہ جب کسی جگہ طاعون ہو تو وہاں مت جاؤ اور اگر جہاں تم ہو وہاں طاعون پھیل جائے تو وہاں سے نکلو نہیں۔ (۸)

اسلامی عہد میں سب سے پہلے ۱۸ھ میں طاعون قصبہ عمواس میں جو کہ بیت المقدس کے قریب ہے رونما ہوا پھر

پورے شام میں پھیل گیا۔اس وبا میں تقریباً ۲۵ ہزار لوگ فوت ہو گئے جن میں بہت سے صحابہ بھی تھے۔ حضرت ابو عبیدہ بن جراح کا وصال بھی اسی طاعون میں ہوا تھا۔(۹)

جو لوگ طاعون میں مبتلا ہو جائیں ان کو صبر کرنا چاہیے، گھبرانا اور چلانا نہیں چاہیے۔ان کا صبر کرنا باعث رحمت اور اجر و ثواب ہے اور اگر وہ اس مرض میں وفات پا جائیں تو ان کو شہادت کا درجہ ملے گا۔ حضرت عائشہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے طاعون کے بارے میں پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ عذاب ہے اللہ جس پر چاہتا تھا نازل کرتا تھا مگر مومنوں کے لیے اللہ نے طاعون کو رحمت بنا دیا ہے، جو بندہ طاعون میں مبتلا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے شہر میں صبر کے ساتھ یہ یقین کرتے ہوئے رہتا ہے کہ اس کو جو بھی مصیبت پہنچتی ہے وہ اللہ کی طرف سے مقرر کردہ ہوتی ہے تو اس کو شہید کا اجر دیا جاتا ہے۔(۱۰)حضرت انس بن مالک نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ

الطاعون شھادۃ لکل مسلم۔(۱۱) "طاعون ہر مسلمان کے لیے شہادت ہے۔"

انس بن مالک ہی سے ایک دوسری روایت امام احمد بن حنبل نے نقل کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ جب کسی مسلمان بندے کو جسمانی بیماری میں مبتلا کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ کہتا ہے کہ میں اس کے عمل کے بدلہ میں نیکی لکھتا ہوں پس اگر اسے شفاء دیتا ہے تو اس کے غسل و طہارت کا انتظام کرتا ہے اور اگر موت دیتا ہے تو اس کی مغفرت کرتا ہے اور اس پر رحم کرتا ہے۔(۱۲)

طاعون میں مبتلا انسان سے دوسرے مریضوں کی طرح ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ رکھنا چاہیے۔اس کی شفایابی کی دعا کرنی چاہیے اور ساتھ ہی اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے اور اس مہلک بیماری سے محفوظ رکھنے کی دعا کرنی چاہیے۔نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موقع کے لیے حسب ذیل دعا مروی ہے۔

"من رای صاحب بلاء فقال الحمد للہ الذی عافانی مما ابتلاک بہ وفضلنی علیٰ کثیر ممن خلق تفضیلا الاعوفی من ذالک البلاء کائنا ما کان ماعاش"(۱۳)

جس نے کسی مبتلائے مرض کو دیکھا اور کہا "اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے اس بلا سے محفوظ رکھا جس میں تجھے مبتلا کیا ہے اور مجھے بہت سی مخلوق پر فضیلت دی تو وہ اس بلا سے ہمیشہ محفوظ رہے گا۔

مگر اس روایت کا راوی عمر بن دینار ہے،امام ترمذی کہتے ہیں کہ وہ مضبوط راوی نہیں ہے گویا یہ حدیث ضعیف ہے اسی کے ساتھ امام ترمذی نے حضرت ابو ہریرہ کے حوالہ سے اور روایت نقل کی ہے جس کے الفاظ قدرے مختلف ہیں۔

الحمد للہ الذی عافانی مما ابتلاک وفضلنی علیٰ کثیر ممن خلق تفضیلا لم یصبہ ذالک البلاء۔(۱۴)

علامہ طیبی کہتے ہیں کہ یہ دعا اس شخص کو دیکھ کر پڑھی جائے جو گناہوں میں مبتلا ہو، جو مرض میں مبتلا ہو یا اعضا بریدہ ہو اس وقت یہ دعا پڑھنا درست نہیں۔(۱۵) تاہم دوسرے محدثین کہتے ہیں کہ یہ دعا عام ہے اسے پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔جو لوگ اسے طاعون کے مریض کو دیکھ کر پڑھنے کی اجازت دیتے ہیں وہ اس شرط کے ساتھ کہ اسے اپنے دل میں پڑھے مریض کو نہ سنائے چنانچہ محدث ابو جعفر محمد بن علی کہتے ہیں کہ "جب ایسے مریض کو دیکھے تو اللہ کی پناہ مانگے اور یہ اپنے دل میں پڑھے مریض کو نہ سنائے۔(۱۶)

یعنی اس بات پر ضرور شکر ادا کرے کہ اللہ نے اسے طاعون جیسے مہلک مرض سے محفوظ رکھا مگر مریض کو سنا کر نہ پڑھے تا کہ اسے جسمانی اذیت کے ساتھ روحانی اذیت نہ ہو۔

حضرت علی روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی مریض کی عیادت کرتے تھے تو کہتے تھے "اے لوگوں کے رب (اس مریض سے) تکلیف دور فرما اور اسے شفا عطا کر، تو ہی شفا دینے والا ہے تیری شفا کے علاوہ کوئی شفا نہیں ہے اور تیری شفا کے بعد کوئی بیماری نہیں ہے۔" (۱۷)

حوالے

(۱) مسلم، کتاب السلام، باب لکل داء دواء، (۲) بخاری، کتاب الطب، (۳) مسند احمد، جلد ۴، ۱۲۳۰ (۴) زاد المعاد، جلد ۴، ۴۰۔۳۹، مکتبہ المنار کویت ۱۹۸۵ء (۵) مسلم، کتاب السلام، باب الطاعون و الطیرۃ، موطا امام مالک الفرار من الطاعون، بخاری کتاب الطب۔ (۶) زاد المعاد جلد ۴۔ ۴۳ (۷) زاد المعاد جلد ۴۔ ۴۲ (۸) بخاری، مسلم، کتاب السلام باب الطاعون (۹) یاقوت الحموی، معجم البلدان جلد ۴، ۵۸، ۵۷۔ بیروت ۱۹۵۷ء (۱۰) بخاری، مسلم، کتاب السلام، باب مایقال اجر الصابر فی الطاعون (۱۱) ایضاً باب مایذکر فی الطاعون (۱۲) مسند احمد، جلد ۴، ۳۸۲ (۱۳) ترمذی، کتاب الدعوت، باب ماجاء مایقول اذا رای مبتلا (۱۴) ترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء ما یقول اذا رای مبتلا (۱۵) تحفۃ الاحوذی شرح ترمذی، جلد ۴، ۲۳۲ (۱۶) ترمذی، کتاب الدعوت (۱۷) ایضاً

ڈاکٹر انیس اسمٰعیل *

طاعون

طاعون ایک ایسا وبائی مرض ہے جس کے بارے میں آج کے نوجوان طبیب کو بہت کم معلومات ہیں کیونکہ انسانوں میں یہ مرض ۱۹۴۸ء کے بعد تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ اور یہ کہا جاتا ہے کہ وبا کی شکل میں یہ مرض پوری دنیا سے ختم ہو چکا ہے اسی لیے اس بیماری کے بارے میں بہت تفصیل سے پڑھانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔ W. H. O. کی اطلاع کے مطابق اس مرض کے جراثیم مختلف جانوروں اور INSECT میں پھر بھی باقی رہ گئے تھے۔ جو جراثیم کے CARRIER کا کام کرتے رہے یہ سمجھا جاتا ہے کہ کیونکہ زلزلہ اور سیلاب کی وجہ سے لوگ اپنے گھر بار چھوڑ کر چلے گئے تھے اور کافی دنوں کے بعد اپنے گھروں کو لوٹے اس دوران بہت سے گھروں میں چوہوں کی تعداد زیادہ بڑھ گئی ان میں سے کچھ چوہے اس وبائی مرض کے CARRIER تھے ان کے ذریعہ یہ جراثیم پسوؤں تک پہونچے اور پھر پسوؤں کے کاٹنے سے انسانوں کے جسم میں داخل ہو گئے کیونکہ جب پسو INFECTED چوہوں کے کاٹتے ہیں تو یہ جراثیم پسو کے حلق میں پہونچتے ہیں اور کھانے کے راستے میں عضلات کے سکڑنے کی وجہ سے رکاوٹ پیدا کرتے ہیں جب یہی پسو کسی انسان کو کاٹتے ہیں تو یہ سارے جراثیم اس انسان کے خون میں داخل ہو جاتے ہیں اور ۲ سے ۷ کر، دن کے اندر انسان کے اندر طاعون کی کیفیت ظاہر ہو جاتی ہے۔

ہندوستان میں طاعون کی پہلی وبا ۱۵۰۰ سے ۶۰۰ سال قبل مسیح کے دوران پھیلی تھی اس کے بعد ۳۲ - ۱۰۳۱ء میں یہ وبا CENTRAL ASIA سے ہندوستان میں پہونچی اس کے بعد ۱۳۲۵، ۱۴۰۳، ۱۶۱۶، ۱۷۰۴، ۱۸۱۲ - ۱۸۳۶، ۱۸۹۵ اور ۱۸۹۹ کے دوران طاعون کی وبا وقتہ وقتہ سے ہندوستان میں پھیلتی رہی۔ ۱۹۰۷ء میں یہ وبا ہندوستان میں اپنے پورے عروج پر تھی جس میں تقریباً ۱۲،۱۵،۸۷ افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ ۶۸ - ۱۹۶۰ء کے دوران یہ مرض ہندوستان میں آخری بار پھیلا تھا۔ طاعون کے جراثیم GM - VE ہوتے ہیں اور یرسینیا پیسٹس (YERSINIA PESTIS) کے نام سے جانے جاتے ہیں ان کی شکل SAFETY PIN جیسی ہوتی ہے مجموعی طور پر طاعون تین قسم کا ہوتا ہے۔

---

* صدر، شعبہ جراحت، اجمل خاں طبیہ کالج، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

BUBONIC PLAGUE (۱)

SEPTICAEMIC PLAGUE (۲)

PNEUMONIC PLAGUE (۳)

(۱)۔ بیو بونک پلیگ ۔ اس میں سب سے پہلے بخار سے شروعات ہوتی ہے جس کے ساتھ ساتھ سردرد اور پیٹ میں درد بھی ہو سکتا ہے کچھ ہی وقت میں جسم میں مختلف جگہوں پر غدود بڑھنے لگتے ہیں جو عموماً ستر فیصد مریضوں میں جنگاسوں میں، لیکن کچھ مریضوں میں بغل اور گلے میں بھی یہ غدود بڑھ سکتے ہیں ان غدود میں چھونے پر بہت تکلیف ہوتی ہے اور اس کے اوپر کی جلد میں سرخی آجاتی ہے ۔ بخار اس میں جاڑے کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے ۔

تقریباً پچاس فیصد لوگوں میں بخار اور غدود کے ساتھ ساتھ پیٹ میں درد بھی ہو سکتا ہے اور متلی یا الٹی اور دست ہو سکتے ہیں جس میں کبھی کبھی خون آجاتا ہے ۔ ۵ سے ۵۰ فیصد لوگوں میں جلد کے اندر بھی BLEEDING ہو سکتی ہے ۔ ۵ سے ۱۰ فیصد لوگوں میں انگلیوں میں جلن یا سڑن پیدا ہونے لگتی ہے اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ جسم کے اندر چھوٹی چھوٹی خون کی رگوں میں خون جم جاتا ہے ۔

اگر علاج نہ کیا گیا تو اس طرح کے مریض عام طور پر ۲ سے ۱۰ دن کے اندر ہلاک ہو جاتے ہیں ۔

(۲) سیپٹیسیمک پلیگ ۔ اس میں مریض کی حالت جلدی بگڑتی ہے جاڑے کے ساتھ بخار شدید سردرد متلی اور الٹی بیہوشی اس کی عام علامات ہیں اس طرح کے مرض میں عام طور سے ۲۵ گھنٹے کے اندر مریض ہلاک ہو جاتا ہے ۔

(۳) نمونک پلیگ ۔ طاعون کے سارے مریضوں میں سے ۱۰ سے ۲۰ فیصد وہ مریض ہوتے ہیں جن کے پھیپھڑے متاثر ہو جاتے ہیں ان لوگوں میں مرض کی شروعات بخار اور نمونیا سے ہوتی ہے مریض کو کھانسی اور بخار رہتا ہے سانس لینے میں دقت ہوتی ہے بلغم میں خون آنے لگتا ہے ان مریضوں سے یہ طاعون بہت تیزی سے اور لوگوں تک پھیل سکتا ہے کیونکہ جب یہ مریض کھانستے ہیں تو بلغم کی چھینٹوں کے ذریعہ ان کے جراثیم اور لوگوں کے سانس کے ساتھ اندر داخل ہو جاتے ہیں ۔ اگر پلیگ کا علاج صحیح طریقہ سے نہ کیا جائے تو کچھ مریضوں میں دماغ کے اوپر کی جھلی میں ورم آنے کی وجہ سے گردن میں سختی اور سردرد شروع ہو جاتا ہے ۔

شاذو نادر پلیگ کے مریضوں میں TONSIL بھی متاثر ہو سکتے ہیں ۔ خون کی جانچ کرنے پر T.L.C بہت بڑھا ہوا ملتا ہے ۔ (۱۵۰۰۰ ۔ ۲۰۰۰۰ /CU.MM) سینے کا ایکسرے کروانے پر پھیپھڑوں میں INFILTRATION اور PLEURAL EFFUSION کی علامات ظاہر ہوتی ہیں ۔ بیو بونک پلیگ ۔ میں جب بڑھے ہوئے غدود چھالوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تب اگر چھالوں کے پانی کو سوئی کے ذریعہ کھینچ کر خوردبین (MICROSCOPE) میں دیکھا جائے تو طاعون کے جراثیم آسانی سے پہچانے جا سکتے ہیں ۔ یہ طاعون کے جراثیم مریض کے بلغم اور خون میں بھی CULTURE کے ذریعہ دیکھے جا سکتے ہیں ۔

تشخیص ۔ آجکل اگر کسی مریض میں بخار کے ساتھ ساتھ کھانسی اور بلغم کے ساتھ خون بھی آرہا ہو یا پھر بخار کے ساتھ ٹانگوں میں بغل میں یا گردن میں گانٹھیں بھی ہوں تو ایسے مریض سے یہ پوچھنا ضروری ہے کہ وہ طاعون سے متاثرہ کسی علاقہ میں تو نہیں گیا تھا اگر وہ ایسے کسی علاقہ سے آیا ہو تو اس کو سب سے پہلے عام مریضوں اور باقی گھر والوں سے علیحدہ رکھنا چاہیے اس

کے ساتھ ہی شہر کے مرکزی دفتر صحت کو فوراً اطلاع کرنی چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ایسے مریض کا فوراً علاج شروع کر دینا چاہیے۔ ANTIBIOTICS کی ایجاد سے پہلے طاعون کے مریض تقریباً ۴۰ فیصد سے لیکر ۱۰۰ فیصد تک ہلاک ہو جایا کرتے تھے لیکن اب علاج سے تقریباً ۹۵-۹۰ فیصد مریض بالکل ٹھیک ہو جاتے ہیں بشرطیکہ علاج صحیح وقت پر شروع کر دیا جائے۔

جو ANTIBIOTICS طاعون کے علاج میں استعمال ہوتے ہیں وہ ہیں STREPTOMYCINE، TETRACYCLINE ، CHOLRAMPHENICOL وغیرہ کچھ SULFA دوائیں جیسے SEPTRAN بھی اس بیماری میں اثر انداز ہوتی ہیں۔ TETRACYCLINE کا INJECTION نسوں میں دیا جاتا ہے اور اس کی مقدار ۵-۱۰ ملی گرام فی کیلو گرام مریض کے وزن کے حساب سے ۶ گھنٹے کے بعد دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ STREPTOMYCINE ۷-۱۰ ملی فی کیلو گرام مریض کے وزن کے حساب سے ہر ۱۲ گھنٹے کے بعد دیا جاتا ہے جب بخار اتر جائے تو STREPTOMYCINE کو روک دیا جاتا ہے۔ لیکن اگلے ۵ دن کے لیے TETRACYCLINE کو جاری رکھا جاتا ہے۔ جو مریض دوائیں منہ کے ذریعے لے سکتے ہیں ان کو یہ دوائیں اسی مقدار میں ہر ۶ گھنٹے بعد کیپسول کی شکل میں دی جاتی ہے۔ اگر مریض کے دماغ کی جھلی پر بھی طاعون کی وجہ سے ورم آگیا ہو تو ایسے مریضوں کو TETRACYCLINE کی جگہ CHLORAMPHENICOL دیا جاتا ہے جن کی مقدار ۱۲-۲۵ ملی گرام فی کیلو گرام مریض کے وزن کے حساب سے دی جاتی ہے۔ مندرجہ بالا علاج کے علاوہ اور دوائیں جیسے بخار اتارنے کی دوا اور وٹامن وغیرہ بھی دیے جا سکتے ہیں۔

علاج کے علاوہ احتیاط بھی ضروری ہے تاکہ یہ مرض اور لوگوں کو نہ اثر انداز کر سکے اس کے لیے سب سے پہلے کوڑے اور گندگی کے ڈھیر جو شہروں اور بستیوں میں جمع ہیں ان کو میونسپلٹی کے ذریعہ صاف کروایا جائے اور ہر آدمی خود یہ دھیان رکھے کہ اپنے گھروں اور آس پاس کے علاقوں کو صاف ستھرا رکھا جائے۔ اور گندی جگہوں پر روزانہ INSECTICIDE چھڑکیں تاکہ کیڑے مکوڑے اور چوہے وہاں پنپ نہ پائیں اور اپنے گھروں میں بھی INSECTICIDES کا چھڑکاؤ کرائیں کھانے پینے کی چیزوں کو ڈھک کر رکھیں۔ باسی کھانا نہ کھائیں۔ صاف پانی پیئیں۔ چوہے مارنے کی دوائیں چھڑکیں اور چوہے مارنے کے بعد ان کو جلا دیں تاکہ ان کے اوپر کے پسو بھی جل کر ختم ہو جائیں ورنہ یہ پسو اور جانوروں یا چوہوں پر چڑھ جاتے ہیں اور یہ بیماری اسی طرح پھیلتی رہتی ہے۔ آجکل کیڑے مکوڑے مارنے کے لیے D.D.T کے علاوہ اور دوائیں استعمال ہو رہی ہیں جیسے KO MALATHION لیکن یہ ساری احتیاط بڑے پیمانے پر اپنانی چاہیے تبھی یہ وبا ختم ہو سکتی ہے۔

اگر کوئی قریبی عزیز یا گھر کا کوئی فرد طاعون کا شکار ہو جائے تو گھر کے باقی لوگ اور اس کے معالج وغیرہ کو ۵ دن کے لیے TETRACYCLINE کے ۵۰۰ ملی گرام کے کیپسول ہر ۶ گھنٹے کے بعد یا CIPLIN D.S کی ایک گولی ہر ۱۲ گھنٹے کے بعد لینی چاہیے اس سے ان لوگوں کی طاعون سے بچت ہو سکتی ہے۔

طاعون کا ٹیکہ ابھی افراط سے نہیں مل پا رہا ہے۔ ورنہ یہ ٹیکہ بھی اس مرض سے بچت کے لیے وقتی طور پر کارگر ہوتا ہے۔

وقار احمد انصاری *

تلسی

تلسی یا Basil بہت ہی عام جڑی بوٹی ہے۔ ہندو لوگ تو اس کی ادویاتی خصوصیات اور دوسرے فوائد کی وجہ سے اپنے گھروں میں یہ پودا اونچی جگہوں پر لگاتے ہیں۔ صبح صبح اس مقدس پودے کی پوجا کرتے ہیں۔ عام گھروں میں یہ پودا گملوں، خالی ڈبوں تک میں لگایا جاتا ہے لیکن ہماری آج کی تہذیب، ہنگامی زندگی اور جدیدیت نے فوائد سے بھرے اس خزانے کو بھلا دیا ہے۔ اس کا نباتاتی نام Qeimum Sanctum ہے۔ اس کا ہر حصہ کسی نہ کسی مرض میں مفید ہے۔ ہندو لوگ تو تبرک کے طور پر اس کی پتی ایک دوسرے کو پیش کرتے ہیں۔ ہندو روایت کے مطابق بھگوان شری کرشن کی مالا میں تلسی کی پتی ضرور ہوتی تھی۔ ہندی ادب اور ویدوں میں جگہ جگہ اس کے فوائد کا تذکرہ آیا ہے۔ فائدے کے لحاظ سے اس جڑی بوٹی کے مقابلے میں اور کوئی اتنا عام پودا نہیں ہے۔ آیورویدمیں اس کی پتی۔ جڑ۔ بیج۔ چھال، عرق اور گودے سے مختلف علاج ہوتا ہے۔ اس کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ سفید اور کالی۔ کالی تلسی سفید کے مقابلے بہتر ہوتی ہے۔ یہ تھوڑی تلخ خوشبودار اور ہاضم ہوتی ہے۔ اس کی چند طبی خصوصیات یہ ہیں۔ (۱) بسیار خوری کی وجہ سے متلی، قے یا بدہضمی کی شکایت ہو تو ایک گلاس پانی میں اس کی چند پتیاں، ادرک، ایک چھوٹی الائچی اور تھوڑی سی سونف کو جوش دے کر ٹھنڈا کر لیں۔ ایک اونس دن میں تین بار استعمال کریں۔ (۲) تلسی کی پتی کا عرق ہمراہ شہد گردے اور پتھری کے لیے مفید ہے۔ چھ ماہ تک استعمال کیا جائے تو پتھری ٹوٹ کر پیشاب کے ذریعہ نکل جاتی ہے۔ (۳) Blood Cholestrol اور قلبی امراض میں اس پتی کا استعمال مفید ثابت ہوتا ہے۔ پیشاب بھی کھل کر آتا ہے۔ (۴) جسمانی سوجن اور کسی بھی قسم کی جلن، جسم کا زہریلہ مادہ اور دوسرے جسمانی اعضاء کو صحیح طریقہ پر کام کرنے میں اس کی پتی بے حد معاون ثابت ہوتی ہے۔ (۵) پتیوں کو دھوپ میں سکھا کر دانت صاف کیا جاتا ہے۔ اگر اسی میں سرسوں کا تیل ملا کر استعمال کیا جائے تو مسوڑھوں کو طاقت ملتی ہے اور منہ کی بدبو بھی ختم ہو جاتی ہے۔ (۶) پتی کو کچل کر، صندل ملا کر سر درد میں استعمال کرنے سے راحت ملتی ہے۔ گرمی اور تھکان سے بھی راحت ملتی ہے۔ (۷) ایک چمچہ پتی کا عرق۔ اتنا ہی ادرک کا عرق اور اتنا ہی شہد ملا کر استعمال کرنے سے

باقی صفحہ ۴۸ پر

* 34 غفار منزل ایکسٹنشن، جامعہ نگر نئی دہلی 110025

ڈاکٹر محمد اقتدار حسین فاروقی *

عنبر کی اصلیت اور دینی و سائنسی اہمیت

عجیب بات ہے کہ بعض نباتاتی یا غیر نباتاتی اشیاء جو زمانہ قدیم میں عام طور سے دستیاب تھیں لیکن ان کی اصلیت کے بارے میں تفصیلات کا علم بہت کم تھا وہ آج کے ترقی یافتہ دور میں بھی معمہ بنی ہوئی ہیں اور ان کی سائنسی پہچان سے اکثر لوگ ناواقف ہیں۔ ایسی ہی ایک شے عنبر ہے جس کی بابت پرانی طبی کتابوں میں متضاد باتیں لکھی گئیں ہیں۔ کچھ میں اس کو ایک نباتاتی شے بتایا گیا ہے تو کچھ میں غیر نباتاتی چیز سے تعبیر کیا گیا ہے۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ قدیم تاریخی، طبی اور دینی کتابوں میں عنبر کا ذکر تو کثرت سے موجود ہے لیکن اس کی پہچان کی نسبت تذکرے بہت ہی کم ہیں اور جو تذکرے ہیں بھی تو ان میں تضاد ملتا ہے۔ اسی لیے موجودہ زمانہ کی انگریزی، اردو، فارسی اور عربی لغات میں عنبر کے معنی اور مفہوم ایک سے زیادہ ہیں۔ لیکن اس سے قبل کہ عنبر کی اصلیت پر روشنی ڈالی جائے مناسب ہوگا کہ ان دینی حوالوں کا جائزہ لیا جائے جن میں اس کا ذکر آیا ہے۔

سنن نسائی کی ایک حدیث میں حضرت سعد بن علی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عائشہ سے پوچھا۔ کیا رسول اللہ خوشبو لگاتے تھے۔ انھوں نے کہاں ہاں مردانہ خوشبو۔ مشک و عنبر (سکتہ العنبر) صحیح بخاری شریف میں ایک لفظ عبیر کا استعمال ہوا ہے جس کا ترجمہ کچھ علماء کرام نے عنبر سے کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔ مثلاً کتاب الصیام میں حضرت حمید سے روایت کردہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ کوئی حریر و دیبا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہتھیلی سے نرم اور کسی بھی مشک و عنبر (مسکتہ ولاعبیرۃ) کی خوشبو آپ کی خوشبو سے بڑھ کر نہ تھی۔

صحیح بخاری شریف میں کتاب المغازی اور کتاب الذبائح کی تین احادیث میں (جو مکررات ہیں) عنبر کو ایک مچھلی بتایا گیا ہے۔ کتاب المغازی کے باب ۵۲۳ (حدیث ۱۴۸۹) میں ارشاد ہوا ہے کہ عمرو بن دینار کا بیان ہے کہ میں نے جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تین سو سوار روانہ فرمائے اور ہمارا امیر ابو عبیدہ کو مقرر فرمایا گیا ہمیں

---

* اسسٹنٹ ڈائرکٹر، نیشنل بوٹنیکل انسٹی ٹیوٹ، لکھنؤ

قافلہ قریش کی گھات میں روانہ کیا گیا تھا۔ ہم نصف ماہ تک ساحل سمندر پر پڑے رہے اور ہمیں سخت بھوک کا سامنا ہوا۔ یہاں تک کہ ہم پتے کھا کر وقت گذارنے لگے اسی لیے ہمارے لشکر کا نام پتوں والی فوج پڑ گیا۔ پس سمندر نے ہمارے لیے ایک مچھلی باہر پھینک دی جس کو عنبر (بخاری شریف العنبر) کہا جاتا ہے۔ تو ہم پندرہ روز تک اس میں سے کھاتے رہے اور اس کی چربی ملتے رہے۔ یہاں تک کہ ہمارے جسم پہلی حالت پر آگئے۔ پس حضرت ابو عبیدہ نے اس کی (عنبر) ایک پسلی کھڑی کروائی اور اس کے نیچے سے ایک سوار نکل گیا۔

انگریزی، اردو اور فارسی کی مشہور لغات میں عنبر (انگریزی Amber) کو ایک خوشبو دار شے بتایا گیا ہے جس کی پہچان مختلف انداز سے بیان کی گئی ہے۔ لیکن عربی کی مستند لغت المنجد میں عنبر کو خوشبو دار شے کے علاوہ ایک قسم کی مچھلی بھی کہا گیا ہے المنجد اور کتاب المغازی کی مندرجہ بالا حدیث کی روشنی میں۔ بہتر ہوگا کہ پہلے عنبر بہ معنی مچھلی کا جائزہ لیا جائے۔ اس کے بعد ہی اس کے خوشبو دار شے ہونے کی اصلیت بیان کی جائے۔

عنبر مچھلی اصل میں وہیل مچھلی کی ایک قسم ہے جو منطقہ حارہ کے سمندروں میں عام طور سے پائی جاتی ہے، یہ انگریزی میں اسپرم وہیل (SPERM WHALE) کہلاتی ہے۔ وہیل مچھلی کی ایک درجن سے زیادہ قسمیں دنیا کے سمندروں میں پائی جاتی ہیں۔ ۱۹۰۳ء میں بحر اوقیانوس میں ایک وہیل مچھلی پکڑی گئی تھی جس کی لمبائی ایک سو گیارہ فٹ ناپی گئی تھی اور جس کا وزن نوے ٹن تھا۔ عرب کے ساحلی سمندروں میں پائی جانے والی نر اسپرم وہیل کی اوسط لمبائی ستر فٹ ہوتی ہے۔ دنیا بھر کی وہیل کی ساری قسموں میں صرف عنبر (اسپرم وہیل) ہی ایک ایسی مچھلی ہے جس کا حلق اتنا کشادہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی اس کے راستہ مچھلی کے پیٹ میں بہ آسانی داخل کیا جا سکتا ہے۔ یہ سائنٹفک حقیقت مختلف تجربات سے ثابت کی جا چکی ہے۔ غالباً یہی وہ مچھلی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں سورۃ الصفت کی آیت نمبر ۱۳۹ تا ۱۴۶ میں کیا گیا ہے۔ ان آیات میں فرمایا گیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے جب اپنی قوم سے پریشان ہو کر ایک کشتی پر سوار ہو کر سفر اختیار کیا اور کشتی والوں نے اپنی مصلحتوں کی خاطر ان کو سمندر میں ڈھکیل دیا تو ایک مچھلی نے ان کو نگل لیا اور بعد میں کسی ساحل پر جا کر اگل دیا۔

عنبر مچھلی کا اوسط وزن ساٹھ ٹن ہوتا ہے جس کا نصف یعنی تقریباً تیس ہزار کیلو گوشت کی شکل میں ہوتا ہے باقی پسلیوں، خون وغیرہ کے طور پر۔ گویا کہ گوشت کے اعتبار سے ایک عنبر مچھلی تین ہزار اوسط وزن کے بکروں کے برابر کہی جا سکتی ہے۔ بخاری شریف کی حدیث میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابو عبیدہ کے تین سو سواروں نے پندرہ دن تک ایک ہی مچھلی کا گوشت خوب سیر ہو کر کھایا۔ اگر ایک سوار (سپاہی) کی دن بھر کی زیادہ سے زیادہ خوراک چار پونڈ (دو کیلو) گوشت تسلیم کر لی جائے تو بھی تین سو لوگوں نے پندرہ دن میں صرف نو ہزار کیلو گوشت بھون کر کھایا ہوگا جو ایک نسبتاً چھوٹی عنبر مچھلی میں بہ آسانی دستیاب ہوا ہوگا یا اگر بڑی عنبر ہوگی تو باقی گوشت بچ رہا ہوگا۔ یہاں اس سائنسی مشاہدہ کا ذکر بھی مناسب ہے کہ وہیل مچھلیاں جب اپنی جسامت یا زیادتی عمر سے اکتا جاتی ہیں تو اکثر سمندر کے کنارے زمین پر جا پڑتی ہیں اور وہیں دم توڑ دیتی ہیں، کبھی کبھی تو کئی مچھلیاں ایک ساتھ اس طرح خود کشی کر لیتی ہیں۔ وہیل کی یہ خصلت بخاری شریف کی حدیث سے صاف ظاہر ہوتی ہے کیونکہ بغیر کسی کوشش اور مہم کے حضرت عبیدہ کی فوج کو یہ مچھلی خود بخود میسر ہو گئی جو یقیناً خود

کشتی کی غرض سے ساحل سمندر پر آن لگی ہو گی ۔جہاں تک حدیث میں روایت ہے کہ عنبر کی پسلیوں کی اونچائی اتنی تھی کہ اس کے نیچے سے ایک سوار گزر گیا تو اس کا اندازہ ہر وہ شخص لگا سکتا ہے جس نے یورپ کی مختلف میوزیم میں وہیل کا ڈھانچہ دیکھا ہو یا پھر اس کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ کسی مچھلی کی تقریباً ساٹھ فٹ لمبی پسلیاں کیسی ہوں گی جن کا وزن تقریباً آٹھ ٹن یعنی لگ بھگ نو ہزار کیلو ہو۔

وہیل کو عام طور سے مچھلی کہتے ہیں کیونکہ یہ سمندر ہی میں پائی جاتی ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کا اصل مچھلیوں سے کوئی بھی تعلق نہیں ہے ۔ درحقیقت وہیل کا شمار دودھ دینے والے جانوروں میں ہوتا ہے ۔جن کو میمل (MAMAL) کہا جاتا ہے ۔ سمجھا جاتا ہے کہ کئی لاکھ سال قبل وہیل زمین پر ہی رہتے تھے لیکن بعد میں اپنے بڑھتے ہوئے وزن اور جسامت کی بنا پر سمندر میں تیرتے رہنا ان کو زیادہ آسان معلوم ہوا اور وہ سمندر ہی میں رہنے لگے ۔ لیکن میمل ہونے کی بنا پر ان کو ناک سے سانس اب بھی لینا پڑتی ہے جس کے لیے وہ ہر بیس سے پچاس فٹ بعد سمندر کی سطح پر آتے ہیں۔

فارسی کی بعض اہم لغات میں عنبر کے معنی کہربا کے دیئے گئے ہیں یعنی ایک ایسی شے جو گھاس کو اپنی طرف کھینچتی ہے ۔عربی لغات میں مچھلی کے علاوہ عنبر (عربی میں عمبر بھی لکھتے ہیں) کو قرن البحر بھی کہا گیا ہے جس کے معنی سمندر کے سینگ یا سمندر کی زلف کے ہیں ۔اسے مصباح الروم بھی بتایا گیا ہے ۔یعنی روم کا چراغ ۔عنبر کا ایک عربی نام القطریون بھی بتایا گیا ہے ۔ عربی، فارسی اور اردو کی لغات میں عنبر کو ایک ایسی خوشبو کہا گیا ہے جس کا رنگ کالا ہوتا ہے ۔ برخلاف اس کے انگریزی کی ڈکشنریاں عنبر کو سنہری رنگ کا ایک سخت مادہ بتاتی ہیں ۔عنبر کا یہی مفہوم بائیبل کی کتاب اسکائیل کی تین آیات سے بھی ظاہر ہوتا ہے جہاں سنہری رنگت کا ذکر ہے ۔

سائنسی اعتبار سے عنبر کی دو قسمیں ہوتی ہیں ایک کا ذریعہ نباتات ہیں اور دوسری کا بعض مچھلیاں ۔خاص طور سے اسپرم وہیل مچھلی جس کا ذکر عنبر نام سے بخاری شریف میں کیا گیا ہے ۔نباتات سے حاصل کردہ عنبر اصل میں وہ گوند ہے جو بالٹک سمندر کے جنوبی ساحلوں میں معدنی شے کے طور پر دستیاب ہوتا ہے یہ چیڑ کی ذات کے پودے (Pines) سے نکلا ہوا تارپین تھا جو لاکھوں سال قبل زمین پر جمع ہو گیا اور معدنی گوند کی شکل اختیار کر کے سخت ہو گیا۔اس کا پتہ حضرت عیسی کے دور سے بہت قبل ہی مصر کے لوگوں نے لگا لیا تھا ۔سولہویں صدی کے بعد اس کے ذخائر بڑے پیمانے پر دریافت کیے گئے یہ عنبر یورپ میں بہت مقبول ہوا ۔ یہ خوشبو دار بھی تھا ۔اور سخت اور سنہرا ہونے کی بنا پر مختلف مصنوعات کے بنانے میں کام آتا تھا ۔یورپ کے رؤسا اس کا سگار بنواتے تھے ۔ شہزادیاں اس سے بنا زیور پہنتی تھیں ۔یوں تو یہ عنبر آج بھی میسر ہے لیکن اس کے ذخائر تقریباً ختم ہو چکے ہیں ۔یورپ کے بازاروں میں آج کل ایک کیلو عنبر کی قیمت تقریباً دس ہزار ڈالر (ڈھائی لاکھ روپیہ) بتائی جاتی ہے ۔ معدنی عنبر میں کسی چیز کو کھینچنے کی طاقت ہوتی ہے ۔رگڑنے سے اس میں کرنٹ سا پیدا ہو جاتا ہے ۔اسی لیے غالباً فارسی کی بعض مستند لغات میں عنبر کے معنی کہربا کے دیئے گئے ہیں ۔پرانے اعتقاد کی رو سے عنبر سے بنا تعویذ محبوب کو اپنی طرف متوجہ کرنے اور رغبت پیدا کرنے کے لیے بڑا کارآمد ہے ۔

عنبر کی دوسری قسم وہ ہے جو اسپرم وہیل کے جسم سے پیدا ہوتی ہے ۔ان مچھلیوں کی آنتوں میں ایک خاص قسم کا زخم پیدا ہو جاتا ہے اور ان میں مواد اکٹھا ہونے لگتا ہے ۔ یہ مواد جب بڑھتا ہے اور زخم پھوٹتا ہے تو پورا مادہ مچھلی کے منہ سے

باہر آ کر سمندر کے پانی سے مل کر جم جاتا ہے۔ یہ مادہ سمندر میں تیرنے لگتا ہے اور اس میں خوشبو پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اور موم کے مانند سخت ہوتا ہے جس میں اسی فیصد کولیسٹرول (CHOLESTROL) پایا جاتا ہے سیاہ ہونے کی بنا پر اسے انگریزی میں (AMBERGRIS) کہتے ہیں کیونکہ انگریزی اور فرانسیسی میں GRIS کے معنی بھوری اور کالی رنگت کے ہیں۔ عربی میں مچھلی سے پیدا شدہ عنبر پر بو علی سینا نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے اسی لیے کئی طبی ادویات کا عنبر اہم جز ہے۔

یہ بتانا تو مشکل ہے کہ مصر، عرب اور روم وغیرہ میں سنہرا عنبر پہلے دریافت ہوا یا سیاہ عنبر لیکن ایک بات یقینی ہے کہ سیاہ عنبر کی تیاری میں مصر اور عرب کے لوگ بڑی مہارت رکھتے تھے۔ سنہرے عنبر کی تجارت مصر، یونان اور روم میں بڑے پیمانے پر ہوتی تھی۔ جبکہ سیاہ عنبر کے مراکز ایران، مصر اور عراق میں ہوا کرتے تھے۔ فی زمانہ معدنی ذخائر کے ختم ہونے اور عنبر مچھلی کی تعداد بری طرح گھٹنے کی بنا پر دونوں اقسام کے عنبر کی تجارت تقریباً ختم ہو گئی ہے اور اس کی جگہ مصنوعی عنبر نے لے لی ہے یا بعض خوشبودار لکڑیوں کے کوئلوں کو بھی عنبر کا نام دے کر ان کی تجارت کی جاتی ہے۔

انگریزی، اردو اور فارسی ادب میں عنبر کا لفظ ادیبوں اور شاعروں کے لیے دلفریبی کا باعث رہا ہے حالانکہ انگریزی میں یہ دلفریبی عنبر کی خوشبو اور سنہرے پن کی بنا پر ہے۔ جبکہ اردو اور فارسی میں خوشبو اور سیاہی کی وجہ سے ہے۔ عنبریں، عنبر آگیں، عنبر آلود، عنبر بار، عنبر پوش، عنبر دان اور گیسوئے عنبر وغیرہ نہ جانے کتنی تشبیہات ہیں جو اردو اور فارسی ادب کا حصہ ہیں۔ گیسوئے عنبر تو نہ جانے کتنے اردو شاعروں کا موضوع سخن رہا ہے لیکن غالباً ان شعراء نے اس سے مراد خوشبودار سیاہ زلفوں سے لیے ہیں۔ بظاہر اس کے امکانات بہت کم ہیں کہ کچھ اردو شعراء یورپی ذوق رکھتے ہوں اور گیسوئے عنبر کہہ کر سنہری زلفوں کو اپنے تصور میں لاتے ہوں۔

باقی صفحہ ۴۲ کا

کھانسی، زکام، گلے کی خراش، موتیابند، بخار اور سانس کی بیماریوں میں بے حد مفید ہے۔ (۸) جلدی امراض میں اس کا گودا پتوں کے عرق میں ملا کر لگایا جاتا ہے۔ اس کا گودا، عرق اور زیرہ آٹے میں ملا کر روٹی پکائی جائے تو ذائقہ بہت اچھا ہوتا ہے۔ پتوں کو جوش دے کر معمولی بخار میں دیا جاتا ہے۔ بیج اور جڑ کو جوش دے کر پلانے سے خوب پسینہ آتا ہے اور ملیریا کا اثر ختم ہو جاتا ہے۔ تلسی کی چائے تو عام ہے۔ چند پتوں کو دھو کر، کشمش یا کھجور یا دونوں چیزیں یا صرف گڑ سے چائے بنا کر دودھ کے ساتھ بہت ذائقے دار ہوتی ہے۔ پانچ چھ پتوں کو خالی پیٹ چبا کر پانی پینے سے مکمل قوت حیات بڑھتا ہے۔ اس کا پودا جہاں ہوتا ہے۔ وہاں مچھر اور دوسرے کیڑے مکوڑے نہیں آتے۔ اس کا عرق زہریلے کیڑوں کے کاٹنے یا ڈنک مارنے میں مفید ہوتا ہے۔ اس کی خوشبو کی وجہ سے سانپ اور دوسرے رینگنے والے کیڑے اس پاس نہیں آتے۔ اس کی پتیوں میں ایک خاص قسم کی مہک ہوتی ہے جس سے آس پاس کا ماحول خوشگوار ہوتا ہے۔ فضا صاف ہوتی ہے۔ تلسی کا پودا لگانا بہت آسان ہے۔ زمین میں بیج ڈالتے ہی چند دنوں میں پودا نکل آتا ہے اس کے بعد ضرورت کے مطابق برابر پانی دینا چاہیے لیکن ضرورت سے زیادہ پانی دینے سے اس کا پودا سوکھنے لگتا ہے۔ اس کی پودھ بھی لگائی جا سکتی ہے۔

(کمانڈر) ایس۔ این۔ اے فردوسی *

بازگشت

کرنل صاحب نے میرے لیے میکڈانلڈ ہوسٹل تجویز فرمایا۔ اس وقت اس ہوسٹل میں بیرون ممالک کے طلبہ کافی رہتے تھے۔ آفتاب ہال کے پرووسٹ (قاری) محمود صاحب تھے۔ کرنل صاحب نے وہیں سے فرمایا، محمود میں تمہیں ایک اچھا طالب علم دے رہا ہوں اس کو میکڈانلڈ دے دو، (قاری) محمود نے فرمایا، ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ بھیج دو، لیجئے صاحب ساری کارروائی آدھے گھنٹہ میں نمٹ گئی اور خاکسار کھانے کی پرچی اور داخلہ کی چٹ لے کر باہر آگیا۔

شام کو وارڈن صاحب سے ملنے گیا، اس وقت میکڈانلڈ کے وارڈن (آج کے پروفیسر) اے۔ ایچ حقی صاحب تھے۔ موصوف نہایت کم گو اور کافی سنجیدہ مزاج تھے۔ اتفاق سے آفتاب ہال کے سینئر ہال مظہر صاحب بھی میکڈانلڈ میں ہی رہتے تھے۔ یہ کافی اسمارٹ شخصیت کے مالک تھے۔ دراز قد، چہرہ لمبا، رنگ قدرے دبا ہوا مگر چہرہ باوقار تھا۔ میکڈانلڈ کے سینئر ہاؤس (مانیٹر) اسرار صاحب تھے۔ پستہ قد، رنگ کافی کھلتا ہوا۔ مگر تھے یہ بھی کافی حد تک کم گو۔ یہ شاید مراد آباد کے آس پاس کے رہنے والے تھے۔ ان کے روم پارٹنر ایک صاحب تھے جن کا نام فیروز تھا۔ یہ غالباً فزکس (ایم۔ ایس۔ سی فائنل) کے طالب علم تھے۔ یہ کافی سینئر تھے اور بہت اسمارٹ۔ ایک اچھے طالب علم اور ساتھ ساتھ اچھے کھلاڑی بھی، شام کو بیڈمنٹن کورٹ ہو یا والی بال کا کورٹ ہو، فیروز صاحب کی حاضری ضروری تھی۔ یہ وارڈن سے کافی قریب تھے اور ہوسٹل کے انتظامی امور اکثر انجام دیتے تھے

جس وقت میں حقی صاحب کے پاس گیا، اس وقت فیروز صاحب بھی وہاں موجود تھے۔ حقی صاحب نے میری پرچی ان کے سامنے بڑھا دی۔ وہ نوواردوں کے نام کا اندراج ایک رجسٹر میں کر رہے تھے۔ چنانچہ میرا نام بھی لکھ لیا گیا اور مجھ سے کہا گیا کہ اپنا سامان ۱۵ نمبر کمرے میں لے آیئے۔ یہ کمرہ مغرب کی جانب کونے میں ایک بڑا ہال ہے۔ اس میں پہلے سے تین حضرات موجود تھے۔ پہلے تو میاں حامد صاحب (جو گھر پر جانی میاں کے نام سے جانے جاتے ہیں) کا داخلہ بھی I.SC. میں ہوا تھا۔ یہ سنبھل کے رہنے والے تھے۔ اور خود پرووسٹ صاحب (قاری) محمود صاحب ان کے لوکل گارجین تھے دوسرے مرزا

---

*41/110 دودھ پور، سول لائنز، علی گڑھ

صاحب یہ ممتاز سے یہاں تبادلہ چاہتے تھے۔ یہ بی۔ایس سی (فائنل) کے طالب علم تھے اور تیسرے، جینگو نتا ئل یہ افریقی نیگرو تھے اور بی۔اے (فائنل) کے طالب علم تھے یہ ممتاز سے یہاں تبادلہ کے خواہاں تھے۔ جیسا کہ لکھ چکا ہوں اس زمانہ میں طلبہ کو سارا فرنیچر یعنی پلنگ، میز، کرسی، ریک اور مچھر دانی کے ڈنڈے خود ہی خریدنے ہوتے تھے۔ اس خاکسار نے بھی خرید سے اور لے آیا۔ گو کہ کھانا ڈائننگ ہال میں کھانا لازمی تھا مگر اس وقت تک ڈائننگ ہال شروع نہیں ہوا تھا لہذا ہمارے بیرے کھانا کمروں پر ہی لے آتے تھے۔

اس وقت لوگوں کو کھانا اور ناشتہ سب ڈائننگ ہال سے ہی ملتا تھا۔ ناشتہ میں دو مٹری (بسکٹ)، آدھا ٹکیا مکھن اور دو پیالی چائے۔ چائے آج کی طرح گلاس یا پیالی میں نہیں ملتی تھی بلکہ ہر لڑکے کا ٹی پاٹ الگ ہوتا تھا اور اسی طرح دودھ الگ دودھ دان میں اور شکر الگ ہوتی تھی۔ کھانے میں وہی ابا سید کا فارمولا دو روٹی اور دو بوٹی، ملا کرتا تھا۔ مگر روٹی گو کہ ڈنلپ (خمیری) ہوتی تھی مگر خاصی بڑی ہوتی تھی۔ اگر کسی کا پیٹ اس میں نہ بھرتا تو وہ وارڈن سے ایک اور روٹی کی منظوری کروالیتا۔ روٹی کی یہ قید صرف کمرے کے لیے تھی۔ ڈائننگ ہال میں جتنی چاہو کھالو کوئی قید نہ تھی۔ گوشت کے ساتھ دال بھی ملتی اور کبھی کبھی سبزی بھی کبھی کبھار انڈا بھی مل جاتا تھا۔ ہفتہ میں ایک دن بریانی اور ایک دن سوئٹ ڈش ملتی تھی۔ شاہی ٹکڑا یا کھیر۔ کسی کی سوئٹ ڈش غائب کرلینا دلچسپ مشغلہ سمجھا جاتا۔ یہ ہمیشہ ہم پلہ دوستوں کے لیے جائز تھا۔ سینئر جونئیر میں یہ حرکت کبھی نہ ہوتی بلکہ اس سے پرہیز کیا جاتا۔ طلبہ سے کھانے کا جو چارج لیا جاتا اس میں سال کے تین ڈنر شامل تھے پہلا سرسید ڈے کا ڈنر، دوسرا نمائش کا (حلوہ پراٹھے والا) ڈنر اور تیسرا ہر ہال کا اپنا اپنا ڈنر۔ الگ الگ ہالوں کے کھانے کے ریٹ الگ الگ تھے۔ مثلاً ایک زمانہ میں ماریسن کورٹ کے رہنے والوں سے صرف ۱۲ روپے ماہانہ لیا جاتا تھا۔ جو بڑھتے بڑھتے ۱۹۵۰ء میں ۲۲ روپے ماہانہ ہو گیا تھا۔ میکڈانلڈ، ممتاز، آفتاب یا ایس۔ایس ہال اور وی۔ایم ہال میں ۱۷ روپے لیے جاتے تھے۔

ایک اور خاص بات یہ تھی کہ اگر کوئی طالب علم بیمار ہو جاتا تو اس کو ڈاکٹر جو بھی کھانا بتاتا وہ اس کو ڈائننگ ہال سے دیا جاتا۔ اکثر دودھ، ڈبل روٹی یا کھچڑی وغیرہ دی جاتی۔ یہ کھانا (اس وقت کے اسپتال اور آج کے) ہیلتھ سروس کے ڈاکٹر تجویز کرتے اگر طالب علم اسپتال کے ان ڈور میں داخل کیا جاتا تو یہی کھانا اس کا ڈائننگ ہال اس کو وہیں اسپتال میں مہیا کرتا۔

بعض لوگ ناشتہ کے علاوہ دودھ بھی لیتے۔ یہ دودھ یا تو انہیں بیرا اپنے پاس سے لا کر دیتا ورنہ وہ کیو نسٹر (آج کا سنٹرل ڈیری فارم) کی بوتل لیتے۔ اس کو بھی وہی بیرا گرم کرکے لادیتا۔ کمروں پر ہیٹر رکھنا یا استعمال کرنا جرم تھا۔ صرف بعض سینئر چوری چھپے رکھتے تھے۔ صبح کی چائے تو لوگوں کو ناشتہ کے ساتھ مل جاتی تھی مگر شام کی چائے کا مسئلہ تھا یا کبھی کبھار اس کے علاوہ بھی طلب ہوتی تو بیرون کا سہارا لیا جاتا یا پھر شمشاد کا۔ شمشاد میں بہت سے ہوٹل تھے مگر ان کا اپنا ایک انداز تھا۔ کیفے ڈی صابری یا کیفے ڈی جمیل (جو اب چیمپئن ڈیری اور کئی کتابوں کی دو کانوں میں تبدیل ہو چکے ہیں) اچھے لیکن مہنگے ہوٹل تھے۔ اکثر چھوٹے ہوٹل سڑک کے کنارے ہی میز کرسی لگاتے تھے مگر یہ سب کچھ چاروں طرف لگے پردوں کے درمیان ہوتا۔ چائے یہاں بھی اسی طرح پوٹ میں اور دودھ اور شکر الگ الگ دیئے جاتے۔ علی گڑھ کا ایک پرانا رواج یہ تھا کہ خواہ طلب کتنی ہی زور کی ہو، چائے کبھی تنہا نہیں پی جائے گی۔ ہر چائے کا خواہاں ساتھی ڈھونڈتا۔ جو سینئر

ہوتا وہ بل ادا کرتا۔ اگر دونوں برابر کے دوست ہوتے تو حساب دوستاں در دل۔ شمشاد کے چائے کے مشہور ہوٹلوں میں ٹی ہاؤس، جہاں لپٹن گرین لیبل ملتی تھی۔ رحمت کا ہوٹل (جو اختر پرنٹنگ کے برابر تھا۔) اس میں اب بجلی کے سامان کی دوکان ہے، یلسین اور انوار کا ہوٹل (جن میں سے اب انوار کے لوگوں نے دودھ اور مٹھائی کی دوکان کھول لی ہے۔) شامل تھے۔ رحمت ہوٹل میں گرمیوں میں لسی بھی ملتی۔ سب سے پہلے رحمت نے ہی چاکلیٹ برفی اور روح افزا لسی شروع کی تھی۔ شمشاد کے علاوہ سلیمان ہال کے سامنے (جہاں آج کل ایک کتاب کی دوکان ہے) کئی اچھے ریستوران کھلے اور بند ہو گئے۔ یونیورسٹی ڈاکخانہ کے پیچھے کیفے ڈی پھوس (یہ اب بھی وہیں قائم ہے۔) اور یونین کے سامنے کیفے ڈی لیلیٰ بھی کافی مشہور تھے۔ کیفے ڈی پھوس کی برفی اور نمک پارے اپنی شہرت میں ثانی نہیں رکھتے تھے۔ چائے کے علاوہ اگر کچھ کھاتا ہوتا تو وہ نمک پارے اور برفی ہی ہوتی۔ عام ہوٹلوں میں چائے (دو کپ پاٹ میں الگ الگ) دو آنے کی اور ٹی ہاؤس میں گرین لیبل کی تین آنے کی ملا کرتی تھی۔

ٹی ہاؤس دراصل اردو ڈیپارٹمنٹ کے ایک ملازم جو شام کو شمشاد میں سیخ کباب لگایا کرتے تھے، ان کا قائم کردہ ہے۔ چونکہ مرحوم نسیم قریشی صاحب خود چائے کے بڑے رسیا تھے اور ہمیشہ گرین لیبل ہی پیا کرتے تھے، اس زمانے میں اردو میں ریسرچ کر رہے تھے۔ مرحوم نے ہی ان کی ہمت افزائی کی جس کی بناء پر انہوں نے اپنے صاحبزادے کو وہ دوکان کھلوادی۔ صاحبزادے میاں مستقیم اس وقت طالب علم تھے جو بعد میں ترقی کرتے کرتے ماشاءاللہ ابھی حال تک تہذیب الاخلاق کے سرکولیشن انچارج تک پہنچے تھے۔

ان کے علاوہ علی گڑھ اسٹیشن پر منگل سین کا چائے کا اسٹال تھا جو آج بھی پلیٹ فارم نمبر ۲ پر مغرب کی جانب موجود ہے۔ وہاں طلبہ یا تو گھر سے آتے جاتے یا پھر کسی سینئر کے ساتھ جا کر چائے پیتے۔ یہ بھی ایک ٹریڈیشن تھا کہ ہر جانے والا پہنچانے والوں کو اسٹیشن پر کم از کم چائے ضرور پلائے گا۔ منگل سین کے یہاں اس وقت (۱۹۵۰ء میں) ایک پیالی چائے ایک آنہ کی ملتی تھی۔ میرے بعض سینئرز نے بتایا کہ تقسیم وطن سے پہلے یہ صرف دو پیسے کی ہوتی تھی۔ آج ۱۹۹۴ء میں وہی چائے ڈیڑھ روپے کی ہے۔

مجھے ہوسٹل میں آئے ابھی ۳-۴ دن ہی ہوئے تھے، شام کا وقت تھا میں مغرب کی نماز پڑھ کر اپنے کمرہ میں آیا اور کھانا کھانے کی تیاری کرنے لگا۔ یکایک بجلی گل ہو گئی۔ باہر کچھ شور بھی سنائی دیا۔ چونکہ شام کا وقت تھا۔ زیادہ تر لوگ باہر یا کامن روم گئے ہوئے تھے اس لیے مشکل ۱۰-۱۲ طلبہ رہے ہوں گے جو کمرہ نمبر ۷ کی طرف بھاگ رہے تھے۔ میں بھی وہاں پہنچا تو دیکھا کہ فیروز صاحب دروازہ کا شیشہ توڑ کر اسے اندر سے کھولنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ دو چار منٹ بعد وہ کھولنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کمرہ میں ایک صاحب سید علی رضا رہا کرتے تھے یہ بی۔اے (فائنل) کے طالب علم تھے اور سینئر ہونے کے باعث انہیں یہ کمرہ اکیلے (سنگل سیٹڈ) دیا گیا تھا۔ یہ شہر سے اپنے کسی دوست کے ساتھ واپس ہوئے تھے اور اس سے یہ کہہ کر آئے تھے کہ تم کامن روم چلو میں کھانا کھا کر آتا ہوں۔ دیگر سینئر طلبہ کی نقل میں یہ بھی چوری چوری ہیٹر رکھتے تھے۔ ہیٹر کی جگہ دراصل یہ لوگ صرف اس کی پلیٹ رکھتے تھے اور استعمال کے بعد پھر چھپا کر رکھ دیتے تھے۔ ہیٹر کا پلگ انہوں نے بیچ میں لٹکتے ہوئے بلب میں ایک ایڈیپٹر لگا کر لگا دیا تھا۔ لیکن جب اس میں کرنٹ نہیں آیا تو جس طرح انہوں نے اپنے دیگر

ساتھیوں کو دیکھا تھا کہ وہ لوگ بیچ میں کوائل کو کسی چیز سے ہلاتے ہیں تو جل جاتا ہے، انہوں نے بھی اپنے ہاتھ میں موجود چمچہ سے کوائل کو ہلانا شروع کیا۔ نتیجہ کے طور پر شدید کرنٹ لگا جھٹکے سے پلگ تو نہ نکلا البتہ کوائل اور نکل کر ان کے پیر پر آ گیا۔ یہ اٹھے اور کھڑکی کی طرف جھٹکا کھا کر غسلخانہ کے پاس جا گرے اس وقت ہر کمرہ میں چھوٹا سا غسلخانہ بھی ہوتا تھا۔

کھڑکی کے باہر چارپائیاں بچھنے والا دیکھ رہا تھا۔ اس نے فوراً مچھر دانی کے بانس سے اس تار کو الگ کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ البتہ اور بلب بھی ٹوٹ گیا۔ وہ چیختا ہوا مین گیٹ سے اندر آیا کہ "ڈ کا مرا" اس سے یہ جملہ پوری طرح ادا نہیں ہو پا رہا تھا۔ بہرحال کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اندر داخل ہو کر کچھ کرے۔ فیروز صاحب کو جیسے ہی پتہ چلا انہوں نے سب سے پہلے مین سوئچ کو آف کیا۔ پھر کٹ آؤٹ نکالا اور پھر آ کر دروازہ کا شیشہ توڑ کر اندر کی چٹخنی کھولی اور داخل ہو گئے۔

چونکہ گرمی کا زمانہ تھا سب کے پلنگ برآمدے میں بچھے تھے۔ ساتھیوں نے فوراً انہیں اس پر ڈالا اور میکڈانلڈ کے سامنے والے میدان سے ہوتے ہوئے سیدھے اسپتال بھاگے۔ اس زمانہ میں CMO کیپٹن حفیظ الرحمن تھے۔ موصوف نے اپنی کوشش کی مگر شاید دوسروں کو تسلی دینے کے لیے، ذاکر صاحب وائس چانسلر تھے، ان کو اطلاع دی گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے ذاکر صاحب کو حقیقت سے آشنا کیا۔ رضا اس دنیا سے دارالبقاء کی طرف کوچ کر چکے تھے۔ ذاکر صاحب نے رضا مرحوم کے ایک عزیز سے رابطہ قائم کیا جو یہیں تھے۔ رضا صاحب کے والد جون پور میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ذاکر صاحب نے رات ۸ بجے ہی اپنی کار (جو ان کی اپنی ذاتی تھی) جون پور کے لیے روانہ کرنے کا حکم دیا لیکن ڈپٹی صاحب سے رات ۱۱ بجے فون پر رابطہ قائم ہو سکا، موصوف نے کہا کہ میت کو علی گڑھ ہی رکھا جائے اور وہیں سپرد خاک کیا جائے۔ وہ خود آرہے ہیں۔ ۸ بجے جب کیپٹن حفیظ الرحمن صاحب نے انتقال کی عام تصدیق کر دی تو علی گڑھ کی روایت کے مطابق تین سائرن بجے۔ حادثہ کی اطلاع یونیورسٹی کے گوشہ گوشہ میں چشم زدن میں پہنچ گئی۔

جس وقت فیروز صاحب نے رضا کو پلنگ پر لٹایا تھا تو کروٹ بدلتے وقت ان کے منہ سے ایک سانس نکلی تھی جس سے ساتھی یہ سمجھے کہ شاید زندگی کی رمق ابھی باقی ہے۔ مگر ایسا نہ تھا۔ یہ غالباً پھیپھڑوں کے اندر کی وہ ہوا تھی جو دبی ہوئی تھی۔ کروٹ بدلتے ہی باہر نکل گئی۔ اس وقت میں نے ان کیفیات کی ترجمانی چند اشعار میں کی تھی، اس کا ایک شعر یاد رہ گیا ہے

کیا کہوں تم سے رضا کا ہیں حال   آہ کھینچی اور بس کروٹ بدل کر رہ گیا

دوسری صبح ان کے والد آ گئے اور یونیورسٹی کے طلبہ، اساتذہ، حتیٰ کہ ہوسٹل کے بیرے اور سقوں نے بھی میت میں شرکت کی اور یونیورسٹی کے قبرستان منٹو آئی میں سپرد خاک کر دیا گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

آج بھی میں سوچتا ہوں کہ ۱۹۵۰ میں سائنس کی چھوٹی چھوٹی باتوں سے اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگ کس قدر ناواقف تھے۔ اس کا موازنہ آج ۱۹۹۴ء میں کیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آج کے چھوٹے چھوٹے بچے اس اعتبار سے کتنے آگے نکل چکے ہیں۔ یقیناً ان کا I.Q اس وقت کے پڑھے لکھے بڑوں سے کہیں آگے ہے۔

(باقی آئندہ)

گوشۂ قارئین

مکرمی و محترمی سلام مسنون

مزاج گرامی ! آپ کا گرامی نامہ مجھے مل گیا تھا۔ میری طبیعت ۱۵ مہینے سے خراب چل رہی ہے اب بہتر ہوں۔ نقل و حرکت میں دشواری ہوتی ہے۔ پہلے تو میرا ذہن آپ کی طرف منتقل نہیں ہوا سمجھا کوئی اور صاحب ہیں، بعد میں تصدیق ہوئی کہ آپ ہیں۔ تہذیب الاخلاق کا رنگ کچھ بدلا ہوا پایا۔ سید حامد صاحب کے منجملہ اور کارناموں میں یہ تہذیب الاخلاق بھی ہے کہ سرسید کی چیزوں کو بھی زندہ رکھا اور ساتھ ہی سنجیدہ رہنمائی کے لیے چیدہ مضامین کے شائع ہونے کی ترتیب بھی قائم کر دی۔ مجھے تو برابر اس کا انتظار رہتا ہے۔ ندائے ملت میں اکثر مضامین شائع کرتا ہوں۔ کاتب صاحب سے بعض وقت سہو ہو جاتا ہے حوالہ رہ جاتا ہے حالانکہ میری مستقل تاکید رہتی ہے۔ مسلم یونیورسٹی کو جس حال پر پہونچا دیا گیا ہے اب ڈر ہی معلوم ہوتا ہے کہ دیکھو کیا خبر آتی ہے۔ میں اپنی مسلسل علالت کی وجہ سے حاضر نہیں ہو سکا۔ ہمارے قائدین کو فرصت نہیں کہ وہ کچھ دن وہاں قیام فرما کر صحیح حالات کا اندازہ کریں اور اس کا مداوا کریں۔ میں تو ۱۹۵۸ء سے مسلسل صرف علی گڑھ اسی لیے حاضر ہوتا رہا کہ پبلسٹی کے بغیر جو کچھ ممکن ہوا سب ہی کچھ کرتا رہا۔ اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمائے۔ اب صورت بے حد تشویشناک ہے۔ آپ نے لکھنے کی فرمائش کی ہے میں نہ ادیب نہ لکھاڑ حاضر در تا کچھ لکھتا ہوں۔ پتہ نہیں ندائے ملت آپ کی نظر سے گذرتا بھی ہے یا نہیں ہے۔ اس نے بڑے وسیع محاذ پر لڑائی لڑی ہے اور خدا کا شکر ہے کہ کامیابی بھی حاصل کی۔ کسی مرحلے پر ضمیر کا سودا نہیں کیا۔ بہرحال آپ تہذیب الاخلاق کے ذریعے اس سلسلہ میں کیا کر سکیں گے واقعی ایک مشکل کام ہے۔ ذمہ داروں سے کچھ کہنا کہ رہنمائی مشکل کام بلکہ افضل جہاد ہے۔ میں اگر کبھی کوئی چیز بھیجوں تو اپنے معیار کے مطابق ہی معاملہ کریں مجھے کوئی شکایت نہ ہو گی۔

ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی
کرامت منزل، اکبری گیٹ، لکھنؤ

مکرمی اسلام علیکم

۱۰ ستمبر کا لکھا ہوا گرامی نامہ ملا۔ ۱۸ نومبر، "تہذیب الاخلاق" کو ایک سو روپے ڈاک خرچ وغیرہ دینے کا خیال بہت اچھا ہے۔ اس سے لکھنے والے کی کچھ تو ہمت افزائی ہو گی۔ لکھنا اس کے لیے بار نہیں ہو گا۔ کم از کم جیب پر جو بار پڑتا ہے وہ اچھے خاصے خوش حال مصنف کے لیے بھی خلش کا باعث ہوتا ہے۔ "تہذیب الاخلاق" کے سرکولیشن کو بڑھانے کی ضرورت ہے۔ اس رسالے کے معیار اور مضامین کو اکثر دانشوروں کو سراہتے دیکھا ہے۔

اردو کے کسی مضمون نگار کو شاید ہی کوئی رسالہ معقول معاوضہ دیتا ہو گا۔ آپ نے سو روپے ڈاک خرچ کے نام سے دینے کا ارادہ کیا ہے۔ یہ بطور ٹوکن کے ہی سہی، اچھی ابتدا ہے لیکن خود مضمون کا معاوضہ نہیں۔ پھر یہ پابندی مصنف پر

کیوں کہ وہ مضمون کسی اور جگہ شائع نہ ہو ۔ (شائع شدہ مضمون پر پابندی ضروری ہے) انگریزی اخبار اور رسالے مضمون نگار کو سینکڑوں روپے ادا کرتے ہیں ۔ ہم کو کہیں سے ایسی توقع نہیں ہے جو کچھ کام کر رہے ہیں وہ خدمت کے جذبے کے تحت ہو رہی ہیں ۔

محمد اسحاق

بازار گارڈ، حیدر آباد

مکرمی السلام علیکم

جس طرح آپ کا پرچہ زمانی اور وقتی اعتبار سے پیچھے چل رہا ہے اسی طرح مضامین کے اعتبار سے بھی پیچھے ہی ہے ۔ حالات حاضرہ پر کوئی خاص مواد اکثر نہیں ہوتا ۔ اس پر خطر و سنگین وقت میں ہندوستانی مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے؟ اس کے لیے کوئی لائحہ عمل و رہنمائی پرچہ میں عنقا ہوتی ہے ۔ اسی طرح نوجوانوں کے لیے بھی کوئی خاص بات نہیں ہوتی ۔ آج کا دور مسابقت کا دور ہے ۔ اس میں مسلم طلبہ کیسے اور کس طرح مقابلہ کر کے آگے بڑھ سکتے ہیں؟ اس سلسلے میں بھی کوئی رہنمائی نہیں دی جاتی ۔ اسی طرح ملت اسلامیہ اور تہذیب الاخلاق کے درمیان کوئی ربط دکھائی نہیں دیتا بلکہ محسوس ایسا ہوتا ہے کہ قارئین اور تہذیب الاخلاق میں کافی بعد ہو گیا ہے اور اجنبیت بڑھ رہی ہے ۔ آپ کوئی خیال نہ فرمائیں تو میں جرات کروں کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پرچہ یا تو بس برکت کے طور پر نکل رہا ہے یا پھر ملت میں مسلم یونیورسٹی کا مقدس "پرساد" تقسیم کیا جا رہا ہے ۔ جس میں سید احمد خاں کے ایک یا دو عدد مضامین حصول برکت کے لیے چھاپ دیئے جاتے ہیں ۔ اداریہ اچھا ہوتا ہے مگر وہ اکثر تعزیت نامہ یا معذرت نامہ کا شکار ہو جاتا ہے ۔ تاہم چند ایک مضامین اچھے ہوتے ہیں مگر جہاں تک پرچہ کے معیار کا سوال ہے وہ ہنوز "بلو پورٹی لائن ہی ہے ۔"

یہ چند تلخ گذارشات تھیں جس کے لیے معذرت خواہ ہوں ۔ میں عموماً خط لکھنے کا عادی نہیں ہوں آج بڑی ہمت کر کے اور وقت نکال کر یہ مکتوب روانہ خدمت کر رہا ہوں شاید کہ دل کا کرب کچھ ہلکا ہو جائے ۔ امید ہے کہ کوئی خیال نہ فرمائیں گے ۔

آپ نے ابھی ابھی ادارت کا بوجھ اپنے کاندھوں پر اٹھایا ہے اور ظاہر ہوتا ہے کہ آپ پرچے کو مفید سے مفید تر بنانے کے لیے کوشاں ہیں ۔ کمپیوٹر کتابت و طباعت اس کا ثبوت ہے ۔ قارئین کی آرا آپ کے لیے معاون ہو سکتی ہیں ۔

امید کرتا ہوں کہ راقم کی گذارشات کو سنجیدگی سے لیں گے اور سید احمد خاں کی اس تاریخی و علمی یادگار کو بہتر سے بہتر بنا کر نذر قارئین کریں گے ۔

محمد اسماعیل

ٹیپو سلطان روڈ، اورنگ آباد ۔ مہاراشٹر



جہاز نور بی ٹانک)
کام کرنے والوں
کے لئے نایاب تحفہ
دماغین
شربت
نزلہ
کھانسی، زکام، نزلہ
کے لئے
خون صفا
خون کی خرابی، پھوڑے
پھنسی، خارش اور داد
کھجو کی دوا
مشہور اور پیٹنٹ دوائیں
DAWAKHANA TIBBIYA COLLEGE ALIGARH
دواخانہ طبیہ کالج مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

ایک مکمل ہیلتھ ٹانک، بلکہ اور بھی بہت کچھ!



سنکارا
آپ کی صحت کے لیے ایک بھرپور ٹانک

سنکارا لازمی عناصر، جڑی بوٹیوں اور وٹامنوں کا نادر مرکب ہے۔ اس میں آئرن، کیلشیم اور زنک کی کافی مقدار ہے۔ اتنا ہی نہیں، سنکارا میں الکحل بالکل نہیں ہے۔ سنکارا آپ کی کس طرح مدد کرتا ہے؟

اسکول جانے والے بچّوں کے لیے:
سنکارا جسمانی اور ذہنی توانائی بڑھانے میں مدد کرتا ہے۔ اس کی وجہ ہے سنکارا میں موجود مقوّی عناصر (بالخصوص زنک اور آیوڈین) جو دماغ کے خلیوں کو بڑی مقدار میں غذا فراہم کرتے ہیں۔ یہ قوتِ حافظہ کی اصلاح بھی کرتا ہے۔

حاملہ خواتین کے لیے:
سنکارا حاملہ خواتین، اور دودھ پلانے والی ماؤں کی ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔ اس میں ماں اور بچّے کی صحت کے لیے ضروری فولک ایسڈ، وٹامن بی ۱۲، آئرن، کیلشیم اور زنک کافی مقدار میں ہیں۔

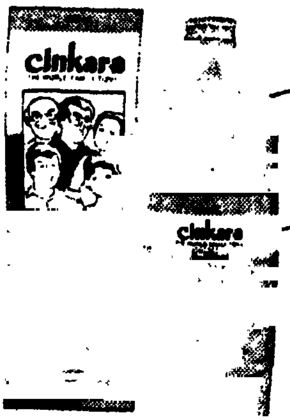
بالغوں کے لیے:
دباؤ اور تناؤ بھری اس دنیا میں سنکارا مہلک امراض سے حفاظت کا سب سے بہترین ذریعہ ہے۔ سنکارا دورانِ خون کو معمول کے مطابق رکھنے اور جگر کے اطراف میں کثافتوں کے جمع ہونے سے روکنے میں مدد کرتا ہے۔

ضعیفوں کے لیے:
سنکارا ضعیفوں کے لیے قابلِ مثال اور طاقت بحال کرنے والا ٹانک ہے۔ اعتدال میں کمی آجانے کے سبب پیدا ہونے والے امراض اور ضعیفی میں پریشان کرنے والی بیماریوں سے حفاظت کرتا ہے۔ ان میں اکثر امراض کا سبب خراب اور غیر متناسب غذا ہے۔

تو آج ہی سنکارا لے آیئے۔ یہ پورے خاندان کے لیے قابلِ مثال صحت بخش ٹانک ہے۔

چند مشہور ٹانکوں میں موجود آئرن، کیلشیم، زنک اور الکحل کی مقدار (فی خوراک) کا موازنہ۔

Reputed brands of tonics	Iron (mg)	Calcium (mg)	Zinc (mg)	Alcohol content percent (V/V)	Contents per unit pack
1	–	12.4	–	12.00	400
2	–	–	–	11.0	240
3.	9.06	–	–	–	464
4	13.00	–	–	–	200
5.	21.50	–	0.00082	5.5	200
6.	16.700	–	–	–	300
7.	–	–	–	–	200
8	7.83	–	0.50	–	100
9.	5.00	9.50	–	9.5	300
Cinkara	[illegible]	[illegible]	2.00	[illegible]	[illegible]



لازمی بنیادی عناصر، وٹامنوں اور جڑی بوٹیوں کا نادر مرکب

ہمدرد
سنکارا
مشہور عالمی فیملی ٹانک، ہر موسم میں سب کے لیے

Chaitra Leo Burnett D HWL 1493 URD